[illegible] باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۴ فہرست مضامین مارچ ۱۹۳۶ء نمبر ۹

عالمگیر کا روسی نمبر ضرور ملاحظہ فرمائیے

[illegible] نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر [illegible] سے شائع کیا۔

حافظ محمد عالم صاحب مدیر عالمگیر

کے اکلوتے نورِ نظر کا ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو ایک بیحد مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ———

اگرچہ روسی نمبر کا کام ۲ تاریخ تک تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن اس جانکاہ ناگہانی صدمہ کے سبب سے اس کی فوری اور قطعی تکمیل ناممکن ہو گئی۔ اسلئے اب انشاء اللہ تعالیٰ یکم اپریل کو روسی نمبر کے وی۔پی کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوگا اور غالباً ۱۰ اپریل تک عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کے نام وی۔پی بھیجدیئے جائیں گے۔

کسی صاحب کو اگر کسی وجہ سے روسی نمبر کی خریداری منظور نہ ہو تو وہ دفتر کو اطلاع دیدیں تاکہ دفتر بلاوجہ وی۔پی وغیرہ کے اخراجات کا زیر بار نہ ہو۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری ضرور لکھیے۔

عالمگیر کا "روسی نمبر" بلا مبالغہ روسی لٹریچر کی جان ہے تقریباً، تمام مشہور روسی مفکرین کے مضامین اور افسانے عالمگیر کے "روسی نمبر" میں موجود ہیں

نیاز مند:۔ منیجر عالمگیر لاہور،

مُلاحظات

نوجوان بھائی کی دائمی مفارقت اور ناگہانی موت کا غم ابھی تبدیل نہیں ہوا تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے میرے دل پر ایک اور چرکا لگایا۔ آہ! دل و جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ جانے کو تیار ہیں۔ آہ! یہ جانگزا خبر کس طرح حوالۂ قلم کروں کہ میرا اکلوتا نورِ نظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو گیا۔

بڑی آرزوؤں، بڑی تمناؤں اور التجاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بیش قدر نعمت۔ یہ بیش بہا دولت عطا فرمائی تھی اور میں ابھی جی بھر کر اسے دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ موت کا پیغام آگیا۔

روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

خدا تعالےٰ کی مشیت اور اس کی مصلحتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور میں درد و کرب اور رنج و الم کے ان احساسات کے باوجود جو ایسے مواقع پر کمزور و بے بس انسان کے دل کو مضطرب اور بے قرار کر دیتے ہیں خدائے بزرگ و برتر سے توفیقِ صبر کا طالب ہوں اور سوائے صبر کے ہمارے حیطۂ اختیار میں بھی کیا ہے؟

اس جانکاہ صدمہ میں جن احباب نے خود تشریف لا کر یا خطوط کے ذریعہ میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی فرمایا ہے میں ان سب کا شکر گذار ہوں۔ چونکہ اپنی پریشانی کی بنا پر فرداً فرداً تمام گرامی ناموں کے جواب میں نہیں لکھ سکا ان لئے ان سطور کے ذریعہ احباب کرام کی خدمت میں اپنے دلی جذبات تشکر پیش کرتا ہوں۔

پنجاب کے تقریباً تمام اسلامی اخبارات نے اس غم انگیز اطلاع کو شائع کر کے جن مخلصانہ الفاظ میں میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے اس کے لئے میں بہت ہی تشکر گذار ہوں۔

عالمگیر کے تمام ناظرین کرام سے بہ الحاح آرزو مند ہوں کہ وہ درگاہ رب العزت میں میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالےٰ مجھے اطمینان قلب اور ذہنی سکون عطا فرمائے۔ میرے مصائب و پریشانیاں ختم ہوں۔ وہ خطا پوش و عطا پاش ذات مجھے اب امتحان ابتلا میں نہ ڈالے۔ تفکرات اور مایوسیوں کی گھنگھور تاریکی دور ہو۔ میری آرزوؤں اور تمناؤں کے خزاں دیدہ گلشن میں روح افزا بہار کا دور دورہ ہو۔

اللہ دکھائے نہ الم نورِ نظر کا،
نہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

یہ واقعہ ہے کہ ان جانگزا اثرات کو جو اس حادثہ کے بعد میرے دل و دماغ پر مستولی ہیں کما حقہ الفاظ کے ذریعے ظاہر کرنا میرے لئے قطعی ناممکن ہے۔ میں بہر حال راضی برضائے الٰہی اور اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہوں۔

ابھی اس تجدہ حادثہ کے ساتھ ایک اور خبرِ وحشت اثر بھی سن لیجئے عالمگیر کے تمام ناظرین کرام غالباً مولانا محسن بہاری کے اسم گرامی سے واقف ہونگے۔ آپ افتخار الملک حضرت مضطر خیرآبادی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ گذشتہ خاص نمبر ۳۶ء میں آپ کا ایک بلند پایہ تحقیقی مضمون "طوفانِ نوح" بھی ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

اب مولانا محسن کے الفاظ میں ہی مذکورہ بالا خبر کو ملاحظہ فرمایئے۔

"مدیر محترم! تسلیم و تحیہ،

عزیزہ خضر بانو خیری کل ۹ ذی الحجہ اتوار کے روز بعارضہ سل انتقال کر گئیں فرزند عزیز مولوی ابو یوسف محی ندوی کے بعد یہی خیری تھیں جنہیں نعم البدل سمجھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا مگر وائے حسرتا اب یہی چھن گئیں آپ سمجھے یہ کون خضر بانو تھیں؟ وہی خضر بانو جن کے بہترین مضامین آپ عالمگیر اور صوبہ بہار کے مختلف اخبارات و رسائل میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ مرحومہ نے چھوٹی سی عمر میں اپنے لائق و فائق اور شفیق والد کی بدولت اچھی خاصی استعداد و قابلیت پیدا کر لی تھی اور کی بہت خدمتگزار تھیں ... انہیں کچھ اور مہلت دیتی۔

... صاحب محسن بہاری کی خدمت میں اس جانکاہ حادثہ پر اپنی اور عالمگیر کے تمام ناظرین کی طرف سے جذبات ہمدردی پیش کرتا ہوا دست بدعا ہوں کہ خدائے قادر و قیوم مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل۔

روسی نمبر بھی پریشانیوں کے سبب پورے طور پر مکمل نہ ہو سکا۔ اب ناظرین کرام کی طرف سے اس مضمون کی شکایتیں آنی شروع ہو گئی ہیں کہ ہمیں اب تک حسب وعدہ روسی نمبر کا وی پی نہیں پہونچا۔ جو لہٰذا تمام حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ یکم اپریل کو تمام خریدار حضرات کے اسمائے گرامی پر روسی نمبر کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوگا اور غالباً ۱۰ اپریل تک تمام وی پی بھیجے جا سکینگے۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ

سہیلی کا ایثار

میرے عزیز رشتہ دار مجھے پیار میں لیلا کہا کرتے تھے۔ ایک رئیس گھرانے کا چشم و چراغ تھی۔ بچپن سے نازونعم میں پرورش پائی تھی۔ روپیہ اور دولت میری نگاہوں میں کوئی وقعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ گھر میں میرے بھائی اور دوسرے بچے موجود تھے مگر میری والدہ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتی تھیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے خاندان میں مدت سے کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بڑی تمناؤں اور آرزوں کے بعد میں پیدا ہوئی تو ابتدا سے ہی میری پرورش و پرداخت میں ہر شخص انتہائی توجہ اور احتیاط برتنے لگا۔

میرے والدین مجھے ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے بھی نہ دیتے تھے۔ صرف میرے پڑوس کی لڑکی رامی البتہ مجھ سے ملنے چلی آتی تھی۔ اسی کے ساتھ میں اپنے گھر میں کھیلا کرتی تھی اور چونکہ میرے گھر کے آدمی اس لڑکی کے عادات سے مطمئن تھے اس وجہ سے مجھے بھی اجازت مل گئی تھی کہ جب کبھی میرا جی گھبرایا کرے تو اس کے مکان پر ہو آیا کروں۔ میں اکثر رامی کے گھر جاکر کھیلا کرتی۔ ہم دونوں گڑیوں کا بیاہ کیا کرتے۔ مہمانوں کی دعوت کے لئے چھوٹی چھوٹی ہنڈیوں میں چاول پکاتے اور بالکل اس طرح خوش خوش رہا کرتے گویا ہمارے مکان پر واقعی کوئی شادی ہوئی ہے۔

اسی طرح دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہوتے گئے۔ اب مجھ میں کچھ سنجیدگی پیدا ہو چلی تھی۔ پہلے تو رامی سے کسی کسی بات پر لڑائی بھی ہو جاتی تھی مگر اب ہم دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرنے لگے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا رامی مجھ سے آئندہ زندگی کے متعلق کوئی نہ کوئی بات پوچھ بیٹھتی۔

"لیلا! تمھاری جب شادی ہو جائیگی تو بھلا ہمیں کیوں یاد کروگی؟"

"پگلی ہوئی ہو۔ بھلا رامی میں تمھیں کوئی بھول سکتی ہوں۔"

"نہیں بہن! پرائے گھر میں ہو کے کوئی لڑکی کسی کو یاد نہیں رکھتی۔"

"تو رامی تم مجھے بھول جاؤ گی۔"

"لیلا! میں تمھیں نہیں بھول سکتی۔"

"یہ کیا بات؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میں تم سے بالکل مختلف ہوں۔"

"آخر میں بھی تو جانوں! تم میں کون سی بات نئی ہے!"

"یہ تمھیں آئندہ معلوم ہو جائیگا۔"

میرے پتا جی میری شادی کے لئے بہت بے چین تھے۔ جب تک میں بچی تھی کوئی بات ہی نہیں تھی مگر جب سے میں جوان ہوئی تھی ان کے اور گھر والوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی تھی۔ آخر کنک پور کے زمیندار ادکانت سنگھ کے لڑکے دیو کرشن سے میری شادی ہو گئی۔ اب وہ بچپن کی بہاریں خواب و خیال ہو گئیں میکے میں جو آزادی اور بے فکری تھی وہ جاتی رہی۔ میں پہلے جیسی بے باک تھی اور بچپن کی شوخیاں میرے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھیں مگر اب بات کرتے ہوئے بھی میں شرمایا کرتی۔

اب تو وہ عیش و آرام یاد آ آکر بڑی تکلیف دیا کرتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مجھے کسی دوسری دنیا میں قید کر دیا گیا ہے۔ بات بات پر ساس کی بک بک نندوں کی جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔ میں نے کبھی کسی کی بات بھلا کب اٹھائی تھی میری سسرال میں کسی چیز کی کمی تو تھی نہیں۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ میرے شوہر خود زمیندار تھے۔ مکان سے قریب ہی ایک باغ بھی موجود تھا۔ قصبہ میں کئی محل اور عالیشان عمارتیں ہماری موجود تھیں۔ روپیہ پیسہ کی یہاں بھی کمی نہیں تھی مگر ایک بیوی کو جو خوشی چاہئے وہ میسر نہیں تھی۔ میرے شوہر خوبصورت بھی تھے آج کل کے زمینداروں کو عموماً جو تعلیم دی جاتی ہے وہ انھیں مل چکی تھی لیکن اسے کیا کیا جائے اپنی بیوی کے ساتھ ان کا سلوک بے حد تکلیف دہ تھا۔ وہ عورت کو مرد کی ملک سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں بیوی کی کوئی وقعت ہی

تھی۔ میں ہر چند کوشش کرتی کہ کسی نہ کسی طرح انہیں خوش رکھ سکوں۔ مگر میری تمام کوششیں بیکار جاتی ہوئی معلوم ہوتیں۔

اول اول تو وہ مجھ سے بڑے تپاک سے پیش آئے۔ نئی نئی امنگیں تھیں بیوی کوئی عجیب چیز معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان کی طبیعت کا یہ جوش گرمی کا ابال ثابت ہوا۔ دو چار دن کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہیں مجھ سے نہ کوئی ہمدردی ہے نہ محبت۔ ان کی بلا سے میں کسی حال میں رہوں۔ میں ساس کے ظلم۔ نند کی جفائیں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔ مگر میں اس حال پر صبر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر مجبور تھی کیا کرتی گھر کا ایک ایک آدمی میرا دشمن تھا اور کسی کو بھی مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

میری شادی سے تھوڑے دن ہی بعد رامی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے پتی قریب کے ایک تھانے میں سب انسپکٹر تھے۔ شادی ہو جانے کے بعد چونکہ میں اور رامی ایک ہی شہر میں تھے اس وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے چلی آتی تھی۔ ایک روز جو وہ میرے پاس آئی تو میں بہت اداس بیٹھی تھی۔ میں نے اب تک رامی پر اپنے دل کا حال ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر آج وہ سمجھ گئی کہ میں ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں مجھ سے اصرار کر کے پوچھنے لگی۔

"لیلا یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے سچ بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے۔"

"کچھ نہیں، رامی۔"

"اچھا' لیلا مجھ سے بھی بات چھپاؤ گی۔"

"رامی' تو میری بچپن کی رازدار ہے تجھ سے کیا بات چھپ سکتی ہے؟"

"اچھا تو دیکھو سچ سچ بتاؤ کیا نند بہن نے کچھ کہدیا یا ساس ماتا ناراض ہو گئیں نہیں ہمارے بھائی صاحب سے کچھ ان بن ہو گئی معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں رامی کسی کا قصور نہیں میری تقدیر کا قصور ہے۔"

"لیلا بہن! دیکھو ہم سے نہ چھپاؤ۔"

رامی نے کچھ اس طرح اصرار کے ساتھ مجھ سے کہا کہ مجھے اپنے دل کا حال کہتے ہی بن پڑی۔ رامی کچھ دیر تک تو چپ بیٹھی رہی اس کے بعد اس نے کہا "لیلا میں اس وقت جاتی ہوں۔ تم میری فکر نہ کرنا اب میں اس وقت ملوں گی جب تمہاری مشکلات دور ہو جائیں گی۔"

میں نہ معلوم کیوں زیادہ اصرار بھی نہ کر سکی۔ رامی میرے پاس سے چلی گئی۔

رامی اپنی دھن کی پکی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اسی دن سے میرے شوہر کی نقل و حرکت کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ خود تو بھلا وہ کیا دیکھ بھال کر سکتی تھی اس نے اپنے شوہر سے سارا حال کہدیا۔ وہ پولیس میں تھے دو ہی دن میں انہوں نے معلوم کر کے بتا دیا کہ وجے کرشن کنک لتا نامی طوائف کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

رامی نے میرے شوہر کے متعلق جب ساری باتیں معلوم کر لیں تو اس نے ایک سچی بہن کی طرح مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے سے بھی گریز نہ کیا وہ ایک دن چھپکر کنک لتا کے مکان پر پہونچی۔ اور اس سے کہا۔

"کنک لتا! تم مجھے نہیں جانتیں۔ نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی ہے۔ لیکن تم ایک عورت ہو اور میں جانتی ہوں کہ عورت کا دل عورت کی تکلیف و مصیبت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ میں اپنی ایک بہن کی دکھ بھری زندگی سے متاثر ہو کر تمہارے پاس تک آئی ہوں۔ شاید اس کی مصیبت تمہیں بھی متاثر کر سکے اور تم بھی میری طرح اس کی ہمدردی پر تیار ہو جاؤ۔"

کنک لتا حیران تھی کہ ایک شریف عورت اس کے گھر پر آ کر اس کے نسوانی دل سے ہمدردی کی اپیل کر رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو۔"

"کنک لتا! یہ نہ پوچھو میں کون ہوں۔ ہاں یہ سمجھ لو کہ میں کیا چاہتی ہوں تم نے میری ایک بہن کی امانت چھین رکھی ہے۔ اس کا شوہر وجے کرشن تمہارے قبضہ میں ہے۔ تم نے اس کے آرزوؤں بھرے دل پر بجلیاں گرا رکھی ہیں۔ تم چاہو تو اس کی موجودہ المناک زندگی کو خوشحال بنا سکتی ہو۔ کنک تم دنیا میں اور وجے کرشن حاصل کر سکتی ہو مگر لیلا کو کوئی وجے کرشن اس کے بعد نہیں مل سکتا۔"

کنک سب کچھ سمجھ گئی۔ رامی نے اسے میرا نام بھی بتا دیا اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وجے کرشن کی بیوی کا نام لیلا ہے۔

رامی نے جو کنک کا دل نرم ہوتے دیکھا تو اس نے اپنے کئی ہزار روپے کے زیور اس کے قدموں پر ڈال دیئے۔ "کنک یہ تمہارے ہیں، اور مجھ سے کوئی وعدہ کرنے سے پہلے تمہارے۔ میں تمہارے نرم دل کو دیکھ رہی ہوں۔ تمہاری نگاہوں سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تم میرا پیغام ہمدردی قبول کرنے کو تیار ہو۔" کنک نے ہر چند اصرار کیا مگر رامی نے وہ زیورات واپس نہیں لئے۔

ایک روز ایک بچے کے ذریعہ سے مجھے کنک کا ایک خط ملا۔ "بہن لیلا! میں تمہاری گنہگار ہوں۔ اپنا قصور معاف کرانے تمہارے پاس تک آنا چاہتی ہوں آج شام کو مجھے اپنے ہاں میں باغ میں آنے کی اجازت دیجئے، میں اس احسان کے بدلے میں کہ تم میرا قصور معاف کردو تمہیں وہ نسخہ بتا دونگی جو بجے کرشن کو آئندہ ہمیشہ کے لئے تمہارا اور صرف تمہارا ہی بنائے رکھے۔" تمہاری خطاوار کنک،

میں اول اول تو پہچانی ہی نہیں کہ یہ کنک کون ہے مگر اس کے خط کے آخری فقرہ نے مجھے شوق دلایا کہ میں اس سے ضرور ملوں اور دیکھوں وہ کون سا نسخہ ہے جس کے استعمال سے میں وجے کرشن کے دل پر قابو پا سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کنک نے میرا کیا قصور کیا ہے لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے میرا کوئی قصور بھی کیا ہے تو میں اسے اس وجہ سے بالکل معاف کر دونگی کہ اس کے ذریعہ سے مجھے وہ نسخہ حاصل ہوا جا رہا ہے جس سے میری تمام عمر کی مصیبت دور ہو جائیگی اور میرا شوہر ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائیگا۔ میں بڑی بے صبری سے شام کا انتظار کرنے لگی لڑکے کے ذریعہ سے میں نے کہلا بھیجا کہ میں اس کی منتظر ہوں۔

شام کو سویرے ہی گھر کے کام کاج سے نبٹ کر میں برابر کے باغ میں چلی گئی۔ کوئی بیس منٹ بھی نہ ہوئے ہونگے کہ سامنے سے ایک خوبصورت عورت آتی نظر آئی قریب آنے پر معلوم ہوا یہ عورت اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنی معلوم ہوتی تھی اس نے نئے فیشن سے بالوں کو آراستہ کر رکھا تھا۔ چہرے پر پوڈر اور کریم ملا ہوا تھا آنکھوں میں خاص طریقہ سے سرمہ کی تحریر نمایاں کی گئی تھی، اس کی ہر ایک حرکت سے انداز و تمکنت ٹپکتی تھی۔ میں حیران تھی کہ آج یہ کون عورت مجھ سے ملنے آئی اسے تو میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں مگر اس کے پیہم مسکرانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے پہچان گئی ہے اور کسی غرض سے میرے ہی پاس آئی ہے۔

اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا اور اپنا ہینڈ بیگ پاس رکھ کر میرے قریب بنچ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک میں اور وہ دونوں خاموش رہے ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ میری طرف سے سلسلۂ گفتگو شروع کئے جانے کی منتظر ہے میری طبیعت میں اس خاموشی سے خود ایک الجھن سی پیدا ہو رہی تھی۔ آخر میں نے کہا۔

"آپ کون ہیں یہاں کس غرض سے آئی ہیں؟"

"کیا آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار ہوا۔ میں تو آنے سے پہلے آپ کی اجازت بھی لے چکی ہوں۔"

"اچھا اب میں بھی، کہو بہن کنک مجھ سے کیا کہنا ہے؟" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں بہن! کہنا تو مجھے نہیں آپ کو ہے۔ مجھے تو اپنی خطا معاف کرانا ہے"

"تم نے ایسی کون سی خطا کی۔ یہ کیا کہہ رہی ہو!"

"نہیں میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں میں نے آپ کے شوہر وجے کرشن پر محبت کے ڈورے ڈالے انہیں تم سے متنفر کیا۔ یہ قصور ہی کیا کم ہے؟"

"لیکن کنک اور اب کیا چاہتی ہو؟" میں نے ٹھنڈی بھرتے ہوئے کہا۔ میرے ان لفظوں سے کنک کا دل بھر آیا اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈالدیں۔ "بہن لیلا! میں خطاوار ہوں۔ میں نے تمہارا قصور کیا میرا قصور معاف کردو۔ خدا کے لئے میری خطا معاف کردو۔"

مجھے سارا حال معلوم ہو کر غصہ ضرور آیا تھا لیکن اس کی ان باتوں سے میں زیادہ دیر تک ناراض بھی نہ رہ سکی۔ عورت کا دل ہی کیا۔ وہ کتنی ہی خفا اور بیزار کیوں نہ ہو دو لفظوں میں پانی پانی ہو جاتی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کنک سے کہا۔

"کنک میرا نام تمہیں کس نے بتایا؟"

"لیلا میں سب کچھ بتا دونگی لیکن پہلے یہ کہدو کہ میں نے تیرا قصور معاف کیا۔"

"اچھا کنک، اگر تم نے کوئی قصور بھی کیا تھا تو میں نے اسے معاف کیا مگر"

"مگر کیا لیلا؟"

"وہ نسخہ؟"

"کون سا نسخہ ..... میں کوئی حکیم ہوں۔"

"دیکھو: میں نے تمہارا کہنا کر دیا تو پھر تم وعدہ سے پھرنے لگیں۔"

"نہیں نہیں مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ لیلا میں تمہیں وہ نسخہ بتا کر بلکہ تجربہ کرا کر پھر جاؤں گی۔"

اس نے مڑ کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس کے اندر سے دو تین قسم کی شیشیاں اور ڈبیاں نکالیں۔ خوشبو اور مہک کے مارے میرا دماغ معطر ہو گیا۔ میں سوچنے لگی، دیکھوں اب کیا کرتی ہے؟

اس نے کہا: "لیلا دیکھو میں اس وقت جو کچھ کرونگی تمہارے فائدے کے لئے۔ تم مخالفت نہ کرنا۔ نہ معلوم کیوں میں اس کا کہنا ماننے لگی۔ مسکراہٹ اب بھی میرے ہونٹوں پر طاری تھی اور میں کبھی کبھی اس سے دور ہٹ جاتی

بھی وہ مجھے پھر ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھا لیتی تھی۔

اس نے میرے چہرے پر ایک خاص قسم کا کریم لگایا۔ پوڈر لگایا۔ میری آنکھوں میں اپنے ہاتھ سے سرمہ لگایا۔ میرے بال کھول کر نئے فیشن سے سنوارے اور جب مجھے اپنی پسند کے موافق سجا چکی تو ہینڈ بیگ میں سے آئینہ نکال کر میرے سامنے رکھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کن انکھیوں سے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا اب میں وہ پہلی لیلا نہیں تھی۔

میں ابھی کنک سے باتیں ہی کر رہی تھی کہ ایک طرف سے میرے پتی آتے ہوئے نظر آگئے۔ میں انہیں دیکھ کر گھبرا گئی میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اتنے میں کسی نے میرا ہاتھ پکڑا۔ رامی میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"رامی تم کہاں؟"

رامی اس کا جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ میرے شوہر نے کہا "رامی نے تو یہ تمام ڈرامہ مرتب ہی کیا ہے۔ اس کی بھیجی ہوئی کنک آئی اسی کے بلائے ہوئے میں اور تم آئے ہیں۔"

"مگر بھائی اس سارے کھیل میں خاص پارٹ تو آپ نے ہی کیا ہے۔" رامی ہنس کر کہنے لگی اس کے ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے تھے۔

میرے منہ سے نکل گیا۔ "رامی تیرے ایثار نے میری زندگی سنوار دی۔"

میں اب تک یہی سمجھتی تھی کہ اس تمام ڈرامہ میں زیادہ تر رامی اور اس کے بعد کنک کا ہاتھ کام کرتا رہا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ رامی کے شوہر نے بھی کچھ کم پارٹ نہیں کیا

اصل بات تو یہ ہے کہ اگر وہ خود اپنی کوشش سے میرے پتی کی بابت سارے حالات کا پتہ نہ لگا لیتے تو رامی کو بھی میری امداد کرنا دشوار ہوتا۔

رامی آج بہت خوش نظر آتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی سچی سہیلی لیلا کی مدد کر کے اس نے اپنے دل پر سے زبردست بوجھ اتار دیا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اب تک میرے پتی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ رامی اسی سب انسپکٹر کی بیوی ہے جو ان کا دوست بن کر ان کے سارے بھید معلوم کرتا رہا ہے جب میں نے انہیں ان سب حالات سے مطلع کیا تو وہ بہت متعجب ہوئے اور رامی سے کہنے لگے "رامی میں نہیں جانتا تھا کہ دنیا میں تم جیسی سچی اور وفادار عورتیں بھی موجود ہیں۔ تم نے اپنی سہیلی لیلا پر نہیں بلکہ مجھ پر احسان کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ تمہارے شوہر نے بھی اس ڈرامہ میں وہ پارٹ کیا ہے کہ میرا کوئی جان نثار دوست ہی ایسا کام کر سکتا تھا۔

رامی ہم سب کو خوش دیکھ کر گھر جانا چاہتی تھی لیکن میں نے یہ کہہ کر اسے روک لیا کہ ابھی تمہارا اور تمہارے ساتھ کنک کا مجھے بہت شکریہ ادا کرنا ہے۔

میں نے رامی اور کنک کو کئی روز مہمان رکھا رامی کے شوہر کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ اور میرے پتی بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملے کنک نے ہم لوگوں کے سامنے اس بات کا عہد کر لیا کہ آئندہ وہ پاکبازانہ زندگی بسر کرے گی۔

اس واقعہ کو مدت گذر چکی۔ اس وقت سے میرے پتی مجھ سے بیحد محبت کرنے لگے ہیں ــــ اب بھی جب کبھی کنک ہمارے یہاں آتی ہے تو ہیں خوب خوب چھیڑا کرتی ہے۔

ٹیگور کے دو جام

"اندھی پھولوں والی لڑکی"۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ میں خیابان چمن میں تازہ لہلہاتے ہوئے پھولوں کی مہک سے مست بیٹھا تھا۔ دنیائے محبت میں کھویا ہوا۔ اس وقت ایک حسین لڑکی مجھے ایک "تحفہ محبت" پیش کرنے آئی۔ وہ محبت کا تحفہ ــــ ایک پھولوں کا ہار کنول کے پتے میں لپٹا ہوا تھا۔ میرا دل مسرتوں سے لبریز ہو گیا اور میں نے اس کو اپنے گلے میں پہن لیا۔ لیکن میری آنکھوں سے دو بڑے بڑے گوہر حسرت ٹپک پڑے۔ وہ پیکر حسن بن کر سامنے کھڑی رہی۔ میں نے اس معصوم کے دست نازک کو چوما اور کہا ــــ اے گل گلزار حسن! میں تیری محبت کے پھولوں کا تحفہ پسند کرتا ہوں مگر افسوس ان پھولوں کی طرح تو بھی اندھی ہے اور نہیں جانتی کہ تیرا تحفہ کتنا خوبصورت اور دلکش ہے۔

"لازوال لطیف درد"۔ اے دنیا! میں تیرے چمن سے ایک پھول چن لایا اس کو جوش مسرت میں اپنے مچلتے ہوئے دل کی آغوش میں لیکر زور سے بھینچا ــــ مگر اس شگفتہ پھول میں جو خار پنہاں تھا اس نے میرے دل میں چبھ کر ایک لطیف زخم پیدا کر دیا۔

جب دن ختم ہو گیا اور رات کی تاریکی نے اپنا قبضہ دنیا پر جمایا تو میں نے دیکھا کہ وہ دلکش پھول جو صبح کے وقت آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتا تھا اب مرجھا کر اپنی پہلی دلکشی کھو چکا۔ لیکن میرے زخم خوردہ دل میں وہ درد ہنوز باقی تھا ــــ اے دنیا! تیرے چمن میں اور بہت سے پھول اپنی دلکش رعنائیوں اور خوشگوار بھینی بھینی خوشبو کو لئے ہوئے کھلیں گے ــــ مگر میری گلگشت کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب میرے پاس وہ میرا دلکش گلاب نہیں ہے ــــ، ہاں! صرف وہ لطیف درد اس دل صد چاک میں اب تک باقی ہے۔ (ترجمہ از باغبان ٹیگور)

فوقی حیدری۔ اسلامیہ کالج وانمباڑی،

تخیلات امیر

از معلی القاب عالیجناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر دام اقبالہ (امیر ملکی)

کس طرح شام جدائی ہو سحر سے واقف
میرے نالے ہی نہیں رنگِ اثر سے واقف

تیری نظروں میں ہے میرے دل بیتاب کا گھر
دل ہے میرا ترے اندازِ نظر سے واقف

فرقتِ غیر نے اب رنگ جمایا اپنا
اب ہوئے آپ محبت کے اثر سے واقف

فتنہ پرداز زمانے میں ہمیں ہیں مشہور
خیر سے آپ کے دشمن نہیں شر سے واقف

پوچھتے کیوں ہیں مری آبلہ پائی کا سبب
کیا نہیں آپ محبت کی ڈگر سے واقف

آشیانے کے عوض کنج قفس ہے معلوم
بدلے گلشن کے ہوں صیاد کے گھر سے واقف

مدد اے ضبط فغاں المدد اے ضبط فغاں
ہو نہ جائیں وہ کہیں سوز جگر سے واقف

آج کیا بات ہے کیوں در پہ لگا ہے میلہ
کل نہ تھے غیر تری راہگذر سے واقف

دوست دشمن کی خبر پوچھتے کیا ہو مجھ سے
بیخبر ہوں نہیں آپ اپنی خبر سے واقف

زیر دیوار مجھے دفن کیا ہائے غضب
ہو گئی خلق خدا آپ کے در سے واقف

ہیں جو نافہم انھیں قدر مری کیا ہو معیں
ہوتے ہیں اہل ہنر اہل ہنر سے واقف

مغل فنِ تعمیر

از جناب ابو عبداللہ محمد صاحب حیدر آباد دکن

ہندوستان میں فن تعمیر ابتدا ہی سے کافی ترقی یافتہ تھا لیکن دور مغلیہ میں اس کو جو فروغ ہوا اس کی مثال ساری تاریخ ہند میں نہیں ملتی دولت کی فراوانی اور شاہی سرپرستی نے وہ سب کچھ کر دیا جو اس کو انتہائے کمال پر پہونچانے کیلئے ناگزیر تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ مغلوں نے ایرانی طرز تعمیر سے ہندوستان کو روشناس کر کے ہندی فن تعمیر پر بہت بڑا احسان کیا۔ ہندی ایرانی اصول کے اختلاط نے فتح پور سیکری کو پیدا کیا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نظیر نہیں رکھتا۔ یوں تو اس سے پہلے بھی بابر و ہمایوں نے کئی عمارات تعمیر کروائیں لیکن زمانے کے ہاتھوں ان میں سے بہت کم محفوظ رہ سکیں۔ پانی پت میں کابل باغ والی مسجد جو بابر نے اپنی عظیم الشان فتح پر تیار کروائی۔ اس جلیل القدر بادشاہ کی ایک ہی یادگار ہے جو اب تک باقی ہے۔ ہمایوں نے بھی اس فن کی سرپرستی کی اور اپنے دار الخلافہ کی آرائش کیلئے کئی عمارتیں بنوائیں۔ مگر بابر اور ہمایوں کی عمارات زمانہ مابعد کے لئے ایک سرسری تمہید تھیں۔

اکبر کے زمانہ سے ایک جداگانہ مستقل فن تعمیر شروع ہوا۔ جو دور جہانگیری کے اختتام تک چلتا رہا۔ دلّی میں ہمایوں کا مقبرہ جس پر پندرہ لاکھ روپیہ صرف ہوئے لیکن جس کی تعمیری نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں شاید اکبر کا پہلا کارنامہ ہے۔ ممکن ہے اس کی ابتدا ہمایوں ہی کے زمانہ میں ہوئی۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ اکبر کے مقبرے کی تعمیر خود اسی نے شروع کی اور اس کی تکمیل جہانگیر کے ہاتھوں ہوئی۔ مغل بادشاہوں کی شاید یہ خاندانی روایت تھی کہ وہ اپنے مقبروں کی تعمیر اپنی زندگی ہی میں کر دیا کرتے تھے فرگوسن صاحب کا خیال ہے کہ یہ لوگ اپنے مقبرے کچھ اس طریقے کے بناتے تھے کہ زندگی بھر تو وہ ان کی تفریح اور عیش گاہ کا کام دیں اور جب وہ اس دنیا سے چل بسیں تو وہی ان کی مقدس خاک کے حامل بنیں۔ زندگی میں یہ عمارت بارہ دری کہلاتی اور مرنے کے بعد اس کا مقصد مقبرہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ مقبرہ بن جانے کے بعد اس کی دیواریں مطربان زشک حور کے پرسوز نغموں سے پھر کبھی نہیں گونجتیں اور چہل پہل اور قہقہوں کے بجائے پر عظمت سکون اور خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔[1] اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں فن تعمیر بڑی حد تک ہندی اثرات کے تحت رہا۔ خصوصاً بابر اور ہمایوں کے ایرانی فن تعمیر کے نظائر قائم کر دینے کے باوجود دور اکبری میں اس قسم کے رجحانات بالکل خلاف توقع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایرانی نقاط کو قطعاً نظر انداز نہیں کر دیا گیا اور نقش و نگار اور گلکاری کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن پھر بھی ہندی اثرات بڑی حد تک فتحپور سیکری کی تعمیر میں کارفرما رہے۔ ہندی معمار ایرانی طرز اور خصوصیت سے اس قدر آشنا ہو گئے کہ اجنبیت کا فرق بالکل مٹ گیا۔ ایرانی آرائشی محاسن اور تعمیری نزاکتوں کو ہندی خواص تعمیر کے ساتھ مخلوط کر کے انہوں نے ایک نہایت ہی ارفع و اعلیٰ مخلوط طرز تعمیر کی ابتدا کی۔ اس کی ایک بین مثال فتح پور سیکری کی مسجد کا بلند دروازہ ہے جس کو اکبر نے اپنی فتوحات دکن کی یادگار میں تیار کروایا۔ زمانے نے اس کو دنیا کی ایک بہترین عمارت تسلیم کر لیا ہے۔ دروازہ خود ایک مکمل عمارت ہے جس میں کئی وسیع اور مختلف چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ فتح پور سیکری کی دیگر عمارات کی طرح یہ بھی سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور اس میں محض سنگ تراشی اور مرمر جڑوانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مصوری اور نقاشی کی عدم موجودگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کی تعمیر ہندی ہاتھ کی بہت زیادہ مرہون منت ہے۔ اس کا نقشہ اس میں شک نہیں کہ ایرانی ہے لیکن طرز تعمیر ایرانی عمارات سے بالکل مختلف ہے

[1] The History Eastein and Indian archetecture By Ferguwsson Page 289

یہ دروازہ فرگوسن صاحب کے الفاظ میں دنیا کے مشکل ترین تعمیری معمہ کا جو ہر زمانہ میں مستند ماہرین کو پریشان کرتا رہا۔ ایک بہترین حل ہے .... بحیثیت مجموعی یہ عمارت ایک افسانہ رنگین ہے جس کی نظیر مشکل ہی سے ملیگی"[1] ایک اور نقاد نے اس کو "انسانی جدت اور کاوش کا نفیس ترین نمونہ" کہا ہے[2] سب سے زیادہ خوبصورت اور پرآرائش فتح پور سیکری میں تین محلات ہیں جن کو اکبر نے اپنی تین منظور نظر بیویوں کے لئے تیار کروایا۔ راجہ بیربل کی بیٹی کا محل جو عام طور پر بیربل کے محل سے موسوم ہے۔ راجہ بہاری مل کی بیٹی کا محل اور جہانگیر کی والدہ معظمہ مریم زمانی کا محل جو سونے کا مکان یا سنہرا مکان کہلاتا ہے اور اکبر کی بڑی بیوی مرزا ہندال کی بیٹی سلطانہ رقیہ بیگم کا محل جو ترکی سلطانہ کا محل مشہور ہے۔ یہ محلات ہر نقطہ ہائے نظر سے اکبری فن تعمیر کے خاص نمونے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ان سے بڑھ کر خوبصورت یا ان سے زیادہ باریک اور افراط سے نقش کئے ہوئے محلات کا جن میں مطلق بھدا پن نہ پیدا ہوا ہو تصور بھی کیا جا سکے[3]۔ خصوصاً راجہ بیربل کی بیٹی اور ترکی سلطانہ کے محلات ہندوستان کے بہترین نقش عمارات تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مریم زمانی کا محل نفاست اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ترکی سلطانہ کے محل کے برخلاف جس پر بعض جگہ شیر ببر اور پرندے نہایت نفاست اور نزاکت سے بنائے گئے ہیں۔ مریم زمانی کا محل انتہائی لطافت آمیز سادگی سے بنا ہوا ہے چونکہ یہ ایک راجپوت شہزادی تھیں اسی لئے شاید یہاں ایرانی خصوصیات کی طرفداری بہت زیادہ نہیں کی گئی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے نقش و نگار خود اکبر کے مذاق کے خلاف ہوں۔ قلعہ آگرہ کا جہانگیری محل بھی سنگ سرخ سے بنا ہوا ہے اور اسی لئے بعض اوقات اس کو لال محل کہا جاتا ہے اس کے اندرونی حصے سے ہندی تخیل کی بلند پروازی اور تعمیری مہارت واضح طور پر نمایاں ہے۔ کمانوں کا اس میں بہت ہی کم استعمال کیا گیا ہے اور ہندی طرز تعمیر کا اس قدر غلبہ ہے کہ حقیقت میں "یہ چیتور یا گوالیار میں بہت زیادہ موزوں ہوتا"[1] لیکن پھر بھی اکبری وجاہت اور اپج جو اس کی عمارات کی ایک لازمی خصوصیت ہے اور جس کے اظہار کا راز صرف اسی کو معلوم تھا قدم قدم پر ظاہر ہوتی ہے۔ پانچ محل کی تعمیر جو محل خاص سے متصل ہے خانقاہی وضع کی یا مسلمانوں سے قبل کے عہد کی جامعات کی سی ہے۔

جہانگیر نے اس میں شک نہیں کہ بہت زیادہ عمارتیں نہیں بنوائیں گر پھر بھی اکبر کا مقبرہ دور جہانگیری کی بہترین یادگار ہے۔ فرگوسن صاحب کا خیال ہے کہ "یہ مقبرہ جس کا نقشہ ہندی یا بڑی حد تک ہندی ہے اپنی نوعیت کا واحد مقبرہ ہے جس کی مثال نہ اس سے پہلے کہیں ملتی ہے اور نہ بعد ہی"[2] اسمتھ صاحب کی رائے ہیں "اس قدر نزاکت اور افراط سے نقش کیا ہوا محل جس سے بدذوقی کا ذرا بھی اظہار نہ ہوتا ہو مشکل سے ملے گا"۔ فتح پور سیکری میں ترکی سلطانہ اور بیربل کی بیٹی کے محلات نقش و نگار کی حیثیت سے بہترین تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن کانچ محل کا شمالی حصہ اگر ان سے زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔ ایسے حصص شاذ ہی ملتے ہیں"[3] جہانگیر نے رنگ کاری کے رواج کو اکبر سے زیادہ ترقی دی چنانچہ کانچ محل کے باغ کا عظیم الشان دروازہ رنگین مرمر سے اور بھی زیادہ دلکش بنایا گیا ہے۔ کانچ محل کے تیار ہونے کے بعد جواہرات جڑوانے کا طریقہ شروع ہوا۔ نور جہاں نے اعتماد الدولہ کے مقبرہ میں جس کو اس نے اپنے باپ کی یادگار میں تیار کروایا جواہرات بھی جڑوائے ہیں اور رنگین مرمر سے بھی کام لیا ہے۔ اس مقبرہ کے بعد طرز تعمیر میں ایک اہم انقلاب ہو گیا کیونکہ ہندوستان میں یہ پہلا اور اپنی نوعیت کا بہترین مقبرہ ہے نہ صرف یہ بلکہ نور جہاں نے اپنے محبوب شاہی شوہر کی یادگار میں بھی ایک مقبرہ تیار کروایا جو کسی طرح دور جہانگیری کی دوسری عمارات سے کم نہیں اس میں سنگ سرخ پر سفید مرمر سے کام لیا گیا ہے اور یہ شرط اس کی خوبصورتی کے لئے کافی تھی کہ نور جہاں کے خاص مذاق نے اس کی تعمیر

1. The History of Eastin Indian architechure by Fergusson Page 297. 2. Architechure East & West by R. Phene Spiers Page 19
3. The History of Eastin and Indian architechure by Fergusson Pages 293/294.

1. The History of Eastin and Indian architechure by Fergusson Page 293.
2. " " " " "
3. Mogul Colour Decorations of Agra by E. W. Smith Page 26.

کی نگرانی کی۔ شاہ دارے (شاہدرہ) میں جو لاہور سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر ہے شہنشاہ جہانگیر سنگ سرخ کے مقبرے میں جو اس کی پرستار نور جہاں نے اس کے لئے تیار کروایا ابدی نیند سو رہا ہے لیکن قوم کی لاپروائی اور تغافل نے اس کو بہت سخت نقصان پہونچایا۔ ورنہ نور جہاں کی محبت کی یادگار دنیا میں آج اتنی خستہ نہ ہوتی۔

شاہجہاں کے زمانے سے فن تعمیر کی تاریخ میں بالکل ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اکبر اور جہانگیر کے برخلاف اس عہد میں ہندی رجحانات مفقود ہوگئے اور ایرانی اثرات نے ان کی جگہ لے لی۔ "تاریخ تعمیر میں اتنے زبردست انقلاب کی نظیر جو اس قدر قلیل عرصہ میں ہوا ہو یا اس بین فرق کی مثال جو اکبر کے وجیہہ اور نفیس ایچ اور شاہجہاں کے انتہائی نازک اور لطیف طرز میں ہے مشکل سے ملیگی۔" [1] فتح پور سیکری اور شاہجہاں کے دلی اور آگرہ کی عمارات اس فرق کو عملی طریقہ سے واضح کردیتی ہیں۔ اول الذکر کی تعمیر میں بہت زیادہ سنگ سرخ کو دخل ہے اور دلی اور آگرہ کے شاہجہانی عمارات سفید مرمر کی ہیں جن پر بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے یہ طرز شاہجہانی کی خاص خصوصیت ہے۔ شاہجہاں کے معماروں کا مقصد فن تعمیر میں نئے تجربات کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا نصب العین یہ تھا کہ ایک مکمل تصویر کو پتھر میں منتقل کردیا جائے۔ جہانگیر کے مصور اور شاہجہاں کے معمار اور سنگ تراش معجز نما تھے۔ شاہجہاں ڈالی سے پھول توڑ کر ان کو دیدیتا تھا کہ پتھر میں ایسا پھول تراش دیا جائے اور اس حکم کی تعمیل میں صرف اتنا فرق ہوتا تھا کہ اس تراشے ہوئے پھول میں بو نہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہجہاں کی عمارات خیام کی رباعیات ہیں۔ برنیر کے جیسا غلط گو سیاح بھی یہاں سر جھکا کر یہ کہتا ہے کہ "ممکن ہے کہ میرا انداق ہندی ہوگیا ہو لیکن میں یہ فیصلہ کن طور پر کہتا ہوں کہ یہ یادگار (تاج) اس بدصورت پتھر کے ڈھیر سے جس کو اہرام مصر کہا جاتا ہے کہیں زیادہ عجائب روزگار میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔" [2] گلاڈسٹن سالومن صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ ناممکن ہے

کہ ان اجزائے مذاق کی صحیح قدر وقیمت کا کوئی اندازہ لگا سکے جس نے مغل پتھر اور سنگ مرمر میں یہ خوبی پیدا کردی کہ وہ مغلوں کی لاقیمت ہیروں سے زیادہ چمک رہے ہیں . . . . . مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پورا مغل فن تعمیر دلفریب آرائش سے پُر ہے . . . . مغل شاہکار میں ایک خاص نزاکت یہ ہے کہ مختلف دیگر حصص اس انتہائی خوبصورتی سے مرکز کے لئے ناگزیر بنائے جاتے ہیں کہ کوئی ایک حصہ دیکھنے والے کی آنکھ کو اصلی عمارت سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں کرسکتا" [3] فرگوسن صاحب لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی کسی اور عمارت کی نہ اس قدر زیادہ تصاویر لی گئیں اور نہ اس کثرت سے کسی اور کو بیان کیا گیا لیکن اس پر بھی یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان لوگوں کو جنھوں نے اس کو نہیں دیکھا یہ بتایا جائے کہ تاج کیا چیز ہے صرف اس لئے نہیں کہ اس کی تعمیر میں بلا کی نزاکت اور خوبصورتی کوٹ کوٹ کر رکھی گئی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس کا نقشہ بہت پیچیدہ ہے . . . . . .
تاج محل اتنی لاتعداد خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے اور اس اعلیٰ ترین قابلیت سے ایک حصہ کو دوسرے کا لازم وملزوم بنایا گیا ہے کہ سب مل کر ایک ایسی مکمل چیز ہوگئی ہے جس کی نظیر صفحۂ ہستی پر نہیں ملتی اور جو ان لوگوں کو بھی محو حیرت کردیتی ہے جو عام طور پر تعمیری نزاکتوں اور دلفریبیوں سے بے بہرہ ہیں" [4] صاحب موصوف ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "تاج اس قسم کی دوسری چیز پیش کرنے کے لئے ساری دنیا سے سوال کرسکتا ہے۔ اس کی خوبصورتی بہت ممکن ہے کہ اعلیٰ ترین نہ ہو لیکن جو کچھ بھی ہے وہ لاجواب، بےنظیر اور لاثانی ہے" [5] بیس ہزار مزدوروں کی بائیس سال تک مسلسل محنت [6] اور پچاس لاکھ روپے کے صرفے کے بعد [7] یہ عظیم الشان کام تکمیل کو پہونچا اور بیس سال تو کجا اگر

---

[1] The History of Eastern and Indian architecture by Fergusson Pages 307/308

[2] Constable and Smiths edition of Bernier Page 299,

3. Mural Painting of The Bombay Art School by W. E. Gladstone Solomon Page 48,

4. The History of Eastern and Indian architecture by Fergusson Page 313

5. " " " " " "

6. The Six Voyages of John Tavernier Baptista Travels in India Part II Book I Page 50

7. Anecdotes of Aurangzaib and Historical Essays by Sarkar Page 148

ایک ہزار برس کی محنت کے بعد بھی یہ بنتا تو رہتی دنیا تک انسان اپنی اس صنعت پر فخر کر سکتا۔ مکرمت خاں اور میر عبدالکریم کی خاص نگرانی میں تاج تیار ہوا دنیا کو ان دو شاعر دماغ معماروں کے نام استادہ ہو کر لینا چاہئے۔

قلعہ آگرہ کی موتی مسجد گو دیگر شاہجہانی عمارات کی طرح شاندار اور پُرآرائش نہیں ہے لیکن مسحور کن تناسب، انتہائی پاکیزگی اور لطیف ترین نزاکت میں اس کی مثال دنیا بھر میں نہیں ہے۔ ہاردل کے الفاظ میں "ممتاز محل کے مقبرے اور موتی مسجد میں بہترین مغل تصاویر کی ساری انوکھی نزاکتیں پائی جاتی ہیں . . . دیواروں پر جڑے ہوئے جواہرات اعلیٰ ترین مغل نقاش اور ماہرین نستعلیق کے کارناموں کی چغلی کھا رہے ہیں" ۵

موتی مسجد جمالیاتی مذاق صحیحہ کا ایک نایاب نمونہ ہے۔ جس کو بنانے سے شاہجہاں کا شاید یہ مقصد تھا کہ غیر مسلم مسجد کو دیکھ کر ہی مسلمان ہو جائیں۔ دلّی کی جامع مسجد کا نقشہ بھی موتی مسجد کے جیسا ہی ہے۔ گو جامع مسجد، موتی مسجد سے بڑی ہے اور دو خوبصورت مینار بھی یہاں ہیں لیکن سنگ سرخ اور سفید مرمر کے عجیب و غریب ملاپ کی وجہ سے وہ کیفیت اور نزاکت اس میں نہیں پائی جاتی جو موتی مسجد میں ہے۔ پھر بھی بہت کم مساجد دنیا میں اس پایہ کی ملتی ہیں۔

قلعہ دلّی کا محل نہ صرف مشرق بلکہ دنیا کا خوبصورت ترین محل ہے جس سے حقیقت میں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مکمل شاہی محل کے لئے کیا کیا چیزیں ناگزیر ہوتی ہیں لیکن اب اس میں لے دیکے اندر داخل ہونے کا راستہ نوبت خانہ، دیوانہائے خاص و عام اور دو ایک دیگر حصص باقی رہ گئے ہیں، محلسرا کا سارا حصہ تباہ ہو گیا اس میں تین باغ کے دربار اور کوئی تیرہ یا چودہ دو سرے دربار تھے جو بالکل فنا ہو چکے اور آج دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کتنے خوبصورت اور شاندار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بقیہ حصے بھی بہترین ہیں لیکن فوجی رہائش گاہ کے بیچ میں ایک تو یہ بالکل بے معنی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف آدھی سے زیادہ ان کی خوبصورتی زائل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مشرق کے بے نظیر جواہرات کوڑے کرکٹ میں ڈال دیئے گئے ہیں"۶ اسی محل میں وہ مشہور دیوان خاص ہے۔ جو شاہجہانی عمارات میں سب سے زیادہ پر تکلف اور پرآرائش مانا جاتا ہے اس میں کلام نہیں کہ آگرہ والے دیوان خاص کی نزاکت اس میں نہیں پائی جاتی لیکن تعمیری محاسن اور آرائشی خوبیاں آپ اپنی نظیر ہیں۔ یہی وہ دیوان ہے جس کی چھت پر یہ لکھا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اور شاہجہاں کے اس دعویٰ کی تردید ذرا مشکل ہی ہے جب شاہجہاں اپنے اس دیوان کو فردوس ارضی کہتا تھا تو شاید تاج کے بدلے جنت سماوی بھی قبول نہ کرتا۔ اور اس کا یہ انکار بڑی حد تک حق بجانب تھا۔

اورنگ زیب کا زمانہ تعمیری نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ قدرتی طور پر اورنگ زیب شاہجہاں کی زبردست شخصیت کے سایہ میں آگیا۔ اس نے دلی کے محل میں چند اضافے کئے اور عام طور پر اس زمانہ میں بھی دارالخلافہ میں اور باہر بڑی بڑی عمارتیں تیار ہوئیں لیکن "تاج" اور موتی مسجد کے آگے بھلا انہیں کوئی کیا پوچھے گا۔

5- Indian aichetechure by E. B. Haruel Page 215, 216 - 6, The History of Eastin and Indian aichelectun by Fergaroan Page 312

عجیب غزل

از شاد عارفی

تو اور پوچھے میرا حال — آگ لگا پھر پانی ڈال — جینا ہے تو ہنس کر جی، — رو کر جینا ہے جنجال

ساقی کی مستانہ چال — نظریں زخمی دل پامال — اس کا کوچہ ہے اور میں، — گویا دل کی رائے بحال

دل کا داغوں سے وہ حال — مفلس لیکن مالا مال — الفت کا انجام بخیر، — دل بپتا میں ہے فی الحال

رس اور انگوروں کا رس، — زاہد کی اب ٹپکی رال — پچھلی سال جب آیا تھا کوئی — دیکھیں کیسا ہوا بکی سال

کشتی ڈوبے فکر نہیں — جو سب کا وہ اپنا حال — لکھ کر میرا نام اے شاد — اس نے بھیجا ہے رومال

محسوسات ماہرؔ

از "شاعر حیات" مولانا منظور حسین صاحب ماہرؔ القادری!

ہوا اس تجمل سے وہ جلوہ آرا — نگاہیں پکاریں کہ "بس کر خدارا"

تڑپتا ہے کب سے کوئی غم کا مارا — ادھر بھی نگاہِ کرم کا اشارا

بڑی کشمکش میں ہے بیمارِ الفت — نہ جینے کی ہمت نہ مرنے کا یارا

اٹھا ایک طوفان ناکامیوں کا — ذرا آرزو کا لیا تھا سہارا

مِرے دل کی اللہ رے بیقراری — ہتھیلی پہ ہو مضطرب جیسے پارا

مری بیخودی کی مجسّم ضمانت — تری مدھ بھری انکھڑیوں کا نظارا

خبر لے! کہ اب منتشر ہو رہی ہے — ترے غم نے جس انجمن کو سنوارا

زمانہ جسے زندگی جانتا ہے — وہ ہے چشمِ فطرت کا مُبہم اشارا

مِری زندگی کا خلاصہ ہے ماہرؔ
وفا کا سفینہ محبّت کا دھارا

"بَر کی تلاش"

از مولانا سید شبیر حسن صاحب قیس حیدرآبادی

وہ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا۔ اس کی سفید چھت پر انگور کی بیل چڑھی ہوئی تھی جہاں سے سمندر کا دلفریب منظر نظر آتا تھا۔ لیکن برآمدے میں پہونچنے پر گھر ویران سا معلوم ہوتا تھا۔ اندر ایک وحشت سی طاری تھی گویا کسی کی حالیہ موت سے اجاڑ ہو گیا ہے۔ آس پاس تناور درخت تھے اور مکان کے سامنے کا چمن عدم توجہی کے باعث سوکھ گیا تھا۔ دو رویہ سرو کے درخت ساکت و صامت کھڑے ہوئے تھے۔ مکان کا اندرونی حصہ اور بھی بھیانک تھا۔ بڑے بڑے صندوق کھلے پڑے تھے۔ صوفوں کی گدیاں میلی اور پھٹی ہوئی تھیں۔ ان میں کی روئی باہر نکل آئی تھی۔ بعض بعض جگہ بے ترتیب پیوند بدسلیقگی کا پتہ دے رہے تھے۔ کرسیاں اور میزیں گرد آلود، تصویریں دھول اور مٹی سے پٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر مکڑی نے جالے تان دیئے تھے۔ ملاقاتی کمرے میں ایک پرانا پیانو رکھا ہوا تھا جس کے نغمے سوئے تھے اور جس کے سُر بجنے کیلئے تڑپ رہے تھے۔ ہال کے وسط میں ایک لیمپ لٹکا ہوا تھا جس کی چمنی سیاہ پڑ گئی تھی۔

ایسے بے رونق گھر میں حسین مادام ڈی میرلک زندگی کے باقی ماندہ دن گذار رہی تھی وہ ایسی گڑیا کے مانند تھی جس کو بچوں نے تھک کر پھینکدیا ہو اور اس سے لاپرواہ ہو گئے ہوں یا اس پھول کے مانند تھی جس کو بھونرے نے خوب چوس کر چھوڑ دیا ہو ــــ لیکن اب بھی اس کا ضیا پاش حسن شہنشاہ کی ندیدی آنکھوں کو خیرہ کر سکتا تھا اور دل میں محبت کی آگ روشن کر سکتا تھا۔

فضول خرچ لوگوں کی طرح اس نے اور اس کے شوہر نے تمام سرمایہ ختم کر دیا تھا اور ڈی مرلک جیسے باہمت شخص نے بدبختی اور مفلسی کا مقابلہ نہ کر کے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ اسے یہ بھی خیال نہ ہوا کہ اس کی بیوی اور لڑکی پیسے پیسے کے محتاج ہو جائینگے۔

مادام نے اس کی موت پر ماتم نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے اور بھی دوست اور چاہنے والے تھے جو اسکو اس مصیبت سے بچا سکتے تھے اور آڑے وقت میں دستگیری کر سکتے تھے اس لئے اس نے تباہی سے بچنے کی خاطر اس طرح کچھ آمدنی پیدا کر لی مگر ایسے گذران کب تک ہوتا۔ اس کی تمام امیدیں تقریباً منقطع ہو چکی تھیں۔ صرف ایک آس باقی تھی ــــ اور وہ اس کی بیٹی کا حُسن ــــ اسی پر اس کے روشن مستقبل کا دار و مدار تھا۔ اگر اس کی بیٹی کا کوئی اچھا خریدار مل گیا تو اس کی بھی زندگی سُدھر جائیگی ــــ اور پھر وہ دوسری شادی کر لیگی ــ لڑکی کا حسن و عشوہ و انداز غضب کے تھے۔ کئی کئی ہفتے تک وہ گھر سے باہر نہ نکلتی۔ جب اس کی ماں سے لوگ وجہ پوچھتے تو وہ کہتی کہ للین بہت بھولی اور شرمیلی واقع ہوئی ہے اور وہ اس کو کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی مادام نے اپنے کھوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے قدم قدم پر مقابلہ کیا اور اپنے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے خوش آئند خیالات باندھتی تھی۔

للین نے دوشیزگی کے منازل طے کر کے شباب کے عالم میں قدم رکھا ایسا مکمل شباب، ایسی کافر جوانی، جو تصورات سے بالاتر ہو۔ اس کے حُسن پر قدسی بھی رشک کریں اور پریاں شرما جائیں۔ وہ فردوس کا نوشگفتہ پھول جس کو دنیا کے ناپاک ہاتھوں نے مَس نہ کیا ہو۔ وہ اچھوتا حسن جو ہوس ران انسان کے گندے جذبات سے آلودہ نہ ہوا ہو؟

اس ڈر سے کہ دیہاتی اور ہلکے لوگوں میں مل کر للین کا تلفظ نہ بگڑ جائے اور پیرس کی طرز معاشرت کہیں بھول نہ جائے مادام نے ان کی صورت سے دور رکھا۔ چونکہ اس میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ اس پر کوئی استانی یا معلمہ رکھتی اس لئے وہ خود اس کو تربیت دینے لگی۔ وہ اس کی خاطر سب کچھ

کرتی۔ اس کی خدمت کرتی۔ کھانا پکا کر کھلاتی۔ نہلاتی۔ لباس پنہاتی، اس طرح للین کا ملکوتی حسن دن بدن نکھرتا گیا۔ اس بے نور گھر میں چمکتا ہوا چاند نور پاشی کر رہا تھا ــــ اس کی ماں اس کے حسن پہ رشک کرتی۔

دونوں نے آئندہ موسم بہار میں پیرس جانے کا ارادہ کیا۔ مادام نے سوچا کہ کہیں سے قرض لیکر پیرس کے بڑے رقص گاہوں میں للین کے حسن کی نمائش کرے گی۔ اسے بہت بڑی امید تھی کہ کوئی متمول نوجوان یا نواب ضرور للین کے لئے پیام دیگا۔ ہر قسم کے لوگ اس شمع حسن کے اطراف جمع ہونگے اور اس موقع پر بہترین بر کا انتخاب کریگی۔

چنانچہ جب ماں بیٹی پیرس پہونچے اور رقص کے جلسوں میں شرکت کی تو بانکے نوجوان اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ تیتری کی طرح ہال میں اڑی اڑی پھر رہی تھی۔ پرستاران حسن اس کو پکڑنے کے لئے دوڑتے اور خود کو بہترین طریقے پر پیش کرتے ــــ مگر ــــ اف! وہ بھی اس بلا کی تھی کہ کسی کے ہتھے نہیں چڑھی۔ افسوس کہ مادام کو کوئی اچھا نوجوان نہیں ملا، کوئی اس کے معیار پر ٹھیک نہیں اترا۔ کوئی نہ کوئی عیب نکال کر مادام نے تمام پیام مسترد کر دیئے۔ بعض نوجوانوں نے بہت کچھ کوشش کی مگر مادام کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ مادام چاہتی تھی کہ للین کے لئے بہترین اور متمول بر ملے اس لئے اس کوشش میں بہت وقت خراب کیا مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور وہ مجبوراً گھر واپس آگئی۔

آخر کار للین اس تنہائی اور قفس سے اکتا گئی اور ماں بیٹی کے درمیان ناچاقی ہوگئی۔ للین اس رنج میں گھلتی گئی۔ اس کے گال مرجھا گئے اور جذبات پژمردہ ہوگئے۔ آنکھوں تلے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ وہ ایک مقید شہزادی کی طرح تھی۔ جس پر دنیا کی مسرتوں کا دروازہ بند کر دیا گیا ہو؟ یا اس چڑیا کی مانند جس کے سامنے خوشنما باغ اور پھولدار درخت ہوں اور وہ ان کا لطف اٹھانے کے لئے تڑپ رہی ہو۔ لیکن قفس سے باہر نہ نکل سکتی ہو۔

ایک رات جبکہ سیاہ ابر چھائے ہوئے تھے اور گرمی زیادہ تھی، مادام نے للین کو کسی کام سے پکارا۔ لیکن اس کو کوئی جواب نہیں ملا ــــ کئی بار آواز دی ــــ مگر بے سود، تب وہ گھبرا کر پلنگ پر سے اٹھی اور للین کے کمرے میں گئی ــــ کمرہ خالی تھا۔ اور پلنگ کی چادر پر کوئی شکن نہیں تھی۔ وہ پاگل کی طرح کمروں میں ڈھونڈھتی رہی ــــ آخر کار وہ باغ کی طرف بھاگی ــــ "للین ــــ للین ــــ" وہ دیوانہ وار چلانے لگی ــــ وہ اندھیرے میں اس طرح دوڑ رہی تھی گویا کوئی جلاد اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

. . . .

. . . .

. . . .

یکایک وہ ٹھٹک گئی۔ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ چکرا کر گر پڑی۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے للین ایک شخص کے زانو پر بیٹھی ہوئی ہے ــــ اس کے ہاتھ للین کی گردن میں حمائل ہیں۔ وہ اس کے بے تحاشا بوسے لے رہی ہے۔ دنیا سے بے خبر ہو کر انتہائی مستی کے عالم میں وہ اس کے پاس کا نوکر تھا جس کو شاید مادام نے کبھی اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کی پرستش کرے گی ــــ اور وہ اس کی ہے ــــ ہمیشہ کیلئے۔

امیدوں کی ناگہاں پامالی اور جسمانی کمزوری نے مادام کا دماغ خراب کر ڈالا۔ اور وہ پیرس کے ایک مشہور پاگل خانہ میں پڑی ہوئی ہے لیکن ــــ اس کی بیٹی نے اسی نوکر کے ساتھ شادی کر لی ــــ
ــــ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے یہ برا کیا؟

(ماخوذ)　　　　　　قیس حیدر آبادی

شورِ مجاہدانہ!

مولانا اظہر امرتسری

اسیری اچھی وگرنہ ہوتا نہ آج میرا کوئی ٹھکانہ
کہ دیکھتا ہوں درِ قفس سے ہوا کے کاندھوں پہ آشیانہ

طلسمِ الفاظ میں الجھ کر رہا نہ واعظ کو شوقِ معنی
وگرنہ مکتب کے بام و در سے بھی اٹھتا شورِ مجاہدانہ

اٹھ اور کر غور حالِ روشن میں اپنے مستقبلِ سیہ پر
کہ صبحِ امروز کی شعاعوں میں شامِ فردا کا ہے فسانہ

یہاں بخارا ہے اور دہلی وہاں ہے انگورہ اور طہراں
یہ شوقِ راحت کا ہے نتیجہ - وہ حاصلِ جوشِ غازیانہ

فقیہ و مُلّا ہیں مالِ اوقاف کیلئے وقفِ جنگ لیکن
جہادِ دیں کا ہو وقت تو "انتظارِ مہدی" کا ہے بہانہ

رہے نہ نظمِ زمانہ قائم اگر تمنا ہو سب کی پوری
کہ ہر بشر چاہتا ہے میرا غلام ہو کر رہے زمانہ

تری مسرت فزا جوانی، مرا شبابِ ملال پرور
جو یہ ہے ہنستی ہوئی کہانی، تو وہ ہے روتا ہوا فسانہ

فقط ہے الفاظ کی لڑائی وگرنہ ہیں ایک شیخ و مے کش
یہ جس کو کہتا ہے باغِ جنت وہ اس کو کہتا ہے بادہ خانہ

شبِ مسرت میں بھی نہ سوئیگی چین کی نیند میری فطرت
کہ کھا کے اٹھا ہوں خوابِ راحت سے میں حوادث کا تازیانہ

بتوں کی نظریں دلِ مسلماں کو دیکھ کر کہہ رہی ہیں اظہر
ہمارے ہوتے ہوئے رہے کیوں خدا کے انوار کا ٹھکانہ

عالمگیر رحمۃ اللہ کے حضور میں !!

از جناب محمد نذیر خاں صاحب بھوپالی ؁

۱

مئی کا مہینہ اور شام کا وقت تھا۔ ہم چند دوست اورنگ آباد سے بغرض شکار موٹر پر روانہ ہوئے۔ اور بہت جلد خلد آباد پہونچ گئے اور ڈاک بنگلہ میں قیام کیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر چاندنی رات میں تفریح کے لئے چل کھڑا ہوا اور عالمگیر کی دوامی خوابگاہ کی طرف جا نکلا جہاں ہر طرف خاموشی طاری تھی۔

ایک ضعیف العمر شخص سنگ مرمر کے فرش پر نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے کپڑے اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے میں نے لباس سے اس کو شناخت کیا کہ وہ خاندان مغلیہ کا مشہور تاجدار ہند[1] تھا جو آج کل ہندوستان کے بچہ بچہ کے نزدیک مورد الزام ہے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

میں نے اس کو سلام کیا۔ میرے پاس گفتگو شروع کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

"بیٹھو" اس نے سلام کا جواب دیکر اس قدر دھیمی آواز میں جو بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی کہا اور خاموش ہو گیا۔

میں بیٹھ گیا اور بات چیت کرنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی رہا تھا کہ شاید میرے قیافہ سے میرے دل کا حال تاڑ کر اس نے کہا۔ "نہ معلوم مورخوں کو مجھ پر بیجا الزامات لگانے اور فرقہ وارانہ اکھاڑوں کے لئے مواد فراہم کرنے میں کیا مزا ملتا ہے؟"

"تو کیا اس سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ الزامات جو آپ پر لگائے جاتے ہیں غلط ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہر وہ شخص جو تعصب سے دور رہ کر غور کرے اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ مورخ مجھ پر الزام لگانے میں حق بجانب نہیں ہیں۔ میں خود اس وقت تم کو تمام الزاموں کے جوابات دینے کے لئے تیار ہوں"۔

۲

"ہم کو یقین دلایا گیا ہے کہ ریاست گولکنڈہ کے استیصال کی وجہ جو کہ ایک شیعہ ریاست تھی سخت مذہبی تعصب ہے"۔ میں نے الزامات میں سب سے بڑا واقعہ زیر بحث لاتے ہوئے کہا۔

"اس بد قسمتی کا تو کوئی علاج نہیں کہ وہی کارروائیاں جو تمام حکومتوں اور فرمانرواؤں کیلئے طرۂ امتیاز ہیں میرے لئے ذلت و بدنامی کا موجب ہوں

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

خود مغلوں کا سب سے زیادہ نیک دل اور غیر متعصب بادشاہ[2] شمالی ہندوستان کو ہضم کر کے نربدا پار کی مسلم ریاستوں پر بھی صرف وسعت حکومت کے شوق میں ہاتھ صاف کرے تو کوئی بھی مخالفانہ تنقید نہ ہو بلکہ اسے "اعظم" کا خطاب دیا جائے اور جب اسی نامکمل اور ناتمام کام کو میں اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چل کر مجبوراً پورا کر دوں تو ظالم۔ غاصب۔ غیر سیاستداں اور متعصب سمجھا جاؤں۔

میری تخت نشینی کے وقت دکن کی ریاستوں میں سے صرف دو یعنی بیجاپور اور گولکنڈہ باقی تھیں۔ سکندر شاہ والی بیجاپور نے میرے خلاف سیوا کو مدد دی اور میرے بار بار متنبہ کرنے پر بھی اس کو کچھ احساس نہ ہوا اس لئے مجبوراً میں نے بیجاپور کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن سکندر سے نہایت عزت کا برتاؤ کیا اس کو سکندر خاں کا خطاب اور خلعت خاص دیا۔

---

[1] محمد محی الدین اورنگزیب عالمگیر ؒ ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء

[2] جلال الدین محمد اکبر ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء

اور اس کے درباریوں کو بھی جاگیریں دیں[۵۱]۔ کیا میرا یہ طرزِ عمل قابلِ اعتراض ہے؟

حیدر آباد کا حال سنو! یہاں کا بادشاہ ابوالحسن (تاناشاہ) تھا۔ اس کی عیش پرستی سے تمام امورِ ریاست میں ابتری پھیل گئی تھی۔ اس کے وزیر مادنا نے مسلمانوں پر سخت ظلم کئے۔ ابوالحسن نے سمبھا کی میرے خلاف مدد کی اور صرف یہی نہیں بلکہ جب میں نے بیجاپور کا محاصرہ کر رکھا تھا سمبھا سے ساز باز کی اور میرے خلاف فوج لیکر بڑھا۔ میں نے (شہزادہ) محمد معظم کو اس کی سرکوبی کیلئے مقرر کیا۔ اس نے جنگ سے حتی الامکان بچنا چاہا اور آسان سی شرائطِ صلح پیش کیں[۵۲]۔ ابوالحسن کے شرائطِ صلح منظور نہ کرنے پر محمد معظم نے صرف شاہی پرگنوں کی واپسی کو صلح کی شرط قرار دیا لیکن اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔

تم خود انصاف کرو کہ ان حالات میں کیا یہ سچ نہیں ہے کہ بادشاہ میں انتظام کی قابلیت مطلقاً نہیں۔ عیاشی دربار اور امراء میں پھیلی ہوئی ہے۔ وزیر اعظم اور درباری ایسے متعصب ہیں جو مسلمانوں کو ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ مرہٹوں کو فوج اور خزانہ سے سلطنت مغلیہ کے خلاف مدد دی جا رہی ہے۔ تیموری علاقوں کو غارت کیا جا رہا ہے۔ تاہم جنگ سے حتی المقدور گریز کیا جا رہا ہے اور معمولی شرائطِ صلح پیش کئے جا رہے ہیں؛ اگر نوشیروانِ عادل بھی ہوتا تو کیا کرتا؟ وہی جو میں نے کیا[۵۳]۔

فتح گولکنڈہ کے بعد اس کو شاہانہ اعزاز کے ساتھ نظربند کر دیا۔ اس کا جو مال ضبطی میں آیا اس میں کروڑوں روپیہ کے جواہرات اور طلائی ظروف تھے اس سے ظاہر ہے کہ خراج ادا کرنے میں بے زری کے جو عذر وہ پیش کرتا رہا سب مصنوعی تھے اور میں نے صلحنامہ کی یہ شرط پوری نہ ہونے کی وجہ سے فوج کشی کی تو یہ مظلوم کو بلا وجہ ستانا نہ تھا بلکہ عہد شکنی کی سزا تھی جو اس ناعاقبت اندیش کو بھگتنی پڑی۔

وہی مورخ[۵۴] جو ان تمام واقعات کی تصدیق کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے سفیر کو ابوالحسن سے سخت کلامی کرنے کی ہدایت کی کہ وہ بھی مجبور ہو کر سختی سے جواب دے اور اس سے ایک قیمتی الماس طلب کیا کہ وہ انکار کرے اور اس طرح جنگ کے لئے مجھے بہانے مل جائیں۔ غور کرو کہ مرہٹوں سے ساز و باز۔ میرے مقبوضات پر تصرف، مسلم آزاروں کا دربار پر تسلط، ملک کی بدانتظامی فسق و فجور کی انتہا اور عام مسلمانوں کی ذلت و خواری تو حیدرآباد پر حملہ کرنے کی سند نہیں بن سکتیں لیکن سفیر کے ساتھ سخت کلامی اور الماس دینے سے انکار وہ جرائم ہیں جن کی بناء پر میں حملہ کر سکتا تھا اور پھر مجھے کسی قسم کا الزام نہ دیا جاتا۔" اس نے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس طویل تقریر کو ختم کیا۔

"لیکن، کہا جاتا ہے کہ آپ نے خود اپنی سلطنت برباد کی کیونکہ دکن کی ریاستیں مرہٹوں کو دبائے ہوئے تھیں ان کا دباؤ اٹھ گیا تو مرہٹے قوت پکڑ گئے۔"

"تو کیا لوگ اس سے بالکل ناواقف ہیں کہ یہ ریاستیں مرہٹوں کی باجگزار بن گئی تھیں اور اگر میں ان کو فتح نہ کر لیتا تو آج مثل بڑودہ اور گوالیار کے وہاں بھی مرہٹوں کا پرچم لہراتا نظر آتا۔"

۳

ایک انگریز مورخ[۵۵] کا یہ قول کہ جب سیواجی دہلی کے قریب پہونچا تو ایک کمتر درجہ کا سردار اس کی پیشوائی کیلئے جے سنگھ کے بیٹے رام سنگھ کے ساتھ بھیجا گیا اور جب وہ حاضر دربار ہوا تو اس کی بات بھی نہ پوچھی گئی اور تیسرے درجہ کے سرداروں میں بلا امتیاز کھڑا کر دیا گیا۔ یہ کس حد تک صحیح ہے۔" میں نے دوسرا الزام بیان کیا۔

"رام سنگھ اس سپہ سالار جے سنگھ کا بیٹا تھا جو امراء میں سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ چونکہ سیواجی جے سنگھ کے توسط سے آیا تھا اس لئے اس کے استقبال کے لئے رام سنگھ سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا جو اپنے باپ کا قائم مقام تھا مخلص خاں کو اس لئے بھیج دیا تھا کہ یہ نہ خیال ہو کہ تعصب کی وجہ سے کوئی مسلمان درباری نہیں بھیجا۔ استقبال کا اصلی رکن رام سنگھ تھا نہ کہ مخلص خاں۔ سیواجی کو پنجہزاری منصب دیا گیا جسے مورخ نے تیسرے درجہ کا منصب بتلایا ہے لیکن کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ اس وقت خود جے سنگھ (سپہ سالار) دلیر خاں اور (وزیر اعظم) فاضل خاں کا منصب بھی پنجہزاری ہی تھا[۵۶] اس کے باپ کو بھی تو یہی منصب ملا تھا۔ رانائے اودے پور کو بھی تو سب سے پہلے یہی منصب ملا تھا[۵۷]۔ کیا وہ پہاڑی چوہا اودے پور کے مہارانوں سے بھی زیادہ معزز درجہ

---

[۵۱] عالمگیر نامہ [۵۲] یعنی مادنا وزیر کو معزول اور قید کیا جائے۔ سیرم ورائے گیر وغیرہ علاقوں سے جو غصباً دبا لئے گئے تھے دست برداری کر لی جائے اور مقررہ خراج کی باقیات ادا کر دی جائے۔ [۵۳] شبلی

[۵۴] نعمت خاں اور خافی خاں،

[۵۵] الفنسٹن [۵۶] ماثر عالمگیری

[۵۷] مآثر الامراء

رکھتا تھا؟ اس کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا۔ تمام علاقے فتح ہو چکے تھے اور مجرمانہ[1] حاضر دربار ہوا تھا۔ تاہم میں نے اس کا مناسب استقبال کیا اور موزوں جگہ دی۔ اس سے بہتر سلوک اور کیا ہو سکتا تھا؟ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح اور اس حیثیت کے دشمن کے لئے تخت سے اتر آتا؟" شدت جوش سے وہ خاموش ہو گیا۔

"تو کیا سیواجی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس میں تحقیر مدنظر نہ تھی؟"

میں نے تھوڑی دیر کے وقفہ سے کہا۔

"اگر مجھے اس کی تحقیر کرنا ہوتی تو اس کے متعلق میں یہ لکھوا کر کہ سیوا کو وہ جگہ دی گئی جو مقربان دولت اور امرائے نامدار کی تھی[2]" قیامت تک کے لئے اس کی توقیر کا واقعہ تاریخ میں محفوظ نہ کراتا۔ صرف گھڑی دو گھڑی کی وقتی ذلت سے میرے دل کی بھڑاس نکل سکتی تھی۔"

"لیکن جے سنگھ نے سیواجی کو جو امیدیں دلائی تھیں ان کا تو دربار کی طرف سے اظہار ہی نہیں ہوا۔"

"جب میں نے جے سنگھ کو سیواجی کے دربار سے ناراض ہو کر چلے جانے کی اطلاع دی تو اس نے صرف یہ لکھ بھیجا کہ اس کا جرم معاف کر دیا جائے۔ اگر اس نے کوئی وعدہ کیا ہوتا اور اس کا مجھ سے اظہار کرتا تو وہ ضرور پورا کیا جاتا۔ جب کوئی وعدہ ہی نہیں کیا گیا تھا تو پھر وعدہ کے خلاف کون سا امر عمل میں آیا؟"

"لیکن جب کہ سیواجی کے بیٹے کو اس سے قبل پنجہزاری منصب مل چکا تھا تو خود اس کو زیادہ ملنا چاہئے تھا۔"

"خاندان مغلیہ میں کبھی کسی کو ابتداءً پنجہزاری سے زیادہ منصب نہیں ملا اور ایسا بھی اکثر ہوا ہے کہ باپ اور بیٹے کو یکساں منصب ملا۔"

"لیکن اگر سیواجی سے اچھا برتاؤ کیا جاتا تو وہ حلقہ بگوش ہو جاتا۔"

"ضرور! افضل خاں کا دغابازانہ قتل، شائستہ خاں پر دھوکے سے حملہ، بیجاپور اور گولکنڈہ سے سازشیں، شہروں اور قصبوں پر بے خبری میں چھاپے مارنا ان تمام واقعات سے یہی نتیجہ تو اخذ کیا جا سکتا ہے۔

شدم آگاہ زود از خوئے آں بیدادگر و شی — اگر بعد از وفا ایں کارہا کر دی چہ میکردم[3]

---

[1] بقول خافی خاں سیواجی کے الفاظ یہ ہیں "بطریق بندہ ہائے مجرم و ذلیل رو بدیں درگاہ آوردہ ام خواہندہ بخشش و خواہے کشش۔"

[2] مآثر عالمگیری - یہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سرکاری یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہے۔

"کیا سیواجی کے جانشین عالمگیری نظام سلطنت درہم برہم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟"

"مرہٹے اب کوئی حکومت یا قوم نہ رہے تھے بلکہ وہ خانہ بدوش تھے جو چوری چھپے رسد پر ڈاکہ ڈالتے اور مویشیوں کو اٹھا لے جاتے تھے[4] اس کو حکومت کی کمزوری نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حالت تو آج تک سرحدی اقوام کی ہے تو کیا اس سے سلطنت انگریزی کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے؟"[5]

۴

"کہا جاتا ہے کہ راجپوت کبھی شاہان مغلیہ کے دست و بازو تھے لیکن آپ کے طرز عمل نے ان کو ناراض کر دیا۔" میں نے تیسرے زبردست الزام پر بحث شروع کی۔

"جسونت سنگھ کی مسلسل بغاوتوں اور غیر راجپوتی حرکتوں کے باوجود اس کو معاف کر دیا گیا اور اس کے مرنے پر جب راجپوتوں نے یہ درخواست کی کہ اس کے شیر خوار بچے اجیت سنگھ کو منصب عطا کیا جائے تو میں نے یہ جواب دیا کہ اس کو دربار میں رکھا جائے جب وہ جوان ہوگا اس کے حقوق دیئے جائیں گے۔ لیکن جسونت سنگھ کے سپاہیوں نے جواب کا انتظار نہ کیا اور میر بحر کے منع کرنے کے باوجود اس کو مار کر دریا پار چلے گئے۔ کیا راجپوتوں کا بغیر اجازت دارالسلطنت کا قصد کرنا اور میر بحر اور شاہی ملازموں سے مقابلہ کرنا اور ان کو قتل کرنا باغیانہ حرکات نہ تھیں اور ان کی پاداش میں اگر ان کو نظر بند کیا گیا تو کیا یہ خلاف انصاف اور ظلم تھا؟"[6]

"مؤرخ اس عدول حکمی کی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ عالمگیر ان بچوں کو مسلمان کر لیتا۔"[7]

"ساہو کو جو سات سال کی عمر میں میری نگرانی میں آیا تھا میں نے مسلمان کیوں نہ کر لیا اور اس کی جاگیر و منصب کو کیوں بحال رکھا؟ کیا یہ ایک عام دستور نہ تھا کہ جب کوئی بڑا عہدہ دار نابالغ اولاد چھوڑ کر مر جاتا تو اس کی پرورش بادشاہ کرتا تھا؟"

---

[3] شبلی - انہی باتوں سے الفنسٹن صاحب نے سلطنت مغلیہ کی کمزوری کا اندازہ لگایا ہے اور ان کو مرہٹوں کے اوصاف میں شمار کیا ہے۔

[4] شبلی

[5] الفنسٹن

[6] لین پول

[7] اسمتھ

"انگریز مورخ لکھتے ہیں کہ عالمگیر نے عاجز ہو کر خود رانا سے صلح کی کوشش کی[1] کیا تم میں اتنی عقل نہیں کہ یہ سمجھ سکو کہ وہ تاریخیں صحیح ہونگی جو کہ اسی زمانہ میں لکھی گئیں یا وہ جو کہ ان تاریخوں کا ماخذ ہیں؟ کیا اس واقعہ کا انھوں نے کسی مستند تاریخ سے حوالہ دیا ہے؟"

"اور یہ بیان کس حد تک صحیح ہے کہ رانا نے تھوڑے ہی عرصہ بعد شرائط صلح پر پانی پھیر دیا۔؟"[2]

"بالکل غلط، سوائے ایک انگریز مورخ کے کسی اور نے بھی اس واقعہ کو لکھا ہے۔؟"

"اور کیا اس واقعہ کے بعد راجپوت مغلوں سے ہمیشہ کیلئے علٰحدہ ہو گئے؟"[3]

"یہ بھی غلط ہے، دکن کی جنگوں میں جے سنگھ، بھیم سنگھ، مان سنگھ وغیرہ کئی راجپوت سردار میرے ساتھ مرہٹوں کے خلاف لڑے۔"

"ہندوؤں کے ساتھ یہ ظلم کہ ان کے مدارس بند کرائے۔ بتخانے تڑوائے مذہبی میلے موقوف کرائے محاصل عاید کئے اور ان کو سرکاری ملازمتیں نہ دیں مذہبی تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟"

"میرا صرف یہ جرم ہے کہ میں نے ہندوؤں کے محبوب شہزادہ دارا شکوہ کو ہندوستان کا بادشاہ نہ ہونے دیا اور کوئی سلوک تو ایسا نہ تھا جو اس سے پہلے ان کے ساتھ روا نہ رکھا گیا ہو۔ میری تخت نشینی کے وقت سلطنت مغلیہ تقریباً ہندو بن چکی تھی۔ ہندو مسلمانوں کے بچوں کو اپنی مذہبی تعلیم دیتے تھے لہذا میں نے اس قسم کے مدارس بند کرا دیئے۔ وہ مناد رجو اعلیحضرت کے اس فرمان کے باوجود کہ آئندہ سے کوئی معابد بلا اجازت شاہی تعمیر نہ کئے جائیں، بنائے گئے تھے اور وہ بت خانے جو حکومت کے باغیوں کے خفیہ جلسوں کا کام دیتے تھے تڑوائے گئے جس میں میرا مقصد عین وہی تھا جو ہنری ہشتم بادشاہ انگلستان کا خانقاہوں کو تڑوانے میں اور خود تمھارے زمانہ میں ترکی میں مصطفےٰ کمال کا ان سازش کے اڈوں کی تخریب عمل میں لانے کا تھا۔ ورنہ مذہبی تعصب کے اظہار کا یہاں دکن میں کافی موقع تھا جہاں میں پچیس سال رہا اور یہاں تو الورہ اور ایسے ہی دیگر منادر کی بھی کمی نہیں تھی۔ میلوں، ناچ رنگ اور گانے بجانے کو مخرب اخلاق سمجھ کر میں نے بند کر دیا۔ جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بعض مذہبی میلے بھی تھے۔ اس میں تعصب کو کوئی دخل نہ تھا۔ چونکہ میں حکومت میں اخلاقی شان باقی رکھنا چاہتا تھا اس لئے غیر شرعی محاصل معاف کر دیئے[4] اور جذیہ جو مذہباً جائز تھا دوبارہ جاری کر دیا۔ واقعہ کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے۔ ہر محصول خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز ادا کرنے والوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ یہ بھی سراسر بہتان ہے کہ ہندوؤں کو عہدے نہیں دیئے۔ فوجوں کی افسری۔ قلعوں کی قلعداری اور اضلاع کی نظامت سے بڑھ کر قابل اعتماد اور کیا عہدے ہو سکتے ہیں؟ ان تمام عہدوں پر عام طور سے ہندو مقرر تھے۔ ہندوؤں کو جاگیریں بھی دیں۔ آج بھی کئی ہندو جاگیرداروں کے پاس میری دی ہوئی اسناد نکلیں گی۔

۵

"اب صرف ایک سب سے اہم واقعہ جواب طلب رہ گیا ہے یعنی باپ اور بڑے بھائی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا، وہ کس حد تک مناسب تھا۔"

واقعات تو ظاہر ہیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا بادشاہ کے جعلی دستخطوں سے احکام جاری کرنا، دارالسلطنت کی خبروں کو مجھ تک پہونچنے سے روکنا۔ میرے سفیروں کو نظربند کرنا۔ میری جاگیر ضبط کرنا۔ باپ کو بدظن کرنا۔ بھائیوں اور بہنوں سے لڑانے کی کوشش کرنا۔ جنگ کی حالت میں میری فوج کو واپس بلا کر مجھے دکن کی ریاستوں کے سامنے ذلیل کرنا اور پھر میرے خلاف کثیر فوج روانہ کرنا ایسے افعال ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہیں کہے جا سکیں اور جن سے درگذر کیا جا سکے؟

میں تو صرف جہاں پناہ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا چنانچہ جنگ[5] کے بعد مجھے قلعہ میں ملنے کے لئے طلب کیا گیا لیکن شائستہ خاں اور روشن آرا (چھوٹی بہن) کے ذریعہ سے اور بعد میں خود اعلیحضرت کے معتمد خلیل اللہ سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ میرے ساتھ دوستی کے پردہ میں دشمنی کی جائیگی، تو مجبوراً شہر پر قبضہ کر لیا۔ پھر بھی جہاں آرا بیگم (بڑی بہن) کے حسب منشا حضرت سلامت کی قدمبوسی کے لئے جا رہا تھا کہ چند معتمد افسروں نے اطلاع دی کہ محل میں مسلح ترکنیں میرے قتل کے لئے متعین کی جا چکی ہیں اور چاہا کہ میں وہاں نہ جاؤں۔ لیکن میں پھر بھی جانے کے لئے بالکل تیار تھا جبکہ مجھکو ایک ایلچی کے ذریعہ حضرت اقدس کا خط ملا جس میں انھوں نے دارا شکوہ

---

[1] الفنسٹن و لین پول [2] ایضاً لین پول [3] ۱۵۰۹ء تا ۱۵۴۷ء

[4] ان محاصل کی تعداد تقریباً ستر تھی۔ [5] جنگ سموگڈھ ۱۶۵۸ء [6] نہرول،

کو اطمینان دلایا تھا کہ تم دہلی سے آگے نہ بڑھو، ہم قصہ فیصل کئے دیتے ہیں [1]
چنانچہ میں نے ملاقات کا ارادہ ملتوی کردیا لیکن اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے سے پھر بھی گریز کیا۔ میں نے ایک لمحہ کیلئے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ یہ جنگ اعلیٰحضرت کے خلاف ہے بلکہ میرا مقصد تو صرف ان کو دارا شکوہ کے پنجہ سے نجات دلانا تھا لیکن انھوں نے میرے تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور نہ صرف دارا بلکہ شجاع، مراد اور خود میرے بیٹے محمد سلطان سے میرے خلاف خط و کتابت کرتے رہے اس لئے مجبوراً تخت پر قبضہ کرنا پڑا [2] لیکن پھر بھی ان کے شاہانہ اعزاز و اکرام میں کمی نہ آنے دی ان سے اکثر امور سلطنت میں رائے لی اور اس پر عمل بھی کیا [3]۔ رہے بھائی صاحب تو ان میں اپنی کج طبعی اور بدتدبیری کی وجہ سے حکومت کرنے کی قابلیت نہ تھی۔"

"لیکن قتل کرنا ہی کیا ضروری تھا کیا کسی محفوظ جگہ قید نہیں کیا جاسکتا تھا؟"

"میں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کرکے رائے طلب کی (یہ کہنا غلط ہے کہ مجلس علماء سے فتویٰ طلب کیا گیا) اور کثرت رائے پر عمل کرتے ہوئے قتل کا حکم دیدیا [4] اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی زندگی میں ملک کو امن و امان نصیب نہ ہوتا بلکہ ہر طرف سازشوں کا بازار گرم رہتا اس لئے سیاسی مصلحتیں مجھے مجبور کررہی تھیں کہ میں وہی طریقہ اختیار کروں جو خود جہاں پناہ سے مجھ کو ورثہ میں ملا تھا۔ [5]

"این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند" [6]

"اچھا تو قتل سے پہلے بازار میں سے گذار کر ذلت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"شاہراہ پر سے گذارنا اس لئے ضروری تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کئی لوگ بعد میں یہ دعویٰ کرتے کہ دارا دراصل قتل نہیں کیا گیا بلکہ وہ اصلی دارا ہے

[1] خط کے الفاظ یہ ہیں: "دارا شکوہ در شاہجہاں آباد ثبات قدم ورزد، کمی خزانہ ولشکر در آنجا نیست، زنہار از آنجا پیشتر نگذرد کہ ما بدولت مہم او را اینجا فیصل مفرمایم"
[2] عالمگیر ایک انسان تھا انسانیت سے بالاتر جذبات کی توقع ہم اس سے نہیں کرسکتے دیکھنا صرف یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کے سوانح حیات کے مرقع میں اس کی تصویر اگر ہمایوں سے زیادہ خوشنما نہیں تو اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں سے زیادہ بری بھی نہیں (مقدمہ رقعات عالمگیری)
[3] سفرنامہ ڈاکٹر برنیر [4] عالمگیر نامہ مآثر عالمگیری [5] خاص شاہجہاں کے حکم سے اس کا بھائی شہریار اور اس کے بھتیجے ہوشنگ و طہمورث پسران دانیال قتل کئے گئے۔ [6] شبلی،

صرف اسی وجہ سے تشہیر کی گئی ورنہ اس کو دہلی لانے کے بجائے کسی غیر معلوم جگہ پر بھی ہمیشہ کیلئے خاموش کیا جاسکتا تھا۔"

"شہزادہ شجاع کی تباہی و بربادی کا الزام بھی تو آپ ہی پر لگایا جاتا ہے۔"

"اس نے میری آگرہ کی عدم موجودگی سے غلط فائدہ اٹھانا چاہا اور شکست کھائی۔ میں خود تعاقب میں گیا بلکہ میر جملہ اور محمد سلطان کو اس کام پر مقرر کیا اگر وہ اس وقت بھی اپنی اس غلطی کا اعتراف کرکے صلح کی خواہش ظاہر کرتا تو مشرقی صوبے یقیناً اس کو دیدیئے جاتے لیکن اس نے فوج جمع کرکے میر جملہ سے مقابلہ کرنا چاہا اور آخرکار فرار ہوا۔ ارخنگ (ارکان) کے راجہ نے اس کی خاطر مدارات کی لیکن اس نے وہاں بھی سازش کرکے اس کے تخت پر قبضہ حاصل کرنا چاہا اور قتل ہوا اس طرح اپنی بربادی کا وہ خود باعث ہوا ہے مجھ پر کیوں الزام لگایا جاتا ہے۔"

"اور کیا مراد ایسے جانباز اور مطیع بھائی کو بھی یہی صلہ ملنا چاہئے تھا؟"

"اس نے مصاحبوں کی باتوں میں آکر اپنی بادشاہی کے منصوبے باندھنا شروع کردیئے اور خود کو تنہا سلطنت کا حقدار سمجھنے لگا تھا جو کہ شرائط صلح کے خلاف تھا صلحنامہ کی پہلی شرط کو میں نے فتح کے بعد [7] پورا کردیا تھا اور دوسری شرط یعنی جاگیر پنجاب، کابل و کشمیر کے لئے لکھدیا کہ تخت سلطنت کے فیصلہ کے بعد عمل میں آئیگی لیکن اس کی جلدبازی نے کام بگاڑ دیا۔ اس پر بھی میں اس کے قتل کیلئے تیار نہیں تھا صرف اس کو اپنے یہاں بلاکر گرفتار کرادیا (نہ تو اس کو شراب پلائی اور نہ کسی مغنیہ کو اس کے پھانسنے کے لئے بھیجا) اور کہدیا کہ یہ گرفتاری وقتی ہے اگر اس نے اپنے رویہ سے ثابت کردیا کہ اب وہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریگا تو اس کو آزاد کردیا جائیگا اور معاہدوں کے مطابق صوبوں کا مالک بنادیا جائیگا۔ لیکن اس نے قلعہ گوالیار سے جہاں وہ قید تھا بھاگنے کی کوشش کی [8] اس پر بھی میں نے اس سے کوئی بازپرس نہ کی لیکن جبکہ علی نقی کے چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے قتل کا مقدمہ دائر کیا اور میرے منع کرنے اور گوالیار کے قاضی کے خونبہا لینے پر زور دینے کے باوجود وہ راضی نہ ہوا تو میں مجبور ہوگیا لیکن میں اس قتل سے خوش نہ تھا [9]

[7] یعنی مال غنیمت کا ایک ثلث جو کہ بیس لاکھ روپیہ نقد کی صورت میں مراد کو ادا کیا گیا [8] خافی خاں۔ [9] خافی خاں بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ چھوٹا لڑکا "مغضوب نظر بادشاہی ہوا اور دوسرے لڑکے کے ساتھ عنایات کی گئیں کیونکہ اس نے باپ کے قتل کا دعویٰ کرنے سے انکار کیا تھا

اب مجھے کوئی مزید سوال نہیں کرنا تھا اس لئے میں خاموش ہو رہا۔

رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی اور تربت کے گرد اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ نورانی جسم آہستہ آہستہ تاریکی میں غائب ہو گیا۔ میں نہ معلوم کتنی دیر تک ان واقعات پر غور کرتا رہا جبکہ ایک مجاور کی آواز "کون ہے؟" نے مجھے چونکا دیا اور میں نے اٹھ کر قیامگاہ کی راہ لی جہاں تمام ساتھی آرام سے پڑے ہوئے سو رہے تھے۔

عالمگیر کی فرد الزامات کی پوری روداد میرے سامنے تھی۔ میں غور سے ایک ایک واقعہ کو جانچ رہا تھا کہ مخالف مورخوں نے اس کو برا بتانے کیلئے کیا کیا غلط بیانیاں کی ہیں۔ کس کس طرح واقعات کو بدلا ہے۔ کیسے کیسے غلط تاریخ اخذ کئے ہیں اور کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہا ہے

کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

مجھے افسوس تھا کہ کیوں میں نے ان بیجا الزامات کو بیان کر کے مرحوم شہنشاہ ہند کی روح کو تکلیف دی اور خوشی بھی تھی کہ کم از کم میں تو اب متعصب مورخوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں میں مبتلا نہ رہا تھا۔

محمد نذیر خاں۔ بھوپال

"کیسے آئے چین"

کیسے آئے چین!
سکھی ری کیسے آئے چین!

سیاں مکھڑا موڑ گئے ہیں،
پریت کا ناتا توڑ گئے ہیں،
برہ کا دکھڑا چھوڑ گئے ہیں،
تڑپت ہوں دن رین!
سکھی ری کیسے آئے چین!

کوئی کہے یہ گربھاتی ہے،
کوئی کہے یہ بوراتی ہے،
کوئی کہے مانُش کھاتی ہے،
سبھی کے کھوٹے بین!!!
سکھی ری کیسے آئے چین

جل کر راکھ ہوئی جاتی ہوں،
گھٹ گھٹ ہائے مری جاتی ہوں،
پانی روپ بہی جاتی ہوں،
رو رو پھوٹے نین!
سکھی ری کیسے آئے چین!

اندرجیت شرما،

کلام محمودؔ

کیا تو جگنوؤں نے گل میں کچھ سوزِ نہاں پیدا
ہوئی ہیں آتشِ گلزار سے چنگاریاں پیدا

نگاہِ مست ساقی تھی عجب موجِ سُرور افزا
کہ ذرّے ذرّے سے دل کے ہیں جامِ ارغواں پیدا

خدا ہی جانے کیا گذریگی مر کر غم نصیبوں پر
کہیں زیرِ زمیں بھی ہو نہ جائے آسماں پیدا

گلِ صد چاک سی حیرانیِ نرگس سے شبنم سے
چمن کے پتّے پتّے سے ہی میری داستاں پیدا

نوائے سوز کی بھی جستجو ہے سازِ محفل کو
کرے گیتی سپند آسا کوئی آتش بجاں پیدا

گلوں کو شعلۂ عُریاں کیا ہے سوزِ باطن نے
عجب کیا ہے ہوا ہو بطنِ نیّر سے جہاں پیدا

بنائے فطرتِ ہستی ہے اضدادِ عناصر پر
کیا کرتی ہے امواجِ خنک برقِ تپاں پیدا

یہاں تخریب سے تعمیر کی بنیاد پڑتی ہے
گلِ پژمردہ کرتے ہیں خمیرِ بوستاں پیدا

میں لوحِ دہر پر محمودؔ وہ تحریر ہوں جس کا
نہ کوئی رازداں پنہاں نہ کوئی ترجماں پیدا

محمود۔ اسرائیلی،

احساس

از حضرت امین حزیں، بھاول پور

"جریدہ! آج چاند کی چاندنی معمول سے زیادہ صحرا کے ذرہ ذرہ کو منور کر رہی ہے۔ قدرت اپنے جوبن کی مستی میں اپنے تمام عطیے ہم پر نچھاور کر رہا ہے... آہ... آج اتنی دیر سے کیوں....؟" زرینہ نے عربی گرنیل کے کندھے کی ٹیک لیتے ہوئے کہا۔

جریدہ بارگاہ حسن میں سرنگوں ہوگیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان اس کے دل کی ترجمانی سے قاصر تھی۔ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے زرینہ کے نرم و نازک ہاتھوں کو پکڑا اور دونوں ایک اونچے ٹیلے پر جہاں ان کے بچپن کی شوخیوں کی یادگاریں دفن تھیں بیٹھ گئے .. وہ آج کچھ خلاف معمول رنجیدہ سا تھا۔ کوئی خیال تھا جو ہر لمحہ اس کی پریشانی اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے زرینہ کی طرف دیکھا اور ... دھیمی آواز میں کہنے لگا،

"پیاری زرینہ! مراکش پر فرانسیسیوں کا حملہ ہونے والا ہے.... جنرل سعید نے مشورہ کے لئے بلایا تھا اس لئے آج ذرا دیر ہوگئی"۔

"تو کیا آپ کو ان کے مقابلے کے لئے جانا پڑیگا؟" زرینہ نے جریدہ کے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔

"یقیناً۔ وطن کی آزادی کے لئے جب تک جسم میں روح اور روح میں احساس ہے۔ میرے خون کا آخری قطرہ آزادی کی دیوی کی بھینٹ چڑھے گا۔" جریدہ نے اپنی تلوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تمکنت سے کہا۔

"تو کیا ہماری یہ رنگین راتیں، روح پرور ملاقاتیں۔ جو میرے لئے تمام دن کی کوفت کا علاج ہیں... ختم ہو جائینگی؟" زرینہ نے بے چینی سے پوچھا وہ مستقبل کے تصور سے غمگیں ہوگئی۔ اس کی محبت کی تمام آسمانی لطافتیں جریدہ کے ایک حرف سے وابستہ تھیں۔ آہ وہ بے چینی سے اس حرف کی منتظر تھی۔ اس کی نظریں جریدہ کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں اس کی آنکھوں میں کچھ نمی تھی جو اس کی باطنی حالت کی آئینہ دار تھی۔

"پیارے تم نہیں جانتے ہو کہ میری خوشی اور خدمت سے میرے ضعیف، نابینا باپ کی خوشی و راحت وابستہ ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟" زرینہ نے مایوسانہ انداز میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "مجھے تمام دن اپنے اونٹوں کے گلے کے ساتھ اسی نخلستان میں رہنا پڑتا ہے جہاں ---- میرے جریدہ ... ہماری محبت کی ابتداء کی پرورش ہوئی تھی --- جہاں اس جھیل کے کنارے .... ہاں، اسی جھیل کے کنارے تم میری تعریف میں لطیف اشعار الاپتے تھے اور جب کبھی میں تم سے روٹھ جاتی تھی تو تم جھیل کے پانی سے میرے کپڑوں کو بھگو کر تنگ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ میں تمہاری ہوجانے کا وعدہ کر دیتی تھی"۔

"ہاں... ہاں... صرف میری... تمام زندگی کیلئے...!" جریدہ نے رنگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تو آپ مجھے ایسی تباہ کن حالت میں چھوڑ دینگے... آہ تنہائی کی سختیاں میرے دل سے جو تمہارے خیال سے ٹکڑے ہو رہا ہے... نہیں اٹھ سکیں گی"۔

. . . .

"پیارے دیکھو! آج حسن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ تیری بارگاہ میں ملتجی ہے.... دیکھو.... رحم کرو.... ورنہ میرے بربط دل کے نازک تار ٹوٹ جائینگے..." زرینہ نے جریدہ کے چہرہ پر نگاہیں جماتے ہوئے غمگین آواز میں کہا۔

جریدہ معنی خیز نظروں سے زرینہ کی طرف دیکھنے لگا جو اپنے مستقبل کے

نظام اور ماضی کے فلک بوس قلعوں کو جدائی کے زلزلوں سے تباہ ہوتا دیکھ کر پریشان و مضمحل ہوتی جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو زرینہ کی تمام خواہشوں کا کماحقہ احساس تھا — لیکن وہ صرف اپنی ذاتی "محبت کی رنگین زندگی" کیلئے اپنے وطن کو غلامی کا مکروہ جامہ پہنانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی ایک لغزش سے اپنے تمام بھائیوں کی آزادی کو غلامی کے بے عزت بازار میں، اپنے عبادت خانوں کو گھوڑوں کے طویلوں میں، اپنے حقیقی جذبات کو مصنوعی طور پر غیروں کی خدمت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان تھا، جو فرض اور محبت کی کشمکش نے پیدا کر دیا تھا۔ وہ کبھی اپنی آرزوں کو خاکستر ہوتے دیکھتا۔ کبھی اپنے پیارے وطن کو غیروں کی زنجیروں میں — اس کو کچھ نہیں سجھائی دیتا تھا کہ کس کی آواز پر لبیک کہے — محبت یا وطن، ، اس کا چہرہ کئی بار غم آلود ہوا۔ اس کی آنکھوں سے کئی خونی قطرے گرے اور ٹیلے کی ریت میں ہمیشہ کے لئے جذب ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ زرینہ جو ابھی تک مجبور نگاہوں سے اپنے بہادر جریدکے چہرے کے تغیرات کا مطالعہ کر رہی تھی اس کے دل کی گہرائیوں میں پہونچنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کی کوششوں نے اس کو دھوکہ میں رکھا۔

جرید نے اپنے سینہ کا بٹن ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "پیاری زرینہ۔ مجھے تمہارے دل کی تمام کیفیات کا پوری طرح احساس ہے اور تمہاری مجبوریوں کو محسوس کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ "

"لیکن ۔ ۔ ۔ " زرینہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہارا دل گوارہ کریگا کہ مجھ غریب کو جس کا جینا تمہارے بغیر موت کے مترادف ہے، جدائی کی آتش میں جلتا ہوا چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"دیکھو زرینہ! جذبات کی ترنگ میں آکر خطرناک غلطی کی مرتکب ہو۔" جرید نے سپاہیانہ آواز میں کہا۔ "میری قسمت کے ساتھ ہزاروں انسانوں کی زندگیاں وابستہ ہیں، میری غلطی کا ساری قوم کو خمیازہ بھگتنا پڑیگا اور آنے والی نسلیں، ہماری روحوں کو غدار — قوم فروش — اور بزدل کہہ کر یاد کریںگی۔"

"نہیں ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ پیارے جرید —!"

"دیکھو زرینہ تم کس طرف بہی جا رہی ہو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"اپنی کائنات محبت کے بہشت کی طرف جانا چاہتی ہوں ۔ ۔ لیکن آہ"

جرید کا سینہ ابلنے لگا — وہ وطن کے ناموس کو بارگاہ محبت پر قربان کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہونے لگی۔ اس نے اپنے دل کو محبت کی مایوسیوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا اس نے حسرت بھری نظروں سے زرینہ کی طرف دیکھا اور یکدم زرینہ کے ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"پیاری زرینہ! الوداع ۔ ۔ ۔ الوداع ۔ ۔ ۔ " جرید نے جاتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ ۔ ۔

"پیارے جرید! پیارے جرید! میرے دل کی تمام محفل نشاط کو ہجوم اندوہ کے سپرد کرکے کہاں جا رہے ہو؟" زرینہ نے دامن پکڑتے ہوئے کہا۔

"جہاں سے واپس آنے کے متعلق میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔" جرید نے مخالف سمت دیکھتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

. . .

کیا زرینہ میری بے لوث محبت وطن کے جذبہ کو اپنی آتشیں لپٹوں سے خاکستر کرنا چاہتی ہے۔ کیا آزادی وطن کی بھول بھلیوں میں [illegible] چاہتی ہے۔ دیکھو میرے ارادہ کی مضبوط چٹان تمہارے آنسوؤں کے طوفان کی روں [illegible] لہروں سے متزلزل نہیں ہو سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ بس مجھے بھول جاؤ ۔ ۔ ۔ وطن کی خاطر ۔ ۔ ۔ بھول جاؤ۔"

وہ اپنے خیالات اور جذبات کی طوفانی رو میں بہنے لگا۔ اس کی کوئی غیر معمولی طاقت رہنمائی کرنے لگی۔ وہ نیچی نظروں سے صحرا کی ریت کی گہرائیوں میں اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یکایک اس نے ایک جھٹکے سے اپنے دامن کو زرینہ کی مضبوط گرفت سے آزاد کر دیا اور ٹیلے کے دامن سے ہوتا ہوا ایک کھجور کے درخت کے پاس پہونچا۔ جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا اس نے اسے کھولا اور جلدی سے اس پر سوار ہو کر مراکش کی سمت تیزی سے روانہ ہو گیا۔

۲

آج صحرا پر سورج کی سختی معمول سے زیادہ تھی۔ ہر طرف آگ برستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گرم ہوا کی تاب نہ لاکر بیچارے اونٹ بھی دور ایک نخلستان کی کھجوروں کے سایے میں پناہ گزیں تھے۔ صحرا میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آبادی کا نشان تک نہ ملتا تھا۔ صرف اسی نخلستان کے

نزدیک تھا ایک جھونپڑا تھا جس پر بیکسی اور مکمل خاموشی طاری تھی۔ جھونپڑے کے اندر سے آنے والی کمزور آواز کبھی کبھی اس مکمل سکوت کو توڑ دیتی تھی۔

"بیٹی زرینہ! پانی۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔ پانی۔۔۔۔"

زرینہ کا بوڑھا نابینا باپ ابراہیم کئی دن سے علیل تھا۔ اُس کی تیمارداری کرنے والی اکلوتی بیٹی آج صبح سے غائب تھی۔ اس کو پیاس اور گرمی کی شدت نے آخری دم تک پہونچا دیا تھا۔ خدا کی وسیع سرزمین پر دوسرا کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا وہ اپنے خیالات کو اس کی تلاش میں پریشان کر چکا تھا۔ بوڑھے اعضا اسے جواب دے چکے تھے بیچینی سے اس نے اپنی لڑکی کو پھر مخاطب کیا۔۔۔۔ جو اپنی محبت کی مثال قائم کرنے کیلئے اپنی زیست کو موت کے سپرد کر چکی تھی۔

"دیکھو! زرینہ اپنے باپ۔۔۔۔۔۔ ضعیف باپ کو پانی بھی۔۔۔۔ نہیں دیتیں۔۔۔۔ کیا آج اتنی بے رحم ہو گئی ہو!۔۔۔۔ آؤ کہ تمھارا نابینا باپ۔۔۔ تمھیں، تنہا ــــ دنیا کے ظالموں۔۔۔ کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے تم سے۔۔۔۔ جُدا۔۔۔۔۔"

بوڑھے ابراہیم کو ایک ہچکی آئی جس نے اس کے کلام کے سلسلہ کو توڑ کر اس کی روح کو آسمان کی بلندیوں پر پہونچا دیا۔۔۔۔ اب اس کی پیاری بیٹی دنیا کے بیرحم حملوں کا مقابلہ کرنے کیلئے تنہا رہ گئی تھی اور وہ بہشت کی سرزمین میں پہونچکر دنیا کی ذمہ داریوں اور فریب آلود چالوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ اونٹوں کو حسب معمول ان کی پیاری مالکہ اور خدمت گذار بہم پہونچانے سے قاصر ہو چکا تھا۔ اس کی آواز فنا کی زنجیروں کی جھنکار میں گم ہو چکی تھی۔ اور مزید اپنی کائنات کی تباہی پر اپنے دردرسوں کو بلانے سے خاموش تھی۔

سورج ڈھلنا شروع ہوا اور اپنے ساتھ صحرا کی آتشیں گرمی کو بھی فطرتی اصول کا احتساب سکھانے لگا۔ اونٹ جو ابھی تک مجبوری سے کھجوروں کے سایہ تک محدود تھے اب ادہر اُدہر بکھرنے شروع ہوئے۔۔۔ کیونکہ ان کی رہنما خود تلاش منزل میں گم ہو چکی تھی۔۔۔ اب کوئی بھی انھیں راہ راست پر لانے والا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب زمین پر سیاہی محیط ہونے لگی تو صحرا کی وسیع فضا میں چند اونٹوں کی آوازیں گونجیں اور پھر ہمیشہ کیلئے معدوم ہو گئیں۔

۳

مراکش کے وسیع میدان باب الطارق میں فرانسیسیوں اور عربوں کی فوجیں برسرپیکار تھیں، گھمسان کی لڑائی میں، شور وغل، چیخ و پکار، مار، دھاڑ سے فضا کانپ رہی تھی ــــ جرید، عربی کرنیل شمالی سمت فوج کے داہنے بازو پر اپنی فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یکایک لڑائی کا رخ تبدیل ہوا اور جرید اپنی فوج سے الگ ہو کر چالیس فرانسیسی سپاہیوں کے نرغہ میں پھنس کر رہ گیا۔ لیکن اس جری سپہ سالار کی ہمت مدافعت برابر بڑھنے لگی اس نے بے تحاشا تلوار چلانی شروع کی۔ کئی فرانسیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔ اب اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ اس کی طاقت اب اُسے جواب دینے لگی۔ اس کی تلوار اب سست پڑنے لگی۔ اس کو اپنی تباہی کا اب یقین ہونے لگا۔ زرینہ کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ زرینہ جس کے بغیر اس کی دنیا اندھیر تھی ــــ اس نے اپنی مایوسیوں کا خیال کیا اور اپنے آپ کو موت کی آہنی گرفت میں پاکر اپنی تمام گذشتہ طاقتوں کو مجتمع کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر دیوانہ وار مقابلہ میں مصروف ہو گیا۔

سامنے جنوب کی طرف ایک غبار کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ جوں جوں وہ آواز نزدیک آ رہی تھی جرید کے دل میں ایک ہیجان بپا ہوتا جا رہا تھا۔ جس کی محرک ایک غیبی طاقت تھی ــــ آواز آنی بند ہو گئی ــــ ایک نقاب پوش جو عربی لباس میں ملبوس تھا۔ گرد و غبار میں اٹا ہوا سامنے سے ظاہر ہوا۔ تھوڑی دور اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اونچا ہو کر اردگرد کسی کی تلاش میں اپنی بیچین نظروں کو گردان رہا تھا ــــ جرید مجبور ہو گیا ــــ اس نے مجبوراً اپنا ہاتھ روک کر نقاب پوش کو آواز دی۔ جو ایک فوجی افسر کی رعب دار آواز تھی ــــ وہ بالکل بے خبر سا ہو گیا تھا۔ اسے کچھ احساس نہ تھا کہ وہ دشمنوں کے نرغہ میں ہے ــــ اس کی بے پروائی سے اس کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور ایک فرانسیسی افسر نے عقب میں آکر پھرتی سے خنجر کا وار کر دیا ــــ جرید ایک دہاڑ مار کر گرا ــــ جس طرح ایک صحرائی شیر شکاری کا تیر پہلو میں کھا کر گرتا ہے۔۔۔ نقاب پوش نے چیخ سنتے ہی ادہر کا رُخ کیا اور اس جگہ پہونچکر جرید کو خاک و خون میں بیہوش پڑے ہوئے دیکھ کر غضبناک اور بے صبر ہو گیا ــــ اس نے جرید کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور اپنے پر قابو پاکر اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"میرے عزیز وطن پرست جرید! دنیائے محبت کو آزادی وطن پر

قربان کرنے والے جرید! تو نے اپنی بیش قیمت زندگی وطن کے نام پر قربان کر دی۔ اپنی آرزو کے کھلتے ہوئے پھول کو خاک کے سپرد کر دیا۔ ... تو نے ... اپنی کائنات کو وطن کے ایک بلاوے پر نثار کر دیا۔ ... ہماری قوم تمہارے جیسے فرزندان ملت پر ہمیشہ فخر کرتی رہیگی۔ .. ماٗیں اپنے بچوں کو تم جیسا بنانا سکھائینگی ..... اور تجھ پر ... تیری یاد پر ... تیرے پاؤں کے روندے ہوئے غبار پر، اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرینگی ....."

اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی، اس کا جگر پارہ پارہ ہو رہا تھا اس نے خونخوار نگاہوں سے بیرحم قاتلوں کو دیکھا، جو اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ .. وہ بھوکے شیر کی طرح غضبناک ہو گیا۔ اس کا نقاب اس کی پھنکاروں سے ہلنے لگا .. اس نے جلدی سے تلوار میان سے نکالا اور خونی بھیڑیے کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑی دیر بعد فرانسیسی افسر کو اپنے سپاہیوں کے گھٹنے کا احساس ہونے لگا وہ اس نقاب پوش کی شمشیر زنی پر حیران تھا۔ اور انتقام کی آگ سے بے صبر ہو رہا تھا۔ ... اس نے جلدی سے اپنے گھوڑے کو ایڑدی اور اس کے نزدیک پہونچکر زور سے اس کے اوپر خنجر پھینکا۔ جو اس کے پہلو میں دھنس گیا۔ نقاب پوش نے ایک چیخ ماری، مگر کچھ سنبھل کر اپنی تلوار اس زور سے اس افسر پر پھینکا کہ وہ اس کے زرہ بکتر کو چیرتی ہوئی اس کی چھاتی میں پیوست ہو گئی۔

گھوڑے نے خفیف سی حرکت کی اور جرید کے پاس آکر کھڑا ہو گیا نقاب پوش نے اپنا دایاں خون آلود ہاتھ جرید کی طرف اٹھاتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

"پیارے جرید! ٹھہرو کہ میں بھی تمھارے ساتھ جانا چاہتی ہوں ... آہ .. اس دنیا میں ... جہاں دنیا والوں کے ظالم ... بیرحم ہاتھ ہمیں جدا نہ کر سکینگے ... ٹھہرو ...... کہ میں اپنی ... بے لوث ... محبت کا ثبوت ... دے لوں ... ٹھہرو! .... کہ میری محبت کا نظام ... تمھاری گود میں آکر مکمل ہو جائے ... "

"کون ہے مجھ بدنصیب کا ..... پوچھنے والا ..." جرید نے آنکھیں کھولتے ہوئے حزین آواز میں کہا ... "

"تمہاری ...... زرینہ ... " زرینہ نے نقاب اٹھاتے اور جرید کے اوپر گرتے ہوئے کہا۔

"زرینہ؟ ... میری روح کا پیام ... میرے دل کا چاند زرینہ ..." جرید نے حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ حیران تھا ..... اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

"پیارے جرید! —— آہ پیارے جرید! ... میں کیسی خوش نصیب ہوں۔" زرینہ نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

جرید خوش ہو گیا، اس کے دل کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی — وہ ایک آسمانی مسرت محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ دنیا سے تنہا نہیں جا رہا تھا بلکہ اپنی آرزوؤں کے خوشنما پھول کو اپنی گود میں لیکر ابدی راحت کی نیند سونے جا رہا تھا —— لیکن ابھی تک اسے کوئی چیز تکلیف دے رہی تھی۔ اس نے پہلو بدلا اور زرینہ کو اپنے بازوؤں میں لیکر اس کے لبوں پر "آخری بوسہ محبت" ثبت کر دیا —— پھر یکدم بے چینی سے وہ قاتلوں سے مخاطب ہوا۔

"جذبات کے غلامو —— وطن کے نام پر انسانیت آزادی حب الوطنی کے نام پر ملوکیت پرستی کا بیج بونے والے ..... خونخوارو ... آزادی کے قاتل —— سچائی کے دشمن . دنیا میں کس طرح ... امن کے نام پر انسانیت کی تباہی پر کمر باندھتے ہیں ..... آہ بیوقوف انسانو! ..... اس کے اونٹوں کی رکھوالی کون کریگا؟ ... اس کے بوڑھے باپ کی خدمت کون کریگا۔؟"

"جرید —!" زرینہ نے بات کاٹتے ہوئے نحیف آواز میں کہا —

"پیارے جرید، پریشان نہ ہو ... سب کا ...

"اللہ مالک ہے!"

(خاص) .... امین حزیں

آرزو

از حضرت اعجاز میرٹھی،

ان کے دم سے بڑھ گئی ہے عز و شان آرزو
اب زمینِ آرزو ہے، آسمانِ آرزو

سامنے ہوگا کسی کے امتحانِ آرزو
پُر اثر کتنی ہے میری داستانِ آرزو

آرزو ہی ان سے خود کردے بیانِ آرزو
شانِ قدرت سے جو پیدا ہو زبانِ آرزو

وہ نہیں سنتے زباں سے داستانِ آرزو
کاش ہو جائیں نگاہیں ترجمانِ آرزو

میرے ہی دم سے جہاں میں آرزو اک چیز ہے
یہ نہ ہوں تو پھر کہاں نام و نشانِ آرزو

آرزو کے نام ہی سے رکھتے ہو کانوں پہ ہاتھ
اب تمھیں ہم کیا سنائیں داستانِ آرزو

جب سے وہ دل میں مکیں ہیں صورتِ فصلِ بہار
کس قدر پھولا پھلا ہے گلستانِ آرزو

نام بھی تو آرزو کا اب کوئی لیتا نہیں
مجھ سے ہی آباد تھا گویا جہانِ آرزو

آرزومندوں کا دل اس راز سے آگاہ ہے
آرزو ہے جانِ دل کی دل ہے جانِ آرزو

تو مرا ہمدرد ہے ناصح مرا دلسوز ہے
میں بتاؤں گا تجھے رازِ نہانِ آرزو

جب سے دیکھا ہے مجھے تم نے نگاہِ ناز سے
میرے دل میں چبھ گئی نوکِ سنانِ آرزو

آپ کے قبضہ میں گر دنیائے حسن و ناز ہے
ہے تصرّف میں ہمارے اک جہانِ آرزو

آرزوئے دل ہے اے اعجاز وجہِ زندگی
دم نکل جائیگا جب نکلیگی جانِ آرزو

نپولین کے مکتوبات محبّت!

جناب مولانا خواجہ احمد صاحب فاروقی

نپولین اعظم اپنی شجاعت والوالعزمی کے لحاظ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ دنیا کی ان شخصیتوں میں سے ہے جن کا نام بقائے دوام حاصل کر چکا ہے اور جو ہمیشہ تاریخ کے چند بہترین اور زندہ جاوید سپہ سالاروں میں شمار کیا جائیگا۔ ایسی بے مثل ہستی کی حیات محبت کا مطالعہ کچھ کم دلچسپی کا باعث نہ ہوگا۔ نپولین دراصل جہاں دلیری اور مردانگی کے جذبات سے لبریز تھا وہاں وہ سرتاسر محبت سے بھی معمور نظر آتا تھا۔ جوزوفائین[1] کے ساتھ تو اس کی زندگی یکسر الفت و پرستاری، ایک ملتہب شعلۂ عشق بن کر رہ گئی تھی۔

چھبیس[۲۶] برس کا جوان، ناشائستہ، زرد روسپہ سالار جو بارس کیلئے صرف بونا پارٹ تھا پیرس آتا ہے۔ یہاں کے عیش و نشاط کو پہلی بار دیکھتا ہے۔ جوزوفائین ایک فیشن پرست عورت سے ملاقات کرتا ہے اور بلا کسی پس وپیش کے جوانی کی پوری گرمی اور جوش کے ساتھ اس کا ثناخواں بن جاتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ حسین جوزوفائین کی عمر تیس[۳۲]

نوٹ:۔ جوزوفائین جزیرہ مارٹینک (Martinique) میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک شریف لیکن ناکارہ خاندان کی لڑکی تھی۔ سولہ برس کی عمر میں اس کی چچی نے جو بڑی ہوشیار عورت تھی ایک شخص الگزانڈر ڈی بوہارنیس نامی باغی امیر سے اس کی شادی کردی لیکن یہ رشتہ بالکل ناکامیاب رہا۔ جوزوفائین طفل مزاج اور غیر تعلیم یافتہ تھی۔ وہ اس شخص کیلئے بے حد ناخوشگوار تھی جو اس وقت روسیو کا مطالعہ کر رہا تھا اور ایسی دنیائے مساوات کا خواب دیکھ رہا تھا جس کی ضمانت تمام فرانسیسی فلاسفہ اپنی تحریروں سے کر رہے تھے۔ وہ بیحد بدگمان اور فضول خرچ واقع ہوئی تھی۔ الگزانڈر کیلئے اس کا حسن بہت ہی جاذب نظر نہ تھا۔ وہ اس کے ہروقت کے آنسوؤں سے بالکل تنگ آچکا تھا۔ "عہد دہشت (Reign of Terror)" میں جب اس کو اور اس کے شوہر کو قید ہوگئی تو جوزوفائین نے بااثر لوگوں سے تعلقات پیدا کرلئے۔ وہ جانتی تھی کہ خوبصورتی اور رعنائی ایک سفاک اور ظالم انقلابی کے دل کو بھی موم کرسکتی ہے۔

بالآخر الگزانڈر نے اس سے علیحدگی حاصل کرلی اور جوزوفائین کے لئے ایک رقم مقرر کردی۔ اس وقت کے دو بچے یوگن اور ہارٹنس تھے، وہ دنیا کو خوب جان گئی تھی اور اپنا وقت عارضی محبتوں میں بسر کرنے لگی۔

۱۷۸۸ء میں وہ ہارٹنس کے ہمراہ وطن ہوتی ہوئی پیرس چلی گئی۔ یہ انقلاب فرانس کا زمانہ شباب تھا۔ الگزانڈر اور اس کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہوگئی تھی لیکن دونوں کی علیحدگی برابر قائم رہی۔ پھر بھی جوزوفائین اپنے شوہر کے عروج و ترقی سے حظ مسرت ولطف حاصل کرتی رہی۔ الگزانڈر کچھ دنوں بعد مرگیا اس کی جائداد ضبط کرلی گئی۔ اس وقت جوزوفائین کی حالت بیحد قابل رحم تھی۔ وہ بیوہ تھی، ایک ذمہ دار ماں، لیکن بالکل مفلس اور نادار۔ اب رابس پیری کی جگہ بارس نے لے لی تھی۔ ہر جگہ اسی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حسین بیوہ کی خوش قسمتی سے بارس کی نگاہ التفات اس کے اوپر پڑی۔ اس کے بچے اعلیٰ اسکولوں میں داخل کردیئے گئے۔ اب اس کے پاس ایک مکان پیرس میں تھا اور ایک دیہات میں۔ اس کی حیثیت افسر جمہوریت کی بیوی کی سی تھی۔ لیکن اسے بارس سے جو کچھ رقم اسے ملتی وہ سب خرچ کردیتی اور اس سے زیادہ قرض لیتی۔

سال کی ہے۔ اس کا آدھا شباب ختم ہو چکا ہے۔ اور یہ کہ جوزوفائین کا التفات محض اس لئے ہے کہ وہ نئے نظام (New regime) کے ایک بڑھتے ہوئے شخص سے ملاقات رکھنا چاہتی ہے۔ نپولین اسے جنت قلب وروح اور فرانس کے پرانے خاندان کی ایک شریف عورت سمجھتا ہے۔ بقول سی۔ ایچ۔ چارلس ان کی پہلی ملاقات ۱۷۹۵ء میں ہوئی۔ پندرہ دن تک ان دونوں میں کچھ تعلق رہا اس کے چھ ماہ بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ نپولین دو ہی دن بعد اٹلی چلا جاتا ہے۔ وہ اسے ہر سٹیشن سے خط بھیجتا ہے۔ ان خطوط میں محبت والفت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ نپولین کو مستقبل نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ حال کا وہ خود مالک تھا قسمت کا خود فرمانروا۔ لیکن وہ اپنی تمام روح ان خطوط میں جذب کر دیتا تھا جو اس نے جوزوفائین کو لکھے۔ اور جس سے اسے بے انتہا محبت تھی،

ایک خط میں وہ لکھتا ہے:۔

"میں جب اس زندگی پر نفرین کرنے لگتا ہوں تو اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں وہاں تیری ہی تصویر حرکت کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ میں اس کو دیکھتا ہوں۔ محبت میرے لئے سراسر مسرت ہے۔ مجھے ہر چیز دعوت تبسم دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بجز اس لمحہ کے جو تجھ سے جدا بسر ہوتا ہے"۔

اس کے لئے اس نے پندرہ مہینوں میں اپریل ۱۷۹۶ء سے لیکر چھ فتوحات حاصل کیں۔ الپس علم سر گئے اور پڈمانٹ نے مشروط اطاعت قبول کرلی۔ اب وہ جوناٹ کو نشانات فتح دیکر اس کے لینے کے لئے پیرس بھیج دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"جلدی ــــ دیکھو میں کہتا ہوں اگر تم نے دیر کی تو تم مجھے بیمار پاؤگی۔ یہ تکان، محنت اور جدائی بہ یک وقت ناقابل برداشت ہیں"۔

بقیہ نوٹ:۔ رفتہ رفتہ بارس بھی الگزانڈر کی طرح اس سے تنگ آگیا۔

۱۷۹۵ء میں نپولین پیرس آیا۔ وہ غریب تھا۔ بینوا اور بے دست، لیکن ٹولن کے محاصرے میں اپنا نام پیدا کر چکا تھا۔ اور بارس نے اسے جنرل بنا دیا تھا۔ اس نے جب جوزوفائین کو دیکھا تو ہمہ تن درد، آہ اور کراہ بن کر رہ گیا اس کی حالت بالکل "نیمہ داغ ونیمہ خاکستر" تھی۔ نپولین اپنی بلند نظری اور اعلیٰ حوصلگی کا ہمیشہ غلام رہا ہے لیکن اس کی زندگی کا صرف یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ مطمح نظر اندھی محبت کے آگے بھلا دیا جاتا تھا پہلی ہی ملاقات کے بعد وہ اس سے شادی کرلینا چاہتا ہے۔ لیکن جوزوفائین اتنی جلد اس کے لئے آمادہ نہ تھی۔ وہ اس سے کچھ خوفزدہ سی تھی لیکن بارس جو اس سے عاجز آچکا تھا۔ شادی پر مُصر ہوتا ہے اور آخر کار ۸ مارچ ۱۷۹۶ء کو نپولین اور جوزفائین کی شادی ہوجاتی ہے۔ بارس اور ٹیلین، دو خاص گواہ بنتے ہیں۔

دو ہی دن بعد نپولین اٹلی کی مہم پر چلا جاتا ہے۔ نپولین بے حد منہمک اور مصروف رہتا ہے لیکن جوزوفائین کو خط لکھنے کیلئے اسے ہمیشہ وقت مل جاتا ہے۔ یہ جلدی میں لکھے ہوئے خطوط تمامتر جوش اور اثر سے بھرے ہوئے ہیں۔ نپولین اسے اٹلی بلاتا ہے لیکن وہ پیرس ہی میں رہ کر جنرل بوناپارٹ کی بیوی کی حیثیت سے لوگوں کی تحسین اور توصیف سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔ آخر کار وہ جون کے آخر میں ملان پہونچ جاتی ہے لیکن اس طرح روتی ہوئی جاتی ہے جیسے وہ کوئی سزا بھگتنے جا رہی ہے۔

جوزوفائین کی بیجا بیاں اور فضول خرچیاں برابر قائم رہتی ہیں۔ نپولین خفا بھی ہوتا ہے لیکن پھر من جاتا ہے اور اس کا قرض تک ادا کر دیتا ہے۔

نپولین کے دل میں اب یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنا خاندان قائم کرے جو شاہان یورپ میں ایک خاص وقار کا مالک ہو۔ اس کی تکمیل کے لئے کسی شاہی خاندان میں شادی کرنا ضروری تھا اور اس کے لئے جوزوفائین کو طلاق دینا ناگزیر، وہ کچھ دنوں تک سوچتا رہا۔ اپنے دل کی اس آرزو کو دباتا رہا لیکن چند سیاسی ضرورتوں اور مشیروں کے پیہم اصرار نے اسے مجبور کر دیا۔ اور آخر کار ۱۸۰۹ء میں اس نے جوزوفائین کو طلاق دے دی۔

لیکن اس میں ذرا کلام نہیں کہ نپولین جوزوفائین سے برابر محبت کرتا رہا۔ جب روس سے باقیماندہ "عظیم الشان" فوج خستہ ودرماندہ واپس

اس حالت میں بھی اسے ایک خیال ——— صرف ایک ہی خیال ہے: "تم آؤ گی؟ ——— ہاں تم میرے پاس ہوگی، میرے دل میں۔ میرے پہلو میں۔ پر لگا لو۔ آجاؤ۔ جلد آجاؤ۔"

لیکن جوزوفائین کو جلدی نہیں ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار ملک اطالیہ کے سپہ سالار اعظم کی بیوی ہے۔ ایک اہم شخصیت ہے۔ نپولین آس لگائے ہوئے ہے۔ اسے غصہ آتا ہے۔ امید و بیم کی کیفیات سے وہ پھنکا جاتا ہے۔ وہ قاصد پہ قاصد دوڑاتا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ وہ کیا سوچ رہی ہے؟ کیا اس نے واقعی کسی انیس۱۹ سالہ جوان سے محبت کر لی ہے۔؟ وہ برابر ایک ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا ہے۔

جوزوفائین علالت اور ابتدائے دردزہ کا عذر کرتی ہے بوناپارٹ کو بڑی ندامت ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"میں نے تمھارے اتنے قصور کئے ہیں کہ میں ان کی تفصیل سے بھی عاجز ہوں۔ میں تمھیں قیام پیرس پر الزام دیتا ہوں درآنحالیکہ تم وہاں بیمار تھیں۔ میری پیاری آمی! مجھے معاف کر دو، بخش دو، محبت جو تم نے میرے رگ و ریشہ میں بھر دی ہے اس نے مجھے فاتر العقل کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ فتور کبھی دور نہ ہوگا۔ کوئی اس بیماری سے اچھا نہیں ہوتا ہے ...... اپنی ماں جیسا ایک خوبصورت بچہ تمھاری گود میں فرحت و انبساط محسوس کریگا۔ اور میں بدنصیب اپنی فتح و کامرانی پر قناعت کروں گا۔"

جوزوفائین نے محسوس کیا کہ یہ بہانے زیادہ دنوں تک چلنے والے نہیں ہیں۔ نپولین تحریر کرتا ہے کہ اگر اس کی بیوی نہیں آئیگی تو وہ مستعفی ہو جائیگا۔ سب چیز چھوڑ دیگا اور خود اس کے پاس چلا آئیگا۔ آخر کار جوزوفائین ناخوشی سے جوناٹ اور جوزف (نپولین کے بھائی) کے ہمراہ آجاتی ہے۔ اس کا کتا "فارچون" بھی ساتھ آتا ہے۔ نپولین جب اس کے ملان کے قریب پہونچنے کی اطلاع پاتا ہے تو اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ورونا میں آجائے۔ "مجھے تمھاری ضرورت ہے اس لئے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔"

لیکن وہ ملان ہی میں انتظار کرتی ہے۔ وہ وہیں چلا جاتا ہے اور دو دن خوب پیار و محبت میں گذرتے ہیں۔ "زہرہ صبح بھی ہے اور جام بلور بھی" کا لطف خاص حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے نزدیک دنیا "ہیں جائے سن و جائے تو باشد" کا نام تھی۔ لیکن فوراً ہی جنگ کی کچھ خطرناک صورتیں اسے جلد واپس جانے پر مجبور کرتی ہیں وہ روزانہ طویل محبت نامے لکھتا رہتا ہے۔ ایک خط میں لکھتا ہے۔

"آہ مجھے اجازت دو کہ میں کسی طرح تمھارے کچھ نقص معلوم کر لوں تم للہ کم حسین بن جاؤ، کم نازک بن جاؤ اور سب سے زیادہ یہ کہ کم مہربان ہو جاؤ ——— اور ہاں کبھی متفکر نہ ہو ——— بدگمان نہ ہو۔ کبھی آنسو نہ بہاؤ ——— تمھارے آنسو مجھ سے عقل چھین لیتے ہیں ——— میرے خون میں آگ لگا دیتے ہیں ——— آؤ، میرے پاس آجاؤ۔ تاکہ مرنے سے پہلے ہم یہ تو کہہ سکیں کہ ہم نے اتنے دن مسرت کے ساتھ گذار لئے۔"

جوان محبت کی یہ طوفان خیزیاں اگرچہ کم ہو گئیں لیکن وہ بیوی سے بدستور محبت کرتا رہا۔ "میدام ستیل" سے وہ کہتا ہے ——— "مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے ——— اگرچہ وہ چالیس برس کی ہو گئی ہے اور اس قدر معلوم بھی ہوتی ہے۔"

دراصل بوناپارٹ کے لئے اس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ تمام زندگی چاہے وہ اسے کتنے ہی فریب میں مبتلا رکھے۔ وہ اسی کا دم بھرتا رہتا ہے، وہی اس کے تمکین و ہوش پر قابض رہتی ہے۔ ذیل میں اس کے خطوط کا انتخاب اس امر کو واضح کردیگا۔

(ملان کو)

ازورونا، ۱۳ر نومبر ۱۷۹۶ء۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ

(بقیہ نوٹ) آئی ہے تو سپاہیوں کو جوزوفائین کا برابر خیال تھا ان لوگوں نے کہا "نپولین کو وہ بڑھیا لڑکی چھوڑنا نہیں چاہئے تھی۔ وہ اس کی خوش قسمتی کا باعث تھی۔" نپولین کو اس وقت بھی کچھ کچھ یقین تھا کہ یہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں۔ "صد ایام" Hundred days سے پہلے ہی جوزوفائین کا انتقال ہو گیا مرتے وقت اس کے لبوں پر بوناپارٹ ہی کا نام تھا۔ نپولین بھی اسے "زینت زیست" اور اس کی محبت کو دل کی سب سے شیریں محبت سمجھتا رہا۔

جوزوفائین سے زیادہ شریف عورتیں بلند منصبوں پر فائز ہوئی ہیں لیکن مقبول سڈنی ڈارک اس قدر قابل محبت کم۔ خواجہ احمد فاروقی

تم سے نفرت کرتا ہوں۔ تم کیسی خوفناک، کیسی بُری، کیسی بیوقوف۔ بالکل سنڈریلا ہو، تم مجھے بالکل خط نہیں لکھتیں۔ اپنے شوہر سے ذرا محبت نہیں کرتیں۔ تمہیں اس مسرت کا خوب اندازہ ہے جو اسے تمہارے خطوط سے ہوتی ہے۔ پھر بھی تم اسے اتفاقاً ہی پانچ چھ سطریں گھسیٹ کر نہیں، بھیجدیتیں۔"

بیگم! پھر تم آخر دن بھر کیا کرتی ہو؟ وہ کیا مشغولیت ہے جو تمہارا تمام وقت لے لیتی ہے اور تمہیں ایسے اچھے محب کو خط لکھنے سے باز رکھتی ہے ... وہ کون نیا اور عجیب محبت ہے جو تمہارے تمام لمحات پر حاوی ہے۔ جو تمہاری فرصتوں پر جابرانہ قبضہ کئے ہوئے ہے اور جو تمہیں، تمہارے شوہر کا آرزومند ہونے سے منع کرتا ہے۔ جوزوفائین! یاد رکھو کہ ایک دن دروازے کھلینگے اور میں وہاں موجود ہونگا۔

میری اچھی آمی! دراصل میں تمہاری خیریت نہ معلوم ہونے سے سخت پریشان ہوں۔ مجھے جلد چار صفحے کا خط لکھو اور اس میں ایسی اچھی اچھی باتیں تحریر کرو جو میرے دل کو مسرت اور محبت سے سرشار کردیں۔
مجھے امید ہے کہ میں جلد تم سے آکر بغلگیر ہونگا اور لاکھوں ایسے طویل اور گرم بوسوں کی بارش کرونگا کہ یہ معلوم ہو کہ تم خط استوا پر ہو۔"

بوناپارٹ۔"

(بمقام جینوا)

ملان ۲۷ر نومبر سنہ ۱۷۹۶ء وقت ۳ بجے سہ پہر

میں ملان آیا اور تمہارے کمرے میں دوڑا ہوا گیا۔ میں نے ہر چیز تمہیں دیکھنے کیلئے، تم سے بغلگیر ہونے کے لئے چھوڑ دی ... ہاں تم وہاں نہیں تھیں۔ تم ایسی جگہ چلی جاتی ہو جہاں ہنگامہ طرب ہوتا ہے۔ مسرت بپا ہوتی ہے ——— تم ایسے وقت چلی جاتی ہو، جب میں تمہارے پاس آتا ہوں، تم اپنے پیارے نپولین کا اب ذرا بھی خیال نہیں کرتیں۔ تمہاری اس سے محبت شاید وہم ہی وہم تھی۔ تمہاری تلون المزاجی شاید اس بے التفاتی کا باعث ہے۔ میں خطرات کا عادی ہوں۔ مجھے زندگی کی لعنتوں کا علاج معلوم ہے۔ یہ بدنصیبی جو میرے اوپر غالب ہے، بیحد و حساب ہے۔ میرا حق تھا کہ میں اس سے بچا لیا جاتا۔

میں یہاں ۹ر کی شام تک رہونگا .... تم خوب عیش کرو۔ عیش تمہارے ہی لئے بنا ہے۔ تمام دنیا تمہیں خوش کرنے پر مسرور ہے۔ لیکن صرف تمہارا شوہر بہت ——— بہت بدنصیب اور غمگین ہے۔

بوناپارٹ"

خواجہ احمد فاروقی،

رُباعیات

(مولانا عابد رضا صاحب بیدار ...)

دیوانہ کئے دیتا ہے آغازِ بہار
کس حشر خیز جذبات ہے اندازِ بہار
کیوں وحشت و جنوں جانب این و من شدہ
عابد ہے شوق ہی ز رازِ بہار

کیا کیفیتِ جوشِ تمنا کہئے
ہوش آئے تو افسانۂ صہبا کہئے
رعنائی میخانہ سے دل ہے بیخود
ہر ذرہ کو اک جنتِ دنیا کہئے

آفتاب

اے ایاغِ زندگی اے نیرِ گردوں مدار
اے چراغِ زندگی اے آفتابِ زرنگار

تیری تابش سے منور کوہسار و باغ و راغ
تیری آمد سے ہوا گل محفلِ شب کا چراغ

جلوہ گستر دیکھ کر تجھ کو ستارے چھپ گئے
چھپ گئے اپنا سا منہ لے کر بچارے چھپ گئے

تیرے ہاتھوں نے اٹھائی ہے نقابِ روئے صبح
ہر روش پر باغ کی پھیلی ہوئی ہے بوئے صبح

بامِ گردوں پر تری ہستی ہے حیرت آفریں
میری نظروں میں ہے تو جامِ شرابِ آتشیں

ہے پیامِ زندگی ذی روح کو تیرا ظہور
تیری تنویروں سے تاباں دشت و صحرا و بحور

تیرے جلووں سے درخشندہ ہے ایوانِ شہی
اور غریب و مفلس و بیکس کی خستہ جھونپڑی

ہیں تری رنگیں شعاعیں کس قدر نیرنگ کار
سنگریزوں کو بنایا جس نے دُرِ شاہوار

تیرے تن پر زیب دیتی ہے تری زرّیں قبا
مشرق و مغرب میں تیری بادشاہی ہے بجا

رنگ دیکھے تیری طلعت کا کوئی وقتِ سحر
پردۂ تاریک سے ہوتا ہے جب تو جلوہ گر

دہر کا ہر ذرّہ تیرے نور سے معمور ہے
چشمِ عالم میں تری ہستی سراپا نور ہے

غنچہ غنچہ صحنِ گلشن کا تبسم ریز ہے
چپہ چپہ ارضِ عالم کا نشاط انگیز ہے

تیری تنویروں سے تابندہ ہے ساری کائنات
میں سمجھتا ہوں تجھے اے شمعِ شبستانِ حیات

مدتوں سے ہے یونہی تاریک کاشانہ مرا
غم فزا دل سوز درد آگیں ہے افسانہ مرا

آ خدارا میرے دل سے داغِ ہجراں دور کر
اس سیہ خانے کو اپنے نور سے معمور کر

آزاد انصاری۔ گنگانوی

داروغہ اہتمام الدولہ بہادر

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت

دولت اور عزت خدا کی دین ہے۔ اس میں کسی کا اختیار نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دولت انھیں لوگوں کو ملتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں تمیز داری سے محنت کرتے ہیں اور عزت ان کو ملتی ہے جو عزت کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور اپنی عزت آپ کرتے ہیں۔ ان کی ابتدا کسی حالت میں ہو ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال داروغہ میر حیدر حسین خاں ہیں جو قوم کے سید لکھنؤ میں رہتے تھے۔ طفلی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خاندان میں کوئی اس قابل نہ تھا جو ان کی پرورش کرتا اور تعلیم دیتا۔ عورتوں میں صرف ایک بہن تھی جس کے یہاں زردوزی کا کارخانہ تھا اور شوہر زردوز تھا تو بھی اپنے چھوٹے بھائی کی پرورش کرتی تھیں۔ باپ کا نام میرزا حاجی بیگ تھا۔ جب حیدر حسین خاں چار برس کے تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں اپنے شوہر کے غم میں دو برس کے اندر پاگل ہو کر مرگئی تھی۔ ایک نانی تھیں جو زمانہ محمد علی شاہ میں نواب ملکۂ آفاق مخدرہ عظمیٰ ممتاز الزمانی بیگم عرف کھیتو بیگم کی خاص محل کی سرکار میں مصاحبت میں دن رات حاضر باش رہتی تھیں ان کو محل سے کہاں فرصت تھی کہ نواسے کی خبر گیری کرتیں۔

بہن کے شوہر چاہتے تھے کہ تعلیم کا سلسلہ تو غیر ممکن ہے کم سے کم حیدر حسین زردوزی کام سیکھ لیں۔ ایک دن ان سے کہا خالی آوارہ کب تک پھروگے کل سے کارخانہ میں بیٹھا کرو تو چار پیسہ کے مزدور ہو جاؤگے۔ پیسہ اپنے قوت بازو سے کچھ کمانا چاہئے غیور حیدر حسین نے اس نصیحت کا بڑا اثر لیا کہنے لگے بیشک مجھے خود فکر ہے کہ کوئی اپنی معاش کی صورت نکالوں اور اسی خیال میں سرگرداں پھرتا ہوں خدا مسبب الاسباب ہے لیکن کوئی پیشہ کرنا میرے لئے ننگ ہے۔ میں تو عزت کی ملازمت چاہتا ہوں اگر اس کی جلد سبیل نہوئی تو کچھ اور سوچا ہے۔ یہ کہہ کر آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔ بہنوئی نے کہا میں نے جو مشورہ دیا تھا اسے تو حیدر حسین نے ٹھکرا دیا اور بُرا مانا لیکن نوکری ان کو کہاں مل سکتی ہے۔

ایک دن اتفاق سے یہ بازار میں گوز خریدنے جا رہے تھے ایک جوگی ملا اس نے ان کی پیشانی سے اقبال مندی کے آثار دیکھ کر کہا بچہ تیرے دروازے پر ہاتھی بندھے گا میری بات یاد رکھنا۔

حیدر حسین نے کہا سائیں جی ہم تو خود غیر کے دروازے پر بندھے ہیں اور بے غیرتی کی روٹی کھا رہے ہیں اور پیسہ پاس نہیں ہے۔ ہاتھی کہاں اور ہم کہاں، یہ تو غیر ممکن ہے اگر ہاتھی بندھے گا تو تم کو ایک دھوتی بندھوا دینگے اب تو خود محتاج ہیں۔ جوگی نے کہا میں کسی سے بھیک نہیں مانگتا نہ اس شہر میں میری پھر پھیری ہوگی صرف میری بات یاد رکھنا۔ یہ کہہ کر وہ آگے چلا گیا بات رفت گذشت ہو گئی۔

لیکن بہنوئی کے اس کلمہ کا تیر ایسا لگا کہ کسی طرح زخم مندمل نہ ہوا نوکری کی تلاش میں دردر کی خاک چھانی مگر کہیں نہ ملی تو ٹھانی کہ بہن کی روٹیاں کب تک توڑیں بہتر یہی ہے کہ شہر چھوڑ پردیس کی بھیک اچھی۔ اس سوختی میں ہماری جان نکل جائیگی۔ لکھنؤ چھوڑ کر اپنی قسمت کا لکھا پورا کریں۔

م یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

یہ منصوبہ دل میں باندھ کر اپنی نانی کے پاس گئے۔ اپنا حال اور بہن کے یہاں پڑے رہنے کی ذلت بیان کیا۔ بہت کچھ روئے گلے اور کہنے لگے، تم سے رخصت ہونے آیا تھا کیونکہ تم سے زیادہ چاہنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اب چندے اپنی چھاتی پر پتھر رکھو اور ہم کو رخصت کرو۔ اگر

زندگی باقی رہی اور کوئی روزگار مل گیا تو ایک دن ساتھ خیریت کے تمہاری قدمبوسی حاصل کرینگے نہیں صبر کرکے بیٹھ رہنا اور جاننا کہ بیٹی کی طرح نواسہ بھی مرگیا۔ بے عزتی کی زندگی کے ساتھ دنیا سے اٹھ جانا آدمی کے لئے بہتر ہے نانی صاحبہ جانے کا نام سن کر رونے لگیں اور کہا جائیں تمہارے دشمن تم کو روٹی کپڑے کی ضرورت ہے تو کیا نانی مرگئی۔ جو کچھ تمہارے کھانے کپڑے کا خرچ ہو مجھ سے لیا کرو لیکن رہو اپنی بہن کے پاس کیونکہ محل میں تو تم کو رکھ نہیں سکتی۔ یہاں تو پانچ برس کا بچہ بھی نہیں آسکتا۔ انھوں نے کہا تو مجھے بھی رخصت کرو کیونکہ میں اب بہنوئی اور بہن کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا نہ کسی غیر کا احسان اٹھانا چاہتا ہوں۔ نانی نے کہا تجھے میری جان کی قسم مجھی کو پیٹے صرف آٹھ روز ذرا صبر سے کام لے۔ میں آج ہی بیگم صاحب سے کہہ کر خدا کو منظور ہے تو تجھے کوئی جگہ دلوا دیتی ہوں۔ اتنے دنوں تم میرے پاس آکر کھانا کھا جایا کرو۔ اسی طرح آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے نواسے کو رخصت کرکے بیگم صاحب کے پاس گئیں تو انھوں نے کہا بیگم خیر تو ہے تم تو رونے کا نام بھی نہیں جانتیں۔ خود روتوں کو ہنسا دیتی ہو۔ یہ آج کیا ہے چہرہ اداس آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ بدحواس آرہی ہو۔ کہنے لگیں حضور کے واسطے اس حال کو نہ پوچھو آج ایسا داغ دینے والا آیا تھا کہ اس کی دو باتوں میں کلیجہ قابو سے نکل گیا اور یہی جی چاہا کہ چھری مار کر جان دیدوں۔ مجھ بدنصیب کی زندگی کا سہارا صرف ایک لڑکی تھی جس پر میری جان فدا تھی اور جی جان سے اسے چاہتی تھی اور اپنی زندگی کا سہارا اسے سمجھتی تھی۔ قسمت کی بات ہے کہ شوہر کے مرنے کے دو برس کے بعد وہ بی بی دو بچے چھوڑ کر مجھے داغ مفارقت دے گئیں دل قابو سے باہر ہوگیا سڑن دیوانی بن گئی۔ میں زندگی میں اتنا ہنسی تھی کہ اس کا کافی بدلا مجھ سے خدا نے لیا سارے محلہ میں ہنسا چیل مشہور تھی۔ کچھ زمانے میں شوہر کا مرنا۔ گھر کا تباہ ہونا۔ جاں نثار بچی کے دو بچے چھوڑ کر دنیا سے سدھارنا مجھے سڑن بنانے کو کیا کم تھا۔ غرض اسی حالت جنون میں اپنی نواسی کو جس کا سن چودہ برس کا تھا ایک زردوز کے یہاں شادی کرکے چاہتی تھی کسی جنگل بیابان میں نکل جاؤں۔ جی بہت گھبراتا تھا کہ نواسی کے سبب سے بہت رنج پہونچا یعنی اس کے شوہر کی مفلسی قرضداری میں پریشانی روز روز کی فاقہ شکنی کیونکر ہوسکے۔ اپنا مکان بیچ کر داماد کا بھرنا بھرا اور اس کو زردوزی کا کارخانہ کھلوا دیا۔ اب یہ صورت ہوئی کہ آپ فاقہ کرنے لگی مگر خدا کا کرنا

ایسا ہوا کہ بی مرزائی کے ذریعہ سے حضور کے قدموں تک رسائی ہوئی بہت کچھ اطمینان ہوا۔ آج کا قصہ سنئے۔ میرا نواسہ جسے میں اپنی زندگی کا ذریعہ جانتی تھی اور جسے چار برس کے سن سے کلیجہ سے لگا رکھا تھا اور جسے بڑی بہن کے پاس چھوڑ کر حضور کے دامن دولت سے وابستہ تھی زار و قطار روتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں اب بہن کے پاس نہیں رہنا چاہتا ان کا سلوک اچھا نہیں دیکھتا۔ اب غیر کے ہاتھ کی روٹی نہیں کھانا چاہتا اپنے قوت بازو کی کمائی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیس چھوڑ پردیس کی بھیک اچھی امید ہے کہ کوئی روزگار ضرور مل جائیگا۔ تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ میرے حواس جاتے رہے دل قابو میں نہ رہا۔ کہا بیٹا کیا نانی مرگئی ہے جو تم مجھے چھوڑ کر پردیس سدھارتے ہو۔ کھانا کپڑا میں تمھیں دے سکتی ہوں۔ کہنے لگا میں بہن کے مکان میں دوبارہ نہیں جاؤنگا۔ میں نے کہا اچھا دو چار دن کا صبر کرو۔ اگر سرکار سے کوئی صورت تمھارے لئے نکل آئی تو بہتر ہے ورنہ تم کو اختیار ہے۔ اب حضور کے ہاتھ میری موت اور زندگی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر نواسہ کہیں نکل گیا تو میں زندہ درگور ہو جاؤنگی۔

جناب عالیہ نے فرمایا اچھا میں آج بادشاہ سے کہونگی آئندہ لڑکے کا مقدر۔ جب محمد علی شاہ محل میں تشریف لائے تو بیگم صاحبہ نے بادشاہ سے عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا اس کا سن کیا ہے کہا پندرہ سولہ برس کا۔ کہا اچھا کہدو ہمارے خواصہ کے خوان دیکھ لیا کرے دوسرے دن سے داروغہ باورچی خانہ مقرر ہوگئے۔ حسب دستور بادشاہ کے خوان کے ساتھ ایک خوان داروغہ کو بھی ملتا تھا۔ یہ اپنا خوان اپنی بہن کو بھیجدیتے تھے اسے گھر بھر کھاتا تھا۔ جبکہ محمد علی بادشاہ نے ماہ ربیع الثانی کی پانچویں تاریخ یوم شنبہ ۱۲۵۸ھ کو اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ تاریخ وفات وہ اور ہیجبال حکومت تو دشد ۱۲۵۸ اور حضرت محمد امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو داروغگی اہتمام دربار عام کی اعتبار الدولہ عطا حسین خان برادر امین الدولہ کو عنایت کی داروغہ باورچیخانہ حیدر حسین خاں کو اہتمام الدولہ کا خطاب دیکر پیش دست اعتبار الدولہ کا مقرر کیا کیونکہ زمانہ ولیعہدی کے روزانہ حاضرباش رہتے تھے اور دخیل مزاج بھی اب کیا تھا مہتمم دربار عام کے پیش دست۔ کل عملہ ان کے اختیار میں تھا ان کی آمدنی کافی تھی۔ مگر تعلیم سے بے بہرہ۔ بالکل جاہل مگر خدا نے اس جہالت پر بھی فضل کیا کہ اس جہالت پر بھی تمام عملہ ان سے خوش تھا اور بڑے بڑے

عملے کے لکھے پڑھے دربار کے عالم فاضل ان سے مشورہ لیتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی دیانت اور امانت مشہور تھی اور بادشاہ کو ان پر اعتماد تھا۔ مرزا امجد علی شاہ نے چار برس دس مہینے ۲۴ یوم سنہ ۱۲۶۳ھ پنجشنبہ کے روز سلطنت کر کے انتقال فرمایا اور سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ رونق افروز تخت سلطنت ہوئے تو دیوانخانہ کے مہتمم اور کارخانجات شاہی کے سکریٹری قرار پائے اس لئے کہ بادشاہ ان کو داداجان کے وقت کا قابل اعتماد کارگذار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ بادشاہ ان سے بہت خوش ہوئے اور عملے والے ان سے مشکل امور میں مشورہ لیتے رہتے یہاں تک کہ بادشاہ کے چوتھے وزیر کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ دربار میں منور الدولہ۔ امین الدولہ دلیر الدولہ، شرف الدولہ کے پہلو بہ پہلو جائے نشست ملتی تھی۔ بادشاہ کے ہر مشورہ کا جواب نہایت عقلمندی سے دیتے تھے۔

اس عرصہ میں سلطنت کا زوال ہو گیا۔ بادشاہ معزول ہو کر لکھنؤ سے کانپور تک پہونچے تھے کہ ایک دن چیف کمشنر نے مصلح الدولہ مسیح الدولہ۔ دیانت الدولہ۔ احسن الدولہ۔ تسخار الدولہ۔ اکرام الدولہ۔ اہتمام الدولہ کو ضمانت کے لئے طلب فرمایا۔ سب شاہی عملہ کے لوگ حاضر ہوئے اور اہتمام الدولہ معرض حساب میں آئے اور دس ہزار روپیہ کا الزام ان پر عاید کیا گیا۔ یہ بہت پریشان ہوئے۔ صاحب لوگ ان فراست اور امانت و دیانت سے خوب واقف تھے۔ آخر برڈ صاحب نے ان کی ضمانت کر لی۔ اہتمام الدولہ نے حساب لکھوانا شروع کی۔ ان کے عملے نے کاغذات دکھلائے اور دس ہزار کے بدلے خود ان کا چودہ ہزار واجب الادا نکلا۔ چیف کمشنر ان کی یادداشت اور دیانت کے مقر ہوئے کہ جاہل اہلکار نے محض اپنی یادداشت کے اعتبار پر الزام سے بریت حاصل کی اور اپنا چودہ ہزار کا مطالبہ پیش کیا۔

غدر سے پہلے جب جان عالم کلکتہ تشریف لے گئے تو تمام شاہی عملے کو سرکار کمپنی نے برطرف کر دیا اور ان کا مطالبہ بھی کچھ ادا کیا ہزاروں آدمی اپنی آبرو لے کر لکھنؤ چھوڑ کر خانہ ویران ہو گئے۔ جو ریاست کرتے تھے فقر و فاقہ کی حالت میں شہروں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم، لوگ خود گرفتار بلا تھے نوکر کس کو رکھ سکتے تھے تو بھی اہل لکھنؤ کی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان کی حالت پر افسوس کرتے تھے۔

اہتمام الدولہ کی پہلی شادی جب یہ داروغہ تھے ۲۳ سال کی عمر میں ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس بی بی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا عقد میر فضل علی صاحب ایک عزت دار نامور تاجر تھے ان کی صاحبزادی کلثوم بیگم صاحبہ کے ساتھ ہوا۔ یہ نیک بی بی نہایت ذی شعور اپنے شوہر کے اطاعت گزار تھی اسی کے زمانہ میں اہتمام الدولہ خطاب ملا۔ جاگیر و منصب ملا۔ جائداد میں ترقی ہوئی لیکن اولاد سے محروم رہے کوئی اولاد اس بی بی سے نہیں ہوئی۔ اہتمام الدولہ کے مرنے کے بعد جو اس بی بی پر مصیبتیں نازل ہوئیں ان کو مردانگی سے سر کیا اور انھیں کے مکان میں ہر طرح کی اذیت اٹھا کے زندگی ختم کر دی۔

اہتمام الدولہ نے اپنے عروج کے زمانے میں بہت عیش کئے۔ اکثر طوائفیں ان کی نوکر تھیں۔ انھیں میں ایک بندی جان طوائف تھی نہایت حسین و خوبصورت اور ان سے بہت محبت کرتی تھی اور بہت خیر خواہ تھی۔ اتفاق سے ایک دفعہ بندی جان کی کوئی بات اہتمام الدولہ کو سخت ناگوار ہوئی انہوں نے غصہ میں اس کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ اس نے اس ناگوار حرکت کا بہت اثر لیا اور دل میں سوچنے لگی کہ جس شخص کا میں اس قدر پاس و لحاظ کرتی تھی اور ہر وقت اس کی خوشی چاہتی تھی اس نے ایک ذرا سی بات میں یہ غیر شریفانہ حرکت کر کے میری جاں نثاری اور وفاداری کو خاک میں ملا دیا۔ تو اس سے خفا ہو کر غیر سے سلوک کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ سب میرے مقدر کی خرابی ہے اب جینا بیکار ہے اس سے مر جانا کہیں بہتر ہے اسی رنج و غصہ میں ایک ہیرے کی انگوٹھی چبا لی اور صبح کو سوتی کی سوتی رہ گئی۔ داروغہ صاحب کو اس کے مرنے کا بہت صدمہ پہونچا۔ مقام سیہ پر اپنے باغ رکنڈی پور میں دفن کیا اور چہلم تک اس کے ماتمدار رہے۔

ممتوعہ عورتوں میں ایک حرم محبوبن تھیں بہت محبوب ترین حرم میں ان کا شمار تھا ان سے ایک فرزند مرزا احمد حسین پیدا ہوئے۔ ان کی شادی نہایت دھوم سے میر نظیر علی خاں صاحب کی صاحبزادی پیاری بیگم سے ہوئی اور نہایت دھوم سے ہوئی۔

اہتمام الدولہ بھی اسی آفت میں مبتلا تھے ان کے پاس سوا جائداد غیر منقولہ اور زر نقد کے اور کوئی وسیلہ نہ تھا۔ بہت عاقبت اندیش تھے سمجھے کہ میرا کوئی وثیقہ نہیں ہے اب بقیہ زندگی بسر کرنا مشکل ہوگی اور جاہل ہوں کہیں نوکری ملنا محال ہے۔ اپنے خرچ کو پہلے کم کیا۔ ہاتھی گھوڑے بیچ ڈالے نوکر کم کئے۔ صرف چھ کہار نوکر رہنے دیئے دو زنانی ڈیوڑھی پر اور چار

ان کی پنیس اٹھانے کے لئے۔ گرمی میں شربتی۔ اصلی جامدانی۔ اور عمدہ چکن کے انگرکھے۔ برکا پائجامہ۔ مندیل دار ٹوپی۔ جاڑے میں شالی چغہ، سفید، شال کا دوشالہ، اصلی جامہ وار اوڑھتے تھے۔ باہر ایک باورچی نوکر تھا لیکن اور کا کھانا نہیں پکاتا تھا۔ زنانے مکان میں کھانا پکایا جاتا اور اس میں خواصوں کا انتظام تھا۔ علی الصباح حوائج ضروری سے فارغ ہو کر ۶ بجے ناشتہ کرکے ۱۱ بجے دن کو دسترخوان بچھتا۔ بیس پچیس آدمی دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ صبح شام تلی اردی کا سالن خاصہ میں ضرور رہتا تھا۔

شام کو نو بجے دسترخوان بچھتا تھا اس وقت گرم گرم پوریاں اور سیخ کے کباب روزانہ بازار سے منگا کر خاصہ پر رکھے جاتے تھے۔

مہدی گنج میں دولتکدہ تھا اور قریب قریب آدھا مہدی گنج ان کے عالی شان محل میں شامل تھا۔ فیل خانہ اصطبل۔ توشے خانہ۔ مودی خانہ۔ دیوان خانہ۔ باورچی خانہ۔ امام باڑہ وغیرہ۔ زنانی ڈیوڑھی۔ محل خانہ۔ خدمتگار۔ چوکیدار۔ کہار۔ منشی وغیرہ بیس ملازم باہر تھے۔ مامائیں، پیش خدمتیں۔ باری داریاں۔ خواصیں۔ مغلانیاں کل تیس عورتیں محل میں ملازم تھیں۔ ماہ محرم میں بہت خاص اہتمام سے مجلسیں ہوتی تھیں۔ ۸ محرم کو حضرت عباس علمبردار کا عظیم الشان علم اٹھتا تھا خستہ باقرخانی رومال میں بندھی ہوئی سب شرکائے مجلس میں بطور تبرک تقسیم ہوتی تھی۔ نوحہ خواں۔ مرثیہ خواں نثر خواں۔ سوزخواں۔ حدیث خواں مجالس میں ذاکری کے لئے نوکر تھے غرضکہ بڑی سرکار تھی جس سے ستر اسی نوکروں کی پرورش ہوتی تھی۔ چوک میں حیدر حسین خاں کا پھاٹک اور کئی کمرے کئی مکان تھے جن کی آمدنی کافی تھی۔

احمد حسین خاں صاحب نے اپنی زندگی نہایت نیک چلنی سے بسر کی فیض آباد میں اہتمام الدولہ کا ایک گاؤں تھا وہیں قیام اختیار کیا اور وہیں انتقال بھی ہوا۔ ان کی ایک صاحبزادی اور تین صاحبزادے تھے۔ محمد حسین عرف چھٹن صاحب مرحوم۔ منے صاحب مرحوم۔ تیسرے صادق حسین صاحب جو بقید حیات ہیں۔ احمد حسین کے زمانہ تک ان کے گھر کی حیثیت بنی رہی لیکن ان کے انتقال کے بعد اول الذکر دو لڑکے خراب چال چلن کے نکلے انھوں نے عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں سب جائداد تباہ کردی اور تباہ ہو کر مر گئے۔ صادق حسین صاحب جو مرزا احمد حسین کی کسی حرم سے تھے بدچلن ہونے سے گھر سے نکالدیئے گئے تھے۔ بعد انتقال احمد حسین خاں بھائیوں نے ان کو ترکہ نہیں دیا بلکہ کچھ روپیہ دیکر بیعنامہ کرالیا اب صادق حسین غریب اور محتاج ہیں۔

اس تاریخی واقعہ کے بیان سے ہماری غرض یہ ہے کہ جو شخص دور فلک سے مفلس و نادار کے گھر پیدا ہوتا ہے اور ہمت سے کام لیتا ہے تو وہ اگر جاہل ہے اس کا دل بے عزتی کے کاموں کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ شریفوں کی طرح محنت کرکے فاقہ کشی سے زندگی بسر کرتا ہے اس محنت کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی دستگیر کے کامیاب ہو کر مدارج اعلیٰ کو پہونچ جاتا ہے اہتمام الدولہ بیچارے ایک غریب خاندان کے آدمی تھے ماں باپ کا سایہ صغر سنی میں سر سے اٹھ گیا یتیم، بسیر تعلیم سے محروم رہے بہن کے در پر پڑے تھے لیکن تھے غیرت دار بہن کی مفت کی روٹی ناگوار ہوئی اس نے چاہا زردوزی کا کام کریں یہ محنت ان کے بلند ارادے کے خلاف تھی پردیس جانے پر مستعد ہوئے نانی کے سمجھانے سے امید ولد نہ کر بہت دن تک بادشاہ نے ضروری آدمی سمجھ کر محض پرورش کی لحاظ سے اپنے دسترخوان کا نگران بنا لیا اور پھر محمد علی شاہ بادشاہ نے انتقال کیا تو امجد علی شاہ نے ترقی دیکر دربار عام کا پیش دست کردیا ایسی ایسی صحبتوں کے آخر مدارج اعلیٰ پر پہونچ گئے اور اکابرین سلطنت کے زمرہ میں شامل ہو گئے یہ سب مراتب دیانت اور امانت سے ان کو حاصل ہوئے ورنہ در اصل جاہل تھے اور کسی بڑے عہدہ کے لائق نہ تھے دانشمندی اور ذہانت سے تمام مدارج طے کئے اور سب مرادیں پوری ہوئیں اور اس سادھو کا کہنا سچ ہوا۔ اخیر عمر میں ضیق النفس کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ سانس چڑھنے لگی بہت سے طبیبوں کا علاج کیا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ فیض آباد میں اپنے دوست نواب شفاء الدولہ بہادر جو طبیب حاذق مشہور تھے علاج کے واسطے تشریف لے گئے حکیم صاحب نے کوئی دقیقہ علاج کا اٹھا نہ رکھا مگر قسمت میں شفا نہ تھی آخر ۲۳ رجب ۱۳۰۳ھ کو فیض آباد میں انتقال ہوا۔ نعش لکھنؤ لائی گئی اور اندرون رقبہ کربلا امداد حسین خاں میں دفن ہوئے۔

تاریخ وفات میر سجاد حسین فلک نے کہی ؎

اے دل عجیب واقعہ ہے طرفہ واردات — احباب ہوتے جاتے ہیں سب خلد کو رواں
بیٹھے ہوئے تھے مسند زر پر جو کل وہ آج — پھیلا کے پاؤں سوتے ہیں مرقد کے درمیاں
قائم پھر اب قیامت کبریٰ ہوئی اک اور — صبح بہار عیش جہاں جس سے ہے خزاں
رحلت جہاں سے کر گیا افسوس وہ رئیس — روئیگا جس کے غم میں لہو برسوں آسماں
خوشخو و خوش مزاج و خوش اقبال و خوش نصیب — خوش خلق و خوش لیاقت و خوش عقل و خوش بیاں
تحریر وصف خوبی سے خامہ ہے سرنگوں — تقریر کی یہ وسعت بھلا کہاں

رضواں نے دی فلک دم تاریخ یہ ندا
اب چین سے ہیں خلد میں حیدر حسین خاں

۱۳۰۳ھ

(۱۸۸۶ء)

کان میں پھر بھی انا الحق کی صدا آتی ہے!

جناب مولانا حکیم جگر صاحب صدیقی بسوانی،

حُسن کو خوب محبت کی دوا آتی ہے
دل جب آتا ہے کسی پر تو قضا آتی ہے

ظلم آتا ہے ستمگر کو جفا آتی ہے
ہم ہیں مظلوم ہمیں صرف دُعا آتی ہے

موسم گل میں اگر گھر کے گھٹا آتی ہے
باغ سے نغمۂ بلبل کی صدا آتی ہے

تم جفا کرتے رہے تم کو جفا آتی ہے
ہم وفا کرتے رہے ہم کو وفا آتی ہے

رُخ پہ بکھرائے ہوئے زلفِ دوتا آتی ہے
موسم گل میں دلھن بن کے گھٹا آتی ہے

قاتل آتا ہے جو بسمل کی عیادت کے لئے
ساتھ ساتھ اس کے دبے پاؤں قضا آتی ہے

کیا غرض ہے جو لگی دل کی بجھائیں آکر
ان کو صرف آگ کلیجہ میں لگا آتی ہے

آفریں کیوں نہ ہو او زہر پلانے والے
دردِ دل کی یہ تجھے خوب دوا آتی ہے

کعبے میں شیخ حرم ہے فقط اللہ کا نام
بتکدہ وہ ہے جہاں خلق خدا آتی ہے

شکوۂ جور و ستم لوگ غلط کرتے ہیں
ظُلم آتا ہے نہ تم کو نہ جفا آتی ہے

میری بگڑی ہوئی قسمت کا سنورنا ہے محال
تم بنا دو تمھیں تقدیر بنا آتی ہے

جو ہوا عشق میں گمراہ اسے راہ ملی،
کان میں کوچۂ جاناں سے صدا آتی ہے

پاؤں تو راہِ محبت میں جدھر رکھتا ہے
بڑھکے منزل اُدھر اے آبلہ پا آتی ہے

کوئی ایسی بھی تمنا ہے ہمارے دل میں
آپ سے کہتے ہوئے ہم کو حیا آتی ہے

اب نہ منصور نہ وہ دار و رسن باقی ہے
کان میں پھر بھی انا الحق کی صدا آتی ہے

پھول تربت کے ذرا آپ اٹھا کر سونگھیں،
ہو گئے خشک مگر بوئے وفا آتی ہے

شانِ حق حُسنِ بُتاں میں نظر آتی ہے جگر
بتکدے جاتے ہیں تو یادِ خدا آتی ہے

ضمیر کی آواز

از جناب چوہدری عبدالوہاب خانصاحب بی۔ایس۔سی

بلبورن لندن کے ایک خاموش کوچے میں بارہ نمبر کی عمارت میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے کئی سال سے ایک خوبصورت کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اس کی شکل وصورت سے اہل کوچہ مانوس اور آشنا ہوگئے تھے۔ اس کی عمر تقریباً پچاس برس سے تجاوز کرچکی تھی اور وہ منازل حیات کی آخری منزل طے کر رہا تھا۔ عادات وخصائل میں باقاعدہ ہونے کے علاوہ تقسیم اوقات کا بھی پابند تھا۔

کوچے کے سرے پر پہونچکر اکثر وہ دائیں جانب مڑکر بانٹ سٹریٹ کی راہ لیتا اور شام کے قریب کلب میں جا پہونچتا۔ مقررہ وقت پر کلب سے اسی راستے واپس لوٹتا۔ اکثر اوقات پیدل آتا مگر جب کبھی کسی دعوت یا مجلس میں شریک ہونا ہوتا تو راستہ میں کوئی ٹانگہ پکڑ لیتا۔ لوگ اسے فارغ البال اور خوشحال تصور کرتے تھے۔ مگر اس کی ظاہرا سج دھج اس کے برعکس تھی کنوارا ہونے کے باعث وہ کرایہ داری کی پُرآسائش طرز زندگی میں خوش و خرم تھا اس لئے اس نے بہت سا ساز وسامان خرید کر فراہم کرلیا تھا۔ اس کی واقفیت کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کے روشناسوں میں سے کسی نے بھی اس کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی۔ اس کی زندگی اور طرز عمل کسی طرح کی رازداری کا محتاج نہ تھا اور نہ دنیا میں آشکار ہونے کا مستحق تھا۔ وہ سادہ فطرت اور سادہ مزاج تھا۔ اس کی پیدائش دیہاتی خطہ میں ہوئی تھی اور ویسکس (Wessex) اس کا جنم بھوم تھا لندن میں وہ بنک کی ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا۔ وقت کے ساتھ وہ ذمہ دار عہدہ پر پہونچ گیا تھا۔ باپ کی موت پر جس نے کافی روپیہ جمع کر رکھا تھا وہ ایک معقول آمدنی کا مالک ہوگیا ہوگیا تھا۔ اس لئے اس نے دنیاوی کاروبار سے قبل از وقت کنارہ کشی کرلی۔

بہت دنوں سے وہ بیمار تھا۔ شام کے وقت اس کا دوست بیڈن اس کی عیادت کے لئے آیا۔ دونوں آگ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کی بیماری زیادہ تشویشناک تھی اس لئے وہ مختلف موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ بلبورن نے پرحسرت انداز سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"بیڈن! میں بالکل تنہا اور افسردہ خاطر ہوں۔ ایسی تنہائی کا اندازہ تم خواب وخیال میں بھی نہیں کرسکتے جوں جوں عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہوں میری تنہائی اور پژمردگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج اتفاقیہ گذشتہ واقعہ کی یاد میرے دل میں تازہ ہوگئی ہے۔ بیس سال ہوئے میں نے ایک خاتون سے وعدہ کیا تھا مگر ایفا نہ کرسکا۔ الفاظ میرے دماغ میں گھوم رہے ہیں اور میرے دل کو نوچتے ہیں۔ میں دنیاوی کاروبار میں اپنے لفظوں کی پاسداری کرتا ہوں لوگ مجھے وعدے کا پورا اور سچا خیال کرتے ہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ رات کے وقت جب تم سو رہے ہو تو کسی کواڑ یا کھڑکی کے کھلا رہ جانے کا خیال کس قدر بیچینی کا موجب ہوتا ہے۔ یا دن کے وقت خط کے جواب نہ دینے کی یاد کس قدر بیقرار کرتی ہے۔ اسی طرح بسا اوقات اس وعدہ کی یاد جسے میں پورا نہ کرسکا مجھے تنگ کرتی ہے۔ مگر آج اس کا خیال مجھے رنج وغم سے گھلائے جا رہا ہے۔"

چند لمحوں کے لئے خاموشی چھاگئی اور وہ بدستور باتوں میں محو تھے۔ بلبورن کی نظریں آگ پر جمی ہوئی تھیں مگر تصور میں مغربی یورپ کے ایک گاؤں کا نقشہ پھر رہا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام کو پھر جاری کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس عہد شکنی کے واقعہ کو کبھی فراموش نہ کرسکا۔ جب میں دنیا کے کاروبار میں تندہی سے مصروف تھا تو اس تگ ودو کی حالت میں بھی اس کی دھندلی سی یاد میرے دل میں باقی تھی۔ آج ایک واقعہ کی قانونی لوٹ

نے جو اسی نوعیت کا تھا پھر اس کی یاد میرے دل میں موجزن کر دی ہے مختصر لفظوں میں یہ واقعہ تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں جب اس سے آگاہ ہو جاؤ گے تو تم میرے ذی حس ہونے کا مضحکہ اڑاؤ گے۔

"میں اپنی عمر کے اکیسویں سال میں تھا تو ٹاؤن بُرو کو جہاں میں نے جنم لیا تھا خیر باد کہا۔ اس گاؤں میں ایک لڑکی سے جو میری ہم عمر تھی میں نے شادی کے عہد و پیمان کئے تھے۔ اُف میں نے اس وعدہ کو پورا نہ کیا، اب میں نا کتخدا ہوں اور یہ ایک پرانی داستان ہو گئی ہے۔"

"ٹان برو کو الوداع کہتے وقت میرے دل میں خیال آیا کہ میں کس اچھوپن سے ایک بڑی الجھن سے نکل گیا ہوں۔ مگر بعد ازاں اس وعدہ شکنی کا خیال بہت دفعہ میرے دل کو ایک ٹھیس سی لگاتا رہا۔ میری ضمیر مجھے لعنت ملامت کرتی تھی کہ کیوں میں دیانت دار نہ رہا میرا دل ٹوٹ چکا تھا اور میں اپنے آپ گوشت کے مجسمے کے سوا اور کچھ نہ خیال کرتا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے صاف لفظوں میں وعدہ کیا اور بعد ازاں اس سے آنکھیں اس سرد مہری سے پھیریں جیسے یہ بھی اعلیٰ خصلت کا جزو ہوتا ہے۔ آہ! یہ کمینگی تھی جو میں کر گذرا۔ لڑکی نے ایک بچہ جنا اور اس کی پرورش کی زحمت میں مبتلا ہو گئی۔ میں اس کی مالی مدد کچھ عرصہ تک کرتا رہا۔ مگر اس نے وہ جگہ جلد چھوڑ دی۔ یہ سوز نہانی ہمیشہ میرے دل میں شعلہ زن رہتا ہے۔ کئی سال گذر گئے ہیں اور یہ واقعہ بہت پرانا ہو گیا ہے اب وہ بوڑھی عورت ہو گی۔ مگر پھر بھی یہ واقعہ دل کو کھائے جا رہا ہے۔"

بیڈن نے کہا: "میں سب کچھ سمجھتا ہوں اور ان تمام باتوں کا انحصار انسان کی فطرت اور خصلت پر ہے۔ ہزاروں شخصوں کو ایسے واقعات پیش آئے اور وہ بھول گئے۔ اگر تم بھی شادی کر لیتے اور بچوں کے باپ ہوتے تو یہ واقعہ تمہیں خواب کی طرح یاد رہتا۔ کیا اس نے شادی کی تھی؟"

"میرے خیال میں اس نے کسی سے شادی نہیں کی تھی اس نے ٹاؤن برو کو چھوڑ کر اکسن بری میں اپنا نام بدل کر جا رہی۔ وہاں اسے کوئی شخص نہ جانتا تھا کہ دو تین سال ہوئے کہ میں اکسن بری میں جا رہا تھا کہ مجھے پتہ چلا کہ اس نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے اور فن موسیقی کی معلمہ ہے۔ بس میں اس کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں۔ اس کشیدگی کے بعد میں نے کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور نہ ایسی کوشش کی۔"

"ڈاکٹر:۔ کیا وہ بچہ زندہ ہے؟"

"کچھ عرصہ ہوا وہ زندہ تھی۔ اس وقت وہ ایک معصوم لڑکی تھی۔ اس کے متعلق اب مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اب بیاہی گئی ہو گی۔"

"ڈاکٹر:۔ کیا اس کی والدہ خوبصورت شریف خاتون تھی؟"

"آہ، وہ خاموش طبع اور ذی ہوش عورت تھی۔ حسن و جمال میں وہ اوسط درجہ کی تھی جب وہ مجھ سے شناسا ہوئی اس وقت وہ میری حیثیت کی لڑکی نہ تھی۔ کسی گانے بجانے کی دکان میں وہ ملازم تھی۔ میرا باپ اس وقت باعزت وکیل تھا۔ اس سے شادی کرنا میری بے عزتی اور ہتک تھی۔"

"ڈاکٹر:۔ میری رائے میں بیس سال کے بعد اس معاملے کے سلجھانے کی کوشش کرنا بعد از وقت ہے۔ وقت کے ساتھ یہ خود بخود بہتر ہو چکا ہے۔ اگر وہ حیات ہیں تو ان کے لئے کچھ روپیہ وقف کر دو۔"

"میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ ان کے لئے کچھ وقف کر سکوں دوسرے میرے کئی رشتہ دار تنگ دست اور مفلوک الحال ہیں اور مالی مدد کے وہ زیادہ مستحق ہیں۔ اگر مجھ میں کثیر رقم وقف کرنے کا مقدور بھی ہوتا تو پھر بھی یہ معاملہ اس طرح طے نہ ہو سکتا۔ میں نے اس سے دولت سے مالا مال کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس کو کہا تھا کہ شاید ہم بالکل قلاش اور مفلس ہونگے مگر وہ بایں ہمہ میری رفیق حیات بنیگی۔"

ڈاکٹر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ "ملبورن! اسے ڈھونڈ کر شادی کر لو۔"

"آہ! بیڈن تم یہ میرا کھلا ہوا مضحکہ اڑا رہے ہو۔ مجھے شادی کی بالکل خواہش نہیں ہے۔ میں اسی طرح زندگی گزار دینے پر راضی ہوں۔ ابھی تک میں اپنے افعال اور خصائل میں کنوارا ہوں۔ باوجودیکہ میرے دل میں اس کی عزت باقی ہے۔ مگر میرا دل اس کی محبت سے معرا ہے۔ میری نظروں میں بغیر کسی دلفریبی کے وہ شریف خاتون کی حیثیت رکھتی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کے دکھ درد میں اس کا مونس و غمگسار بنوں کیونکہ یہ تمام میری ناعاقبت اندیشی کا انجام ہے۔ میں بہت عرصہ سے خیال کر رہا ہوں کہ اس نفرت انگیز لغزش کی تلافی کروں اور اپنی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کر لوں۔"

ڈاکٹر:۔ اس کار عظیم میں خوش قسمتی تمہاری پاسبان ہو عنقریب تم صحتیاب ہو کر ضمیر کی اس اندرونی تحریک کو آزمائش کی کسوٹی کے سپرد کر دو گے۔ بیس سال کا طویل عرصہ خاموشی میں گزر گیا ہے۔ اب تم اسے زیادہ اہمیت نہ دو میں تمہیں اس کے بھلا دینے کی تلقین کرونگا۔"

بلبورن اپنے ضمیر کی گونجتی ہوئی آواز کو جو کئی مہینوں سے اس کے دل میں موجزن تھی روحانی خیال کرتا تھا۔ وہ اس آواز کو کسی اصول پر محمول کرتا تھا۔ ہر وقت وہ ڈاکٹر کی نصیحت اور اندرونی دھڑکن کے سود و زیاں کے متعلق گہری فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ یہ جذبات اس پر جلدی اثر پذیر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اسے صحت ہوگئی۔ اپنے ضمیر کی آواز کو اس نے ہستی کے راز میں دے دینے کی دھن اسے مضمحل کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز اس پر قابو پا رہی تھی۔ وہ علالت کے پراگندہ خیالات نے جو اسے تنہائی میں عموماً پریشان کرتے رہتے تھے بالآخر اسے مغلوب کر لیا۔ بیماری کے چار مہینے بعد وہ موسم بہار کی خوشگوار صبح کو ایکسن بری کی طرف روانہ ہوگیا۔ روانگی سے ایک دو روز پیشتر اس نے ڈاکخانہ کی سرنامہ جات کی کتاب سے معلوم کیا کہ وہ عورت جس کو روپوش ہوئے بیس سال کا عرصہ گذر گیا ہے اپنا نام تبدیل کرکے ایکسن بری میں اقامت پذیر ہے اس نے وہاں بیوہ کی حیثیت میں رہائش اختیار کی ہے۔ اس کی ظاہری حالت میں ابھی تک خاص فرق نہیں آیا ہے۔ اس کی لڑکی بھی زندہ تھی اور اسی کے ساتھ رہتی تھی۔ ڈاکخانہ کے سرنامہ جات میں اس کا پتہ درج تھا ——— "مسز لیونورا فرنیک لینڈ اینڈ مس فرنیک لینڈ معلمان فن موسیقی، ایکسن بری۔"

بلبورن دوپہر کے وقت ایکسن بری پہونچا۔ شہر میں داخل ہوکر سب سے پہلے اس نے ان کا مکان دریافت کیا۔ مکان کے دروازے پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔ مگر تحقیق کئے بغیر مکان میں داخل ہونے سے گھبراتا تھا۔ سامنے کی کھلونوں کی دوکان پر وہ بیٹھ گیا جس کے عین مقابل ان کا رقص سکھانے کا کمرہ تھا اس اثنا میں اس نے ادھر ادھر کی باتیں سن سنا کر ان کے چال چلن کے متعلق دریافت کیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ مسز فرنیک لینڈ اور اس کی لڑکی کے متعلق لوگوں کے خیالات خوشگوار ہیں اور شہرت و نیک نامی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ باوجودیکہ مسز فرنیک لینڈ کا ذریعہ معاش رقص و سرود سے وابستہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ سنجیدہ عورت تھی خیراتی کاموں میں وہ مدد کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ مذہبی جلسوں میں گانے بجانے کا پارٹ وہ بخوشی ادا کرتی۔ غرض شہر کی مذہبی، قومی اور دیگر قسم کی مجالس میں وہ ضرور شرکت کرتی۔ اس کی لڑکی شہر کی گانے بجانے والی عورتوں کے گروہ کی سرغنہ تھی۔ کرسمس اور ایسٹر کے موقع پر وہ کلیساؤں کی اپنے سریلے گیتوں سے رونق بڑھاتی اور آلات موسیقی کے استعمال میں ماہر ہونے کا ثبوت دیتی۔ دونوں شہر میں نیک نام مشہور تھیں۔

اپنے پیشے کا پروپگنڈا بڑے سادے طریقے سے کرتی تھیں۔ جس کمرہ میں لڑکیوں کو گانے بجانے کے متعلق سبق دیئے جاتے تھے اور عملی طور پر گانے کی مشق کرائی جاتی تھی اس کی کھڑکی قصداً کھلی رکھی جاتی تھی تاکہ گذرنے والے راہگیر ان کے گیتوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ مسز فرنیک لینڈ پیانو بھی کرایہ پر دیا کرتی تھی اور وہ اس کمپنی کی ایجنٹ تھی۔ اس کی آمدنی کا زیادہ انحصار انہیں دو باتوں پر تھا۔

ان حالات کا انکشاف بلبورن کے لئے بہت مسرت انگیز تھا۔ ان کی حالت اس کی امید اور توقع سے بدرجہا بہتر تھی۔ ان کو دیکھنے کا اسے بہت زیادہ اشتیاق تھا۔ انتظار کی صبر آزما گھڑیاں اسے زیادہ نہ کاٹنی پڑیں۔ یکایک مسز فرنیک لینڈ چھتری لئے نمودار ہوئی اور دروازے پر آکر رک گئی۔ اس کا جسم تپلا تھا۔ مگر وہ کمزور اور نحیف نہ تھی۔ اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ جس نے صغر سنی میں مجھے مسحور کر رکھا تھا آج بالکل تبدیل ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ اور فکر کے آثار ہویدا تھے۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئی تھی جو شاید بیوگی کی علامت تھی۔ بعد ازاں اس کی لڑکی بھی ادھر آنکلی جو بالکل اپنی والدہ سے ملتی جلتی تھی۔

اس کے دل میں ملاقات کرنے کا مصمم ارادہ جاگزیں ہوگیا۔ اگلے دن اس نے اپنا ملاقاتی کارڈ بھیجا۔ چونکہ وہ دن بھر مصروف رہتی تھی اس لئے اس نے ملاقات کے لئے شام کا وقت مقرر کیا۔ شام کے وقت وہ ان کے مکان پر جا پہونچا۔ مسز فرنیک لینڈ نے اس کو گانے بجانے کے بڑے کمرے میں بٹھایا اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد ان کی ملاقات تکلفات مروجہ سے رنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ آہ وہ مظلوم عورت عمدہ لباس پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے رعب اور دبدبہ اور سخت مزاجی ٹپکتی تھی۔ یہ ملاقات خوشی کی جھلک سے بالکل خالی معلوم ہوتی تھی۔ بیس سال کی خاموشی کے بعد بے اعتنائی اور بے التفاتی کے سوائے اسے اور کیا امید ہو سکتی تھی۔

"مسٹر بلبورن کیا حال ہے، ادھر کیسے نکل آئے؟" یہ اس کی رسمی گفتگو کا پہلا فقرہ تھا۔ "افسوس میں تمہیں ملاقات کے کمرے میں نہیں لیجا سکتی کیونکہ وہاں میری فرانسس اور اس کا دوست پیار و محبت کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"آہ تمہاری لڑکی ——— اور میری۔"

ہاں ہاں کہتے ہوئے اس نے تیزی سے کہا کہ "اس کے متعلق تم چنتی

تگو کم کروگے اتنا ہی بہتر ہے۔ اب تم مجھے بیوہ تصور کرو۔"

ملبورن:۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

مسز فرینک لینڈ کے انداز تکلم میں اس قدر روکھے پن اور بے التفاتی کی ملک پائی جاتی تھی کہ وہ جھجک کر رہ گیا۔ طعن وتشنیع اور گلہ کا پرحسرت منظر جو دست تخیل نے کئی بار اس کے سامنے پیش کیا تھا دنیائے حقیقت میں غایب تھا اس لئے وہ جھٹ اپنے مدعا کی طرف پھرا اور کہا۔ "لیونورا! کیا تم بالکل آزاد ہو؟ میرا مطلب شادی اور وعدہ . . . . "

مسز فرینک لینڈ:۔ ہاں، بالکل آزاد ہوں۔" مگر حیرانی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ پھر وہ حرف مطلب زبان پر لایا۔ "بیس سال ہوئے میں نے تم سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اب ایفائے وعدہ کے لئے حاضر ہوا ہوں، آہ! . . . . . لاپروائی . . "

یہ گفتگو اس کی مزید حیرت کا باعث ہوئی۔ بہت افسوسناک لہجہ میں اس نے اپنی ناراضگی ظاہر کی اور کہا اب میں زندگی کے آخری مراحل طے کر رہی ہوں اس عمر میں میرا ایسے سوال پر غور کرنا نہایت نامناسب ہے اس سے میرے حالات بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔ موجودہ آمدنی میں میری ضروریات بآسانی نپٹ جاتی ہیں اور مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے شادی میرے لئے بالکل عبث اور بے حقیقت ہے۔ کیا چیز تمہیں اس طرف راغب کر رہی ہے؟"

"آہ! ضمیر کی آواز مجھے کوستی ہے۔ نفسانی خواہشات کو اس سے کوئی سروکار نہیں اور مجھے شادی کی خواہش نہیں ہے۔ یہ ضمیر کی صدا اور ایفائے وعدہ کا معاملہ ہے۔ یہ اندرونی دھڑکن مجھے جنون کی حد تک لے گئی ہے۔ تم سے وعدہ کیا اور اس سے منحرف ہوا۔ افسوس یہ شرمناک فعل مجھ سے سرزد ہوا تھا اس کی تلافی کرنا میرا فرض ہے۔"

"مسٹر ملبورن تمہارا خیال قابل تعریف ہے۔ مگر میری موجودہ حالت بھی ذرا نظر غائر کی محتاج ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ مجھ میں شادی کا شوق بالکل مٹ چکا ہے اس لئے میں اپنی زندگی کی پرسکون طرز معاشرت کو نئے سانچے میں کیونکر ڈھالوں اس تغیر میں تمہارے ضمیر کے لئے راحت ہے مگر اس میں میرے لئے بہت بڑا انقلاب ہے۔ میں اس شہر کے باعزت لوگوں میں شمار ہوتی ہوں اور اس عزت کو میں نے بڑی جانفشانی اور تندہی سے حاصل کیا ہے اس لئے یہ تبدیلی میرے لئے بہت ناخوشگوار ہوگی۔ میری پیاری فرانسس ایسے نوجوان سے رسم و راہ پیدا کر رہی ہے جو عنقریب بہت اچھا خاوند ہوگا۔ مجھے اس کی فکر بھی دامنگیر ہے"

ملبورن:۔ کیا وہ میرے متعلق کچھ جانتی ہے؟"

"خدا بچائے، نہیں، بالکل نہیں، اس کے خیال میں اس کا باپ مدت مدید سے سپرد خاک ہو چکا ہے۔"

مایوسی کے عالم میں وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ دروازے پر پہونچکر وہ ٹھہر گیا اور کہا۔ "میری آرزو جائز ہے اس کے پورا کرنے سے کوئی غیر معمولی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ کیا تم اس پر دوبارہ غور نہیں کروگی؟ آؤ آؤ! اس لڑکی کی یاد میں ہم اپنے پرانے تعلقات کو از سر نو تازہ کر لیں۔"

ملبورن نے اکثر اوقات اس سے ملاقات کی اور ہر دفعہ اس پر اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ مسز فرینک لینڈ نے اپنے پرانے دوست کا پیغام اپنی لڑکی کے بھی گوش گذار کیا۔ اس نے بڑی نفرت سے اس کی مخالفت کی۔ مس فرینک لینڈ اپنی پہلی ملاقات میں اسے بڑی بے مروتی سے پیش آئی۔ اس کو کامیابی دشوار نظر آنے لگی اس پر مایوسی اور سراسیگی چھا رہی تھی مسز فرینک لینڈ اپنی ہٹ کی پکی اور پوری معلوم ہوتی تھیں اپنے خیال پر وہ بدستور قائم تھی۔ اس نے کہا کہ اتنے عرصہ کے بعد شادی کی درخواست اور صرف ضمیر کی خاطر بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہے ایسی حیلہ سازی سے کام نہیں چلیگا۔"

ایک روز وہ کھڑکی میں کھڑے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک نوجوان جو وضع قطع سے محرر معلوم ہوتا تھا وارد ہوا۔ یہ فرانسس کا دوست تھا۔ مسز فرینک لینڈ نے کہا وہ گھر پر نہیں ہے اس سے اس کا پتہ پوچھ کر وہ اس کی تلاش میں چلدیا۔ مسز فرینک لینڈ نے بتایا کہ یہ نائٹ بری ہے اور یہاں سے پچاس میل کے فاصلہ پر رہتا ہے۔ فرانسس اور اس کے تعلقات مثل سابق پرجوش نہیں رہے۔ اس کے چند دوستوں نے ہمارے پیشہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے گو یہ ان کی پرواہ نہیں کرتا مگر اب اس پر کچھ اثر ہو رہا ہے۔" ملبورن نے کہا۔ "ہماری شادی اس دقت کو رفع کر دیگی۔ کیونکہ شادی کے بعد تم اس پیشہ کو ترک کر دوگی۔"

اس دلیل نے اس پر اثر کیا۔ یہ تجویز مس فرینک لینڈ کے کانوں تک بھی پہونچی اور اس نے بھی اس کے ساتھ اتفاق کیا۔ کچھ مدت کے بعد قریب کے گرجا میں دونوں کی شادی ہوگئی۔ اور وہ لندن میں رہنے لگے۔

ملبورن نے دوبارہ لندن میں رہائش اختیار کرلی۔ اس دفعہ اس کا مکان کسی اور کوچے میں تھا۔ فرانسس کا منگیتر مسٹر پرسیول کوپ بھی اس تبدیلی پر بہت خوش تھا۔ کاروبار کے لئے وہ لندن میں بہت دفعہ آتا اور ان سے ملنے ضرور آتا۔ لندن کی نئی بود و باش کی خوشی دیر تک نہ رہی کیونکہ ایکسن بری ایسی چھوٹی جگہ بہت مشہور تھی مگر لندن میں وہ بالکل نووارد تھیں اور اتنے بڑے پررونق شہر میں مقبول عام ہونا بہت مشکل تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے ایام زندگی بہت بے لطف ہو رہے تھے لندن میں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہوا ہوگا جبکہ تمام خاندان ہفتہ عشرہ کے لئے جزیرہ وائٹ میں سیر و تفریح کے لئے چلا گیا۔ پرسیول کوپ بھی وہاں پہونچا۔ اس کا خاندان کے نئے فرد سے یعنی ملبورن سے تعارف کرایا گیا۔ ان کے پاس وہ دو تین دن کے لئے ٹھہرا۔ آخری دن جبکہ اسے ان لوگوں سے رخصت ہونا تھا وہ کرایہ کے بجرا پر سیر کے لئے نکلے۔ ابھی دور نہیں گئے تھے کہ مسٹر کوپ کے سوائے سب کو ٹھنڈی ہوا ناموافق معلوم ہونے لگی۔ اس کی خاطر ملحوظ رکھتے ہوئے وہ تمام خاموش بیٹھے رہے۔ ان کو بیکل سا دیکھ کر اس نے خود بخود واپس ہونے کے لئے راستہ تبدیل کیا۔ واپسی کے وقت وہ بالکل چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے اور بجرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فرانسس، ملبورن کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اور مسٹر کوپ اس کے بالمقابل بیٹھا ہوا تھا۔ اس حالت میں اس کو ان کے درمیان مشابہت کی گہری جھلک نظر آئی جس سے وہ حیرت کے عالم میں غرق ہوگیا۔ مسکراہٹ اور بشاشت اس کے چہرے سے غایب ہوگئی ساحل پر پہونچکر وہ چند لمحوں تک بے خود و وارفتہ ہوکر بیٹھا رہا جب وہ گھر کو روانہ ہوئے تو ان کے خط و خال اپنی اصلی حالت پر آگئے اور مشابہت بالکل دور ہوگئی۔ بحری خوف و ڈر کا اثر چہرہ پر بہت زیادہ ہوتا ہے اور عام طور پر نقش و نگار کی خاندانی مشابہت جو آنکھ کو ظاہرا دکھائی نہیں دیتی ایسے وقتوں پر نمایاں طور سے نظر آنے لگتی ہے۔ اور اس لمحہ کے گذر جانے کے بعد انسان اپنی اصلی حالت اختیار کرلیتا ہے۔ انسان کی ظاہری حالت تبدیل کرنے میں عمر اور صنف کا بہت زیادہ دخل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سیر کے دوران میں درمیانی پردۂ راز نہاں کو آشکارا کرنے کے لئے اٹھ گیا اور عارضی طور پر ان کی حقیقی مشابہت کو ظاہر کر دکھایا۔ شام کے وقت مسٹر کوپ نے کہا۔

"فرانسس کیا تمہارا سوتیلا باپ تمہاری امی کا ممیرا یا چچیرا بھائی ہے؟"

فرانسس:۔ وہ میری اماں سے سوائے پرانا دوست ہونے کے اور کوئی رشتہ نہیں رکھتا۔ تمہارے دماغ میں ایسے وہمات کیوں جاگزیں ہوئے ہیں"؟ وہ [illegible] بالکل خاموش رہا اگلے دن وہ ان سے رخصت ہوگیا۔

مسٹر کوپ راستباز نوجوان تھا۔ گھر پہونچکر وہ مسز فرنیک لینڈ کی گذشتہ زندگی کی سوچ میں پڑ گیا۔ کبھی خلوت اور خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا بحری سیر کے متعلق محو تخیل رہتا اور ان کے نقش و نگار کی مشابہت پر دماغ سوزی کرتا۔ وہ سوچتا تھا کہ مسز فرنیک لینڈ کے گذشتہ حالات پر اسرار ہیں اور میں صرف مس فرانسس کی ظاہری شکل و صورت پر فریفتہ ہوگیا ہوں۔ مزید حالات دریافت کئے بغیر شادی کرنا سراسر نادانی ہے۔ ایک طرف فرانسس کا خیال دامنگیر تھا اور دوسری طرف اپنی عزت اور نیکنامی کا سوال تھا۔ آخر کئی دن کی سوچ بچار کے بعد اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے فرانسس سے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا۔

مس فرانسس نے اس سوال کا ذکر اپنی والدہ کیا۔ مسز فرنیک لینڈ پر اس بات کا گہرا اثر ہوا جو اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ فرانسس نے کہا میرے خیال میں اس میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے۔ کیا اس نے خط و کتابت کا سلسلہ اسی لئے منقطع کرلیا ہے۔ اس کی والدہ کچھ مشوش سی ہوکر سہم گئی۔ جس سے فرانسس شک و شبہ کے عالم میں پڑ گئی۔ اسی رات اس نے اپنے والدین کو کھٹا پٹی اور بدمزگی کی گفتگو کرتے سنا افسوس ان کی باہمی الفت اور امن و امان کے دن ختم ہوگئے تھے اور شکر رنجی اور جھگڑے پھوٹ پڑے تھے۔

مسز ملبورن خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور کہتی تھی۔ "آہ تم۔ نے دوبارہ میری زندگی کو تلخ کردیا۔ تم نے ضمیر کی آواز سے مجھے یہاں تک حیران کردیا کہ مجھے تمہاری درخواست باصرار کو منظور کرتے بنی۔ ایکسن بری میں ہم دونوں آرام و راحت کے ایام بسر کر رہے تھے۔ میری صرف یہی آرزو تھی کہ مس فرانسس اس خوبصورت نوجوان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوجائے افسوس تمہاری بے جا مداخلت سے تمام معاملہ نے دگرگوں صورت اختیار کرلی ہے۔ آہ! تم کیوں میری امن و سکون کی دنیا میں رخنہ انداز ہوئے اور میری سخت محنت سے حاصل کی ہوئی عزت کو خاک میں ملا دیا۔" اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور رقت انگیز لہجہ میں رونے لگی۔ ملبورن پشیمانی کی حالت میں

تصویر کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

علی الصبح مسز ملبورن اپنی لڑکی کی حسب خواہش مسٹر کوپ کے پاس گئی، فرانسس بہت متفکر تھی اور والدہ کا انتظار بڑی بیقراری سے کر رہی تھی گاڑی سے اترتے ہی اس نے خاموشی کی وجہ دریافت کی۔ مسز ملبورن صحیح وجہ بتانے سے گھبراتی تھی گر طنزاً سمجھا دیا کہ مسٹر کوپ کی کشیدگی کی وجہ اس کی ملبورن سے شادی کرنا ہے۔ فرانسس نے تمام حالات کو سوچا اور سمجھا پھر والدہ سے کہا کہ کیا اس کا شک درست ہے؟ اس نے خجالت اور شرمندگی سے نگاہ نیچی کر لی اور کہا۔ "ہاں درست ہے!"

اس کے جسم پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ صحیح النسب پادری مجھ سے شادی کرتا جبکہ میری پیدائش ہی مشتبہ ہے اس نے حیرت اور افسردگی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر اپنے غمگین جذبات پر قابو نہ پا سکی دفعتاً اس کی چشم رعنا سے سیلاب اشک جاری ہو گیا۔ مسٹر ملبورن کے سامنے وہ خاموش رہی مگر جب وہ کرسی پر اونگھنے لگا تو مسز ملبورن نے غیظ و غضب سے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ مسز فرانسس کہتی تھی کہ یہ بھوت پریت کی طرح ہماری شادی کی تقریب میں وارد ہوا ہے اور ہمارے تمام ارادوں کو یاس و حسرت میں بدل دیا ہے۔ آہ! میری بچی، یہ سب کچھ میں نے اس کی ضمیر کی خاطر کیا۔ اس میں ہماری تباہی اور بربادی مضمر تھی۔ ایکسن بڑی کو جہاں ہم باعزت زندگی بسر کر رہی تھیں خیرباد کہی۔ اُف! ان دنوں کی یاد اجالے کے بعد تاریکی ضروری ہے۔ ہماری زندگیاں شمع کی طرح بھبک کر گل ہو رہی ہیں

ملبورن غفلت کی نیند نہیں سو رہا تھا۔ اس سرزنش اور نکتہ چینی کو بخوبی سن رہا تھا مگر اس نے اف تک نہ کی اس نے کلب میں جانا شروع کر دیا۔ گھر کے رنج آمیز خیالات بھوت کے سائے کی طرح اسے ہر جگہ گھیرے ہوئے تھے اور اسے کہیں چین نہ لینے دیتے تھے اب اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ کلب میں بھی یکسوئی قلب سے اخبار نہ پڑھ سکتا تھا۔

مسٹر کوپ بدستور ان سے کنارہ کش تھا۔ گو ملبورن نے اپنی لڑکی اور عورت کی طنز آمیز گفتگو بڑی خاموشی سے برداشت کی مگر وہ غور و فکر میں نسبتاً زیادہ مستغرق رہنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نیا خیال اس کے دماغ میں نشو و نما پا رہا ہے۔ ان کی چیخ و پکار سے تنگ آ کر اس نے لندن کو چھوڑ دینے

کا ارادہ کرلیا۔ ایک روز اس نے اپنا خیال ان پر ظاہر کیا اور وہ رضامند ہوگئے
اس نے ایک پرانا گھر جو مسٹر کوپ کی جائے رہائش سے ایک میل کے فاصلہ پر
تھا کرایہ پر لے لیا۔ پرانے وقتوں میں یہ مکان کسی لارڈ کی ملکیت تھی اس لئے
یہ مکان بہت خوشگوار اور فراخ تھا۔ مسز ملبورن نے کہا۔ کسی دن مسٹر کوپ
تم سے میرے گذشتہ واقعات کے متعلق استفسار کریگا۔ اگر تم نے اس کو
صاف صاف کہہ سنایا تو یہ فرانسس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملادیگا۔
اس لئے میں تم کو اس امر سے آگاہ کرتی ہوں۔"

مس فرانسس دن بدن رنج وغم سے کمزور اور لاغر ہوتی جاتی تھی۔ اور
ملبورن سے بہت ملتی جلتی دکھائی دیتی تھی۔ آہ! لوگوں میں چہ میگوئیاں
ہونگی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔۔

ملبورن نے اس پر زیادہ بحث نہ کی اور کہا اب سے ہمیں کوئی اکٹھا نہیں
دیکھیگا۔ نقل مکان ازبس ضروری ہے اس نے بیوی اور لڑکی کو ایک ہوٹل
میں بھیجدیا اور اپنے گھر کو فروخت کردیا۔ گھر کے سامان کو نئے مکان میں منتقل
کردیا۔ جب حاطر خواہ انتظام ہوگیا تو وہ ان کو سٹیشن تک رخصت کرنے گیا
اور خود کسی کام کا بہانہ کرکے واپس لوٹ آیا۔

نیا مکان درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ جس کو انھوں نے بہت پسند
کیا۔ مسٹر کوپ سب سے پہلا شخص تھا جو انھیں وہاں ملنے آیا مگر اس کی
ملاقات پہلے جیسی نہ تھی۔ وہ کسی اور حیثیت سے ملتا تھا۔ یہاں آئے ہوئے انہیں
دو تین دن گذرے ہونگے جب انھیں ایک خط موصول ہوا یہ خط مسٹر ملبورن
کا تھا جس میں لکھا تھا کہ اس نے ایک کثیر رقم ان کے نام جمع کرادی ہے اب
وہ اس رقم کی مالک ہے۔ اور زندگی بھر کے لئے مس فرانسس اس کے سود کی
جائز وارث ہے۔ اس کی وفات پر اصل رقم اس کے بال بچوں میں تقسیم

ہوجائے۔ اخیر میں خط ان سطور کے ساتھ بند کیا گیا تھا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرض کی کوتاہی سے کئی ایسی لغزشیں ہوجاتی ہیں
بعد ازاں جن کی تکمیل اس دھبے کو نہیں مٹا سکتی۔ ہمارے گذرے ہوئے
برے اعمال تغیر وتبدل کے انتظار میں بالکل ساکن اور الگ تھلگ نہیں رہتے
بلکہ وہ متحرک پودے کی طرح پھیلتے ہیں اور اپنی جڑیں زمین میں اس طرح گاڑ
دیتے ہیں کہ ان پر اصلی پودے کے کاٹ ڈالنے کا کوئی برا اثر نہیں ہوتا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو ڈھونڈھنے میں میری غلطی تھی۔ ایسے معاملات
کو سلجھانے میں شادی کوئی چارہ نہیں ہے۔ ابدی مفارقت ہم دونوں کیلئے
بہترین حیلہ ہے۔ تم مجھے ڈھونڈھنے کی ناکام کوشش مت کرنا۔ میرے خیال میں
ہمارا وصال زیادہ فتنہ انگیز ہوگا۔

اس کے بعد ملبورن روپوش ہوگیا۔ نام تبدیل کرکے اس نے برسلز میں
رہائش اختیار کرلی اور اب مسز ملبورن کے سوا اور کوئی پہچان نہیں سکتا تھا،
موسم گرما کی دوپہر کو وہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ مسٹر کوپ اور مس فرانسس کی شادی
کا اعلان اس کی نظر سے گذرا اب وہ مسز کوپ ہو چکی تھی۔ یہ پڑھکر اسے بہت
خوشی ہوئی اور خدا کا شکر بجا لایا۔ یہ عارضی تسکین قلب اصلی خوشی سے بہت
دور تھی اس سے پیشتر اس کے ضمیر کی آواز اسے بیچین کرتی تھی مگر اب وہ ہمیشہ
کے لئے اپنے روشناسوں سے کنارہ کش ہوگیا ہے۔ یہ خیال اس پر منوں بوجھ
ڈال رہا تھا۔ اپنی پھوٹی قسمت پر کڑھتا تھا۔ غم واندوہ سے آزاد ہونے کیلئے وہ
شراب کا عادی ہوگیا۔ شراب کے نشہ میں ہر وقت مخمور رہتا مگر اس حالت میں بھی
وہ اپنی بیوی اور لڑکی کے لئے بے ضرر تھا۔ کیونکہ اس کی زبان پچھلے واقعات پر
بالکل بند تھی۔

(ترجمہ۔ تھامس ہارڈی از عبدالوہاب خاں صاحب بی۔ ایس۔ سی)

عالمگیر بکڈپو کی چند قابل دید کتابیں!

کھرپا بہادر

مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار۔ نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مزاحیہ طرز بیان کے ساتھ لنکران اعظم کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں سے ہولناک و قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی و دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے۔ کھرپا بہادر کو پڑھ کر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائینگے بہترین لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کا رنگین سرورق قیمت عہ محصول ۵ر

خطوط کی ستم ظریفی

مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ہنسانے والی نئی کتاب۔ چغتائی صاحب کی مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر۔ بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ فوراً طلب فرمایئے قیمت ۱۲ ر

کتاب التقدیر

علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ آپ نے تقدیر کے مسئلے پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی تھی۔ جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب مرحوم نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب تقضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوگئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا۔ اب ہمارے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں۔ اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپے ہے — مگر ناظرین عالمگیر کو یہ قابل دید کتاب صرف عہر علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔ کتاب کا حجم پونے آٹھ سو صفحات ہے۔

شادی

آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے تمسخنی حالات خود ملا صاحب کے فاونٹن پن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھایئے۔ حجم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے عہ

صبح لطافت

ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابل دید مجموعہ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں۔ پڑھتے جائیے اور ہنستے جائیے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف دو روپے عاہ

(نوٹ) ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔

علامہ جرجی زیدان مصری کے دو بہترین تاریخی ناول

موتیوں کا درخت ۱۲ر | محبوبۂ قیروان ۱۲ر

حجم ۳۰۰ صفحات | حجم ۲۷۵ صفحات

دفتر عالمگیر کی طرف سے بصرف زر کثیر ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں پہلی مرتبہ شائع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ کتاب کی دلچسپی کے لئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے آج سب سے پہلی فرصت میں طلب فرمایئے!

ملنے کا پتہ

"عالمگیر بکڈپو" بازار سید مٹھا لاہور

Alamgir Book Depote
Bazar Said Mitha
Lahore

جذباتِ فضا

جناب سید دل محمد صاحب فضا جالندھری

ہوش حاصل ہے نہ منزل کی طلب — عشق میں اک راز ہے دل کی طلب
غرق ہو کر بھی ہے ساحل کی طلب — دیکھیے گم کردہ منزل کی طلب
جان دے کر کشتگانِ ناز کو — پھر بھی ہے شمشیرِ قاتل کی طلب
بیخودیٔ دل کا عالم دیکھیے — ہے لبِ ساحل بھی ساحل کی طلب
ان کے جلوے سے یہ رشکِ طور ہے — دیکھیے پُر آرزو دل کی طلب
پھر بھڑک اٹھی ہے پروانوں کی خاک — پھر انھیں ہے شمعِ محفل کی طلب
گوشۂ دل کی طرف بھی اک نظر — تا کجا اے قیس محمل کی طلب
اس فضا میں اے دلِ بیتاب ہوں — مٹ چکی ہے دل سے منزل کی طلب
وہ نگاہِ شوخ اشک آلود ہے — دیکھتا تو کوئی منزل کی طلب
خاک ہو کر بھی وفائے عشق میں — ہے وہی حسرت وہی دل کی طلب
آہ کیوں بیگانۂ تاثیر ہے — ٹھوکریں کھاتی ہے کیوں دل کی طلب
اور گم کرتا ہے جوشِ آرزو — جس قدر بڑھتی ہے منزل کی طلب
غرق ہو یہ کاش بحرِ عشق میں — کشتیٔ دل کو ہے ساحل کی طلب
حسن کی فطرت سراپا ناز ہے — کیا کرے پھر کوئی حاصل کی طلب
ہے مآلِ غم ہی تمہیدِ سکوں — اے فضا کیا عشق میں دل کی طلب

ہارون الرشید اور شارلیمان

کیا ان میں باہمی تعلق تھا؟

مترجمہ مولانا عبدالحلیم صاحب ناظم دربھنگوی (مولوی فاضل)

(ذیل کا مضمون ایک مصری فاضل کا ہے جس کا پورا ترجمہ بلا تصرّف صرف اس غرض سے شایع کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان کے فاضل مورخین اس بحث پر قلم اٹھائیں اور اگر ان دونوں بادشاہوں کے درمیان واقعی کوئی تعلق ہے تو مدلل طور پر ثابت کریں ورنہ بصورت دیگر اس شاندار گھڑی کا واقعہ بھی جو ہماری زبانوں پر جاری ہے صرف افسانہ ہوا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے اپنے مقالات میں ان دونوں بادشاہوں کے تعلق اور اس مشہور گھڑی کے واقعہ کو مشکوک قرار دیا ہے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ سے ذوق رکھنے والے اصحاب اس جدید بحث پر عالمگیر کے صفحات میں ضرور روشنی ڈالیں گے۔ مترجم)

تاریخ کے پڑھنے والوں کے نزدیک بلکہ بعض تاریخی کتابوں میں عام طور پر مشہور ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور شہنشاہ فرانس شارلیمان میں سیاسی روابط و تعلقات تھے۔ بلکہ ان میں باہم اتنا اتحاد تھا کہ ایک دوسرے کو پیامات محبت اور ہدایائے الفت بھی بھیجتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے شاہ شارلیمان کو کنیستہ القیامہ کی کنجیاں بھی سپرد کر دی تھیں اور اس کو بیت المقدس کی حفاظت کی اجازت بھی دے دی تھی۔ چنانچہ اسی رشیدی استحقاق کی وجہ سے شارلیمان نے اپنا لقب "حامی الاراضی المقدسہ" رکھ لیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ اور بھی مختلف مزعومات ہیں جنہیں ان دونوں بادشاہوں میں تعلقات ثابت کرنے والے پیش کرتے ہیں۔

میں نے اس شہرت بے اصل کیلئے عربی زبان کی مرکزی تاریخیں طبری ابن الاثیر، ابوالفدا، ابن خلدون، ابن خلکان، مسعودی اور سیوطی کی بغور و خوض ورق گردانی کی، لیکن مجھے ہارون اور شارلیمان میں کسی تعلق کا کوئی تذکرہ نہیں ملا۔ اسی تتبع و تلاش میں اس کا ذکر صرف بعض متاخرین کی کتابوں میں میری نظر سے گذرا جسے ان لوگوں نے غالباً یورپین تاریخوں سے نقل کیا ہے۔ پھر میں نے لاطینی تاریخوں کا مطالعہ شروع کیا بالخصوص علامہ کلینکلوز (Klien clausae) کی تاریخی بحثیں میں نے بغور پڑھیں جنہیں علامہ موصوف نے دو معتبر لاطینی تاریخوں یعنی (Lauia de اور Annal Rayal) Charle mag ne پر اعتماد کرتے ہوئے مرتب کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید اور شارلیمین میں کسی قسم کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ تعلقات جو عالم اسلام کے اتنے بڑے خلیفہ کے ساتھ شارلیمین کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں بالکل خرافات ہیں۔ جنہیں سن عیسوی کی متوسط صدیوں کے راہبوں اور مورخین نے صرف شارلیمان کی عظمت شان دکھلانے کیلئے خود گڑھ لیا ہے۔ علامہ موصوف نے اپنے اس دعویٰ کو متعدد قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

ان میں ایک دلیل تو یہی ہے کہ "دو متذکرالصدر لاطینی تاریخیں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتیں اور درحقیقت بعض علمی طبقہ میں بھی دونوں بادشاہوں کے تعلقات کا تذکرہ ان دونوں لاطینی کتابوں کو اچھی طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے پھیل گیا ہے لاطینی کتاب (Ka ?ia de charlemagne)

نے شارلیمین اور بطریرک القدس کے درمیان نو مرتبہ تحائف کے ارسال کا تذکرہ کیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ہارون الرشید اور شارلیمین میں بھی اس قسم کے تعلقات تھے۔"

میں نے سطور بالا معاینہ کرنے کے بعد قرون وسطیٰ کی تاریخ الٹنی شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس دور کے پچھلے مورخین نے بطریرک القدس اور شارلیمین والی تاریخی حقیقت پر ہوائی قلعے تیار کرلئے اور ہارون الرشید کے تعلقات کی داستانیں اختراع کر لیں۔

سب سے پہلے جس نے ہارون اور شارلیمین کے تعلقات کا ذکر کیا ہے وہ مقدس گول (St. Gaul) ہے۔ اس شخص نے ان دونوں شاہوں کے درمیان ہاتھی، شیر اور دوسری قسم کے مشرقی ہدایا کے تبادلے کا قصہ گھڑا۔ اور وہ بھی اس زعم فاسد کی بنیاد سنہ ۹۲۵ء میں یعنی شارلیمان کی موت کے ایک سو گیارہ سال بعد رکھی گئی۔ طرہ یہ کہ اس خیال کا ماخذ کتاب "حیات شارلیمین" (La vie de Charlemagne) مصنفہ اگنہارڈ کو قرار دیا ہے۔ پھر طرفہ بر طرہ یہ کہ شارلیمین کو "حامی الاراضی المقدسہ" یعنی تمام مقدس زمینوں کا محافظ بھی بنا دیا ہے۔ ایک محقق کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں کہ مقدس گول نے اگنہارڈ کی تحریر کا مطلب نہیں سمجھا۔ یا دانستہ اس کی طرف ایک ایسے خیال کی نسبت کر دی جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مقدس گول کے بعد پادری رسنو نے ایک کتاب لکھی جس میں گول کے مزعومات کو ذکر کرتے ہوئے ایک قصہ اور اپنی طرف سے بڑھا دیا وہ یہ کہ "کسی مشرقی امیر کبیر نے یورپ کی طرف توجہ کرتے ہوئے صلیب مقدس کے کچھ ٹکڑے اور اس مبارک پیالے کے ٹکڑے جس میں حضرت مسیح نے پانی پیا تھا بطور ہدیہ شارلیمین کو بھیجے۔ یہ اس وجہ سے کہ شارلیمین اراضی مقدسہ کا محافظ تھا، لیکن شارلیمین کے جائے سکونت تک پہونچنے کے قبل ہی قاصد جزیرہ کریت میں مر گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا آدمی جو پہلے قاصد کے ساتھ تھا ان مقدس ٹکڑوں کو شارلیمین کے پاس لایا۔"

اس قصہ سے پادری رسنو کا مقصد صرف اپنے گرجا کو مشہور کرنا تھا، جس میں بقول ان کے وہ مقدس ٹکڑے اس وقت تک (تا دم تحریر کتاب) موجود تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ عجیب و مضحکہ خیز بات تو پادری بونے سنہ ۹۶۸ء میں تحریر کی۔ انھوں نے یوں افسانہ نگاری شروع کی کہ "شارلیمین نے قبر مقدس کی زیارت کی اور ہارون الرشید کو اراضی مقدسہ ہبہ کرتے ہوئے وہاں کا محافظ بھی اسی کو بنا دیا۔" تعجب تو یہ ہے کہ ان اختراعی قصوں پر دو صدیاں بھی نہ گذری تھیں کہ یہ تاریخی حقائق بن گئیں جن پر کسی شک کا غبار بھی نہیں پڑ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں بادشاہوں کے تعلقات کے سلسلہ میں قرون وسطیٰ کے برخود غلط مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر قارئین حیران و متعجب ہو جائینگے کیونکہ یہ لوگ اس اختراعی تاریخ نگاری میں کچھ اس طرح پریشان و خبط ہیں کہ ایک تاریخ کا محقق ان کی حالت دیکھکر ششدر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ملاحظہ کریں کہ سیبیون نے سنہ ۱۶۳۹ء میں یہ عبارت لکھی "عجم کے شہنشاہ ہارون الرشید نے اراضی مقدسہ شارلیمین اعظم کو دیدیئے تھے۔" پھر دوسرے مورخ مزری نے سنہ ۱۶۷۹ء میں [illegible] کی دوستی ہارون الرشید سے اتنی بڑھ گئی تھی کہ شارلیمین نے ہارون کو اراضی مقدسہ دیدیئے۔" اس کے بعد ایک اور مورخ بربریق نے مزری کی تائید کرتے ہوئے اتنا اور بڑھا دیا کہ شارلیمین نے ہارون کو اراضی مقدسہ دیکر ان سے اپنی حفاظت کا بالکل قطع تعلق کر لیا۔

قارئین ان پریشان و متضاد اقوال سے ضرور اندازہ لگا رہے ہونگے کہ اس وقت کے مورخین صرف ایک دوسرے کے لکھے ہوئے پر بلا تحقیق اعتماد کر لیتے تھے اور پھر اس پر اپنی طرف سے بھی کچھ بڑھا دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ قدیم و جدید اکثر تاریخیں اس قسم کے خرافات سے لبریز ہیں۔ جن کو صحیح تاریخ کے دامن سے تحقیقی و علمی طور پر پاک کرنا از بس ضروری ہے۔

علامہ بربہائر (Brehier) نے علامہ کلینکلوز (Kleinclausz) کے تاریخی مقالات کے قبل اسی بحث کے متعلق بعض [illegible] لکھے تھے جن میں ہارون اور شارلیمین کے درمیان تعلقات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب علامہ کلینکلوز کے محققانہ و مدلل مقالات شایع ہوئے، تو علامہ بربہائر اپنی بے سود ہمت پر بہت خفیف ہوئے اور رسالہ ریویو ہسٹورک (Revue historique) میں ایک طویل مضمون لکھ کر اپنے گذشتہ نظریے کی خود ہی تردید کر دی ہم علامہ بربہائر کے پہلے مقالات کا خلاصہ صرف دو باتوں میں درج ذیل

ستے ہیں جن پر علامہ موصوف نے اوّل اوّل کافی زور دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے
ود مراجعت کر لی ہے لیکن ہم بھی ان امور کی حقیقت پر کچھ نظر ڈالیں گے،
ہ لکھتے ہیں۔

(۱) اس زمانہ میں عیسائیوں کو مذہبی تکلیف کافی پہونچ رہی تھی جس
بنا پر یوروشلم کے بطریک نے شارلیمان سے دوستانہ تعلق جوڑ لیا تھا،
س سے ثابت ہوتا ہے کہ شارلیمین اور ہارون الرشید میں عمدہ تعلق تھا اسی
جہ سے بطریک نے توسط شارلیمین ہارون سے اپنی تکلیف دفع کرنی چاہی"۔

میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کو کوئی دینی تکلیف ہی
تھی۔ چنانچہ آج تمام کے تمام علمائے تاریخ بعہد ہارون الرشید عیسائیوں
دینی تکلیف کا صاف انکار کرتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ مشہور تاریخی خط بھی
یش نظر ہے جس کو تیوڈیسوس بطریک کے بطریق نے ۸۶۹ء میں بھیجا
تھا۔ اس خط میں بطریق موصوف نے مسلمانان عرب کے عدل و انصاف و
ہمہ گیر مساوات کی بے حد تعریف کی تھی۔

(۲) علامہ بریبار پھر لکھتے ہیں۔

"اندلس میں تمام بوزنطی اور اموی شارلیمین و ہارون الرشید کے
شمن تھے۔ اسی دشمنی کی وجہ سے ہارون اور شارلیمین میں باہم قرابت
یدا ہو چکی تھی"۔

لیکن کیا ایک مورخ کے لئے جائز ہے کہ جن امور کا صحیح اور علمی طور پر
وت نہ بہم پہونچ سکے۔ پھر بھی وہ اپنی طرف سے ان کا غلط نکال لے ہمیں
ں شک نہیں کہ مورخین ایسے علمی نتائج کو جو صحیح علمی تحقیق پر مبنی ہوتے

ہیں نہایت وسعت صدر کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ کسی ایسی تحقیق
کو جو واہیات و خرافات دلائل پر مبنی ہوں ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ کیا تاریخ
میں بھی "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" کو دخل ہے؟

لہذا آخری سطور میں ہم صاف عرض کئے دیتے ہیں کہ عربی زبان
کی تمام اصولی اور مستند تاریخیں خلیفہ ہارون اور شارلیمان کے درمیان
کسی تعلق کو بھی قطعاً ذکر نہیں کرتیں۔ پھر حیات شارلیمان سے متعلق دو
لاطینی تاریخیں (یعنی ha uie de chae اور Azannel Kayae
Lemagne) شارلیمین اور یوروشلیمی بطریق کے درمیان لوعد د
ہدیہ دینا کا ذکر تو کرتی ہیں لیکن ہارون و شارلیمین کے درمیان کسی تعلق
کا کوئی تذکرہ نہیں کرتیں۔ اب ہم نتیجہ اور علمی توضیح یوں دیتے ہیں کہ ہارون
نے نہیں بلکہ قدس کے بطریق ہی نے شارلیمین کو قبر مقدس کی کنجیاں دی تھی
... شارلیمین ارض مقدسہ کا قطعاً محافظ نہ تھا۔ اور کنجیوں۔ گھڑی۔ ہاتھی
اور اس قسم کے جن ہدایا کا ذکر مشہور ہے وہ محض خرافات ہیں جن کو قرون
وسطی کے مصنفین نے اپنی ذاتی اغراض یا شارلیمین بادشاہ فرانس کی خانہ
ساز عظمت کو دکھلانے کے لئے گھڑ لیا تھا۔ اور یہ وہ مصنفین ہیں کہ صحیح
علمی طور پر مورخین کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

یہ میری مہینوں کی تحقیقی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے
جو ناظرین کے پیش نظر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(ترجمہ از الہلال مصر)

عبدالسلیم۔ ناظم دربھنگوی

غزل

از مولانا عبد الحلیم صاحب ناظم دربھنگوی

سر میں جب سودا نہیں اور دل میں درد نہیں
زندگی کی پھر حقیقی لذتیں حاصل نہیں

رکھ دیا سر کاٹ کر خود اس کے پائے ناز پر
میں بحمد اللہ رہینِ منتِ قاتل نہیں

پڑ گئے ہیں ماہ میں دراصل کچھ نقطے سیاہ
ورنہ ان کے عارضِ تاباں پہ ہرگز تل نہیں

خوف ناکامی ارادے کے تزلزل ہی تک ہے
ہمتیں جب بندھ گئیں پھر دوریِ منزل نہیں

اک زمانہ وہ بھی تھا ہوتی تھیں جب دلداریاں
اب یہ دلجوئی ہے کیوں کیا وہ ہمارا دل نہیں

عشق کی دنیا میں ناظم چین کیسا آرام کیا
اس جہاں میں کچھ سکونِ دل قرارِ دل نہیں

پیمانِ مستحکم

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

جناب مولانا بشارت کریم صاحب عزیزی - بہار

ساعات گھنٹے میں ــــ گھنٹے ایام میں ــــ ایام ہفتے میں ــــ ہفتے مہینوں میں ــــ مہینے سال میں تبدیل ہوئے ــــ تبدیل ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ زمانے نے نہ معلوم کتنی دفعہ کہنگی سے تنگ آ آ کر لباس پارینہ چاک کر ڈالا اور پھر پوشاک جدید میں مسرور و خنداں، جلوہ گاہ عام پر ظاہر ہوا ــــ آفتاب ہمارے سروں پر لاکھوں بار نکل نکل کر چمکا اور چمک چمک کر ڈوبا۔ گلستان اور چمنستان میں ان گنت مرتبہ بہار و خزاں آتی جاتی رہی۔ زمانے نے ہزاروں الٹا پلٹا کھایا۔ خدا معلوم کتنے مرتبہ طوطیان نیک ادا، طائران خوشنوا۔ بلبلان [illegible] قریب جا جا کر محبت کا راگ الاپا ــــ [illegible] رہیں ــــ اور اپنی سرمستیوں کا مظاہرہ کرتی رہیں ــــ یہاں تک کہ گلوں کی شگفتگی، اور ان کا رنگ و روپ، برقرار نہ رہ سکا۔ خاص کر ــــ عنادل کی آتش عشق نے ان کے دل ــــ دماغ ــــ روح ــــ حتی کہ سارے جسم کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اور پھر ان کے مفاصل (پتیاں) روش پر منتشر ہو گئے ــــ بکھر گئے ــــ پراگندہ ہو گئے ــــ پامال ہو گئے ــــ بلبلوں نے اپنے عشق کی وہ چنگاریاں ــــ محبت کے وہ شعلے ــــ جذبات کے وہ شرارے بھڑکائے کہ پھول تو پھول، بعض کلیاں بھی آتش سرمستی و والہی میں، سوزاں و بریاں ہو کر قبل از وقت ہی بلبل اور گلچین بہار کو داغ مفارقت دے گئیں۔ بالآخر ان گشتگان عشق و محبت کے متعلق گلچیں کو یہ ناطق فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے،
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

گلچیں نے تو خیر کل مَنْ عَلَیْھَا فَان پڑھتے ہوئے اس صدمہ جانکاہ سے رستگاری حاصل کر لی لیکن ــــ خدا کی پناہ، بلبل نے وہ نالہ و شیون، وہ فریاد و بکا، وہ آہ و وادیلا، وہ گریہ و زاری، وہ صدائے احتجاج بلند کی ــــ کہ توبہ ہی بھلی۔ ہر ایک بے درد، سفاک، ظالم اور بیرحم جس کا قلب و جگر فولاد کا سا تھا وہ بھی فریادی بلبل کے اس نالے کی تاب نہ لا سکا ؎

بلبل ناشاد نے کچھ اس طرح فریاد کی
روتے روتے آج ہچکی بندھ گئی صیاد کی

بلبل نے صرف اسی پر بس نہ کی بلکہ وہ خون کے آنسو رونے لگی ــــ رونے لگی اور روتی رہی ــــ اور اسی طرح اپنی جان شیریں کھوتی رہی اور زبان حال سے یہ کہتی رہی ؏

یا جاں رسد بجاناں، یا جاں ز تن برآید،

خونیں قطرات اشک سے اس نے محبوب گلاب کے پودوں کی آبیاری کی ــــ آبیاری کی اور کرتی رہی۔ یہاں تک کہ دوبارہ نونہالان گلاب، سرسبز و شاداب ہو گئے۔ اور ہر چمن میں تازہ روح اور نئی زندگی عود کر آئی۔ بہار پھر اپنی سرمستیاں دکھلانے لگی ــــ ہاں اسی طرح نہ معلوم کتنی خزاں اور کتنی بہاریں چمن میں آئیں اور گئیں۔ مگر تم ــــ مجھ سے قسم لے لو۔ حلف اٹھوا لو کہ میرے لوح دل سے جو ہر طرح کی شائبہ آمیزی سے بالکل مصفیٰ اور مجلیٰ ہے اور جس میں تمہاری محبت کے متبرک حروف منقوش ہیں۔ مرور ایام اور امتداد زمانہ نے ایک نقطہ بھی محو کیا ہو۔ بلکہ میرے تمام اعصاب، تمہاری محبت کی گرمی تمہاری یاد کی سوزش سے اب تک تپاں ہیں۔

ہاں! میں تمہاری محبت میں اب تک سرشار ہوں۔

ہاں! ہاں!! مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جبکہ میں نے تمہیں اول ـــــ اور نہ صرف اول مرتبہ ایک لہلہاتے باغ کی سبزہ زار روش پر، نرم نرم پودوں کے درمیان، لچکدار گلاب کے ایک خوشنما پھول کی باریک اور نازک پنکھڑیوں کو نازک ـــــ مگر بھری بھری انگلیوں سے مس کرتے ہوئے مصروف گلگشت پایا تھا، ہاں میں نے تمہیں دیکھا ـــــ دیکھا، اور دیکھتا رہا، تمہیں میری موجودگی کا کافی دیر تک احساس بھی نہ ہوا - اور میں تمہاری اس لاعلمی سے بیحد متمتع ہوا ـــ ناگاہ! اس پھول سے جس کو نسیم بہار کے سرد جھونکوں نے محبت کی لوریاں گا گا کر تمہاری نازک ہتھیلی کے پرسکون گہوارہ میں تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، ایک بھونرا لپٹ گیا اور وہ اس کی مٹھاس کو چوسنے لگا۔ تمہاری طبیعت جلی - کڑھی ـــــ بگڑی ـــــ برہم ہوئی - مگر ـــــ تمہارا وقار، تمہاری شان حسن تمہاری متانت، تمہاری تمکنت، اس بات کی متقاضی نہ ہوئی کہ تم ـــــ ہاں تم، دو دلوں کے درمیان جدائی کا باعث بنو - بھونرا بیٹھا رہا ـــــ لپٹا رہا ـــــ چوستا رہا اور تم ان دونوں کے عشق کی کتاب ـــــ کتاب کے ہر ہر ورق ـــــ ورق کے ہر ہر صفحہ ـــــ صفحے کی ہر ہر سطر ـــــ سطر کے ہر ہر جملہ ـــــ جملے کے ہر ہر لفظ ـــــ لفظ کے ہر ہر حرف ـــــ حرف کے ہر ہر نقطہ کا بغور، دنیا و مافیہا سے بیخبر، چپ و راست سے غافل ـــــ حتیٰ کہ خود اپنے سے گم ہو کر مطالعہ کرتے رہے اور ـــــ میں اپنی قسمت کی اس کتاب کو، جس کے تمام حروف، تمہاری روشن پیشانی پر کندہ تھے جلد جلد پڑھتا رہا - بھونرا چوستا رہا ـــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بھونرا چوستا رہا اور تمہارے چہرے کا رنگ درد و تکلیف، کرب و بےچینی سے ادلتا بدلتا رہا - مجھے اس رنگ کی تبدیلی بھی یاد ہے پہلے سُرخ ـــــ پھر زرد ـــــ پھر بالکل زرد ـــــ پھر سفید، پھر سُرخ ـــــ پھر ـــــ پھر ـــــ ناگاہ بھونرا اڑ گیا، آنکھوں سے اوجھل ہو گیا - تب کہیں تمہارا سحر دور ہوا - طلسم بیخودی ٹوٹا ـــــ آپے میں آئے - اس کے بعد ـــــ اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری نظریں اوپر کو اٹھیں - لڑیں ـــــ جھکیں ـــــ اور ـــــ جم گئیں ـــــ تم مجھے دیکھ کر شرما گئے ـــــ جھینپ گئے ـــــ آب آب ہو گئے ـــــ اس لئے کہ تمہارا بھونرا بھی۔ تمہارے گلاب جیسے رخسار و لب کا۔ تم سے کچھ ہی پرے محو حیرت ہو کر ـــــ انگشت بدنداں رہ کر، عالم نیم مدہوشی و وارفتگی میں نظارہ کناں تھا - کیونکہ میں بھی تمہارے عارض تاباں کے عشق و محبت کی نیمگرم مٹھاس سے مستفیض ہونا چاہتا تھا ـــــ لیکن وائے شومئی قسمت کہ میرا طلسم خواب بھی اسی وقت کافور اور تار سحر بھی اسی وقت تار تار ہوا جبکہ تمہارے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی تم "اوئی" کہہ کر بھاگے۔ پھر اپنے ساتھیوں اور مسیتوں کے جگمٹ میں جا کر مل گئے۔ مگر میں نے محسوس کر لیا کہ میری ملتجیانہ نگاہوں کا اثر تمہارے معصوم دل پر بھی ہوا اور ضرور ہوا، اور ہونا بھی یہی تھا اور اس لئے کہ ؎

عشق اوّل در دل معشوق پیدا میشود تا نسوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

ہاں! آج تک میں تمہاری اسی گرمی نظر کی سوزش سے نیم سوختہ ہو کر تڑپ رہا ہوں ـــــ تمہاری اس تیغ نگاہ کا ذبیحہ ـــــ تمہاری اس تیر نظر کا کشتہ، تمہاری اس نوک مژگاں کا نخچیر ہوں۔

اے کاش تم دوبارہ رونما ہوتے تاکہ میں آنکھوں کو سینکتا۔ روح کو گرماتا، جسم میں لگی ہوئی آتش خاموش کو کبھی خاموش نہ ہونے دیتا - ہاں، اب تک میں تمہارا متوالا ہوں، اور ـــــ تمہاری محبت ـــــ پاک و بے لوث محبت میں ـــــ سرشار۔

وہ زمانہ بھی مجھے کبھی نہ بھولیگا جب ایک دفعہ ہم اور تم، ایک سہانی رات میں، اس رات میں کہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی چودھویں کا چاند تھا اور بدر کامل نہایت ہی فیاضی سے تمام چیزوں پر نور کی بارش کر رہا تھا - آسمان ابر سے اور فضا غبار سے، بالکل پاک و صاف تھی - اول تو یونہی ہر چیز نور کے بحر ذخار میں تیرتی نظر آ رہی تھی، مزید براں برسات کی چاندنی اپنی نورانیت کے اس دلفریب منظر میں اور بھی گوناگوں اضافہ کر رہی تھی - ہاں اسی رات میں، ہم اور تم ایک پہاڑی کے دامن میں، ایک خوشنما آبشار کے کنارے ایک سفید ـــــ دودھ سے زیادہ سفید و شفاف - مثل یخ بستہ چٹان پر بیٹھے عشق و محبت کی وادی میں گم ہوئے - کھوئے ہوئے مستغرق اس شعر کی ہم آہنگی میں مصروف تھے ؎

دیدار سے گو کچھ نہ ہو مقصود ہے اتنا
تو میری نظر میں رہے میں تیری نظر میں
(اختر مینائی)

صرف یہی نہیں ـــــ بلکہ تمہارا مرمریں جسم میرے تنگ آغوش میں محو سکون تھا اور میں تمہارے جسم کی حرارت کافی طور پر محسوس کر رہا تھا - اس وقت ہم دونوں کے تنفس تیز اور نبض سریع تھی ـــــ بہت ہی سریع، اور میں

پڑھ لیا۔ لکھا تھا "محبت" ایک بار پھر ہم دونوں رعشہ براندام ہوگئے۔ چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ یہ کیوں؟ اسی مستقبل کی منحوس ساعات کا خیال کرکے۔ ہم دونوں کے چاروں طرف سو غیر اختیاری طور پر کسی نامعلوم جذبہ کے زیر اثر پھر اسی سطح مصفیٰ پر آ رہے۔ اس چارے ... حرف د۔ و۔ ا۔ م۔ تیار ہوئے۔ ہم دونوں نے دونوں کلمات کو ملا دیا۔ مطلب حل ہوگیا ۔۔۔ واضح ہوگیا ۔۔۔ صاف ہوگیا کہ لکھا تھا "محبت دوام" ہم دونوں نے اسے پڑھ لیا۔ اور جھوم گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں باہم ایک دوسرے سے چپیاں تھے۔ میں کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے محبت کیے جاؤ رکھے جانے کا "پیمان مستحکم" کر رہے تھے۔ مجھ کو یاد ہے کہ تم نے مجھ سے "محبت دوام کرنے کا پیمان مستحکم" کیا تھا۔ اور جب میں تمہارے ہونٹوں پر مہر محبت ثبت کیا جا رہا تھا تو تم نے یہ بھی کہا تھا کہ "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی"

معاً ہماری نظریں مرئی اور محسوس محبت کے اثر پاک جگہ کو تلاش کرنے لگیں ۔۔۔ جستجو کرنے لگیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ آہ! وہاں مطلع بدلا ہوا تھا ۔۔۔ رکھا ہی کیا تھا ۔۔۔ وہاں تو اب صرف ایک ہلکا سا اثر تھا ۔۔۔ دھندلا سا نقش تھا وہ حروف اب بھی وہاں کندہ تھے ۔۔۔ اور ضرور تھے لیکن تقریباً غیر نمایاں ۔۔۔ غیر مرئی ۔۔۔ اس لئے کہ تمہاری آنکھیں جدائی کے خوف سے اگر اشکبار ہوکر تمہاری پلکوں کے ہر ہر بال میں دُرِّ یتیم پرونے میں مصروف تھیں تو میں بھی خون کے آنسو رو رو کر دل و جگر کے ٹکڑے کو سیلاب اشک کی طغیانی اور خون اشک کے دریاؤں میں جلد از جلد غرقاب کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ ہم دونوں نے اس جگہ کو دیکھنے کے لئے دوبارہ کوشش کی۔ لیکن بے سود ۔۔۔ بے کار ۔۔۔ بے فائدہ ۔۔۔ لاحاصل۔ اس لئے کہ اس وقت ہم دونوں کی حالت ٹھیک اس جہاز کی تھی جو تیز ... جہاز کو کہرے ۔۔۔ گہرے اور کثیف کہرے نے ... اپنے دامن تیرہ و تار میں لے لیا ہو۔ اور جہاز راستہ نہ پاکر متحیر و سرگرداں ہو کر رک گئے ہوں ۔۔۔ ہاں، بالکل اسی طرح اس وقت ہم دونوں کے عشق و محبت کا جہاز بھی ہمارے آنسوؤں کے کہر میں گھر کر ... ہو رہا تھا ۔۔۔ ہچکولے کھا رہا تھا ۔۔۔ متلاطم تھا۔ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں کو خوب بھینچ کر صاف کر لیا آہ وہ جگہ نہیں ۔۔۔ بلکہ اس کا صرف ایک کلمہ نظر آیا یعنی ۔۔۔ "دوام" اس لئے کہ محبت کا لفظ وہاں سے معدوم ہوچکا تھا ۔۔۔ مٹ چکا تھا ۔۔۔ زائل ہوچکا تھا ۔۔۔ پھر ہم دونوں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا ۔۔۔ کھولا، اور دیکھا ۔۔۔ آہ واقعی لفظ "محبت" غایب تھا۔ لیکن "دوام" کا لفظ پھر تیز ہوتا گیا۔ اس کے بعد ۔۔۔ آہ! ۔۔۔ اس کے بعد ہم دونوں کی آنکھوں نے وہ دیکھا جو نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ یعنی بجائے "محبت" کے "فراق" خود بخود چھپ گیا ۔۔۔ چھپ گیا اور بالکل عیاں ہوگیا ۔۔۔ ہم دونوں پھر لرز گئے، ۔۔۔ رعشہ براندام ہوگئے ۔۔۔ کیونکہ وہاں جہاں اب سے کچھ ہی پیشتر سرور انگیز الفاظ مرتسم تھے اب ایک غم انگیز جملہ مرقوم نظر آیا ۔۔۔ لکھا تھا ۔۔۔ "فراق دوام" آہ یہ منظر ۔۔۔ یہ منحوس منظر دیکھ کر ہم دونوں کا کلیجہ دہل گیا۔ آنکھوں کی روشنی سلب ہوگئی ۔۔۔ ہم دونوں نے سمجھ لیا کہ یہ نقش ہے ہماری آنے والی منحوس زندگیوں کا، یہ آئینہ ہے ہمارے مستقبل کے نامبارک لمحہ کا۔ یعنی ہم دونوں کی "محبت" پائدار و راسخ تو ہوگی مضبوط و مستحکم تو ہوگی ۔ لیکن ہم دونوں کو یکجائی کبھی حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ ۔۔۔ ہم دونوں "فراق دوام" کی آگ میں حشر تک جلتے رہیں گے ۔۔۔ اس کے بعد ۔۔۔ اس کے بعد وہ وقت بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم دونوں دلگیر، دل گرفتہ اور بادیدہ پرنم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ اس وقت ہم دونوں کی حالت صرف رحم ... ہی نہیں بلکہ نا دیدنی تھی۔

میں سنبھالے تھا ان کو وہ مجھکو   یاد ہے ہائے وقت رخصت کا (رنجیدہ)

ہاں! مجھے سب کچھ یاد ہے۔ مگر اب!؟ ع

خواب و خیال ہوگئیں ساری حکایتیں   وہ دن گذر گئے وہ زمانہ گذر گیا،
اور گئے وہ دن کہ تھے ارمان عیش سب بود   کبھی نہ آئیگی وہ شب و سحر ہوگی (انشاء)

یا ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

اے کاش! کہ تم دوبارہ رونمائی کرکے اپنی شراب محبت کے دو ایک جام اور پلاتے مجھکو وہ شراب عطا کرتے جو دو آتشہ ہوتی میرے جنون کو دوبالا کرتی کیونکہ میں متمنی ہوں اُسی "محبت دوام کے پیمان مستحکم" کا میں آرزو مند ہوں تمہارے دہن مبارک سے اسی مصرعہ کو دوبارہ سن لینے کا یعنی ع من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی۔

للہ! تم ہماری اس استدعا کو مسترد نہ کرو۔ ٹھکرا نہ دو۔ کیوں؟ اس لئے کہ ع

دن بہت ہوگئے نہیں دیکھا   ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
بادلوں کی طرح برستی ہیں   آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں (رجوتیں)

ہاں! ۔۔۔ ہاں!! میں تیری محبت میں اب تک سرشار ہوں۔

انوار سخن

داغ دل بے شمار ہو جائیں
ہم سراپا بہار ہو جائیں

پرسشِ غم ہے اس لئے شاید
اور ہم بے قرار ہو جائیں

تو نوازے تو رہ نشیں سائل،
صاحب اقتدار ہو جائیں

ترا نقشِ قدم اگر پائیں!
مرے سجدے نثار ہو جائیں

دیدہ و دل خدا کرے دونوں!
خوگرِ انتظار ہو جائیں!

اس کو مدِ نظر ہے ضبطِ غم،
غیر اب رازدار ہو جائیں،

دید کی آرزو نہ رہ جائے
وہ یہاں ایکبار ہو جائیں

زندگی میں تھے داغِ دل پنہاں
اب وہ شمعِ مزار ہو جائیں

دل اگر پاک ہو کدورت سے
راز سب آشکار ہو جائیں

سارا عالم ہو غمگسار انور
وہ اگر غمگسار ہو جائیں

لطیف انور گورداسپوری

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۴ — نمبر ۱۰

فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۳۶ء

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

سالہائے گذشتہ کی طرح اس سال بھی عالمگیر کا سالانہ نمبر جون ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شایع ہوگا۔ عالمگیر نے خاص نمبروں کے سلسلے میں جو قابل رشک شہرت حاصل کرلی ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء انشاءاللہ ہر لحاظ سے امتیازی خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا۔ اس کیلئے جو تصویریں مہیا کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کمال مصوری کا نادر ترین نمونہ کہلانے کی مستحق ہے آپ ان تصویروں کو دیکھ کر بلا شبہ کہہ اٹھینگے کہ رنگوں اور خطوط کے لطیف امتزاج نے حسن و کیفیت کی ایک خاموش دنیا بسادی ہے۔

اس نمبر کے لئے جو مضامین و منظومات مہیا کئے گئے ہیں ان کے محاسن کا اظہار زبان قلم سے ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ ہر مضمون خیالات و جذبات کی تربیت و تہذیب کا بہترین ذریعہ ہے۔ تفصیلات کیلئے مئی کے پرچہ کا انتظار کیجئے جن حضرات نے سالانہ نمبر کیلئے اب تک مضمون نہیں بھیجا ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس اعلان کے دیکھتے ہی اپنے قدیم شیوۂ عالمگیر نوازی کے پیش نظر اپنے اپنے نتائج افکار بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مصروفیات اور پریشانیوں کی مشترکہ یورش کے باعث فرداً فرداً مضامین کیلئے خطوط لکھنے سے قاصر رہا۔ اس لئے میں اپنے محترم کرمفرماؤں سے یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ میری درخواست کے بغیر مضامین اور منظومات بھیجکر مجھے شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

موجودہ اقتصادی بدحالی کے زمانہ میں یہ اعلان کرتے ہوئے دل کو ایک تشویش سی پیدا ہوتی ہے لیکن عالمگیر کو ترقی کے اس بام رفیع تک لانے میں جن تشویش انگیز پریشانیوں کا میں آج تک بفضل ایزدی مقابلہ کرتا آیا ہوں ان سے یہ تشویش کچھ زیادہ نہیں اس لئے میں اللہ کا نام لے کر
یہ اعلان کرتا ہوں کہ

عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء بھی گذشتہ خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح بڑے

یعنی

جہازی سائز پر شایع ہوگا،

اور میں اپنی پریشانیوں کے باوجود اس پر سیکڑوں روپیہ زائد صرف کرکے سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء ایسا جاذب نظر بنانا چاہتا ہوں کہ باید و شاید۔ خدا نے چاہا تو آپ دیکھینگے کہ یہ سالانہ نمبر ہر حیثیت سے کتنا شاندار ہے۔ تصاویر، مضامین افسانے اور منظومات کے اعتبار سے یہ اشاعت خاص فی الواقع خاص چیز ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے عالمگیر سے ایسی والہانہ محبت ہے جس کا اظہار بذریعہ الفاظ ناممکن ہے۔

قارئین کو معلوم ہوگا کہ گذشتہ مہینے میرا لخت جگر اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔ ؎

ساعتِ عشرت یکایک لمحۂ غم ہوگئی　　عید آتے ہی مرے گھر میں محرم ہوگئی

یہ قدرت کی ان بوجھی مصلحتوں کا کرشمہ ہے کہ جو احباب چند ہفتے پہلے تبریک و مسرت کے خطوط لکھ رہے تھے آج ان کے گرامی نامے حزن و ملال کا آئینہ بنے ہوئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اس صدمے کا اثر میرے دل و دماغ سے چلا جائے لیکن احباب کی آئے دن کی ہمدردی اس زخم کے درد کا احساس از سر نو تازہ کرتی رہتی ہے ؎

مضطرب کر دیا احباب کی ہمدردی نے　　ورنہ میں اور یہ احساس اجڑ جانے کا

بہر حال جن احباب کرام نے اس صدمہ جانکاہ میں میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا میں ان کا بصمیم قلب ممنون ہوں۔ خطوط کے ذریعہ شرکت غم کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ میں فرداً فرداً جواب لکھنے سے معذور ہوں۔ یقین ہے کہ میری یہ جائز معذرت لائق پذیرائی اور قابل قبول ہوگی۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ

قطعات تاریخ وفات فرزند دلبند جناب حافظ محمد عالم صاحب مدیر "عالمگیر"

از جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر

(۱)

مرگ پسر کہ بر سر حافظ فتد چو کوہ، بودہ است ہمچناں ز ازل بند و بست آہ
ممکن نہ شد ز کس کہ بگرداندش ز راہ تیرے کہ از کمانِ مقدر بجست آہ
کے می تواں کشید و چساں می تواں کشید تیر غمے کہ در جگر او نشست آہ
رفتہ بہار و سبزہ ندیدیم روئے گل، گوئی حیات پردہ بکشاد و بست آہ
تاریخ رحلتش ز دلِ حامدِ حزیں،
برجست۔ ناگہاں دلِ حافظ شکست آہ
۱۹۳۶ء

(۲)

دلِ حافظ بخست از مرگ فرزند چہ تاریخ غمش کلکم نگارد
بچشم دل نظر کردم بروئش بگفتم، دیدہ از غم خوں ببارد
۱۹۳۶ء

اسلام اور اسپین

جدید تہذیب پر اسلام نے کیا اثر ڈالا؟

یورپ میں "ترکۂ اسلام" کے نام سے ایک جلیل القدر کتاب شایع ہوئی ہے جس میں متعدد مشاہیر علما نے مل کر تصنیف کیا ہے اور جس میں دکھایا ہے کہ موجودہ تہذیب پر اسلام کے کیا کیا احسانات ہیں۔ الفریڈ ولیم نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"ملک عرب میں اسلام ظاہر ہوا اور اس کے ظہور نے ایک نئی تہذیب پیدا کردی جسے اسلامی یا عربی تہذیب کہتے ہیں۔ عربی اس لئے کہ خلفاء کے زمانہ میں دین اسلام اور عربی زبان ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ یہ اسلام کی خوش نصیبی تھی کہ محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) ایسے زمانہ میں ظاہر ہوئے جب عربی زبان عروج کو پہونچ چکی تھی۔ اس واقعہ سے انکار نہیں کہ کوئی سامی زبان بھی عربی زبان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ عربی اس قدر وسیع زبان ہے کہ ہر قسم کے معانی کیلئے اس میں الفاظ موجود ہیں۔"

اس کتاب کا پہلا باب جی۔ بی۔ ٹرینڈ نے "اسلام اور اسپین و پرتگال" کے عنوان سے لکھا ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

اسپین کے باشندوں کو اسلام سے حد درجہ بغض رہا ہے ان کے مذہبی پیشواؤں اور مورخوں نے اسلام کا چہرہ بری طرح بگاڑا، اور باشندوں کو یقین دلادیا کہ اُن کے تنزل کا اصلی سبب اسلام کا ان کے ملک پر قبضہ تھا۔ لیکن ۱۸۹۸ء میں امریکہ سے شکست کھانے کے بعد اسپینیوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے حق کو دیکھنا شروع کردیا۔ بتدریج اسلام سے ان کا تعصب کم ہونے لگا اور ان کے بعض علماء نے تسلیم کیا کہ اسپین کو اسلام سے بہت نفع پہونچا ہے اور یہ کہ ۱۴۹۲ء میں اسپین سے اسلام کی جلاوطنی نہ صرف اس ملک کی بدنصیبی تھی بلکہ ساری دنیا کیلئے ایک مصیبت تھی۔

اسلام نے رواداری پیدا کی

یورپ مذہبی تعصب سے اندھا ہو رہا تھا لیکن اسلام کے اثر سے اسپین کے مہذب طبقہ میں رواداری پیدا ہوگئی۔ چنانچہ وہاں کے باقیماندہ عیسائی بادشاہوں نے مسلم علما، صناع، اور ماہرین موسیقی کو اپنے درباروں میں جمع کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا مگر جوں ہی اسلام کو شکست ہوئی کیتھولک۔ پادریوں نے اسپین کو تعصبات کا مرکز بنادیا۔ اس کی ذہنی آزادی سلب کرلی اور اسے اپنا غلام بنالیا۔

اسلامی اسپین

قدیم اسپینی مورخوں نے اسلام پر بے شمار جھوٹی تہمتیں لگائی ہیں لیکن بعد کے علماء کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ جس زمانہ میں تمام یورپ پر جہل کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اسپینی مسلمانوں نے ایک جلیل القدر تہذیب اور منظم اقتصادی زندگی قائم کی جس سے تیرہویں صدی کے یورپ نے بہت فائدہ اٹھایا اور علوم و فنون میں اس سے بیش بہا مدد لی۔ اس حقیقت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ڈینٹی وغیرہ شعرا پر عربی روح صاف طور سے نظر آتی ہے۔

لیکن اسپینی مسلمان کون تھے؟ کیا وہ خالص عرب تھے؟ طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں اسپین فتح کیا۔ خود طارق عرب نہیں بلکہ بربری قوم کا ایک فرد تھا اس کے ساتھ صرف تین ہزار سپاہی تھے جن میں سے عرب صرف تین سو تھے۔ باقی دو ہزار سات سو مجاہد بربر تھے اس کے بعد ۷۱۲ء میں موسیٰ بن نصیر فتح کو مکمل کرنے کے لئے ایک فوج لیکر آیا۔ یہ فوج بھی عربوں، شامیوں، مصریوں اور

بربر سے مخلوط تھی۔

پھر اسلامی فتح کے بعد بکثرت عیسائیوں نے اپنا مذہب بدل ڈالا اور مسلمان بن گئے۔ عربی نام رکھ لئے اکثر فاتحوں حتیٰ کہ خود موسیٰ بن نصیر نے اسپین کے آخری شاہی خاندان کی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور ایک ہی نسل کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ اسپینی مسلمانوں کی مائیں اسپینی عورتیں ہوگئیں جن میں مسلمان بھی تھیں اور عیسائی بھی۔ اسپینی مسلمان عالی خاندان عیسائیوں میں شادی کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ عیسائی عورتوں کو مسلم عورتوں پر ترجیح دیتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں عربی خون بتدریج کم ہوگیا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسپین کے تمام مسلمان عرب تھے۔

اسپین کی زبان

فتح اسلام کی تیسری یا چوتھی صدی میں اسپین کے باشندے دو زبانیں بولتے تھے (۱) عربی زبان جو وہاں کی سرکاری زبان تھی (۲) بول چال کی رومی زبان جسے عرب بھی بولنے لگے تھے اور جس سے موجودہ اسپینی زبان پیدا ہوئی ہے۔

اسپین کے عیسائی

اگرچہ اسلامی فتح سے دو سو برس بعد تک اسپین پر عربی زبان کا پورا قبضہ نہ تھا جیسا کہ مقدس بیان سے ثابت ہے تاہم اسلامی تہذیب ترقی کرتی گئی۔ اسپین کے عیسائی عام طور پر ان پڑھ تھے اور عربی زبان پر قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن تعلیمیافتہ لوگ عربی زبان کو اپنی زبان پر ترجیح دیتے تھے چنانچہ قرطبہ کے بشپ نے انھیں سخت ملامت بھی کی تھی کہ وہ اپنی قومی زبان کے مقابلے میں عربی نظم و نثر کے کیوں دلدادہ بن گئے ہیں مگر عیسائی باشندے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ عربی ان کی زبان سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ پھر جب سے مسلمانوں نے اسپین میں کاغذ سازی کو رائج کیا تو عربی زبان کی کتابیں باسانی مل جایا کرتی تھیں۔

دسویں صدی عیسوی میں قرطبہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے متمدن شہر تھا۔ ساری دنیا کی نگاہیں اس پر تھیں اس میں ستر کتب خانے اور نو سو پبلک حمام تھے۔ عیسائی بادشاہ قرطبہ ہی سے طبیب، انجینیر، اور مغنی بلاتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک عیسائی ملکہ کا لڑکا بہت موٹا تھا جب یورپ بھر میں کہیں اس کا علاج نہ ہوسکا تو ملکہ نے اسے قرطبہ بھیجا جہاں سے وہ بالکل اچھا ہوکر واپس گیا۔

قرطبہ کے تنزل کے ایک سو برس کے بعد شہر اشبیلیہ نے شہرت حاصل کی اور قرطبہ کا وارث بن گیا۔ یہ زمانہ طوائف الملوکی کا تھا۔ مگر اسی زمانہ میں یورپین ممالک کے سب سے زیادہ سیاح اسلامی اسپین میں آئے اور واپس جاکر اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی تہذیب پھیلانے لگے۔ شمالی اسپین (مسیحی) میں اور وہاں سے یورپین ممالک میں اسلامی تہذیب اس طرح اور بھی جلد پھیلی کہ طوائف الملوکی کے زمانہ میں اسپین کے غیر مسلموں نے یہاں سے بہت زیادہ تعداد میں ہجرت کرنا شروع کردی تھی کیونکہ مرابطین اور موحدین کے عہد حکومت میں خصوصاً سنہ ۱۰۹۰ء سے سنہ ۱۱۴۶ء تک انھیں بہت ستایا گیا۔ اندلس کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہبی تعصب ظاہر کیا جیسے مسلم بربر بادشاہ اور شمال سے عیسائی پادری اپنے ساتھ لائے تھے لیکن اس دینی جنون کے زمانہ میں بھی ایسے علماء پیدا ہوئے جو اپنے عہد میں اپنی نظیر آپ تھے اور اپنی قابلیتوں کی وجہ سے دنیا کے سب سے بڑے عالم تسلیم کئے گئے۔ ابن رشد، ابن طفیل، ابن العربی، ابن میمون، ابن جبیر، اسی زمانہ میں ظاہر ہوئے تھے۔ اسلامی اسپین سے بھاگنے والے یورپین ممالک میں اپنے ساتھ اسلامی طرز لباس کا فیشن، بعض اسلامی عادتیں اور محاورے لے گئے۔ لیکن یورپ میں اسلامی تہذیب اس وقت سے بہت تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی جب وسط تیرھویں صدی عیسوی میں مسیحیت نے اندلس پر یلغار شروع کی اور بہت سے مسلمان دستکار اور علماء مسیحی حکومت کے ماتحت ہوگئے سنہ ۱۰۸۵ء میں عیسائیوں نے طلیطلہ فتح کیا۔ سنہ ۱۲۳۶ء میں قرطبہ پر ان کا قبضہ ہوگیا اور سنہ ۱۲۴۸ء میں اشبیلیہ کو بھی انھوں نے چھین لیا۔

بعض اسلامی صنعتیں!

اسپین کے مسلمان چمکیلی مٹی سے برتن بناتے تھے اس صنعت میں انھوں نے ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ ساری دنیا میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی تھی گیارہویں صدی عیسوی میں طلیطلہ اس صنعت کا مرکز تھا۔ مٹی کے یہ برتن نہایت خوشنما ہوتے تھے ان پر ایسا رنگ ہوتا تھا کہ یاقوتی سے شروع ہوکر سبز کے رنگ پر ختم ہوتا تھا پرتگال، اٹلی فرانس کے بادشاہ اور امراء ان برتنوں کو بڑی قیمت پر خریدتے تھے حتیٰ کہ بشپ زینیس نے ایک مرتبہ کہا، ان کافر دستکاروں (یعنی مسلمانوں) میں ایمان کی اتنی ہی کمی ہے جتنی ہم میں دستکاری کی ہے۔

دباغت اور سناری

قرطبہ میں کھال کی دباغت ایسی ہوتی تھی کہ تمام یورپ میں مشہور تھی اسی طرح اندلس کے سنار بھی یورپ میں ضرب المثل بنے ہوئے تھے۔

موسیقی

اسپین کی ملی موسیقی اور مراکش کی موسیقی میں بہت زیادہ بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح دونوں ملکوں کا ناچ بھی بہت مشابہ ہے ضرور اسپین کے عیسائی بادشاہوں کے دربار میں مسلمان ماہرین موسیقی موجود تھے۔ تاریخ سے بھی ان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں ہی نے اسپین میں عود اصل کیا نیز بانسری اور رباب کو رواج دیا۔ رباب کا نام موجودہ اسپینی زبان میں "رابل" ہے اور پرتگالی اسے "رابیگا" کہتے ہیں۔

اسپینی زبان میں اکثر موسیقی آلات کے نام عربی ہیں جو کثرت استعمال سے ذرا بگڑے ہوئے تلفظ میں بولے جاتے ہیں مثلاً "تاندیروا" جو عربی میں "سندیر" ہے یا "سوناجان" جو اصل میں "صنوج" (جمع صنج) ہے۔ اسی طرح ایک عربی بوق کا نام "نفیل" ہے جو اصل میں "نفیر" ہے یا "گیطہ" جو اصل میں "غیطہ" ہے یا "بوگ" جو عربی لفظ "بوق" تھا ہے۔ موسیقی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور اسپینی لفظ "زندا" ہے حالانکہ یہ بھی عربی ہے اور طرب بگڑ کر بنا ہے۔

اسپین کے لوگ جب گانا سن کر وجد میں آتے ہیں تو "اولیہ" پکارتے ہیں لیکن یہ خالص اسلامی لفظ "اللہ" ہے۔ عرب بھی جب وجد میں آتے ہیں تو "اللہ اللہ" کہتے ہیں۔ پھر اسپینی گانے بھی عربی گانوں کی طرح "یا لیل یا لیل" سے شروع ہوتے ہیں۔

اسپینی زبان پر احسان

جب مسلمانوں نے اسپین پر قبضہ حاصل کیا تو بکثرت عربی الفاظ اسپینی زبان میں داخل ہوگئے اور اسے وسیع بنا دیا۔ اسپینیوں نے عربی تلفظ اس طرح سے لئے ہیں کہ عربی کا حرف تعریف الف لام برقرار رکھا ہے اور اسی کے ساتھ اسپینی حرف تعریف "لا" بھی بڑھا دیا ہے۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عربی لفظ	اسپینی لفظ
الحاجہ	La Alhaja
الرز	La arraz
الساقة	La acaqia
النقال	La anacala
القبلہ	La alcoba
المخدة	La almahda

اسپین کے کسانوں میں جتنے اوزان اور پیمانے رائج ہیں اب تک ان سب کے نام عربی ہیں۔ پھر بہت سے زراعتی لفظ بھی عربی ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج تک اسپین کے باشندے انشاء اللہ کہتے ہیں۔ اگرچہ اس کا تلفظ اوشاء اللہ کرتے ہیں۔

مقامات کے نام

اسپین اور پرتگال میں آج تک اکثر مقامات کے نام وہی ہیں جو عربوں نے رکھے تھے اگرچہ تلفظ کسی قدر بدل گیا ہے مثلاً "جبرالفارو" اصل میں "جبل الفاد" ہے یا "جبرالٹر" اصل میں "جبل الطارق" ہے یا "طرفلجار" اصل میں "الطرف الاغر" ہے۔ "الجیراس" اصل میں "الجزیرہ" ہے۔ اسپین میں زیادہ تر مقامات کے نام "وادی" سے شروع ہوتے ہیں۔ اسپینی زبان میں یہ لفظ Guad لکھا جاتا ہے مگر بولا وادی ہی جاتا ہے۔

خاندانوں کے نام

اسپین میں آج تک بہت سے خاندانوں کے نام عربی اسلامی ہیں مثلاً

بنو خالد	Bena dalid
بنو الوکیل	Bena udalla
بنو شرف	Bena sharfe
بنو عبداللہ	Benacasim
بنو غانم	Benaganim
بنو محمد	Benaiamemel

ظاہر ہے کہ اور ایسے ہی خاندان عرب اور مسلمان تھے مگر زبردستی عیسائی بنالئے گئے۔

دسویں صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب پورے اسپین میں پھیل چکی تھی حتیٰ کہ مسیحی علاقوں میں بھی اور جب طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو اسلامی تہذیب یورپ کے تمام حصوں میں پہونچ گئی۔

قرطبہ کی بربادی کے بعد طلیطلہ نے علوم و فنون میں اس کی جگہ لے لی حتیٰ کہ ۱۰۸۵ء میں قبضہ کے بعد بھی یہ شہر علم و حکمت کا مرکز بنا رہا۔ خود شاہ الفانسو ششم کا دربار اسلامی تہذیب میں ڈوبا ہوا تھا اور شاہ نے اپنا لقب قرار دیا تھا۔ "دونوں دینوں کا شہنشاہ"۔ اس زمانہ میں طلیطلہ کی درسگاہیں یورپین طالب علموں سے لبریز دکھائی دیتی تھیں۔ یورپ کا کوئی ملک نہ تھا جہاں سے طالب علم نہ آتے ہوں حتیٰ کہ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ

کے طالب علم بھی موجود تھے۔ چنانچہ انگریز عالم رابرٹ نے طلیطلہ ہی میں تعلیم حاصل کی اور یورپ میں سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ کیا۔ پھر سکاٹ لینڈ کا عالم میکائیل دانیال مورلے اڈلرڈ آف باتھ وغیرہم نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی تھی اور انہوں نے عربی سے لاطینی میں ارسطو اور اقلیدس کی کتابیں ترجمہ کیں۔

اسپین کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب کیلئے جو سب سے زیادہ قیمتی میراث چھوڑی وہ مسلم فلسفیوں کی تصانیف ہیں۔ مرابطی اور موحدی سلطنتیں اگرچہ متعصب تھیں مگر انہوں نے فلسفیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اور موقعہ دیدیا کہ جو چاہیں لکھیں بشرطیکہ اپنی تعلیمات کی عوام میں اشاعت نہ کریں یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے فلسفی قرطبہ کے عروج کے زمانے میں ظاہر نہیں ہوئے بلکہ عہد طوائف الملوکی میں ظاہر ہوئے۔ انھیں لوگوں نے ارسطو کا فلسفہ عربی زبان میں منتقل کیا۔ اور تمام یورپ مجبور ہوا کہ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لئے اپنے طالب علموں کو طلیطلہ بھیجے۔ جہاں وہ عربی زبان میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

(اتحاد۔ پٹنہ)

رباعیات

حضرت عابد شاہجہانپوری

۱

گر دل غمِ جاناں سے دیوانہ سہی
پامالِ تمنا سہی ویرانہ سہی
عابد گلہ جور نہ آئے لب تک
دنیائے وفا سے کوئی بیگانہ سہی

۲

ہر ذرۂ دل روح سے بیگانہ ہے
پامال ہر اک ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے
سنتی کبھی وہ چشمِ ستمگر عابد
زمانہ خاموش ترا افسانہ ہے

۳

ہر گام پہ اک پیکرِ خاموش ہوں میں!
یہ عالمِ حیرت ہے کہ بیہوش ہوں میں
کچھ راز تو بتیا ہی دل کا کھلتا
شاید ترے جلووں سے ہم آغوش ہوں میں

جذباتِ عالیہ

حضرت دل شاہجہاں پوری

دل اب وہاں ہے جہاں خود ہی تماشا ہوں میں
ہجومِ شوق و تمنا میں گم ہوا ہوں میں!

اس اضطراب پہ قرباں اک جہانِ سکوں
کوئی سنبھال، ہائے تڑپ رہا ہوں میں!

چمک اٹھی مرے ذروں سے عشق کی قسمت
دیارِ حسن میں تو خاک ہو چکا ہوں میں!

حریمِ ناز سے آتی ہے یہ صدا پیہم!
کہ اس حجاب پہ بھی عالم آشنا ہوں میں!

مری خموشیِ مجبور اک قیامت ہے
یہیں سے عشق کی فطرت بدل رہا ہوں میں!

اک آہِ سرد نے صدہا کئے ہیں حشر بپا
ابھی تو دردِ محبت کی ابتدا ہوں میں!

یہ کوئے عشق کی دشواریاں معاذ اللہ
قدم قدم پہ ہیں نشتر برہنہ پا ہوں میں!

مجھے کہیں دلِ پامال کا نشاں نہ ملا،
ہر ایک ذرے کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں!

نہ پوچھ عشق کی روداد اشک خوں کو دیکھ
دلِ شکستہ کی فریادِ بے صدا ہوں میں!

مشاہدہ کا تقاضا ہے اب حجاب نہیں،
حدودِ طور سے شاید گزر چکا ہوں میں!

سنبھال اپنے دلِ مطمئن کو اے ناصح،
کہ سرگذشتِ محبت سنا رہا ہوں میں!

اسی سے کیجئے افتاد کا کچھ اندازہ،
نظامِ دہر بدلتا ہوا اٹھا ہوں میں!

حبابِ بحر کی سمجھو مجھے نمود اے دلؔ
اگر یہ وہم نہیں ہے تو اور کیا ہوں میں؟

سُرخ پھُول

شہرۂ آفاق روسی افسانہ نگار "گارشن" کا ایک مشہور افسانہ

ایوان تورگنیف کی یاد میں

مترجمہ سعادت حسن منٹو،

"حضور ملک معظم شاہنشاہ پطرس اوّل کے نام پر میں مطلع کرتا ہوں کہ پاگل خانہ کا معاینہ کیا جائیگا۔"

یہ الفاظ سمع خراش اور چیختی ہوئی بلند آواز میں ادا کئے گئے۔ ہسپتال کا سیکرٹری جو روشنائی کے دھبوں سے بھری ہوئی میز کے قریب بیٹھا بیماروں کے متعلق ایک بوسیدہ رجسٹر میں اندراج کر رہا تھا مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر وہ دو نوجوان جو بیمار کے ساتھ تھے نہ ہنسے۔ دو دن اور دو راتوں کے سفر نے جو ان کی آنکھوں میں کٹا تھا انھیں اس قدر ماندہ کر دیا تھا کہ وہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے وہ اس پگلے کی نگہبانی کرتے رہے تھے جسے وہ ٹرین سے ابھی ابھی ساتھ لائے تھے۔ سفر کی آخری منزل پر ان کے ساتھی کی دیوانگی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ انھوں نے بڑی مشکل سے ایک کرتا تلاش کر کے ریلوے کے نوکروں اور سپاہیوں کی مدد سے اسے پہنایا تھا۔ اس طرح یہ دو نوجوان طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر بصد مشکل اپنے دیوانے ساتھی کو شہر تک لائے تھے اور اب ہسپتال تک پہنچے تھے۔

ان کے ساتھی کی شکل سخت بھیانک تھی۔ بھورے رنگ کے سوٹ پر جو دیوانگی کے دوروں کے باعث جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا ایک جیکٹ نما کرتا تھا جو بڑے عرض کی زین سے بنا ہوا تھا۔ یہ کرتا اس کے بدن پر لپٹا ہوا تھا اس کی لمبی باہیں اس کے بازوؤں کو چھپا رہی تھیں جو اس کی پیٹھ کے پیچھے رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی سُرخ آنکھیں (دس دن سے وہ متواتر جاگ رہا تھا) شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ نچلا لب لرزاں تھا۔ پیشانی پر بال گھوڑے کی ایال کی طرح بکھر رہے تھے۔ وہ دفتر میں ایک کونے سے دوسرے کونے میں تیز اور بھاری قدم اٹھاتا۔ موم جامے کی منڈھی ہوئی کرسیوں، پرانے درازوں اور کتابوں کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتا اور اپنے ساتھیوں کی موجودگی سے بالکل غافل ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

"اس کو ساتھ والے کمرے میں لیجاؤ، داہنے ہاتھ۔"

"میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔ پچھلے سال مجھے تمہارے ساتھ رہنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ ہم دونوں نے ہسپتال کا معاینہ کیا تھا مجھے سب کچھ معلوم ہے اور مجھے دھوکا دینا بہت مشکل کام ہے۔" دیوانے نے کہا۔

یہ کہکر وہ دروازے کی طرف مڑا۔ وارڈر نے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ اس پر وہ انداز سے تیز اور سنبھلتے ہوئے قدم اٹھاتا اور اپنے دیوانے سر کو اکڑائے ہوئے دفتر سے باہر چلا گیا۔ باہر نکلتے ہی وہ دفعتہً داہنے ہاتھ اس وارڈ کی طرف بھاگ پڑا جو ذہنی بیماریوں کے مریضوں کے لئے مخصوص تھا اس کے ساتھی جو اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکے۔

"گھنٹی بجاؤ۔ میں خود نہیں بجا سکتا اس لئے کہ تم نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں"

اس پر ایک قلی نے دروازے کو کھول دیا اور وہ تینوں ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

ہسپتال کی سنگین عمارت بہت وسیع تھی اور ساخت کے لحاظ سے کسی سرکاری دفتر کے مشابہ تھی۔ دو بڑے کمرے تھے ایک کھانے کا کمرہ اور دوسرا وہ جو کم تکلیف دہ مریضوں کیلئے مخصوص تھا۔ یہ کمرہ کافی فراخ تھا جس کے شیشے لگے ہوئے دروازے ایک باغ کی طرف کھلتے تھے۔ ان دو کمروں کے علاوہ بالائی منزل پر بیس چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں مریضوں کی رہائش کا انتظام تھا اور دو

اس کے لئے یہ دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب"؟

"نہیں تمہارا خیال شاید درست ہی ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اور اس کی حرکات کا مشاہدہ کرنے کے لئے کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

مریض کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک تیز قدم اٹھاتا ہوا چکر لگا رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ اپنے لبوترے سلیپروں کو فرش کے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ اور اپنی دھاری دار سوتی ڈریسنگ گون کو ادھر ادھر لہراتا جاتا تھا۔

ڈاکٹر کا معاون اور انسپکٹر جو اس کے ساتھ آئے تھے دونوں دروازے کی دہلیز پر خاموش کھڑے تھے۔

"میرے دماغ میں ایک ایسا ہی زبردست خیال محفوظ ہے" مریض چلتے چلتے ٹھہر کر کہنے لگا۔ "جب یہ میرے دماغ میں پیدا ہوا تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا میں دوبارہ جنم لے رہا ہوں۔ میرے حواس تیز ہو گئے اور میرا ذہن پہلے کی نسبت زیادہ کام کرنے لگ گیا اس سے قبل جن مسائل کو سلجھانے کیلئے میں گھنٹوں غور و فکر کیا کرتا تھا اب میں انہیں فوراً حل کر لیتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں میں نے فلسفہ کی انتہاؤں تک رسائی حاصل کر لی ہے میں اب اس فکر عظیم کا تجربہ کر رہا ہوں کہ زمان و مکان محض ایک قصہ ہے۔ میں ہر زمانے میں رہتا ہوں۔ میری جائے اقامت مکان کی سرحدوں سے بہت دور ہے، ہر ایک جگہ ہے یا کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ میری مرضی پر منحصر ہے چنانچہ میرے لئے یہ دونوں صورتیں یکساں ہیں کہ تم لوگ مجھے یہاں رکھو یا یہاں سے رخصت کر دو مشکیں کس لو یا کھلا چھوڑ دو۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ اس جگہ پر میرے ایسے بہت لوگ موجود ہیں نگران کے لئے یہ جگہ بہت ہولناک ہے۔ آخر تم انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے ہو؟ کون چاہتا ہے . . . . "

"تم نے ابھی ابھی کہا ہے" ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "کہ تم مکان کی سرحدوں سے بہت دور رہتے ہو مگر یہ چیز تم کو ہر حالت میں تسلیم کرنی پڑیگی کہ میں اور تم اس کمرے میں موجود ہیں اور اس وقت (ڈاکٹر نے جیب سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا) ساڑھے دس بجے ہیں اور مئی سنہ اٹھارہ سو کچھ کی چھ پانچ ہے۔ اب بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟"

اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے لئے دونوں صورتیں یکساں ہیں کہ میں کس زمانہ میں زندگی بسر کرتا ہوں یا کس مقام پر رہتا ہوں۔ جب میرے لئے ان میں کوئی فرق نہیں تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ہر جگہ پر ہوتا ہوں اور ہمیشہ ہوتا ہوں"۔

ڈاکٹر ہنس پڑا۔

"یہ بیہودہ منطق ہے اس نے کرسی پر سے اٹھ کر چلتے ہوئے کہا" شاید تمہارا خیال درست ہو، اچھا خدا حافظ۔ ہاں سگار پیو گے"؟

"شکریہ" کہہ کر مریض نے خاموشی سے سگار لیا اور اس کے ایک سرے کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ غور و فکر میں مدد دیتا ہے . . . . . یہ دنیا درحقیقت مائکروکوزم ہے۔ ایک طرف قلیات ہیں اور دوسری طرف تیزاب۔ دنیا میں معادلت یہی ہے کہ مخالف و متصادم عناصر ایک دوسرے کے اثر کو زائل کرتے ہیں ـــــ خیر، خدا حافظ ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ ان میں سے اکثر اپنے اپنے بستروں کے پاس کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی افسر اپنے ماتحتوں سے اتنا خراج توقیر و عزت وصول نہیں کرتا جتنا ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر اپنے دیوانے مریضوں سے وصول کرتا ہے۔

مریض جواب کمرے میں اکیلا تھا کمزوری کے باعث لرزتا ہوا ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ جب اس کے لئے چاء لائی گئی تو اس نے کھڑے کھڑے دو ہی گھونٹ میں چاء کا برتن خالی کر دیا۔ اور توس کا وہ ٹکڑا جو چائے کے ساتھ آیا تھا منہ میں ڈالتے ہی نگل گیا۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل کر بے پروا انداز میں چند گھنٹوں تک ہسپتال کی عمارت کے اندر چکر کاٹتا رہا۔

بارش کی وجہ سے فضا نم آلود تھی اس لئے مریضوں کو باغ میں جانے کی اجازت نہ تھی جب ڈاکٹر کا اسسٹنٹ نئے مریض کو تلاش کرتا ہوا آیا تو ملازموں نے غلام گردش کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پر وہ اس دروازے کے ایک شیشے کے ساتھ اپنا منہ جمائے ہوئے تھا جو باغ کی طرف کھلتا تھا اس کی تمام توجہ کا مرکز ایک سرخ پھول تھا ـــ گل لالہ کی قسم کا ایک پھول۔

"چلئے صاحب! آپ کا وزن کرنا ہے!" ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اس کے کاندھے کو چھوتے ہوئے کہا۔

جب مریض اس کی طرف مڑا تو وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں خوفناک طور پر تنفر اور حسد و بغض کے جذبات سے دہک رہی تھیں ڈاکٹر کے اسسٹنٹ کو دیکھ کر اس نے فوراً ہی اپنے چہرے کا رنگ بدل لیا اور کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ نہایت آرام سے چل پڑا گویا وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ وہ دونوں ڈاکٹر

کے پرائیویٹ کمرے میں لے گئے۔ مریض خود بخود ترازو کے چبوترے پر چڑھ گیا ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اس کا وزن کر کے اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا یہ ایک سو نو پونڈ تھا۔

جب دوسرے روز اس کا وزن کیا گیا تو ایک سو سات پونڈ تھا اس سے دوسرے دن یہ ایک سو چھ رہ گیا۔

اگر وزن اسی طرح گرتا رہا تو اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا اور اسے ہدایت دی کہ مریض کو مقوی ادویات اور غذا دی جائے۔ مگر زیادہ خوراک اور ادویات کے باوجود وہ روز بروز دبلا ہوتا گیا۔ اور ڈاکٹر کے اسسٹنٹ کی نوٹ بک میں اس کے وزن میں ہر روز ایک پونڈ کمی ہوتی رہی وہ رات کو ایک لمحے کیلئے بھی نہ سوتا تھا۔ اور دن بھر حرکت کرتا رہتا تھا۔

اس کو معلوم تھا کہ وہ پاگل خانے میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ بعض اوقات وہ پہلی شب کی طرح آدھی رات کے سناٹے میں جاگ پڑتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ اس کی تمام ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور اس کا سر بہت وزنی ہو گیا ہے۔ مگر وہ اس وقت بہت باہوش ہوتا تھا۔ اس کی وجہ شاید رات کے سکون میں خیالات و افکار کی غیر موجودگی تھی یا شاید اس لئے کہ نیم خوابی کی حالت میں اس کا دماغ بہت کمزور ہو گیا ہوتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ ان لمحات میں وہ اپنی حالت سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ گویا وہ ہم ایسا ہوشمند انسان ہے مگر پو پھٹتے ہی ہسپتال میں مریضوں اور ملازموں کی بیداری کا شور اور دن کی تیز روشنی اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا کر دیتی اور پھر اس پر جنون سوار ہو جاتا تھا۔

اس کا دماغ معقولیت اور بیہودگی کا ایک عجیب و غریب اجتماع تھا۔ وہ اتنا سمجھتا تھا کہ اس کے آس پاس سب مریض ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ خیال کرتا تھا کہ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کو وہ اچھی طرح جانتا ہے یا ان کے متعلق اس نے کسی سے سنا ہے یا کسی کتاب میں پڑھا ہے اور یہ کہ صرف اسی لئے وہ اس سے چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہسپتال میں تاریخ کی سب قوموں اور سب زمانوں کے لوگ آباد ہیں۔ کچھ وہ جو مر چکے ہیں۔ کچھ وہ جو زندہ ہیں، دنیا کے اکابر، بادشاہ اور وہ سپاہی جو گزشتہ جنگ میں کھیت آئے تھے اب دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ وہ کسی دائرہ سحر کے درمیان گھرا ہوا معلوم ہوتا تھا اور خود بینی کے جذبہ میں آ کر بعض اوقات وہ اپنے آپ کو اس دائرے کا حقیقی انسانی مرکز تصور کرتا تھا۔

ہسپتال میں ہر شخص کے ذمے کوئی نہ کوئی کام تھا اور وہ اس چیز کو ایک کار عظیم تصور کرتا تھا جس کا مقصد دنیا کے تمام معایب کو نیست و نابود کرنا ہے۔ گو اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ بدیوں کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے لیکن وہ خود میں اس کام کے لئے کافی و وافی قوت محسوس کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے خیالات میں نفوذ کر سکتا تھا۔ وہ ہر چیز کے باطن میں جھانک کر اس کی اندرونی کیفیات کا مطالعہ کر سکتا تھا مثال کے طور پر صحن کے دراز قد درخت اس کو اپنے تجربات کی تمام کہانیاں سناتے تھے۔ ہسپتال کی عمارت کو جو یقیناً پرانی وضع کی تھی۔ وہ پطرس اعظم کی تیار کردہ سمجھتا تھا۔ اس کو یقین کامل تھا کہ جنگ پولٹاوا کے دوران میں زار پطرس، اس عمارت میں قیام پذیر تھا۔ یہ علم اسے اس عمارت کی دیواروں، شکستہ پلستر کاری اور اینٹوں اور ٹائلوں کے ان ٹکڑوں سے معلوم ہوا تھا جو باغ میں بکھرے پڑے تھے وہ ان پر اس جگہ کی تمام تاریخ لکھی ہوئی پاتا تھا۔

قبرستان کے چھوٹے احاطے میں اس کے خیال کے متعلق ایسے ہزارہا لوگ آباد تھے جو عرصہ ہوئے مر کھپ چکے تھے۔ وہ اس کوٹھری کی کھڑکیوں کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے شیشوں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا جو قبرستان کے ساتھ باغ کے ایک کونے میں بنی ہوئی تھی۔ ان شیشوں کے ناہموار اور قوس قزح کی طرح رنگین عکسوں میں اسے ایسے چہرے جھلکتے معلوم ہوتے جو یا تو زندہ انسانوں کے ہوتے تھے یا وہ تصویروں سے متعلق ہوتے تھے۔

موسم اب بہت خوشگوار اور پیارا ہو رہا تھا۔ وہ دن بھر کھلی ہوا میں ٹہلتا رہتا۔ باغ کا وہ حصہ جو مریضوں کی سیر و تفریح کے لئے مخصوص تھا اس میں درخت کثرت سے اگے ہوئے تھے اور جہاں کہیں ممکن تھا پھولوں والے پودے بھی اگائے گئے تھے۔ ہسپتال کا منتظم ہر مریض کو مجبور کرتا تھا کہ وہ باغبانی میں تھوڑا بہت حصہ ضرور لے۔ چنانچہ سارا دن مریض روشوں پر جھاڑو دیتے۔ بوٹوں کو پانی دیتے اور اسی طرح کے دیگر کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

باغ کے ایک کونے میں بیروں کے درخت تھے۔ دوسرے کونے میں خاروں کا ایک جھنڈ تھا۔ درمیان میں ایک مصنوعی ٹیلے پر بڑے پیارے پھولوں کی کیاریاں بنائی گئی تھیں۔ سب سے اوپر والی کیاری میں شوخ رنگ کے پھول کھل رہے تھے درمیانی جگہ پر گل کوکب کا ایک نادر پودا تھا اس کا پھول بیچ میں سے زرد اور بیرونی پنکھڑیاں عنابی رنگ کی تھیں۔ یہ مقام باغ کا مرکز اور اس چمن کی دلکش

ترین جگہ تھی اور دیکھا گیا تھا کہ اکثر مریض اس کو بہت پراسرار اہمیت دیتے تھے نئے مریض کی نظروں میں بھی یہ جگہ غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ گویا یہ سب جگہ کا تاج ہے۔

روشوں کے ساتھ ساتھ پھول کھل رہے تھے۔ یہ بوٹے مریضوں نے اگائے تھے اس جگہ پر قریب قریب وہ تمام پھول موجود تھے جو ایک روسی باغ میں مل سکتے ہیں۔ گلاب، پٹونیا، تمباکو کی جھاڑیاں جن پر اودے رنگ کے پھول کھلتے ہیں، نسترن، چمیلی، گل لالہ۔ غرض کہ ہر قسم کے پھول موجود تھے۔ پھاٹک کے پاس گل لالہ کی [illegible] قسم کے تین پودے اگ رہے تھے۔ ان کے پھول عام قسم کے پودوں کے پھولوں سے بہت چھوٹے تھے۔ ان کا امتیازی نشان ان کے عنابی رنگ کی غیر معمولی شوخی تھی انہیں پودوں کے ایک پھول نے نئے مریض کی توجہ کو خاص طور پر اپنی طرف منعطف کرایا تھا جب ہسپتال میں داخل ہونے کے پہلے روز اس نے دروازے کے شیشے میں سے باغ کی طرف جھانکا تھا۔

جب وہ پہلی مرتبہ باغ میں آیا تو وہ سیڑھیوں پر ٹھٹک کر ان شوخ رنگ کے پھولوں کی طرف نظریں گاڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ یہ پھول صرف دو تھے جو محض اتفاقیہ طور پر دوسرے پھولوں سے بہت پرے ایک کونے میں ناہموار گھاس اور سرکنڈوں کے درمیان اُگے ہوئے تھے۔

پھاٹک کے باہر مریض قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ وارڈر نے جو ان کے پاس ہی کھڑا تھا ان سب کو ایک ایک سوتی ٹوپی تقسیم کر دی جس کے ماتھے پر سُرخ صلیبی نشان بنا ہوا تھا۔ یہ ٹوپیاں دوران جنگ میں فوجی ہسپتال میں استعمال کی گئی تھیں اور نیلام پر خریدی گئی تھیں۔ نئے مریض نے جو اپنے خیالات میں غرق تھا اس ٹوپی کے سُرخ صلیبی نشان کو بہت پُراسرار خیال کیا اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور اس کے سُرخ نشان کو بغور دیکھنے کے بعد گل لالہ کی طرف دیکھا۔ پھول ٹوپی کے نشان سے زیادہ شوخ رنگ تھا۔

"میدان اسی کے ہاتھ رہا ہے مگر پھر کیا ہوا آخیر دیکھا جائیگا"۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

یہ کہتا ہوا وہ سیڑھیوں پر سے اتر کر نیچے باغ میں آیا اور وارڈر کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے ایک کیاری پھاند کر اس سرخ پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ اس کو توڑنے کا ارادہ نہ کر سکا اس نے اپنے بڑھے ہوئے بازو میں ایک خلش اور جلن سی محسوس کی جو رفتہ رفتہ اُس کے تمام جسم پر پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پھول کے عنابی پنکھڑیوں سے کسی نامعلوم طاقت کی رو خارج ہو کر اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر رہی ہے وہ ذرا اور آگے بڑھا اور پھول توڑنے کے لئے اپنا ہاتھ اور آگے بڑھایا مگر اس کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ پھول اپنے آپ کو بچانے کے لئے ایک خطرناک قسم کی زہریلی اور بدبودار گیس چھوڑ رہا ہے۔ اس پر اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے اسی حالت میں آخری مرتبہ پھول کو توڑنے کی زبردست کوشش کی لیکن ابھی اس کا ہاتھ ڈنڈی تک ہی پہونچا تھا کہ دفعتہً ایک وزنی ہاتھ نے اس کے کاندھے کو پکڑ لیا — یہ وارڈر کا ہاتھ تھا۔

"پھولوں کو توڑنا اور کیاریوں کو روندنا منع ہے ہمارے یہاں تم ایسے بیسیوں پاگل ہیں اگر ان میں سے ہر ایک پھول توڑنے لگے تو یہاں بالکل اجاڑ ہو جائے"۔ بوڑھے وارڈر نے اس کے کاندھے پر سے ہاتھ نہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

اس پر مریض نے وارڈر کے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اس کی گرفت سے آزاد ہو کر بڑے اضطراب سے قدم اٹھاتا ہوا روش پر چلا گیا۔

"آہ بدقسمت لوگو" اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ "تمہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا تمہاری بصارت اس قدر کمزور ہے کہ تم خواہ مخواہ اس پھول کی حفاظت کر رہے ہو۔ کچھ بھی ہو مگر میں اس کو ضرور تباہ کر دونگا۔ آج نہیں کل ہم اپنی قوت کا اندازہ لگائینگے اور اگر اس کوشش میں میں فنا ہو گیا تو یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

دن بھر وہ باغ میں گشت لگاتا رہا۔ وقت کاٹنے کے لئے کبھی وہ ایک مریض کے ساتھ باتیں شروع کر دیتا اور کبھی دوسرے مریض کے ساتھ ٹہلنے لگ جاتا جب شام کی تاریکی چھانے لگی تو اس کا یقین حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اس نے دل ہی دل میں یہ کہا۔ "اب سب کام تیار ہے"۔ اس کو یقین تھا کہ اب ہسپتال کے آہنی سلاخوں والے دروازے گر پڑیں گے اور سب مصیبت زدہ لوگ بھاگ نکلیں گے۔ تمام دنیا لرز کر اپنا پُرانا لباس اتار دیگی اور نئے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔

ان خیالات میں کھویا ہوا وہ پھول کو قریب قریب بھول گیا لیکن جونہی وہ باغ چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا تو ایک بار پھر اس کی نگاہیں ان دو سُرخ پھولوں کی طرف پڑیں جو گھنی اور شبنم آلودہ گھاس کے درمیان اُگے ہوئے تھے۔ وہ ٹھہر گیا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی قطار سے علٰحدہ ہو کر وارڈر کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور کسی اچھے موقع کا انتظار کرنے لگا۔ کیاری پھاند کر کس سرعت سے ایک سرخ پھول توڑ کر اس نے اپنے کرتے کے دامن میں چھپا لیا۔ یہ

شخص نے نہ دیکھا۔ جب اس کے پیٹ کے ساتھ اس پھول کی شبنم آلود پنکھڑیاں مس ہوئیں تو اس کا رنگ لاش کی طرح زرد ہو گیا اور فرطِ خوف سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ سرد پسینے کے قطرے اس کی پیشانی سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ہسپتال میں لیمپ روشن تھے اکثر مریض اپنے اپنے بستروں پر لیٹے کھانے کا انتظار کر رہے تھے مگر چند بے صبری سے کمروں اور غلام گردش کے چکر کاٹ رہے تھے۔ بیمار مریض بھی ان میں شامل تھا۔ وہ مٹھیاں بھینچے ہوئے اپنے بازو کو چھاتی کے ساتھ اس زور سے لگائے ہوئے ادھر اُدھر چل رہا تھا۔ گویا وہ اس پھول کو دبا کر اس کی جان نکال دینا چاہتا ہے جو اس نے اپنے کرتے کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ جب کوئی شخص اس کے پاس سے گذرتا تو بڑی احتیاط سے پرے ہٹ جاتا وہ اتنی احتیاط کرتا کہ اس کے کرتے کے دامن کے ساتھ بھی نہ چھونے پائے۔

"میرے نزدیک نہ آنا، میرے نزدیک نہ آنا" وہ چلا پڑتا مگر ہسپتال میں لوگ اس کی اس چیخ پکار پر کوئی کان نہ دھرتے۔ وہ اسی طرح مکمل دو گھنٹے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ادھر اُدھر چکر کاٹتا رہا۔

"میں تم کو فنا کر دونگا۔ تمہارا گلا گھونٹ دونگا۔" وہ پھول سے مخاطب ہو کر وقتاً فوقتاً بڑے خوفناک اور منتقم لہجے میں کہتا رہا۔ کبھی کبھی وہ غصے میں اپنے دانتوں کو پیسنے بھی لگ جاتا۔

کھانا ڈریسنگ روم میں چنا گیا۔ لمبی اور ننگی میزوں پر بہت سی چوبی اور روغن شدہ تھالیاں پڑی تھیں جن میں پتلا دلیا دیا گیا تھا۔ مریض ان میزوں کے قریب بنچوں پر بیٹھ گئے اس پر ہر ایک کو سیاہ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا بانٹا گیا ہر آٹھ مریضوں کے لئے شوربے کی ایک ایک تھالی مخصوص تھی جس کو وہ چوبی چمچوں سے روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔

وہ چند مریض جن کو نسبتہً اچھا کھانا دیئے جانے کی اجازت تھی ان سے علیحدہ ہمارے مریض نے وہ کھانا جلدی جلدی نگل لیا جو وارڈ اس کے کمرے میں لایا تھا اور اس سے مطمئن نہ ہو کر ڈائننگ روم میں چلا گیا۔

"مجھے یہاں کھانے کی اجازت دی جائے۔" اس نے منتظم سے کہا۔

"کیا تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔" منتظم نے اس کے لئے تھالی میں کھانا چنتے ہوئے کہا۔

"مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے اور مجھے اپنی صحت برقرار رکھنا ہے اور اس کا انحصار تمام تر میری خوراک پر ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آج کل میں قطعاً سو نہیں رہا ہوں۔"

"کھاؤ بھلے آدمی کھاؤ اور جلدی جلدی تگڑے ہو جاؤ ۔۔۔۔۔ تاراس اس کو چمچ اور روٹی دیدیتا۔"

وہ برتنوں کے سامنے بیٹھ گیا اور دلئے کی ایک پلیٹ ڈٹ کر کھانا شروع کر دی۔ جب سب مریض کھا کر فارغ ہو چکے اور منتظم نے دیکھا کہ وہ ابھی تک کھائے چلا جا رہا ہے تو اس نے اس سے کہا۔ "بس کرو میاں اب بس کرو۔ بدہضمی کی شکایت مول لے لوگے۔ خیال رہے۔"

"آہ، کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ ان دنوں مجھے کتنی طاقت کی ضرورت ہے! کتنی قوت درکار ہے۔ اچھا خدا حافظ نکولائی نکولیچ" یہ کہہ کر مریض اٹھا اور بڑے تپاک سے منتظم کا ہاتھ دبایا۔ "خدا حافظ"

"مگر اب جا کہاں رہے ہو؟" منتظم نے مسکرا کر اس سے دریافت کیا۔

"میں، اب؟ کہیں نہیں، یہیں ٹھہرونگا۔ لیکن شاید کل ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔ آپ کی عنایات کا شکریہ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر ایک بار منتظم کا ہاتھ دبایا۔ اس کی آواز تھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

"حوصلہ کرو میاں حوصلہ کرو" منتظم نے اسے دلاسا دیا۔ "آخر ایسے تاریک خیالات سے فائدہ؟ جاؤ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔ تمہیں بہت بہت سونا چاہیئے۔ یہ تمہارے لئے بہت فائدہ بخش ہوگا۔"

مریض روتی آواز میں کچھ بڑبڑایا۔ منتظم اس کو چھوڑ کر نوکروں سے میزوں کے برتن صاف کرانے میں مشغول ہو گیا۔

نصف گھنٹے کے بعد ہسپتال میں سوائے اس مریض کے اور سب محوِ خواب تھے جو اپنے کمرے کے ایک کونے میں بستر پر کپڑے اتارے بغیر لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا گویا اس کو بخار چڑھ رہا ہے۔ وہ بار بار سینے پر اپنی مٹھیاں بھینچتا تھا اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چھاتی میں کوئی بہت ہی زہریلی اور گمنام زہر سرایت کر گئی ہے۔

رات بھر اس نے ایک لمحہ کے لئے آنکھ نہ جھپکی۔ اس نے پھول کو صرف اس لئے توڑا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ فعل ایک بہت بڑا معرکہ تھا جس کو انجام دینے کے لئے وہ مجبور تھا۔ جب اس نے اس پھول کو پہلی مرتبہ دروازے کے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا تھا تو سرخ پنکھڑیوں نے اس کی توجہ کو اپنی طرف

منتخب کیا تھا۔ اس وقت اس نے محسوس کیا تھا کہ بھری دنیا میں سے صرف اسی کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ دنیا کے تمام مصائب اس سرخ پھول میں جمع ہو گئے ہیں۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ان پھولوں سے افیون تیار ہوتی ہے اور شاید یہی چیز تھی جس نے اس کے دماغ میں جگہ پکڑ کر ایسے خطرناک وہم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اس پھول نے دنیا کی تمام بدیوں کو اپنی پنکھڑیوں میں پناہ دے رکھی تھی اور وہ خیال کرتا تھا کہ اس کی پنکھڑیاں صرف اسی لئے سرخ ہیں کہ وہ معصوم لوگوں کے خون اور مصیبت زدہ انسانوں کے آنسوؤں سے آلودہ ہیں۔

اس کی نظروں میں یہ پھول جو بظاہر نہایت ہی معصوم اور بے ضرر تھا خدا کے خلاف برسرپیکار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو توڑ کر فنا کر دیا جائے مگر یہ تو کام کا ایک حصہ تھا ـــــ اس کو یہ بھی دیکھنا تھا کہ کہیں یہ پھول اپنی زہریلی گیس پھینکنے پر کامیاب نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کو اپنے کرتے کے نیچے سینے کے مقام پر دبا رکھا تھا۔ اس کو امید تھی کہ صبح ہونے پر اس پھول کا تمام زہریلا اور فاسد مادہ مردہ ہو جائیگا یعنی وہ اس کے جسم میں داخل ہو جائیگا۔ اور وہاں نیکی اور بدی میں کشمکش ہوگی جو اس میدان میں جیتے گا وہ غالب رہیگا۔ پھر وہ خود فنا ہو جائیگا مگر اس کی یہ موت بہادرانہ موت ہوگی۔ وہ ایک ظفرمند سپاہی کی طرح جان دیگا۔ سپاہی جو انسانیت کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ اس لئے کہ اس سے قبل کسی شخص نے تن تنہا دنیا کی تمام برائیوں کو کچلنے کی ایسی غیر معمولی جرات نہ کی تھی "وہ برائیوں کے اس مخزن کو نہ دیکھ سکے مگر میں نے اس کو دیکھ لیا۔ اب میں اس کو فنا کئے بغیر کیونکر رہ سکتا ہوں۔ موت آتی ہے تو آئے"۔ وہ ایک عرصے تک اس وہم میں غلطاں و پیچاں بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔

صبح ہونے پر ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اس کو مشکل سے سانس لیتے ہوئے پایا مگر فوراً ہی اس پر دیوانگی کا دورہ ہوا اور وہ اضطراب کی حالت میں بستر پر سے کود کر باہر صحن میں چلا گیا اور دوسرے مریضوں سے پہلے سے بہت بلند آواز اور بڑے غیر مربوط انداز میں گفتگو شروع کر دی اس کو باغ میں جانے کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ صحن ہی میں ٹہلتا رہا۔

جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کا وزن دن بدن کم ہو رہا ہے اور وہ رات کو ایک لمحہ کیلئے بھی آنکھ نہیں جھپکتا بلکہ چوبیس گھنٹے حرکت کرتا رہتا ہے تو اس نے حکم دیا کہ اس کو افیون کے جوہر کا ایک تیز ٹیکہ لگایا جائے۔

مریض نے ٹیکہ لگواتے وقت کسی قسم کا شور برپا نہ کیا۔ خوش قسمتی سے اس کے دیوانے خیالات اس وقت اس عمل سے موافقت رکھتے تھے۔ وہ بہت جلد سو گیا اس کی وحشیانہ حرکات بند ہو گئیں اور وہ شور جو اس کے کانوں میں برپا تھا اور اس کی مضطرب چال کے لئے سر تال کا کام دیتا تھا خاموش ہو گیا۔ وہ بیہوش ہو کر ہر ایک چیز کو بھول گیا حتیٰ کہ اس پھول کو بھی جس کو اسے توڑنا تھا۔

مگر تیسرے روز جب اسے ہوش آیا تو اس کو اپنا ارادہ فوراً یاد آ گیا اور وہ اس بوڑھے وارڈر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو اس کے پلنگ کے قریب کھڑا تھا اٹھ بھاگا۔ وارڈر نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ فوراً ہی دوڑتا پھاندتا باغ میں پہونچا اور ایک ظفرمندانہ نعرہ لگاتے ہوئے پھول کو توڑ کر اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔

"تم پھولوں کو کیوں توڑتے ہو؟" وارڈر نے دوڑتے ہوئے اس سے فقط اس قدر دریافت کیا مگر مریض آتے ہی بستر پر لیٹ گیا تھا اور سینے پر اپنے دونوں بازوں کو جوڑے اس قدر واہی تباہی بک رہا تھا کہ وارڈر صرف اس کے سر سے سرخ نشانی والی ٹوپی اتار کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب اس کے وہم کی کشمکش پھر شروع ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ پھول میں سے بدی کی لانبی لانبی دھاریں نکل رہی ہیں جو سانپوں کی طرح رینگ کر اس کے جسم سے لپٹ رہی ہیں اور اس کو اپنے شکنجے میں کس کر اور اس کے بازوؤں کو دبا کر اس کے بدن میں اپنا خوفناک زہریلا مادہ داخل کر رہی ہیں اس نے رونا شروع کر دیا اور گالیوں کے ساتھ ساتھ جو وہ اپنے اس دشمن کو دے رہا تھا وہ دعا بھی مانگتا رہا کہ خدا اسے اس شر سے محفوظ رکھے۔

شام کے قریب جب پھول کی پتیاں مرجھا گئیں تو اس نے سیاہ شدہ پھول کو اپنے کرتے کے نیچے سے نکالا اور بوٹ سے اچھی طرح اس کو کچل دیا پھر وہ اس کچلے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھا کر غسلخانے میں چلا گیا۔ یہاں اس نے پھول کے باقی ماندہ اجزاء کو انگیٹھی کے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں پر پھینکدیا اور اپنے دشمن کو آگ پر جلتے۔ سکڑتے چڑچڑاتے اور آخرکار ایک سفید راکھ میں تبدیل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس نے اس راکھ کو پھونک سے اڑا دیا ـــــ اب پھول قطعی طور پر گم ہو گیا۔

دوسرے روز اس کی حالت پہلے سے ابتر ہو گئی اس کے چہرے کا رنگ خوفناک حد تک زرد پڑ گیا۔ گال اندر کو پچک گئے اور آنکھیں دھنس گئیں۔ مگر وہ اس کے

باوصف دیوانہ وار ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ گو اس کے قدم لڑکھڑاتے تھے اور اس کا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا مگر اس نے اپنی غیر مختتم گفتگو بند نہ کی اور بولتا رہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ اس پر کسی قسم کی زبردستی کی جائے۔" بوڑھے ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب ہمیں اس کی نہ ختم ہونے والی حرکات بھی تو بند کرنی ہیں اس کا وزن صرف ۹۳ پونڈ رہ گیا ہے۔ اگر اس کا وزن اسی رفتار سے کم ہوتا رہا تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ صرف دو تین دن ہی اور زندہ رہیگا۔"

ڈاکٹر نے کچھ دیر سوچا اور نیم سوالیہ لہجے میں کہا۔ "تو پھر مارفیا یا کلورل"

"کل مارفیا کے ٹیکے نے کچھ اثر نہیں کیا۔"

"تو اس کی مشکیں کس کر چارپائی پر لٹا دو ۔ ۔ ۔ مشکل ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اچھا ہو سکے گا۔"

چنانچہ اس کی مشکیں کس لی گئیں۔ اب وہ پلنگ کے آہنی ڈنڈوں کے ساتھ جکڑا ہوا ایک لمبا سا کرتہ پہنے لیٹا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی جنونی حرکات کم نہ ہوئیں۔ وہ بہت عرصہ تک بہت عرصہ تک اپنے آپ کو اس بندھن سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخرکار اس نے ایک زبردست جھٹکے سے اپنی ٹانگیں چھڑا لیں پھر اس نے دوسرے بندھنوں سے آزاد ہو کر کمرے میں ٹہلنا اور دیوانہ وار شور برپا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے اور وہ ان کو آزاد نہ کرا سکا تھا۔

"آہ، تم کو کیا ہو گیا ہے!" وارڈر اس کو اس طرح آزاد اور شور برپا کرتے دیکھ کر چلایا۔ "ضرور شیطان نے تمہاری مدد کی ہے۔ ۔ ۔ اے گرنیکا ۔ ۔ ۔ ایوان ادھر آئیو ذرا ۔ ۔ اس دیوانے نے سب رسیاں توڑ ڈالی ہیں۔"

دونوں نوکر بھاگتے ہوئے آئے۔ اب ایک طویل جنگ شروع ہو گئی جو ہسپتال کے ملازمین کے لئے باعث تکان اور مریض کے لئے سخت اذیت رساں تھی جو اپنی قوت کا آخری ذرہ تک اس میں صرف کر رہا تھا۔ انجام کار ملازموں نے بڑی مشکل کے بعد اس پر قابو حاصل کر لیا اور اس کو بستر پر لٹا کر پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اس کو کس دیا۔

"آہ، تم کو معلوم نہیں ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے ہانپتے ہوئے ان لوگوں سے کہا۔ "تم تباہ ہو جاؤ گے۔ میں نے تیسرا پھول دیکھا ہے پوری طرح کھلا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ کھل چکا ہوگا۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔ مجھے اس پھول کو تباہ کر دینا چاہئے۔ مار دینا چاہئے۔ ہلاک کر دینا چاہئے۔ پھر سب بدی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ ہر ایک شخص کی جان بچ جائیگی۔ میں تم لوگوں کو ہی یہ پھول توڑنے کے لئے بھیج دیتا مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں تم تو اس کو ہاتھ لگاتے ہی مر جاؤ گے۔"

"خاموش رہئے، جناب خاموش رہئے۔" بوڑھے وارڈر نے جو اس کی نگہداشت پر مامور تھا اس سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

اس پر مریض دفعتہ خاموش ہو گیا۔ اس نے وارڈر کو دھوکا دینے کا ارادہ کر لیا اس روز وہ سارا دن اور ساری رات اسی حالت میں پلنگ کے ساتھ جکڑا رہنے دیا گیا۔ شام کا کھانا کھلانے کے بعد وارڈر نے فرش پر ایک چٹائی بچھائی اور اس پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ یہ دیکھ کر مریض نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اس نے اپنے بدن کو حرکت دینا شروع کی حتیٰ کہ وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنی کلائیوں سے پلنگ کے آہنی ڈنڈے کو محسوس کر سکے وہ اس کپڑے کو جس سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس ڈنڈے کے ساتھ بڑے زور سے رگڑنے لگا تھوڑے عرصہ کے بعد وہ کپڑے کی گانٹھ ڈھیلی ہو گئی اور وہ اپنی ایک انگلی باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب باقی کام نکال آسان تھا اس نے کمال چابکدستی اور چالاکی سے جو کسی ہوشمند انسان کا حصہ ہو سکتی ہے اس گانٹھ کو کھول لیا جس سے اس کی کلائیاں پیٹھ کے پیچھے بندھی ہوئی تھیں۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ ایک عرصہ تک بوڑھے وارڈر کے خراٹوں کو سنتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اپنی جیکٹ اتار دی —— اب وہ بالکل آزاد تھا۔

بستر سے اٹھ کر وہ دروازے کی طرف گیا مگر وہ اندر سے مقفل تھا اور چابی یقینی طور پر بوڑھے وارڈر کے جیب میں تھی اس خوف سے کہ شاید بوڑھا وارڈر جاگ پڑے اس کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس کی جیب ٹٹولے۔ چنانچہ اُس نے کھڑکی میں سے باہر نکلنے کا تہیہ کر لیا۔

رات تاریک، گرم اور پرسکون تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ سیاہ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ان مانوس اجرام فلکی کو پہچانتے ہوئے وہ اس خیال سے بہت مسرور ہوا کہ وہ اسے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آنکھیں جھپکتے ہوئے روشنی کی ان غیر مختتم کرنوں کو دیکھا جو ستارے اس کی طرف بھیج رہے تھے اس سے اس کا

دیوانہ ارادہ اور بھی مضبوط ہوگیا۔ اب اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ جنگلے کی سلاخوں کو خم دیکر ان کے درمیانی حصے سے اس گلی میں جو جھاڑیوں اور گھاسوں سے بھری ہوئی ہے کود جائیگا اور پھر سنگین دیوار پر چڑھ کر باغ میں چلا جائیگا۔ پھر آخری جنگ ہوگی اور اس کے بعد . . . موت! . . . مگر اس کو اس کی بالکل پروا نہ تھی۔

اس نے جنگلے کی موٹی سلاخ کو اپنے ہاتھوں سے موڑنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ آخر کار اس نے اپنے کرتے کو بل دیکر موٹی رسی کی شکل میں تبدیل کیا اور اس کو جنگلے کی ایک کیل سے کس کر باندھ دیا اور اس کا ایک سرا پکڑ کر لٹک پڑا۔ بڑی کوششوں اور جھٹکوں کے بعد کیل خم کھا گئی اس سے سلاخوں کے درمیان ایک تنگ راستہ پیدا ہوگیا۔ اس نے اپنے جسم کو سکیڑ کر بڑی مشکل سے خود کو اس راستے سے باہر نکالا۔ مگر ایسا کرتے ہوئے اس کے کاندھے گھٹنے اور اس کی کہنیاں بہت بری طرح چھل گئیں اب وہ سنگین دیوار کے سامنے جھاڑیوں میں کھڑا تھا۔

سب طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیمپوں کی دھندلی روشنی ہسپتال کی بلند عمارت کی کھڑکیوں پر پڑ رہی تھی مگر ان میں کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا اس کے یہ معنی تھے کہ کسی نے اس کو کمرے سے باہر نکلتے نہ دیکھا تھا۔ بوڑھا وارڈر بلنگ کے قریب چپائی پر شاید گہری نیند سو رہا تھا۔ ستارے اس کی طرف دیکھ کر ہمدردانہ طریق پر ٹمٹما رہے تھے۔ اس کی نورانی شعاعیں ٹھیک اس کے دل کے اندر نفوذ کر رہی تھیں۔

"میں تمہارے پاس آرہا ہوں"۔ اس نے مدھم آواز میں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ابتدائی کشمکش سے اس کا بدن چھلنی ہو رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن ٹوٹ گئے تھے اور اس کے ہاتھ اور گھٹنے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اب وہ جھاڑیوں میں کھڑا دیوار پر چڑھنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا اس مقام پر جہاں قبرستان اور باغ کی دیواریں آپس میں ملتی تھیں چند اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں مریض ان خالی جگہوں کی مدد سے دیوار پر چڑھ گیا اور درخت کی ایک شاخ پکڑ کر بڑی آہستگی سے باغ میں کود گیا۔

سیڑھیوں کو طے کر کے وہ بھاگا ہوا لالہ کے پودوں کی طرف بڑھا پھول کی ننھی سرنگوں تھی اس کی پتیاں پیچھے کی طرف سمٹی ہوئی تھیں مگر یہ شبنم آلود گھاس میں نمایاں طور پر نظر آرہا تھا۔

"یہ آخری ہے" مریض نے زیر لب کہا۔ "سب سے آخری۔ آج یا تو فتح نصیب ہوگی یا موت مگر ان میں سے جو کچھ بھی ہو۔ میرے لئے اب ایک ایسی اہمیت رکھتی ہے ذرا انتظار کرو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "میں بہت جلد تمہارے پاس پہونچ جاؤنگا"

اس نے پودے کو اکھیڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور پھول کو مٹھی میں دبا کر اسی راستے سے اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ جس سے وہ آیا تھا۔ بوڑھا وارڈر ابھی تک سو رہا تھا مریض اپنے بستر پر لیٹا ہی ہوگا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔

دوسرے روز صبح کو وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا اس کا چہرہ پرسکون اور منور تھا ـــــ اس کے لاغر شدہ پتلے ہونٹوں اور اندر کو دھنسی ہوئی سبز آنکھوں سے ظفرمندانہ مسرت کا اظہار ہوتا تھا جب ہسپتال والوں نے اس کی نعش کو تابوت میں لٹایا تو انھوں نے اس کی بند مٹھی سے سرخ پھول کو نکالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس کا ہاتھ بہت اکڑ چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی فتح کے نشان کو اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گیا۔

اُن کا ــــ؟ انتظار

سحبان الہند علامہ کیفی چریا کوٹی،

(۱)

رات وہی ہے، دن وہی، جوش ہے انتظار میں
لیجئے! فرق آگیا، گردشِ روزگار میں

ذوق کے اعتبار سے جور کا اب پتہ نہیں،
اور وفا کے شوق میں جبر ہے اختیار میں

قلب میں موجِ ذوق ہے آنکھ میں رنگِ شوق ہے
کوئی ہے انتظار میں، کوئی ہے اعتبار میں

یاد کسی کی دل میں ہے رنگ رخِ نشاط کا
مست مشام ہو گیا، پھول کھلے بہار میں

باغ یہی ہے وہ نہیں نام بھی جس میں خار کا
جو ریں جو نمود ہے، رنگ یہاں ہے پیار کا

(۲)

کان ادھر لگے ہوئے آنکھ اُدھر اٹھی ہوئی
اور جبین آرزو جانبِ در جھکی ہوئی

پاؤں کی چاپ ہر گھڑی ایک کھٹک ہے سانس کی
شکل قدم کے نقش کی قلب میں ہے، بنی ہوئی

وردِ زباں پہ نام ہے، قلب میں اہتمام ہے
"لیجئے اب وہ آگئے" ایک ہی رٹ لگی ہوئی

پیکِ خیالِ شوق کا راہ میں رہبری کو ہے
آنکھ زمیں بنی ہوئی اور نظر بچھی ہوئی

پاؤں کو چومتا ہوا شوق جو "اُن" کو لائے گا
جان اگر طلب کرے آج تو اُس کو پائے گا

(۳)

ایک وہی چراغ ہیں اور جہاں ہے انجمن
رنگ وہی ہے پھول میں پھول بھی حاصلِ چمن

ماہ میں ٹھنڈی روشنی ان کے ہی دم قدم سے ہے — مہر کے آئینہ میں بھی عکس انہیں کا ضو فگن
صبح کی دلفریبیاں، شام کی خوش نمائیاں — رنگِ شفق میں ہیں وہی حسن انہیں کا ہر کرن
روح کا وہ قرار ہیں، عیش کی وہ بہار ہیں — مہر کا وہ سنگار ہیں قہر ہے ان کا بانکپن

پائے خرام ناز ہے ان کا جہانِ آرزو
جسم ہے آرزوئے دل، اس میں وہ جانِ آرزو

(۴)

ایک انہیں کی ذات میں حاصلِ کائنات ہے، — پاؤں میں ان کے خاک ہے یا وہ مری حیات ہے
خوف نہ ہو گناہ کا تو میں انہیں خدا کہوں — اور میں ان کو کیا کہوں لاکھ میں ایک بات ہے،
آنکھ سے میری دیکھئے، میرے ہی دل سے پوچھئے — ایک انہیں کا دیکھنا حاصلِ شش جہات ہے،
عشق کی شرع میں سنا قول ہے مستند یہی — ایک انہیں کی رہبری میرے لئے نجات ہے،

باب پہ ان کے شوق کے خم یہ سرِ نیاز ہے
اور ادا جو ہوسکے دل کے لئے نماز ہے

(۵)

جوش میں اضطراب ہے شوق میں پیچ و تاب ہے، — اور کہوں تو کیا کہوں؟ حال مرا خراب ہے
راز کی بات ہے مگر میں نہ کہوں تو کیا کروں؟ — شوق جو جاں گداز ہے زیست مجھے عذاب ہے
رات جو ہے تو کوہِ غم، دن ہے تو محشرِ الم — ہجر کے بس میں پڑ گئی جان کا کیا حساب ہے
ہجر میں کل بدل گیا ہائے نظامِ زندگی — جان میں اضطراب ہے قلب میں التہاب ہے،

یاد ہے مجھ کو قول یہ کیفیؔ غم نواز کا،
حسن و جمالِ دلنشیں شمع میں ہے گداز کا،

شاہی عید کا جلسہ

ایک تاریخی مضمون،

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

آخری شاہ اودھ جان عالم حضرت محمد واجد علی شاہ اختر کا سامان عید جو لکھنؤ میں بزمانۂ بادشاہت تھا اس کا ذکر تو بارہا ہوتا رہا ہے لیکن بعد زوال سلطنت جب سلطان عالم کلکتہ میں تشریف لائے اور مصائب قید و بند سے نجات پائی تو دل بہلنے کا سامان کافی نہ تھا۔ ہر وقت طبیعت گھبراتی تھی سلطنت اودھ کی یاد بیچین کرتی تھی۔ موچی کھولا عرف مٹیا برج میں کوٹھی عالیشان خرید کی، اور بہت سے محل بنوائے۔ سلطان خانہ تعمیر ہوا۔ نور محل بنوایا۔ تفریح بخش، فرحت منزل۔ تاج منزل۔ خلوت منزل۔ دولت منزل۔ جشن منزل۔ نشاط منزل۔ بیت السرور۔ جواہر منزل۔ بادشاہ منزل۔ قصر المنزل۔ فلک سیر گوشہ شہنشاہ منزل۔ حسن منزل۔ اسد منزل۔ زرد کوٹھی۔ رادھا منزل بسارد منزل۔ پری منزل۔ نور منزل۔ حشمت منزل۔ باغ دلکشا۔ باغ فلک۔ سلطان باغ۔ ہمایوں باغ۔ گلستان ارم۔ خاص منزل تیار ہوئے۔ اس کے بعد حضور نے اپنے دل بہلنے کے واسطے رہس کا آغاز کیا اور رہس والیاں مقرر ہوئیں ان کی تنخواہیں طے کرکے ان سے متعہ کیا تاکہ نامحرم پر نظر نہ پڑے۔ عید کے روز شب بھر رادھا کنھیا کا رہس کھیلا جائے جس کا آغاز اس طرح ہوا رہس والیاں سب سارد امنزل میں ــــــ رہتی تھیں اور ان کے کمرے الگ الگ ہوتے تھے۔ یہ رہس صرف بادشاہ، شہزادے۔ شہزادیاں اور اعزا و اقارب اور محلات کی خوشی کے واسطے ہوتا تھا اور صبح تک ہوتا تھا۔

طریقہ یہ تھا کہ پہلے ملکہ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ مع خدم و حشم تشریف لاتی تھیں۔ پھر حضور ملکہ عالیہ ملکہ اودھ رونق آرا بیگم نواب اختر محل صاحبہ رونق افروز ہوئیں۔ ملکہ تاج النسا۔ معشوق محل صاحبہ۔ ملکہ شاہ زمانہ نواب دل آرا بیگم۔ ملکہ مہرتن افسر النسا بیگم عرف نشاط محل صاحبہ۔ ملکہ سیمتن، نواب اچھی بیگم صاحبہ۔ ملکہ زمانہ مہدی بیگم صاحبہ۔ نواب واجد محل بیگم صاحبہ شہزادہ محل نواب گیہان بیگم صاحبہ۔ نواب یادگار محل۔ فخر محل۔ خاقان محل محبوبہ محل۔ نواب فخر محل صاحبہ۔ نواب مغل محل صاحبہ۔ الفت محل۔ نواب صاحبزادی بیگم صاحبہ، نواب شباب محل صاحبہ وغیرہ وغیرہ رونق افروز ہوئیں۔ پھر بہوئیں تشریف لائیں۔ ملکہ ؟ النسا بیگم صاحبہ۔ نواب بادشاہ بہو صاحبہ۔ نواب مسرت آرا بیگم صاحبہ۔ نواب فغفور بہو صاحبہ۔ نواب ملکہ معظم تاج عالم بلقیس جہاں مریم دوراں نیاہات النسا بیگم صاحبہ۔ نواب شہریار بہو صاحبہ۔ پھر داماد بادشاہ نواب تاجدار دولہا۔ نواب شہریار دولہا صاحب وغیرہ پھر مرشدزادے تشریف لائے۔ پھر رہس والیاں اپنے اپنے مقام پر آگئیں پردہ پڑ گیا۔ یہ سب کنھیا رہس کی ایکٹر ہیں۔ نواب چمنستان بیگم صاحبہ کنھیا کا پارٹ کرتی تھیں۔ گہنا مع پشواز پہنا۔ گلوبند کارچوبی باندھا۔ مکٹ کارچوبی لگایا۔

نواب دہرا فروز بیگم صاحبہ نے رادھا کا پارٹ کیا۔ نتھ پہنی۔ بینہ لگائی۔ تمام ہندوانی زیور پہنے پھر گھیتیا پشواز پہنی۔ چاندی کی بانسری ہاتھ میں لیکر تیار ہوگئیں۔

زعفران پری، یعنی نواب ہادی بیگم صاحبہ جو فن رقاصی و موسیقی میں بہت مہارت رکھتی تھیں۔ کارچوبی دو پر لگائے جامہ حسن پر زر پہنا۔ ہر قسم کے زیور پہنے۔ پائجامہ زریں زیب جسم کرکے پری بن گئیں۔

ارغوانی پری نواب پیاری بیگم صاحبہ نے ارغوانی پر لگائے۔ پشواز پہنی

زیور پہنے گھنگھا کارچوبی پہنا۔ ارغوانی پری کا پارٹ ادا کیا۔

للتا سکھی، چپن سکھی۔ سالکھا سکھی۔ لڑوا سکھی۔ جیغہ کلغی۔ سلطان بند تمام زیور پشواز۔ دوپٹہ۔ پائجامہ پہنکر سکھیوں کا پارٹ کریں۔ نواب آغائی بیگم للتا سکھی۔ نواب سلطانی بیگم چپن سکھی۔ نواب زہرہ بیگم مُرلا سکھی نواب احمدی بیگم مُرلا سکھی بنیں۔

نواب خوش آرا بیگم نے جوگن کا پارٹ کیا۔ تہمد شنجرفی۔ کفنی لمبی۔ بال مصنوعی جٹاکے مصنوعی نقلی سانپ گلے اور کپڑے میں لٹکائے۔ جھولی داہنے شانے پر تونبی بیراگی ہاتھوں میں بھبوت سچے موتیوں کا لگائیں۔

نواب خوش قدر بیگم نے عفریت دیو کا پارٹ کیا۔ جاکٹ پتلون سیاہ داستانہ سیاہ۔ موزہ سیاہ۔ چہرہ مٹی کا کالا۔ گرز چوبی سیاہ۔

مروت پسند غربت کا پارٹ کریں۔ انگرکھا۔ پائجامہ۔ چکن سفید۔ کمربند دستار باندھ کر تیار ہو جائیں۔

نواب لاڈلی بیگم صاحبہ رام چیرا بنیں۔ دھوتی۔ مرزئی۔ جنیو۔ انگوچھا ہاتھ میں چاندی کا کڑا پہن کر تیار ہوئیں۔

اب پردہ اٹھایا جائے۔ ایک نورانی بارہ دری میں سب سکھیاں گاتی نظر آئیں۔ ایک جانب ارغوانی پری اور زعفران پری کرسیوں پر جلوہ افروز ہوں۔ دیو پریوں کے سامنے گرز گراں لئے ہوئے کھڑے ہوں۔ ایک کرسی پر جوگن بیٹھی ہوئی نظر آئے۔ اس کے قریب غربت دست بستہ کھڑا ہو۔ بیچ کے در میں رادھا کنھیا عجیب شان و شوکت سے اپنی اپنی کرسیوں پر رونق افروز ہوں۔ رام چیرا دونوں کی خدمت میں دست بستہ کھڑا ہو۔ چار سکھیاں بیچ میں کھڑے ہو کر بادشاہ کی ٹھمریاں گاتی ہوں اور بعد ختم ٹھمری کہیں جیتی رہو جان عالم۔

غربت جوگن کے سامنے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہے۔ جگ جگ جیو انند رہو جوگن صاحبہ کاہے جی ملین ہے؟

جوگن:۔ چوبیس برس سے میں نے اس غم میں جوگ لیا ہے کہ رادھا اور کنھیا کا ناچ نہیں دیکھا۔

غربت:۔ تو میں اس کی تدبیر کرتا ہوں۔ آپ غم نہ کریں۔

غربت جاتا ہے اور عفریت دیو سے ملتا ہے۔

عفریت:۔ بھائی غربت آج تم کہاں آئے؟

غربت:۔ ہماری جوگن صاحبہ کہتی ہیں مجھے رادھا کنھیا کا ناچ دکھا دو۔

عفریت پریوں کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک جوگن کہتی ہے کہ ہمیں رادھا کنھیا کا ناچ دکھا دو۔

زعفران پری۔ اچھا تو اس بیچاری جوگن کو یہاں لے آؤ۔

جوگن کو تخت پر بٹھا کر عفریت لاتا ہے اور زعفران پری کے سامنے پیش کرتا ہے۔

زعفران پری:۔ کیوں جوگن جی تم رادھا کنھیا کا ناچ دیکھنا چاہتی ہو؟

جوگن:۔ بیس برس سے اس غم میں جوگن بنی ہوں کہ رادھا کنھیا اور ان کی سکھیوں کا ناچ دیکھوں۔

زعفران پری:۔ عفریت جوگن کو رادھا کنھیا کا ناچ دکھا دو۔

عفریت رادھا کنھیا سے کہتا ہے زعفران پری نے کہا ہے اپنا ناچ معہ سکھیوں کے جوگن کو دکھا دو۔

اس وقت سکھیاں کھڑی ہو کر ایک چادر تانیں اور رادھا کنھیا ہنڈولہ بہت سریلی آواز میں گائیں جوگن بیہوش ہو جائے۔

استھائی راگ ہنڈولہ۔ ہنڈولہ جھولے سیام۔ سیام کمینی گھٹا چلت پلون سننہ ننہ سننہ ننہ سننہ ننہ۔

پہلا انترہ۔ سب سکھیاں مل کے پینگ بڑھاؤ۔ لیکے تان تنہ تنہ تنہ تنہ تنہ تننہ۔

دوسرا انترہ۔ مورمکٹ کٹ راکھ رو کنڈر پائل باجے جھننہ جھننہ جھننہ ننہ۔ جے رام چندر جی کی۔

پردہ اٹھ جائے اور کنھیا جی ایک طرف کھڑے ہوں۔ ان کے دو سکھیاں ہوں۔ دوسری طرف رادھا کھڑی ہوں ——— ان کے ساتھ دو سکھیاں ہوں۔

اب دونوں میں سوال و جواب شروع ہو اور ایک دوسرے کو پہچانے اور تھ بھاؤ ہوتا جائے اور چکر لگائیں۔ مطلع رادھا کا۔

مجمع غم میں ایسا ستم ایجاد کیا قاتلا بھول کے ہم کو نہ کبھی یاد کیا

دوہرا:۔ میں برہنی سنجوگ سنگ نہ کو و ساتھ + ناری ثبوت بید کے پھیلا کے ہاتھ۔ جواب کنھیا جی کا۔

نام میرا کنھیا میں تجھے جانتا ہوں۔ رادھا جی جان سے میں تجھکو سوا مانتا ہوں

رادہا جی کے انگ پہ بنیا او چھب دیت   مانو پھول کیتکی بھنور باس لیت

جواب رادھا۔ میں ترے غم میں دیوانی ہوئی اے گانا   میں نے جی جان سے تم کو تو یہاں پہچانا۔

دوہرا:۔ او پیارے موہن پلک ڈھانپ توہے لیوں   نا میں دیکھوں اوران کو اور نا توہے دیکھنے دیوں۔

جواب کنھیا:۔ عشق تیرے رادھا جی جنگل جنگل چھانا   دیو پری نے بھی مجھکو کبھی نہیں پہچانا۔

جواب رادھا:۔ ندی کنارے دھواں اٹھے میں جانوں کچھ ہوئے!
جن کے کارن میں جلی کہیں ہی نہ جرنا ہوئے!

سوال رادھا کا:۔ راجن کے راج ادھراج مہراج جگ جگ جیو انند رہو وہ مُرلی جس میں چھ راگ چھتیس راگنیاں باجت ہیں کہاں چھوڑ آئے؟ دہی بجاؤ۔

کنھیا کا جواب:۔ راجن کے راج ادہ رانی۔ ہمارا مالوا سیس دیت ہے جگ جگ جیو انند رہو۔ رام دہائی وہی مُرلی کھوگئی۔

جواب رادھا:۔ لگا کھوب چینت ہوں۔ تم کہرے کو دے آئی ہو۔ یہ کہہ کر رادھا جی خفا ہوگئیں اور الگ بیٹھیں۔

کنھیا جی ان کی منت کرنے لگے۔ پاؤں پر گرے ادہا تھ باندھکر منانے لگے پھر مجبور ہوکر کنھیا جی رام چیرا کو پکاریں۔

رام چیرا:۔ ہاجر مہراج ہاجر

کنھیا جی:۔ رادہا جی خفا ہیں کہ تم مرلی کہرے کو دے آئے ہو اور مانت نا ہیں۔

رام چیرا:۔ پھر مناؤ کسی سکھی کو بیچ میں ڈالو۔

کنھیا جی:۔ ارے للتا،

للتا:۔ آئی مہراج، تال میں کروں کے ساتھ ناچتی ہوئی جائے۔

کنھیا:۔ ہمرے رادہا رسیا گئے کا کروں۔

للتا:۔ منتی کرو۔ چرودری کرو۔ موڑ گھسو۔ ناک رگڑو۔

کنھیا:۔ (رادہا جی کی چرودری کرتے ہوئے) رادہا جی موسے بول کیوں نا ہے انترا۔ کا موسے کچھ چوک بھئی۔ موری رانی ہنس ہنس گھونگھٹ کھول کیوں نا ہے۔ جب یہ بہت منتی کریں اور سب سکھیاں جمع ہوجائیں۔ تب کنھیا جی کھڑی ہوجائیں اس وقت رام چیرا کہے مہراج رادہا کو دانا سے مانگو۔

اور تپشیہ کرو۔ کنھیا جی آسن مار کر ناک پکڑ کر سانس روکیں۔ فوراً رادہا جی اٹھ کر گلے چمٹالیں۔

پھر سکھیاں لڈو پوجا کریں۔ یعنی کنھیا جی گال پھلا کر آنکھیں حیرت زدہ بنائیں کہ پتلیوں کو حرکت نہ ہو اور بائیں پاؤں سے کھڑی ہوں۔ اور دہنے پاؤں کو بائیں گھٹنے پر رکھیں۔

اور چاروں سکھیاں دہنے گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر بائیں پاؤں کو اونچا کرکے دونوں ہاتھوں کو گول لڈو کے مانند بنا کر اور ہاتھوں کو گردش دیتی ہوئی کنھیا کے گالوں کو ٹھوکا دیں اور کہتی جائیں لے لے لڑوالے۔ پھر سب سکھیاں گا کر بیٹھ جائیں۔ کنھیا جی کھڑے ہوکر دوہرا گائیں۔

مرلی ہمری کھوگئی متھرا سنہ رابن کے ریت
نا موہے سوجھت اور چھوڑ نا موہے سوجھت میت

رادہا:۔ مہراج میری خوشی چاہتی ہو تو مُرلی ڈھونڈھ کر لاؤ۔

کنھیا:۔ اچھا مرلی ڈھونڈت ہوں اور سب سے کہیں ہماری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔

رام چیرا:۔ ہمری مُرلی کسی نے دیکھی ہے؟

کنھیا جی اسے ایک گھونسا ماریں اور کہیں مُرلی ڈھونڈتے ہی کہ مر گئی پھر کہیں۔ ہمری مرلی کسی نے دیکھی ہے۔

رام چیرا کہے۔ ہمری بھینس کسی نے دیکھی ہے۔ پھر کنھیا اسے دھکا دے کر نکال دیں۔

اس وقت کنھیا جی مسافر سے پوچھیں۔

کنھیا:۔ میاں مسافر کہاں سے آتے ہو؟

مسافر:۔ متھرا بندرابن سے آتا ہوں۔

کنھیا جی:۔ ہماری مرلی بھی کسی کے پاس دیکھی ہے۔

مسافر:۔ ہاں دیکھی ہے۔ پنگھٹ پر چار پنہاریاں پانی بھرتی ہیں ان میں ایک گوری مکھی نانی سی ہے اس سے مانگ لاؤ۔

کنھیا جی پنگھٹ پر جائیں اور منت سے کہیں۔ تم کو لڈو کھلائینگے ہماری مُرلی دے دو۔

پنہاریاں:۔ جاؤ جاؤ یہاں مرلی نہیں ہے۔

آخر ایک پنہاری کہے۔ "راجن کے راج ادھراج، شیوبر دہان،

جگ جگ جیوا مند رہو۔ ہم کو تازہ مکھن لادو تو تمھاری مرلی دیں۔
مکھن متھتی جائیں اور کہیں اب دہی میں ماکھن بچن جات ہوں۔ کنھیا جی جب مکھن مانگیں تو وہ گانا شروع کر دیں۔ آخر کنھیا جی کچھ مکھن چرا کر لائیں پنہاریوں کو دیں اور ان سے اپنی مرلی لیں اور بجائیں تو رادہا جی دوڑ کر ان کے گلے سے چمٹ جائیں۔

رادہا مہراج کا بول بالا رہے اب ہمرا من خوش ہوا۔
تم گدی پر براجو میں تمھارے آگے گاؤں اور ناچوں۔

اس گانے کے بعد دونوں کو مبارک باد دی جائے اور جلسہ ختم ہو بادشاہ سلامت اور سب اعزہ و اقربا اپنے اپنے محلات میں تشریف لے گئیں اسی طرح بادشاہ کی دلبستگی کے بہت سے سامان مہیا تھے تاکہ زوال سلطنت کا رنج ان کو نہ ہو۔

رادہا منزل والیاں سب سے پہلے تیار کی گئی تھیں۔ یہ کل اٹھارہ تھیں ان سب کو ایکہزار آٹھ سو چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی۔
دوسری سارد منزل والیاں پندرہ تھیں۔ آٹھ سو اکسٹھ روپیہ ان کو دیا جاتا تھا۔
تیسری سلطان خانہ والی چوبیس[۲۴] بیگمیں تھیں جو سب بادشاہ کی ممتوعہ تھیں ماہوار دو ہزار چونتیس روپیہ ان کو دیا جاتا تھا۔
چوتھا رہس حضور والیوں کا ہے۔ یہ خاص منزل والیاں کہلاتی ہیں سب گیارہ بیگمیں ہیں۔ تنخواہ چار سو پینسٹھ روپیہ ماہوار ملتی ہے۔
پانچواں رہس سرور منزل والیوں کا ہے ان کو صاحبات خلوت بھی کہتے ہیں۔ ان میں اکثر سن رسیدہ ہیں۔ سب ممتوعہ ہیں کل سولہ بیگمیں ہیں۔ تین سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔
چھٹا شہنشاہ منزل والیاں ان کو رہس کی تعلیم نہیں دی کل تنخواہ تین سو چالیس روپیہ ماہوار ہے اس میں آٹھ بیگمیں ہیں۔
ساتویں جلسہ والیاں ہیں۔ یہ چھوٹے جلسہ والیاں ہیں۔ سات بیگمیں ہیں یہ ممتوعہ ہیں دو سو روپیہ ماہوار ان کو دیا جاتا ہے۔
آٹھویں جلسہ والیاں یہ سب پانچ بیگمیں ہیں۔ نور منزل والیاں کہلاتی ہیں۔ بادشاہ اس جلسہ سے نہایت خوش تھے کل تنخواہ دو سو چھتر تھی۔
نواں جلسہ یہ جلسہ حال میں مقرر کیا گیا تھا۔ نواب زینت بیگم اور نواب سحر نگہ سے بادشاہ متعہ کر چکے تھے۔ باقی متوقع متعہ کی تھیں۔ سب گیارہ بیگمیں تھیں۔ یہ جواہر منزل والیاں مشہور ہیں۔ تنخواہ کل کی تین سو پچاس روپیہ ماہوار تھی۔ سنہ ۱۲۹۲ھ میں یہ جلسہ رہس سکھانے کے لئے مہتاب الدولہ نواب درخشاں کے حوالے کیا گیا۔
دسواں یہ خاص جلسہ والیاں مشہور ہیں کل سات بیگمیں ہیں تین ممتوعہ ہیں۔ باقی امیدوار متعہ ہیں فی کس ستر روپیہ ماہوار تنخواہ ہے اور بادشاہ خود ان کو تعلیم دیتے تھے۔ تین برس کی تعلیم سے سروں میں بخوبی واقفیت ہو گئی۔ نچانا۔ گوانا۔ ارتھ بھاؤ بتانا۔ ٹکڑے پاؤں سے ادا کرنا سب بادشاہ نے سکھایا کسی سازندے۔ مغنی۔ رقاصی۔ وزندے کو اس میں ذرا دخل نہیں بلکہ بادشاہ کے سوا تعلیم کے وقت آنے کی اجازت نہیں۔ اگر کبھی بادشاہ کا جی چاہتا تو سازندوں کو ساتھ بجوانے کا حکم دیتے ہیں۔ تین مہینہ میں جنکوہر۔ دھرپد۔ جرنگ۔ نردت ترانہ۔ دھمال۔ روپک۔ تبورا۔ چوتالہ دیمھا۔ تتالہ۔ کبھر کی جیب۔ برم لچھی۔ سولفاضہ۔ چھب تالہ۔ چاچر غزل ادھا۔ خیال۔ ٹھمری گا لیتی ہیں۔ طنبورے پر کام کرتی ہیں۔ بغیر طنبورہ گلے کے سروں پر گا سکتی ہیں۔ جو دھر لچھی کے چھ ٹکڑے پاؤں سے نکالتی ہیں۔ دو تین سو چیزیں سب طرح کی آج تک سکھائی گئی ہیں۔
نقلیں بھی مضحک کرتی ہیں۔ صورت اس کی یہ ہوئی کہ بادشاہ نے نو جلسے مرتب کئے اور رادہا منزل والیوں۔ سلطان خانہ والیوں پر بہت محبت کی۔ اکثر بادشاہ نے صبح کا خاصہ شام کو اور شام کا خاصہ صبح کو نوش فرمایا مگر آخر کار ان سبھوں نے بسبب صحبت ڈوم ڈہاڑھی کا مزاج اختیار کر لیا اور اکیلے بادشاہ کی صحبت کا اثر کچھ نہ ہوا۔ علم کی طرف توجہ بالکل نہ کی یہ حالت دیکھکر بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا۔ کبیدہ خاطر ہوئے۔ سوچ رہے تھے کہ الٰہی کیا کروں۔ بغیر سازندوں کے ایک کلمہ زبان سے ادا نہیں کر سکتیں۔
ایک دن شاہ زمانی نے بادشاہ کو بہت ملول دیکھ کر کہا۔ حضور آپ کیوں پریشان خاطر رہتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بادشاہ نے یہ تمام قصہ شاہ زمانی سے کہا کہ تعلیم ناقص اور خراب ہوئی اس کا مجھے بہت قلق ہے۔ شاہ زمانی نے جواب دیا قربان جاؤں حضور کا علم کیا کم ہے جو آپ ان ڈوم ڈہاڑیوں سے تعلیم دلواتے ہیں اور ان پاجیوں کو تعلیم میں شریک کرتے ہیں۔

بادشاہ نے کہا۔ ان جلسہ والیوں کی عادتیں خراب ہو گئی ہیں اور میری تعلیم سے خوش نہیں رہتیں۔ چاہتی ہیں کہ ڈوم ڈھاڑی بھی ان کے شریک تعلیم رہیں۔ شاہ زمانی نے عرض کیا حضور ایک در بند ہزار در کھلے لعنت بھیجو ان جلسہ والیوں کو میں سرکار کے لئے کنواری لڑکیاں نوکر رکھتی ہوں۔ کچی لکڑی کی طرح جدھر موڑو گے بے تکلف آمنا وصدقنا قبول کرینگی۔ سرمو اطاعت سے مُنہ نہ موڑینگی۔

نواب یادگار محل صاحب اور اہل کار وغیرہ دار وغا شغاق السلطان اور نواب شہزادہ بیگم صاحبہ نے اس کلام کی پرزور تائید کی اور اسی طرح ان کے سمجھانے سے بادشاہ بھی راضی ہو گئے اور یہ طریقہ بہت مفید ہوا۔ بادشاہ نے عہد واثق کیا کہ اب سے تمام عمر کسی ڈوم ڈھاڑی۔ میراثی۔ کلاونت۔ گویئے دھرپد والے کو دور بنال کئے۔ رقاص۔ پکھاوجی کے حوالے ایک رہس والی کو نہیں کیا آخر اس دسویں جلسہ والیوں کی تعلیم بالکل پانی نظر آئی۔

ان میں نواب خانہ آبادی بیگم۔ نواب منیر بیگم۔ نواب گلبدن بیگم۔ نواب مہر افروز بیگم۔ نواب نازک بدن بیگم۔ نواب ممتاز بیگم۔ نواب ماہ افروز بیگم۔

گیارہواں جلسہ یہ گھونگھٹ والیاں مشہور ہیں۔ ان کو بھی خاص بادشاہ تعلیم دیتے ہیں سات بیگمیں ان میں بھی ہیں دو سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ دار ہیں اچھا گاتی ہیں۔

بارہواں جلسہ یہ نتھ والیوں کے نام سے مشہور ہے محض بادشاہ کی تعلیم میں ہے۔ سات اسم ہیں ان کی تنخواہ ماہوار ایکسو چھیا نوے ہے۔

تیرہواں جلسہ اس میں بھی سات اسم ہیں۔ یہ گانے والیاں مشہور ہیں اور بادشاہ خود ان کو تعلیم دیتے تھے۔ بہت جلد کمال حاصل کر لیا۔

چودہواں جلسہ پلکن والیاں مشہور ہیں یہ کل سات پریاں ہیں تنخواہ ایکسو چھیا نوے روپیہ ماہوار اور بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔

پندرہواں جلسہ۔ یہ جھومر والیوں کے نام سے مشہور ہیں اور بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔ سات اسم ہیں۔

سولھواں جلسہ جھلنے والیاں مشہور ہیں۔ یہ بھی سات اسم ہیں نواب مہ افروز بیگم۔ گلبن بیگم۔ کبک خرام بیگم۔ نواب لالہ عذار بیگم وغیرہ بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔

سترہواں جلسہ بلبیر والیاں مشہور ہیں۔ یہ بھی سات اسم ہیں نواب عشق نما بیگم۔ گل اندام بیگم۔ نواب زہرہ بیگم۔ وغیرہ۔

اٹھارہواں جلسہ بندیا والی سات اسم ہیں نواب جاندار بیگم نواب پری خصال بیگم وغیرہ بادشاہ کی تعلیم میں ہیں۔

انیسواں جلسہ یہ مرثیہ والیاں مشہور ہیں۔ سوز پڑھتی ہیں۔ بادشاہ نے تعلیم دی ہے۔ نواب غمگسار بیگم۔ نواب ماتمی بیگم۔ نواب مرثیہ خواں بیگم۔ نواب نوحہ خواں بیگم۔ نواب ذاکرہ بیگم۔

بیسواں جلسہ یہ نقل والیاں مشہور ہیں اور مضحک نقلیں کرتی ہیں۔ سات اسم ہیں۔ نواب تین تیرہ بیگم۔ نواب پو بارہ بیگم۔ نواب چار کوڑی بیگم وغیرہ

اکیسواں جلسہ تماشے والیاں مشہور ہیں سات اسم ہیں۔ نواب زر اندو بیگم۔ نواب زردار بیگم۔ نواب زر افشاں بیگم۔ وغیرہ۔

بائیسواں جلسہ یہ مصاحبین مشہور ہیں۔ نواب کج کلاہ بیگم۔ خورشید کلاہ وغیرہ

بادشاہ کی تعلیم میں تینتالیس اسم ہیں اور سب جلسہ والیاں ملا کر دو سو تیرہ گانے والیاں ناچنے والیاں ہیں۔ یہ سب ہر وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتی ہیں مگر تینتالیس جو خاص ہیں ان سے زیادہ تر گفتگو اور صحبت رہتی ہے اور وہی تعلیمیافتہ شاہ کہلاتی ہیں۔

بادشاہ کی سرکار میں دو ڈومنیاں بھی ہیں جن کو سرور محفل کہتے ہیں یہ ظرافت میں مشہور ہیں۔

لوگ جانتے ہیں کہ زوال سلطنت کے بعد بادشاہ عیش پرستی میں پڑ گئے۔ اصلی بات یہ ہے کہ اکثر ایسے کثیر اور لازوال نقصان پہونچنے کے بعد کچھ ایسا صدمہ پہونچتا ہے کہ لوگ اپنی جان دیدیتے ہیں۔ اولاد کا مر جانا۔ عزیز و اقارب کا اٹھ جانا خود مرض مزمن میں مبتلا ہو جانا اکثر مہلک ہوتا ہے لیکن ایسے واقعات سے تو کبھی کبھی صبر بھی آجاتا ہے۔ لڑکا مر گیا۔ دو چار برس کے بعد غم جاتا رہا اور اب اولاد کو بھول گیا۔ یا خدا نے دوسرا بیٹا دیدیا پہلے بیٹے کا خیال بھی نہیں آتا۔

لیکن زوال سلطنت و زوال دولت ہر وقت کلیجے کی پھانس بن جاتا ہے اور اس کی خلش نہیں جا سکتی اور جس کی حکومت و سلطنت چلی جائے اس کے صدموں کی انتہا کو کوئی نہیں جان سکتا اور جان سکتا ہے تو وہی جس کا یہ حال ہوا ہو۔ کوئی اس دکھ کو بہادر شاہ ظفر سے پوچھے۔

سلطان عبدالعزیز سے پوچھے۔ عبدالحمید خان سے پوچھے۔ قیصر جرمن سے پوچھے۔ امان اللہ سے پوچھے کہ کیسا داغ سلطنت ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اگر یہ سامان تعیش نہ کرتے تو سلطنت جانے کے بعد ۳۲ بتیس برس کیونکر زندہ رہتے۔ اس شراب دوآتشہ نے ان کو مخمور رکھا اور اسی کی بدولت ان کا غم غلط ہوتا تھا اور دن عید تھا رات شب برات تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وہ پریوں کے جھرمٹ سے دم بھر الگ ہوں۔ انھوں نے اپنے داغ سلطنت کا بہت اچھا علاج کیا۔ گویا پرستان کے راجہ اندر تھے ہر وقت پریوں کا جھرمٹ ان کے سامنے ناچا کرتا تھا ان کی زندگی عیش سے کٹتی تھی۔ بہت عقلمندی سے اپنے غم کو غلط کیا حقیقت میں جان کا بدلہ مل نہیں سکتا انھوں نے اپنا زر و جواہر روپیہ پیسہ کو اپنی جان پر نثار کر دیا مفلسی میں بادشاہی کی مٹیا برج کو سلطنت اودھ بنا دیا دیکھنے والے کہتے ہیں کہ بادشاہ کے وقت میں مٹیا برج دوسرا لکھنؤ معلوم ہوتا تھا۔

غزل

ہجر میں تیرا مبتلا روئے نہیں تو کیا کرے
ہنسا رکھے تجھے خدا، خوش رہے تو خدا کرے

عشق تعب نواز ہے حسن طرب طراز ہے
مجھکو خوشی کہاں نصیب رنج تری بلا کرے

بلبل و نالہ و تعب گل ہمہ خندہ و طرب
شمع و ناز بزم شب۔ کوئی جلے جلا کرے

تجھکو بجا ہے ناز حسن جلوۂ حسن دیکھ کر
کوئی جیے جیا کرے کوئی مرے مرا کرے

تیرے خرام ناز میں فرق پڑے تو کیوں پڑے
کوئی پسے پسا کرے کوئی مٹے مٹا کرے

حسن حیا و ناز ہے عشق تحیر و ادب
کوئی کہے تو کیا کہے کوئی کرے تو کیا کرے

ناز و نیاز میں رشید شان ہے حسن و عشق کی
کیوں نہ کوئی جفا کرے؟ کیوں نہ کوئی وفا کرے

(رشید اکبر آبادی)

محسوساتِ ماہر

از مولانا منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدرآباد دکن

اُتر بھی آ فرازِ لامکاں سے
اٹھا دے یہ بھی پردہ درمیاں سے

اُسے پروا نہیں دیر و حرم کی
جسے نسبت ہے تیرے آستاں سے

وہی آغاز ہے راہِ طلب کا
قدم آگے نہ پھر اُٹھیں جہاں سے

پئے تسکینِ دل جنت کے خالق
وہاں کا ایک نظارہ یہاں سے

دکھا دوں تابشِ انوارِ صہبا
صُراحی کو لڑا دوں کہکشاں سے

تصوّر اور تری کافر نظر کا
تعلّق اور برقِ بے اماں سے

طلب کرتا ہوں دادِ سخت جانی
بلائیں مانگتا ہوں آسماں سے

جسے شعر و سخن کہتے ہیں ماہر
عبارت ہے مرے حسنِ بیاں سے

بحری سوار

"S.M. SYNGE." کا مشہور ڈرامہ

جناب محمد فاروقی صاحب مالیگانوی

تعارف:۔

موریا	ایک بڑھیا
بارٹلے	اس کا لڑکا
کیتھلین	اس کی بڑی لڑکی
نورا	اس کی چھوٹی لڑکی

مرد، عورت وغیرہ وغیرہ

جگہ:۔ آئرلینڈ کی مغرب جانب دور ایک جزیرہ

منظر:۔ جھونپڑے کا باورچی خانہ۔ مچھلی کے جال، روغنی کھالیں کاتنے کا چرخہ دیوار سے لگے ہوئے چند تختے وغیرہ وغیرہ،

کیتھلین ایک غریب لڑکی عمر تقریباً بیس سال آٹا گوندھ کر توے پر رکھتی ہے پھر اسے آگ پر رکھ کر اپنے ہاتھ صاف کرکے چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ نورا ایک نوجوان لڑکی دروازے سے اندر جھانکتی ہے۔

نورا:۔ (دھیمی آواز سے) وہ کہاں ہے؟

کیتھلین:۔ وہ اندر لیٹی ہے خدا اس کی مدد کرے۔ ممکن ہے وہ سو رہی ہو۔ اگر وہ اس قابل ہے۔

(نورا آہستہ سے اندر داخل ہوتی ہے اور اپنی شال کے نیچے سے ایک بنڈل نکالتی ہے۔)

کیتھلین:۔ (چرخہ تیزی سے گھماتے ہوئے) یہ کیا ہے نورا؟

نورا:۔ اسے نوجوان پادری نے دیا ہے یہ ایک قمیض اور ایک سادہ جراب ہے، انھیں ڈونیگل میں ایک ڈوبے ہوئے آدمی کے بدن سے نکالا گیا ہے۔"

(کیتھلین یکایک چرخہ روک لیتی ہے اور سننے کی غرض سے آگے جھک جاتی ہے)

جب وہ خود مائیکل کو تلاش کرنے باہر جائیگی۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ کپڑے مائیکل کے ہیں یا نہیں۔

کیتھلین:۔ یہ کپڑے مائیکل کے کس طرح ہوسکتے ہیں نورا؟ وہ جنوب میں اتنی دور کیسے جاسکتا ہے؟

نورا:۔ نوجوان پادری کہتا ہے کہ اس نے اسے دیکھا ہے وہ کہتا ہے۔ "اگر وہ مائیکل کے ہیں تو تم بوڑھی عورت سے خود کہہ سکتی ہو کہ خدا کی رحمت سے مائیکل کو ایک پاکیزہ تجہیز و تکفین نصیب ہوئی اور اگر وہ اس کے نہیں تو کوئی اس کے متعلق کچھ نہ کہے کیونکہ بڑھیا اس کی موت پر غم سے دیوانی ہوجائیگی۔"

(سامنے کا دروازہ جو کہ نورا نے ادھورا کھلا چھوڑ دیا تھا ہوا کے جھونکوں سے پورا کھل جاتا ہے)

کیتھلین:۔ (تشویشناک نگاہوں سے باہر دیکھتے ہوئے) کیا تم نے پادری سے پوچھا آیا وہ بارٹلے کو گھوڑوں کے ساتھ گالوے کے جاترا کو جانے سے روکیگا؟

نورا:۔ "میں اسے روکوں گا نہیں"۔ وہ کہتا ہے "مگر تمھیں ڈرنا نہیں چاہیئے اس کی ماں خود آدھی آدھی رات تک دعا اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ اور خداوند رب العزت اسے اس کے لڑکے سے محروم نہیں کرسکتا۔

کیتھلین:۔ کیا سفید چٹان کے پاس سمندر زیادہ خطرناک ہے نورا؟

نورا:۔ ہاں خطرناک ضرور ہے۔ خدا ہماری حفاظت کرے۔ مغرب کی طرف گھٹائیں اٹھ رہی ہیں اور اگر ہوا چل گئی تو سمندری طغیانی اور بھی بڑھ جائیگی۔ (وہ بنڈل سمیت میز کے قریب جاتی ہے)

کیا اب میں اسے کھول سکتی ہوں۔؟

کیتھلین :- ٹھہرو! ممکن ہے وہ جاگ اٹھے اور ہمارے ختم کرنے سے پہلے یہاں آجائے۔ (وہ میز کے قریب آجاتی ہے)

نورا :- (اندرونی دروازے تک جاکر سنتی ہے) وہ بستر پر حرکت کر رہی ہے، وہ ایک لمحہ میں یہاں آجائیگی۔

کیتھلین :- نورا سیڑھی لاؤ۔ میں انہیں مچان پر رکھ دیتی ہوں جہاں وہ انہیں مطلق دیکھ نہیں سکتی۔ اور جب سمندر میں طوفان کا زور کم ہوگا تو وہ خود اس کی لاش کو مشرق کی طرف بہتے ہوئے سطح آب پر دیکھنے کیلئے باہر جائیگی۔

(دونوں سیڑھی کو روشن دان کے دیوار کے مقابل رکھ دیتی ہیں کیتھلین چند سیڑھیاں طے کرکے بنڈل کو مچان پر رکھ دیتی ہے۔ موریا اندرونی کمرے سے داخل ہوتی ہے)

موریا :- (اوپر کیتھلین کی طرف دیکھتے ہوئے تنک مزاجی سے) کیا یہاں جو گھاس موجود ہے وہ کھانا پکانے کے لئے کافی نہیں ہے۔؟

کیتھلین :- آگ پر عرصہ سے روٹی پک رہی ہے (گھاس نیچے پھینکتے ہوئے) اور سمندر میں طغیانی کم ہونے کے بعد اگر بارٹلے کانیمرا جائیگا تو اسے روٹی کی ضرورت ہوگی۔ (نورا گھاس اٹھاکر آگ پر رکھتی ہے)

موریا :- (آگ کے قریب سٹول پر بیٹھتے ہوئے) آج جبکہ جنوب اور مغرب سے گھٹائیں اٹھ رہی ہیں اور طوفان بڑھ رہا ہے بارٹلے ہرگز باہر نہیں جائیگا۔ وہ آج نہیں جا سکتا نوجوان پادری اسے یقیناً روکیگا۔

نورا :- وہ اسے نہیں روکیگا اور میں نے ایمن۔ سائمن۔ سٹیفن۔ فینی، کالم شان کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ آج ضرور جائیگا۔

موریا :- وہ ہے کہاں نورا؟

نورا :- وہ اس تلاش میں باہر گیا ہے کہ اس ہفتے کوئی جہاز جانے والا ہے یا نہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ اب بہت جلد واپس لوٹیگا کیونکہ سبز ٹیلے کے پاس سمندر کا زور کم ہو رہا ہے اور ماہیگیروں کی کشتیاں بھی مشرق سے واپس ہو رہی ہیں۔

کیتھلین :- میں بڑے پتھر کے پاس کسی کے پاؤں کی آہٹ سن رہی ہوں۔

نورا :- (باہر دیکھتے ہوئے) وہ آرہا ہے اور تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے۔

بارٹلے :- (اندر آتا ہے اور چاروں طرف دیکھتا ہے پھر نرم اور غمگین لہجے میں کہتا ہے) کیتھلین وہ رسی کہاں ہے جسے کانیمرا میں خریدا گیا تھا؟

کیتھلین :- وہ سفید تختے کے پاس کھونٹی سے لٹک رہی ہے اسے لاکر دیدو نورا میں نے آج ہی صبح اسے وہاں لٹکایا ہے۔ سیاہ پاؤں والا سور اسے دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

نورا :- (ایک رسی دیتے ہوئے) کیا یہی ہے وہ رسی؟

موریا :- بہتر ہوگا بارٹلے اگر تم رسی کو وہیں تختے کے پاس لٹکتا ہوا چھوڑ دو (بارٹلے رسی لیتا ہے) اس جگہ اس کی ضرورت ہوگی۔ میں تم سے کہتی ہوں مائیکل کی لاش کل صبح یا پرسوں صبح یا اس ہفتے کسی دن بھی بہتی ہوئی ملیگی اور ہم خدا کے فضل وکرم سے اس کے لئے ایک بہت گہری قبر بنائیں گے۔

بارٹلے :- (رسی کی لگام بناتے ہوئے) میرے پاس اور کوئی لگام نہیں جس کی مدد سے میں سواری کر سکوں اور مجھے آج ہی جلد روانہ ہو جانا چاہئے۔ آج کے جہاز کے سوا آئندہ دو ہفتے تک اور کوئی جہاز نہیں جائیگا اور اس سال میلہ گھوڑوں کی تجارت کیلئے بہت مفید ہوگا میں نے لوگوں سے یہ کہتے سنا ہے۔

موریا :- اگر مائیکل کی لاش سمندر میں بہتی ہوئی پائی گئی اور گھر میں کوئی تابوت بنانے والا نہ رہا تو لوگ ہمیں کیا کہینگے؟ خصوصاً اس وقت جبکہ میں نے کانیمرا کے بہترین سفید تختوں کیلئے ایک بڑی قیمت ادا کی ہے۔

بارٹلے :- لاش کس طرح مل سکتی ہے اماں جان! ہم مسلسل نو دن سے اس کا انتظار کر رہے ہیں حتیٰ کہ مغرب اور جنوب سے ہوا کے تند جھونکے واپس لوٹ رہے ہیں۔

موریا :- اگر لاش نہیں مل سکتی تو ہوا سمندر میں طغیانی پیدا کر رہی ہے اگر وہاں سینکڑوں ہزاروں گھوڑے بھی ہوں تو میرے بیٹے کے مقابلے میں ان کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے اور اس وقت جبکہ وہ اکلوتا بیٹا ہو۔

بارٹلے :- (بدستور لگام بناتے ہوئے کیتھلین سے) تم روزانہ کھیت میں جانا کیتھلین اور جوار کو بھیڑوں سے محفوظ رکھنا اور اگر کوئی خریدار مل جائے تو تم سیاہ پاؤں والے سور کو فروخت کر سکتی ہو۔ بشرطیکہ قیمت اچھی ہو۔

موریا :- کیتھلین جیسی لڑکی ایک سور کی اچھی قیمت کس طرح وصول کر سکتی ہے؟

بارٹلے :- (کیتھلین سے) اگر باد نسیم کے جھونکے چاند کے اختتام تک چلتے رہے تو تم اور نورا جانوروں کیلئے کافی گھاس کاٹ لینا اب سوائے ایک شخص کے آج سے ہمارے ساتھ کوئی بھی کام کرنے والا نہ ہوگا ـــ ہمارے لئے یہ بہت بڑی بدنصیبی ہے۔

موریا :- اور یقیناً اس سے بھی بڑی بدنصیبی اسوقت ہوگی جب تم بھی دوسرے لڑکوں کی طرح غرق آپ ہو جاؤ گے - اس وقت میں کس طرح زندگی گذار سکونگی بارٹلے؟ اور میرے ساتھ یہ لڑکیاں؟ میں ایک ضعیف و ناتوان عورت جو ہر لمحہ موت کا انتظار کر رہی ہے -

(بارٹلے لگام رکھ کر اپنا پرانا کوٹ اتارتا ہے اور اسی فلالین کا ایک نیا کوٹ پہنتا ہے)

بارٹلے :- (نورا سے) کیا جہاز ساحل کی طرف آرہا ہے؟

نورا :- وہ سبز ٹیلے سے گذر رہا ہے اور اپنے بادبان ہوا میں اڑا رہا ہے،

بارٹلے :- (اپنی تھیلی اور تمباکو لیتے ہوئے) مجھے جہاز تک پہونچنے کے لئے نصف گھنٹہ لگیگا اس کے بعد میں دو یا تین دن میں واپس لوٹونگا اور اگر خدانخواستہ ہوا ناموافق رہی تو میں چار یا پانچ روز میں واپس آسکونگا -

موریا :- (آگ کی طرف مڑکر اپنی شال سر پر ڈالتے ہوئے) کیا یہ سنگدل اور بے رحم انسان نہیں جو اپنی بوڑھی ماں کا کہنا نہیں مانتا جبکہ وہ اسے سمندر میں جانے سے روک رہی ہے -

کیتھلین :- سمندر کا سفر ایک نوجوان آدمی کی زندگی کا سوال ہے پھر ایک بوڑھی عورت کو کون خاطر میں لاسکتا ہے؟

بارٹلے :- (لگام اٹھاتے ہوئے) مجھے جلد روانہ ہو جانا چاہئے - میں لال گھوڑے پر سوار ہونگا اور سفید ٹٹو اس کے پیچھے دوڑیگا ——— خدا کی رحمت تمہارے ساتھ ہو -

(چلا جاتا ہے)

موریا :- (جب وہ دروازے سے گذرتا ہے وہ چلاتی ہے) وہ چلا گیا - خدا ہماری حفاظت کرے - اب ہم اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکتے - وہ چلا گیا! اور جب سیاہ رات دنیا کو اپنی آغوش میں چھپا لیگی اس دنیا میں میرا کوئی بیٹا باقی نہ ہوگا -

کیتھلین :- اماں جان جب وہ سفر پر جا رہا ہے تو اسے دعا کیوں نہیں دیتیں؟ کیا یہ رنج و الم ہمارے لئے کافی نہیں جو تم اسے بددعا کے ساتھ بھیج رہی ہو -

(موریا بغیر مڑے ہوئے چمٹے سے آگ کو بے پروائی سے کریدتی ہے)

نورا :- (اس کی طرف مڑتے ہوئے) تم گھاس کو آگ سے ہٹا رہی ہو اماں جان -

کیتھلین :- (چلاتی ہے) غضب خدا کا! ہم یہ روٹی دینا بھول گئے نورا،

(آگ کے پاس جاتی ہے)

نورا :- او خدا! وہ شام تک بھوکا رہیگا اور اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے

کیتھلین :- (توے پر سے روٹی اٹھاتے ہوئے) یقیناً وہ تباہ ہو جائیگا جب گھر میں ایک بڑھیا ہمیشہ بڑبڑایا کرتی ہے اس گھر کے لوگوں کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی (موریا سٹول پر کانپتی ہے)

کیتھلین :- (روٹی کا کچھ حصہ کاٹ کر کپڑے میں لپیٹتی ہے پھر موریا سے) تم چشمے والے کنویں پر جاؤ اور جب وہ وہاں سے گذرے تو یہ روٹی اسے دیدینا اس صورت میں تم دوبارہ اس سے مل سکتی ہو پھر تمہاری بددعا لوٹ جائیگی اور تم اس سے کہنا "خدا تمہاری حفاظت کرے" اس طرح وہ مطمئن اور خوش ہو جائیگا -

موریا :- (روٹی لیتے ہوئے) کیا میں اس کی تیز رفتاری کا مقابلہ کرسکتی ہوں

کیتھلین :- ہاں اگر تم فوراً روانہ ہو جاؤ -

موریا :- (کانپتے ہوئے کھڑی ہو جاتی ہے) میرے لئے چلنا سخت دوبھر ہے -

کیتھلین :- (بیتابانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اسے لکڑی دو نورا ورنہ وہ پتھر پر پھسل کر گر پڑیگی -

نورا :- کون سی لکڑی؟

کیتھلین :- وہی جسے مائیکل کانیمرا سے اپنے ہمراہ لایا تھا -

موریا :- (لکڑی لیتے ہوئے) دنیا میں بوڑھے لوگ اپنے بچوں کے لئے چیزیں چھوڑ جاتے ہیں مگر اس گھر میں خود نوجوان لڑکے اپنے پیچھے بوڑھوں کے لئے چیزیں چھوڑ جاتے ہیں -

(وہ آہستہ آہستہ باہر جاتی ہے ' نورا سیڑھی کے پاس آتی ہے)

کیتھلین :- ٹھہرو نورا! ممکن ہے وہ فوراً واپس لوٹ آئے - وہ شدت غم سے دیوانی ہوگئی ہے، نہیں معلوم وہ کیا کر گذریگی، خدا اس کی حفاظت کرے

نورا :- کیا وہ جھاڑی سے گذر گئی -؟

کیتھلین :- (باہر دیکھ کر) اب وہ دور چلی گئی - بنڈل کو جلدی نیچے پھینکو خبر نہیں وہ کب لوٹ آئے -؟

نورا :- (مچان سے بنڈل اتارتے ہوئے) نوجوان پادری کل یہاں سے گذریگا - ہم اس سے پوچھینگے آیا یہ کپڑے مائیکل کے ہیں؟

کیتھلین :- (بنڈل لیتے ہوئے) کیا اس نے کچھ کہا یہ کپڑے کہاں ملے؟

نورا :- (نیچے اترتے ہوئے) اس نے کہا دو آدمی کشتی میں آئرش شراب لیکر صبح دن نکلنے سے پیشتر شمال کی جانب سیاہ چوٹی سے گذر رہے تھے یکایک لاش ان سے چپو سے ٹکرائی

کیتھلین (بنڈل کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے) مجھے چاقو دو نورا! نمکین پانی نے گانٹھ کو سخت بنا دیا ہے اور یہ گانٹھ اس قدر مضبوط ہے کہ ایک ہفتے کے عرصے میں بھی نہیں کھل سکتی۔

نورا:۔ (چاقو دیتے ہوئے) میں نے سنا ہے کہ یہ ڈانیگل سے لایا گیا ہے جو ایک دور دراز فاصلے پر واقع ہے۔

کیتھلین:۔ (ڈوری کاٹتے ہوئے) یقیناً! کچھ عرصہ پیشتر یہاں ایک شخص آیا تھا وہی جس سے یہ چاقو خریدا گیا ہے اس نے کہا کہ اگر تم پاس کی چٹان سے چلنا شروع کروگے تو سات دن میں ڈانیگل پہونچوگے۔

نورا:۔ تو پھر خیال کرو کہ ایک لاش کو وہاں تک بہنے کے لئے کتنا عرصہ لگے گا

(کیتھلین بنڈل کھول کر ایک پھٹا قمیص اور ایک جراب نکالتی ہے دونوں غور سے دیکھتی ہیں)

کیتھلین:۔ (دھیمی آواز سے) خدا ہماری مدد کرے۔ نورا کیا یہ کہنا تعجب خیز نہ ہوگا کہ یہ کپڑے یقیناً مائیکل ہی کے ہیں؟

نورا:۔ میں اس کا دوسرا قمیص لاتی ہوں پھر ہم معلوم کرسکینگے کہ آیا وہ اسی کے ہیں (کونے میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے) وہ ان کپڑوں میں نہیں آخر وہ کہاں ہے؟

کیتھلین:۔ میرا خیال ہے کہ بارٹلے نے آج صبح اسے پہنا تھا کیونکہ اس کا قمیص نمک کی زیادتی سے بھاری ہو رہا تھا (کونے میں بتاتے ہوئے) وہاں اسی کپڑے کی ایک پھٹی ہوئی آستین پڑی ہے اسے لے آؤ۔

(نورا آستین لے آتی ہے۔ دونوں کپڑے کا مقابلہ کرتے ہیں)

یہ دونوں ایک ہی کپڑا ہے نورا۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے شخص نے بھی دکان سے وہی کپڑا خریدا ہو جیسا کہ مائیکل نے لیا تھا۔

نورا:۔ (جراب لیکر اس کے بخئے گنتی ہے اور چلاتی ہے) یہ مائیکل ہی کے ہیں

کیتھلین، یقیناً مائیکل کے خدا اس کی روح کو بخشے۔ جب وہ خود اس حقیقت سے واقف ہوگی تو کیا کہے گی؟ اور پھر بارٹلے بھی بحری سفر پر روانہ ہوگیا ہے۔

کیتھلین:۔ (جراب لیتے ہوئے) یہ تو بالکل سادہ جراب ہے۔

نورا:۔ یہ تیسرے جوڑ کی دوسری جراب ہے جسے میں نے خود بنا تھا۔ میں نے گن کر ساٹھ بخئے لگائے تھے جن میں چار میں نے خود چھوڑ دیئے تھے۔

کیتھلین:۔ (بخئے گن کر) بخئے بالکل برابر ہیں (روتے ہوئے) آہ نورا کتنا بھیانک منظر! اس کی لاش اتنی دور شمال سے بہتی ہوئی آئے اور اس پر سوائے سمندر پر اڑنے والی سیاہ روحوں کے اور کوئی بھی ماتم کرنے والا نہ ہو۔

نورا:۔ (جھومتے ہوئے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلاتے ہوئے) کتنے رحم کی بات ہے کہ ایک شخص جو اتنا بڑا ملاح اور ماہی گیر ہو اپنے بعد سوائے ایک پھٹے ہوئے قمیص اور ایک سادہ جراب کے کوئی بھی نشانی نہ چھوڑ سکے۔

کیتھلین:۔ کیا وہ آ رہی ہے نورا؟ میں راستے پر کچھ آہٹ سن رہی ہوں۔

نورا:۔ (باہر دیکھکر) وہ آ رہی ہے، وہ پھاٹک کے قریب ہے۔

کیتھلین:۔ اس کے آنے سے پیشتر انھیں وہیں رکھدو شاید بارٹلے کو دعا دینے کے بعد وہ کچھ آسودہ خاطر ہو۔ اور ہم یہ ظاہر نہیں ہونے دینگے کہ بارٹلے کے جانے کے بعد ہم نے کچھ دیکھا یا سنا ہے

نورا:۔ (بنڈل کے باندھنے میں کیتھلین کو مدد دیتے ہوئے) ہم اسے یہیں کونے میں رکھدینگے (وہ بنڈل کو کونے میں رکھدیتی ہیں کیتھلین چرخے کے پاس واپس جاتی ہے)

نورا:۔ کیا وہ دیکھ سکتی ہے کہ میں رو رہی تھی۔

کیتھلین:۔ پیٹھ دروازے کی طرف کرلو اور اس طرح بیٹھ جاؤ کہ تمھارے چہرے پر روشنی نہ پڑنے پائے۔

(نورا دروازے کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھ جاتی ہے۔ موریا لڑکیوں کی طرف دیکھے بغیر اندر داخل ہوتی ہے اور آگ کے دوسری طرف ٹٹول کر بیٹھ جاتی ہے روٹی کا بنڈل اب تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ لڑکیاں ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہیں۔ نورا روٹی کی طرف اشارہ کرتی ہے)

کیتھلین:۔ (کچھ دیر کاتنے کے بعد) کیا تم نے روٹی نہیں دی اماں جان؟

(موریا بغیر مڑے ہوئے دھیمی آواز سے رونا شروع کرتی ہے)

کیتھلین:۔ کیا تم نے اسے جاتے ہوئے دیکھا؟ (موریا بدستور روتی کیتھلین بےصبری سے) خدا تمھاری مدد کرے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اپنی آواز کو زور دو اور مجھ سے کہو کہ تم نے کیا دیکھا؟ بجائے اس کے کہ تم ایک گذری ہوئی بات پر ماتم کرو؟ کیا تم نے بارٹلے کو دیکھا۔ میں پوچھتی ہوں؟

موریا:۔ (نحیف آواز سے) میرا دل چور چور ہو رہا ہے۔

کیتھلین:۔ (بدستور) کیا تم نے بارٹلے کو دیکھا۔

موریا:۔ میں نے خوفناک ترین چیز دیکھی ہے۔

کیتھلین:۔ (چرخہ چھوڑ کر باہر کی طرف دیکھتی ہے) خدا تمھیں معاف کرے۔ وہ گھوڑے پر سوار سبز ٹیلے سے گذر رہا ہے، اور اس کے پیچھے سفید ٹٹو:۔

(موریا چونک جاتی ہے جس سے شال پیچھے گر پڑتی ہے اور اس کا سفید بال سے ڈھکا ہوا سر نظر آنے لگتا ہے وہ سہمی ہوئی آواز سے کہتی ہے)

موریا اور اس کے پیچھے سفید ٹٹو ______

کیتھلین۔(آگ کے قریب آکر) آخر تمھیں کون سی چیز تکلیف دے رہی ہے؟

موریا۔ میں نے اتنی خوفناک چیز دیکھی ہے کہ کسی کو اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

کیتھلین اور نورا۔ اوہ! (وہ دونوں آگ کے قریب بڑھیا کے قریب بیٹھ جاتی ہیں۔)

نورا۔ ہم سے کہو اماں جان تم نے کیا دیکھا؟

موریا۔ میں چشمے والے کنویں کے پاس پہونچکر دعا مانگنے میں مشغول ہو گئی، یکایک بارٹلے لال گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں آیا اور اس کے پیچھے سفید ٹٹو! (وہ اپنی آنکھوں سے کوئی چیز چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتی ہے) خدا ہماری حفاظت کرے نورا۔

کیتھلین۔ تم نے کیا دیکھا؟

موریا۔ میں نے خود مائیکل کو دیکھا۔

کیتھلین۔(نرمی سے) نہیں اماں جان! جسے تم نے دیکھا وہ مائیکل نہیں تھا کیونکہ اس کی لاش دور شمال میں پائی گئی ہے اور خدا کی رحمت سے اسے ایک پاکیزہ تجہیز و تکفین نصیب ہوئی ہے۔

موریا۔(مخالفت کے انداز میں) میں نے آج اسے خود سوار ہوتے اور بھاگتے دیکھا ہے۔ پہلے بارٹلے لال گھوڑے پر آیا۔ اور میں نے کہنے کی کوشش کی۔ "خدا تمھاری حفاظت کرے۔" مگر کسی چیز نے میرے گلے کو الفاظ سمیت گھونٹ دیا۔ اور وہ تیزی سے میرے قریب سے گذر گیا اس نے کہا: "تم پر خدا کی رحمت ہو" اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر میں نے اوپر دیکھا اور چلائی وہاں سفید ٹٹو پر مائیکل سوار تھا وہ نفیس خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے پاؤں میں نئے جوتے تھے۔

کیتھلین۔(رونے لگتی ہے) ہم تباہ ہو گئے، ہم لٹ گئے۔

نورا۔ کیا نوجوان پادری نے کہا تھا کہ خداوند رب العزت اسے اس کے لڑکے سے محروم نہیں کر سکتا۔

موریا۔(دھیمی مگر صاف آواز میں) سمندر کا دیوتا اچھی طرح جانتا ہے۔ بارٹلے اب مجھ سے کھو جائیگا، جاؤ تم ایمن کو بلا لاؤ تاکہ وہ سفید تختوں سے ایک عمدہ تابوت تیار کرے کیونکہ اپنے لڑکوں کے بعد میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس گھر میں میرا شوہر تھا اور شوہر کا باپ اور چھ بیٹے، چھ بہترین انسان! حالانکہ ان کی پیدائش کے وقت مجھے سخت تکلیف اٹھانی پڑی ان میں سے چند تو مل سکے اور کچھ ہمیشہ کے لئے کھو گئے مگر اب وہ سب کے سب چل بسے۔ سٹیفن اور شان ایک بہت بڑے طوفان میں کھو گئے تھے۔ بعد میں ان کی لاشیں گولڈن متھ کے سمندر میں پائی گئیں۔ جہاں سے دونوں ایک ہی تختے پہ اس دروازے سے اندر لائے گئے (وہ تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر جاتی ہے۔ دونوں لڑکیاں نیم وا دروازے سے کچھ آہٹ سن کر چونک جاتی ہیں)۔

نورا:۔ (کان میں) تم نے کچھ سنا کیتھلین؟

کیتھلین۔(آہستہ سے) وہاں ساحل کے قریب کوئی رو رہا ہے۔

موریا۔(بغیر کچھ سنے ہوئے بدستور) یہاں شیمس تھا اور اس کا باپ۔ یہ سب اندھیری رات میں گم ہو گئے تھے مگر طلوع آفتاب کے بعد بھی ان کا کوئی نشان نہ ملا۔ اس کے بعد پاچ کشتی کے الٹ جانے سے غرق ہو گیا۔ میں یہاں بارٹلے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت بارٹلے بالکل بچہ تھا وہ میرے زانو پر سو رہا تھا۔ یکایک میں نے دو دو تین تین عورتوں کو ہاتھ باندھے ہوئے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔ قبر کی سی خاموشی۔ پھر میں نے باہر دیکھا ان کے پیچھے چند آدمی پھٹے ہوئے سرخ بادبان میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اٹھائے لا رہے تھے جس سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر خشک زمین پر اپنا نشان چھوڑ رہے تھے۔ (وہ پھر رک جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں کو دروازے کی طرف پھیلا دیتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور بوڑھی عورتیں سینے پر ہاتھ باندھے اندر داخل ہوتی ہیں اور دہلیز کے قریب چبوترے کے مقابل دو زانو ہو جاتی ہیں ان کے سروں پر سرخ کپڑے پڑے ہوتے ہیں)۔

موریا۔(نیم خوابی کی حالت میں کیتھلین سے) یہ کون ہے؟ پاچ یا مائیکل؟

کیتھلین۔ مائیکل کی لاش دور سمندر میں پائی گئی ہے پھر جب وہ وہاں ملی تو مائیکل یہاں کس طرح آسکتا ہے؟

موریا۔ لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی پھر لوگ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مائیکل یا اس کے کسی ہم شکل کی لاش ہے؟ کیونکہ ایک لاش جب متواتر نو دن تک پانی میں تیرتی پھرے تو اس کی شناخت اس کی ماں بھی نہیں کر سکتی۔

کیتھلین۔ وہ مائیکل ہی کی ہے کیونکہ لوگوں نے اس کے کپڑے دور شمال سے بھیجے ہیں۔ خدا اس کی روح کو بخش دے (وہ مائیکل کے کپڑے لاکر موریا کو دیتی ہے

موریا آہستہ سے کھڑی ہو جاتی ہے اور کپڑے لے لیتی ہے نورا باہر دیکھتی ہے)

نورا ۔ وہ لوگ اپنے ساتھ کوئی چیز اٹھائے لا رہے ہیں جس سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر زمین پر نشان بنا رہے ہیں۔

کیتھلین ۔ (ایک عورت کے کان میں) کیا یہ بارٹلے ہے؟

عورت ۔ یقیناً! خدا اس کی روح کو بخشدے۔

(دو نوجوان عورتیں آگے بڑھ کر تختہ کو سرکاتی ہیں پھر چند آدمی تختے پر بارٹلے کی لاش کو بادبان میں لپٹی ہوئی لاتے ہیں اور میز پر رکھدیتے ہیں)

کیتھلین ۔ (عورتوں سے) وہ کہاں غرق ہوا؟

ایک عورت ۔ وہاں سفید چٹان کے قریب جہاں موجیں سمندر کو اور بھی خوفناک بنا رہی ہیں۔ سفید ٹٹو نے لات چلائی جس سے وہ سمندر میں گر پڑا اور جلد ہی غرق ہو گیا۔

(موریا میز کے قریب دوزانو بیٹھ جاتی ہے۔ عورتیں دھیمی آواز سے ماتم کرتی ہیں اور جسم کو آہستہ آہستہ حرکت دیکر جھومتی ہیں کیتھلین اور نورا میز کے دوسرے سرے پر اور مرد دروازے کے قریب دوزانو ہو جاتے ہیں)۔

موریا ۔ (سر اٹھا کر اس طرح گویا ہوتی ہے جیسے اس نے اپنے گرد لوگوں کو دیکھا ہی نہیں) وہ سب رخصت ہو چکے اب سمندر میرے لئے کوئی مزید تکلیف کا باعث نہیں بن سکتا۔ جب سمندر میں طغیانی بڑھیگی اور موجیں مشرق و مغرب سے اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے سے ٹکرا کر مہیب آواز پیدا کریں گی مجھے دعا مانگنے۔ عبادت کرنے یا چیخنے چلانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی اب مجھے سیاہ راتوں میں "مقدس پانی" کی تلاش میں باہر جانے کی ضرورت نہ ہوگی اور جب دوسری عورتیں سمندر کے مدوجزر سے سہم کر گریہ زاری کرینگی میں اپنے گھر میں خاموش اور مطمئن آرام کی نیند سوتی ہونگی (نورا سے) مجھے "مقدس" پانی دو نورا۔ وہ کھانے کی میز پر ہے اس کا آخری چلو۔ نورا پانی دیتی ہے۔

موریا ۔ (بارٹلے کے پاؤں کے قریب کپڑے گراتی ہے۔ اور "مقدس پانی" اس کی لاش پر چھڑکتی ہے) کیا میں نے تمہارے لئے رات رات بھر دعائیں مانگی بارٹلے؟ کیا میں نے سیاہ راتوں کو تمہارے معلوم ہوئے بغیر عبادت میں نہیں گذارا۔ مگر اب مجھے مکمل آرام نصیب ہوگا۔ اب میں بے پروائی سے طویل راتوں کو میٹھی نیند میں گذار سکونگی۔ اگر مجھے روٹی کا ٹکڑا اور بدبودار مچھلی ہی شکم پری کے لئے میسر ہو جائے۔

(وہ دوبارہ دوزانو ہو جاتی ہے اور اپنے ہاتھوں کو سینہ پر باندھ کر زیر لب دعا پڑھتی ہے)

کیتھلین ۔ (ایک بوڑھے آدمی سے) ہو سکے تو آپ اور ایمن سورج طلوع ہونے سے پیشتر تابوت تیار کر لیں۔ بوڑھی ماں نے خود ایک نفیس تختہ خریدا ہے اس کا خیال تھا کہ مائیکل کی لاش جلد ہی مل جائیگی۔ میرے پاس تازہ روٹی موجود ہے آپ کام کے دوران میں اسے کھا سکتے ہیں۔

بوڑھا ۔ (تختے کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا اس میں کیل بھی ہیں؟

کیتھلین ۔ نہیں کالم کیل تو ہم بھول ہی گئے۔

دوسرا آدمی ۔ تعجب ہے کہ وہ کیل کیونکر بھول گئی جبکہ پورے تابوت کا سامان موجود ہے۔

کیتھلین ۔ وہ اب بوڑھی ہو گئی ہے اور اس کی طاقت جواب دے رہی ہے۔

(موریا دوبارہ کھڑی ہو جاتی ہے اور مائیکل کے کپڑوں کو پھیلا کر ان پر "مقدس پانی" کے آخری قطرے چھڑکتی ہے)

نورا ۔ (کیتھلین سے) آج وہ خاموش اور مطمئن ہے لیکن جس روز مائیکل غرق ہوا تھا اس کی چیخ و پکار چشمے والے کنوئیں تک باسانی سنی جا سکتی تھی۔ وہ مائیکل کو دل سے چاہتی تھی۔ کسی کو اس کا گمان بھی ہو سکتا ہے۔

کیتھلین ۔ (دھیمی اور صاف آواز سے) ایک بوڑھی عورت کسی کام سے بہت جلد اکتا جاتی ہے کیا یہ مسلسل نو دن سے گھر میں آہ و زاری اور ماتم نہیں کر رہی ہے۔؟

موریا ۔ (پانی کے پیالے کو منہ کے بل میز پر رکھتی ہے اور بارٹلے کے پیروں پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے) اب وہ سب اکٹھا ہو گئے خدا بارٹلے کی روح کو اور شیمس اور پاچ اور اسٹیفن اور شان کی روح کو بخشدے (سر جھکاتے ہوئے) اور میری روح پر اور نورا کی روح پر اور اس دنیا میں تمام بسنے والے انسانوں کی روحوں پر خدا کی رحمت ہو (وہ ٹھہر جاتی ہے اور عورتوں کے رونے کی آواز ذرا تیز ہو جاتی ہے پھر یکایک خاموش ہو جاتی ہے)

موریا ۔ (بدستور) خدا کی برکت سے مائیکل کو شمالی سمندر میں ایک پاکیزہ تجہیز و تکفین میسر ہوئی بارٹلے ایک نفیس سفید تختوں والے تابوت کا وارث ہوگا اور یقیناً ایک گہری قبر کا وارث ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہئے دنیا میں کوئی بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ نہیں رہ سکتا اور ہمیں اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ (وہ دوبارہ دوزانو ہو جاتی ہے)

——— (پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے) ———

"برسوں سے"

جناب مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ آگرہ

نظر میں ہے خمارِ نرگسِ مستانہ برسوں سے / اٹھا رکھے ہیں ہم نے بادہ و پیمانہ برسوں سے

تلاشِ قیس میں ہے آج تک ویرانہ برسوں سے / کہاں آوارہ ہے تو اے دلِ دیوانہ برسوں سے

کہیں کھوئی ہوئی ہے ہمتِ رندانہ برسوں سے / کہ خالی جام ہیں خاموش ہے میخانہ برسوں سے

وہی ہیں حسن کے جلوے وہی شوقِ خود آرائی / جنونِ شوق کھو بیٹھا مگر دیوانہ برسوں سے

نگاہیں پھیر لیں تم نے تصدق ان نگاہوں کے / بنا رکھا ہے مجھکو آپ نے بیگانہ برسوں سے

جہاں اب دُرد بھی ڈھونڈھے سے میکش کو نہیں ملتی / وہیں آباد تھا اے ہمنفس میخانہ برسوں سے

ہماری کم نگاہی پر مگر جلووں کو رحم آئے / نگاہیں تک رہی ہیں آرزو مندانہ برسوں سے

خزاں کے بکھرے پتوں ہوا میں اڑتے ذرّوں پر / مری ناکامیوں کا ثبت ہے افسانہ برسوں سے

دمِ آخر نگاہِ منتظر نے کیا کیا طاہر
ہوا تھا رازِ دل کا آج تک افسانہ برسوں سے

نازو

از جناب اختر انصاری صاحب بی۔ اے (آنرز)

میرے شوہر کو مناظر قدرت اور ان کی دلپذیر شادابیوں سے بہت محبت ہے چنانچہ ہم شہر سے کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر عروس فطرت دست انسانی کی گستاخیوں سے ناآشنا ہے چاند، سورج، مینہ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں۔ اور اس کے سادہ حسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹری ہے جس پر سے دن رات ریلیں گذرتی ہیں۔

یہ گذرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پاکر اپنی بہن کو داغ دے گئی۔ جو جوان ہوئی اور جوان ہو کر مرگئی۔ جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت اور بڑی جانفشانی سے پالا۔ میں دن دن بھر اس کو گود میں لئے رہتی اور ساری ساری رات ہنگورے میں لٹا کر لوریاں سناتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اماں جان بھی اگر زندہ رہتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی۔ جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہوگئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آگئیں، اس کے سیاہ بال بیحد گھنے اور لانبے ہوگئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہوگیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مچ ایک عورت معلوم ہوتی۔ میں اس اٹھان اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن آہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری پھبن، یہ تمام رعنائی ایک دھوکہ ہے۔ ایک فریب ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح آئی ہے ایک جھونکے کے مانند گزر جائیگی۔

ہائے وہ کیسی منحوس اور نامراد صبح تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا "آپا! میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے" میں نے اس بڑھتے ہوئے بخار کو سوء ہضم کا نتیجہ سمجھا تھا اور اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک دو دن کی دوا کے بعد اتر جاتا ہے بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر و بیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ آبا جان نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلوائے اور جب ان کی کوششیں نامشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا لیکن بخار کسی طرح نہ اترا اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلا دیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے قبلوا دیا گیا میں روئی اور جتنی دعائیں مانگی گئیں مانگیں مگر طبیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری ناز کی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ صرف رونا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سنبھالا بات کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر اس کو کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آکر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہوگئی تو یہ رونا تو کم ہوگیا لیکن زبان کی ویسی گونگی رہی چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی سب کچھ سمجھتی تھی اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف

تھی۔ ایک دفعہ ــــــ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکے ــــــ اس نے اپنے بکس میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلے میں نکالے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے جس خیال کے ماتحت اس نے وہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی اسی طرح اکثر اس کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لاعلاج مرض کو پہچانتی ہے اور اس کے نتیجے سے واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی ــــ ابھی بیمار نہ پڑی تھی ــــ تو اس کے جوان دل میں بہت سی جوان آرزوئیں تھیں۔ بخار نے آرزوؤں کا یہ لہلہاتا چمن جھلس کر رکھ دیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہو گئے۔ لیکن اس حالت میں بھی دو ارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور آپا زبیدہ کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزومند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ گئی اس لئے اس کو ریل میں بیٹھنے کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے ان کو ریل کا سفر آئے دن درپیش رہتا ہے لیکن ہمارے تمام اعزہ و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے۔ چنانچہ جب نازو گود میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور ادھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں یہ تعلق بالکل ختم ہو گیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جا سکی۔

نازو کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیماری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہو جائینگی۔ میرٹھ میں ہماری خالہ کی بیٹی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے اباجان کو لکھا تھا کہ زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہوگی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤنگی۔ نازو نے اسی وقت سفر اور شادی کی شرکت کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ دن اور ہفتے گن گن کر کاٹ رہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موذی بخار نے اس کو آلیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہوگا تو میں تجھ کو ساتھ لیکر میرٹھ جاؤنگی اور فی الحقیقت میں اس کو میرٹھ لے جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے۔ چنانچہ جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے بلاوے کا خط لکھا تو میں نے اباجان سے ذکر کیا اور نازو کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ نازو کے لئے ناقابل برداشت ہوگا تو میں نے اپنی تمام کوششیں اباجان کو راضی کرنے میں صرف کر دیں۔ میں روئی بھی منتیں بھی کیں، اوروں سے سفارشیں بھی کرائیں لیکن اباجان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

نازو خالہ اماں کے خط کی بابت سن کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہونگی لیکن تین دن ہو گئے اور نہ اباجان نے اجازت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں نازو سے کہہ دیتی کہ "پیاری نازو تمہارے اباجان تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے تم وہاں نہ جاؤ گی۔" آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "نازو! صبح کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی غالباً ایک دو مہینہ کے بعد ہوگی۔" نازو نے یہ سن کر اپنی نظریں جھکا لیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دوا لینے الماری تک گئی۔ جب دوا شیشے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ نازو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے ڈھلک کر نیچے گر رہے تھے اور تکئے کو بھگو رہے تھے۔

اس واقعہ کو پانچ برس گذر چکے ہیں۔ اب نہ نازو ہے، نہ اباجان ہیں، نہ وطن ہے، نہ وہ گھر جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔ میں ہوں۔ میرا دل ویران ہے۔ پردیس ہے اور جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے۔ آسمان سے ظلمتیں برستی ہیں اور جنگل کی وسیع پنہائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کی

۔ شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے ریل اپنی شاندار
ہیبت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ آتی اور میرے مکان کے سامنے سے گذرتی
ہے اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ نازۂ افق کے کسی بعید
ترین گوشے سے حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں
ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے۔ لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال
کرتی ہوئی۔ اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی سفاکانہ بے التفاتی کے ساتھ نکل جاتی
ہے تو اس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے
ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ (جامعہ)

نغمۂ دل!

جناب پنڈت اندر جیت صاحب شرما

اے میرے دل شیدا تو راگ سنائے جا
اب نیند نہیں آتی بیٹھا ہوں میں گائے جا
تاریک فضاؤں میں نغموں کو بہائے جا
ذرّوں میں سمائے جا
سرمست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا

گہوارۂ غفلت میں ذرے پڑے سوتے ہیں
آغوشِ محبت میں قطرے جو ہیں روتے ہیں
دنیا کو ڈبوتے ہیں ظلمت کو بھگوتے ہیں
غفلت کو مٹائے جا
سرمست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا،

ظلمت کے مناظر پر چادر ہے ستاروں کی
آفاق پہ چھائی ہے اک موج شراروں کی
دنیا مری نظروں میں ہے نور کے پاروں کی
تصویر بنائے جا
سرمست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا

خاموش تری ہستی کا ہوگا رباب اک دن
موجوں کے تھپیڑوں میں ٹوٹے گا حباب اک دن
رکھا ہی نہ رہ جائے یہ تیرا حجاب اک دن
پردوں کو ہٹائے جا
سرمست بنائے جا ہستی کو بھلائے جا،

غزل

ستم ہے دل رہے اس شوخ کی محفل سے بیگانہ
رہا خود راہبر گویا رہِ منزل سے بیگانہ

لرزتے تھے زمین و آسمان بیتاب تھا عالم
قیامت تھی ہُوا دل جب تری محفل سے بیگانہ

محیطِ عشق میں نا آشنائے کامیابی ہوں
کہ میری کشتی امید ہے ساحل سے بیگانہ

سناؤں کیا تجھے روداد میں سوزِ محبت کی
بر نگِ شمعِ کشتہ ہوں تری محفل سے بیگانہ

مری رودادِ بربادی نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے
نشاط و عیش کا کیا ذکر میں ہوں دل سے بیگانہ

عجب افسانۂ عبرت ہے اس بیکس کی بربادی
رہِ الفت میں جو ناکام ہو منزل سے بیگانہ

اگر مانگو تو مل جاتا ہے سب کچھ اُس کی محفل سے
کہاں ہے وہ تمنائے دلِ سائل سے بیگانہ

عجب انداز کا مجنوں ہوں میں دشتِ محبت میں
مری لیلیٰ ہے قیدِ پردۂ محمل سے بیگانہ

رشید اب حضرتِ ناصح جو برہم ہیں تو ہونے دو
وہ کیفِ مے سے کیا واقف؟ جو ہو محفل سے بیگانہ

رشید شاہجہانپوری

اُردو شاعری اور شراب!

جناب ماسٹر باسط صاحب بسوانی

شیخ، ناصح، زاہد وغیرہ

اکبر الہ آبادی ؎

دل بھی کانپا، ہونٹ بھی تھرائے، شرمایا بھی خوب
شیخ کو لیکن تری محفل میں پینا ہی پڑا،

حضرت اکبر نے مصرعہ کیا لگایا ہے تصویر کھینچی ہے۔ ع دل بھی کانپا ہونٹ بھی تھرائے شرمایا بھی خوب۔ پہلے دل کا کانپنا اس کے بعد ہونٹ بھی تھرائے دل نہ کانپتا تو ہونٹ کیوں تھراتے؟ شرمایا بھی خوب۔ "خوب" کیا خوب ہے معنی میں کس قدر ترقی ہو گئی۔ باوجود ان تمام باتوں کے غریب شیخ کو چھٹکارہ نہ ملا۔ اور چھٹکارہ کیونکر ملتا کوئی ایسے ویسے کی محفل تو تھی نہیں "پینا ہی پڑا" کی کیا تعریف ہو سکتی ہے؟

(ر) ساغر مے ہے سامنے شیخ سے کہہ رہے ہیں وہ
دیکھتا کیا ہے ہر طرف مرد خدا چڑھا بھی جا

یہ بھی ایک مرقع ہے ساغر سامنے ہے مگر شیخ غریب اپنے تقدس کے لحاظ سے جھجک رہا ہے۔ جب زیادہ اصرار ہوا تو آمادگی ظاہر کی مگر ساتھ ہی اس کا بھی خیال ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے مگر پلانے والا چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو یہ لطیف شے شیخ کے حلق کے نیچے اتر جائے لہٰذا تاکیداً فرمایا جاتا ہے ع

دیکھتا کیا ہے ہر طرف مرد خدا چڑھا بھی جا

"مرد خدا" کے ٹکڑے کے برمحل ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ چڑھا بھی جا کتنا خوب ہے۔

شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگا لی جائیگی،

شیخ کی دعوت میں دراصل شراب کا کیا کام؟ مگر نہیں اس زمانہ کے شیخ ہیں ممکن ہے کچھ پی لیتے ہوں لہٰذا احتیاطاً تھوڑی سی منگا لینے میں کیا حرج ہے رہا یہ کہ کیوں پیتے ہیں؟ اس کی تاویل شیخ جیسا خوش تقریر اور دعویٰ تقدس سو طرح کر سکتا ہے۔

باسط ؎

کس ہو تقریر سے کیونکر جناب شیخ کو
روز پی لیتے ہیں تھوڑی وعظ فرمانے کے بعد

ریاض ؎

خم مے پر برس پڑے ترا ابر سیہ بن کر
رہیگی یادلے واعظ تری تقریر مینخانہ

تقریر مینخانہ کا کیا لطف بیان کیا جائے جس کے دوران میں جناب واعظ خم پر برس پڑے اور پھر برسنا بھی کس انداز کا۔ "ابر سیہ بن کر" مطلب یہ ہے کہ تقریر واعظ سے بجائے خفا ہونے کے حضرت ریاض لطف اندوز ہوئے اور واعظ کے برس پڑنے کی طرف دھیان نہ دیا۔

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
میکدے سے اب پرانی جائیگی

کیوں نہ ہو شیخ جیسے بزرگ کے لئے چاہئے بھی کہنہ۔ آخر کوئی مناسبت تو ہونا چاہئے؛

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ
بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

سبحان اللہ غرق مئے ناب اولیٰ کی تدبیر اس سے اچھی کیا ہو سکتی ہے کسی صورت سے شیخ کو داخل ثواب کرنا ہے۔

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

خدا جانے یہ کس قسم کی شراب تھی کہ جس کو پی کر سوائے سجدہ کے اور کچھ نہ سوجھا۔ اس شغل۔ ان اشغال کی کیا تعریف ہو۔ ہر بندہ خدا کو یہ توفیق کہاں ہوتی ہے۔

کمبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا
واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

اور ذکر کریں۔ آخر رندوں کے ستانے اور ہر وقت مذمت شراب

کرنے کا کچھ تو پھل ملنا چاہیئے۔

امیر ؎

امیر اک بات بھی واعظ نہیں کہتا خدا لگتی　　خدا جانے بکا کرتا ہے کیا جھوٹا خدائی کا

دو مصرعوں میں تین جگہ لفظ خدا کی تکرار ہے مگر کیا مجال جو کہیں ناگوار ہو۔ خدا لگتی اور خدائی کا جھوٹا۔ محاورے کس روانی اور بیساختگی سے نظم ہوئے ہیں۔

آتش ؎

زاہدان خشک کو کیفیت دینا نہیں　　ساغر گل سے ہوئے کس دن چمن میں خار مست

زاہدان خشک کو خار خشک سے تشبیہ دینا۔ ساتھ ہی کیفیت سے محرومی اللہ اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔

داغ ؎

قسم ہے مجھکو زاہد کیا کرے گر آنکھ سے دیکھے　　چھلکنا ساغر کا چھکنا بادہ خواروں کا

قسم دیکر پوچھ رہے ہیں۔ آخر دریافت میں اس قدر اصرار کیوں۔ صرف اس لئے کہ زاہد سے سوا اس جواب کے اور کوئی امید ہی نہیں کہ وہ بھی زہد و تقویٰ کو نذر ساغر کردے۔

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　ہائے کمبخت تونے پی ہی نہیں

کیا کہنا ہے۔

باسط ؎

پی کے دیکھو تو حال کھل جائے　　شیخ پوچھو نہ کچھ مزہ کیا ہے

داغ ؎

اندیشہ فردا نہ رہے حضرت زاہد　　میخانے میں پی لیجئے تھوڑی سی اگر آج

ہاں عادت ہوگئی تو بادہ کوثر بھی پینے میں مشکل نہوگی۔

اگر آپ مول لیتے تو تیز نشہ ہوتی　　ملے مفت کی جو زاہد وہ نہیں شراب ہرگز

تیز نشہ نہ سہی مگر مفت کی شراب حلال تو ہوگئی۔

اے داغ میکدے میں گئے ہیں جناب شیخ　　ٹوٹا ہے آج قبلہ حاجات کا لحاظ،

لحاظ ٹوٹنا ہی تو مشکل ہوتا ہے اس کے بعد ہر مشکل آسان ہے۔

تقصیر لغزش کی اے محتسب نہیں　　یہ چیز اڑکے جاتی ہے میخوار کی طرف

اس میں کیا شک ہے اس سے اچھی کیا تاویل ہوسکتی ہے۔ "یہ چیز" کیا لطیف اشارہ ہے۔

کچھ شان مغفرت سے نہیں دور زاہدو　　ڈوبیں گناہ بادہ کشوں کے شراب میں

شان مغفرت سے دراصل بعید نہیں کہ رندان بلانوش بھی اپنی ندامت کے طفیل بخشدیئے جائینگے۔

غالب ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

واعظ کو در میخانہ سے کوئی مناسبت نہیں اسی سے تو حضرت غالب کو حیرت ہے اور اس کے اظہار کا پیرایہ بھی خوب۔ ڈرتے ڈرتے کہا ہے۔ ؏

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

باسط ؎

مزہ ہو میکدے میں شیخ سے مڈ بھیڑ ہو جائے　　وہ پوچھیں تو کہاں آیا میں پوچھوں تم کہاں آئے

میر ؎

بارے مستوں نے ہوشیاری کی　　دیکھے کچھ محتسب کا منہ جھلسا،

کیا خوب۔ محتسب کو کس ترکیب سے خاموش کیا ہے۔

باسط ؎

شیخ جی کی میکشی کا کچھ عجب انداز ہے　　کچھ تو پہلے پیتے ہیں کچھ وعظ فرمانے کے بعد

میخانے سے پلٹتے ہوئے شیخ جی ملے　　پوچھا کہاں گئے تھے تو بولے کہیں نہیں

بیٹھے ہیں شیخ صاحب رندوں میں آج پی کے　　کیا غیب سے ہوئے ہیں سامان دل لگی کے

جو شیخ جی کا چلے بس تو میکشی کیسی　　خیال دختر رز بھی حرام ہوجائے

مرے ساقی یہ بناوٹ نہیں دیکھی جاتی　　لبھے ہے شیخ نے منہ اپنا بنا رکھا ہے

بیخودی میں بھی تھا پاس وضعداری شیخ کو　　لب سے جب ساغر ہٹایا وعظ فرمانے لگے

سر دور آج اچھی دل لگی ہے　　کہ میں بیٹھا ہوں اور زاہد نے پی ہے

لغزش مستانہ

ریاض ؎

ہماری لغزش پا میں طواف کعبہ ہے　　پیے ہوئے در پیر مغاں سے آتے ہیں

قربان اس پیر مغاں کے جو اس رنگ سے پلائے۔

چکبست ؎

رخ ہے ساقی کی طرف ہاتھ میں پیمانہ ہے　　رہنما آج مری لغزش مستانہ ہے

کوئی تعریف ہوسکتی ہے۔ لغزش بھی کس ٹھکانے کی ہے۔

جلال لکھنوی ؎

...شاروں کا کیا پاؤں بہکتے نہیں دیکھا   او مست تری لغزش پا اور ہی کچھ ہے

"اور ہی کچھ" سے لغزش پا اور ہی کچھ ہو گئی ہے۔

باسط ؎

...ست ہیں جب ہاتھ میں آجاتا ہے ساغر   لیتی ہے قدم لغزش مستانہ ہمارا
...زش لے لئے لاکھ قدم بڑھ کے ہمارے   چھوٹا نہ مگر ہاتھ سے پیمانہ ہمارا
...ازل کے روز پیر مغاں کا تھا مرید   میری ہر لغزش میں رنگ لغزش مستانہ تھا

توبہ شکنی

داغ ؎

...ی داغ توبہ کی ہے کبھی پھر شراب پی   نہ عذاب ہی ملیگا نہ ہمیں ثواب ہرگز

کیا فیصلہ فرمایا ہے۔

لطافت لکھنوی ؎

...ہ مرکی ہوس میں دم توبہ شکنی   جب اٹھے دست دعا رہ گئے چلو ہو کر

"چلو ہو کر" کی کیا تعریف ہو!

ریاض ؎

...بہ شکن یہ کون ہوا خم سے ہمکنار   کیا کیا ملی ہے ٹوٹ کے توبہ گناہ سے
...م ہے توبہ شکن توبہ مری جام شکن   سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

توبہ شکنی تک تو غنیمت تھا مگر یہ جام شکنی تو ملاحظہ کیجئے۔ دوسرے مصرعہ ...ے تو منظر ہی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

جگر بسوانی ؎

...م اسے توبہ اسی میں غرق کر دیتے ہیں پھر تجھ کو
جہاں لبریز ہو کر سامنے پیمانہ آتا ہے

توبہ شکنی کا ذکر کس لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔

باسط ؎

...سط توبہ شکن تھا گوشۂ میخانہ تھا،   لب پہ تھا کچھ کچھ تبسم ہاتھ میں پیمانہ تھا
...ور آنکھوں سے ابھی ساغر و مینا نہ کروں   موسم گل کا تقاضا ہے کہ توبہ نہ کروں
...ہو اور آج زاہد اس طرح میکشی ہو   توبہ بھی میکدے میں منہ تیرا دیکھتی ہو

کیف و بیخودی

جگر مرادآبادی ؎

...سی کی مست خرامی کا واہ کیا کہنا   کہ جیسے حافظ شیراز چور چور آئے

ندرت تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ریاض ؎

بری کیا تھی فاقہ مستی بڑے لطف سے گذرتی   لئے کچھ جوے کی تلخی غم روزگار ہوتا

کیا پیاری تمنا ہے۔

دست شفقت اس طرح اک رندنے پھیرا ریاض   بیٹھکر یاد خدا میں جھومتا جاتا رہا،

چکبست ؎

کیفیت گلشن ہے مرے نشہ کا عالم   کوئل کی صدا نعرۂ مستانہ ہے میرا

جلال لکھنوی ؎

دل ہو وہ چشم مست ہو بزم شراب ہو   کوئی خراب ہو تو بلا سے خراب ہو

داغ ؎

عالم وجد میں بیخود نہیں ہوتے صوفی   نشے میں چور ہیں رندان خرابات ہی کیا

صوفی بدمست کیوں نہیں ہوتے مگر ان کو کوئی نہیں کہتا۔ قصور تو صرف رندوں نے کیا ہے۔

مومن ؎ کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں،   بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

شب ماہتاب کے بھولے ہوئے جلوے خدا کرے کسی کو نہ یاد آئیں بیخبری تو بیخبری جان پر بن جاتی ہے۔

میر ؎ کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو   صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

اچھا ہوا ورنہ ممکن تھا کہ منبر و محراب کا خیال کر کے گناہگار ہو جاتے۔

باسط ؎ کوئی اس وقت دیکھے دور کی آئے کیفیت   ہم اپنے کانپتے ہاتھوں سے جب جام لیتے ہیں

(باسط بسوانی)

لمعات

مجھ پہ طاری موت کا ہنگام ہے
چارہ گر سمجھا ہے اب آرام ہے

دل کا آنا موت کا پیغام ہے
عشق کا آغاز ہی انجام ہے

انتظارِ یار بھی اک کام ہے
صحن ہے، کوچہ ہے، در ہے، بام ہے

میری بربادی کا چرچا عام ہے
جانتے ہو؟ آپ پر الزام ہے

اس طرح ہوتی ہے طے راہِ اُمید
منزلِ مقصود ہر ہر گام ہے

یا ہوئی ہے وصل کی شب مختصر
یا مؤذن مُرغِ بے ہنگام ہے

آب و دانہ نے دکھایا تھا قفس
شفقتِ صیاد ہی اب دام ہے

بزمِ عشرت میں نگاہِ التفات
حُسن کی سرکار سے انعام ہے

یہ بھی اک اسلوب ہے فریاد کا
تم سے مطلب ہے فلک کا نام ہے

کچھ لڑکپن، کچھ جوانی، کچھ ہرم
کچھ سحر، کچھ دوپہر، کچھ شام ہے

پھر گئی جب یہ تو دنیا پھر گئی
آنکھ تیری گردشِ ایام ہے

ساری دُنیا دیکھتی ہے آپ کو
عاشقِ شیدا اگر بدنام ہے

اس کے ساجد کاتبِ اعمال ہیں
آہ آدم سخت نافرجام ہے

آپ نیّر کو نہ ہرگز بھولئے
اِک وہی تو بندۂ بے دام ہے

نیّر امرتسری

شہیدِ محبت!

ایک بالکل سچا اور بیحد پُردرد افسانہ

جناب مجتبیٰ احسین صاحب ایوبی۔ سیتا پور،

نواب فدا حسین صاحب میں جہاں تمام انسانی خوبیاں تھیں وہاں اُن میں دولت پرستی کا ایک ایسا عیب تھا جس پر اپنی اولاد کی قربانی بھی ان کے نزدیک جرم نہ تھی۔ وہ ایک ایسے علاقے کے مالک تھے جو بادی النظر میں کافی زرخیز تھا لیکن اپنی عمر کے آخری دور میں انھوں نے اپنی چھوٹی لڑکی نجمہ کے خون سے اس کو سرسبز و شاداب رکھنے کی کوشش کی۔ قدرت نے اگر ایک طرف ان کو تمام اسباب آرام و آسائش بڑی فیاضی کے ساتھ عطا کر رکھے تھے تو دوسری طرف ان کے ساتھ یہ ظلم بھی کرنے میں بخل نہیں کیا تھا کہ ان کو کوئی اولاد نرینہ عطا نہیں کی جس کی نواب صاحب کو بڑی آرزو تھی اور یہی سبب نجمہ کی بربادیوں کا باعث بن گیا۔

نجمہ جیسی نیک، معصوم، حسین عصمت مآب دوشیزہ اپنے باپ کی دولت پرستی کا جس بری طرح شکار ہوئی آج دنیائے انسانیت میں اس کی نظیر ڈھونڈھے نہیں مل سکتی۔

وہ نجمہ جو پھولوں میں پیدا ہوئی۔ کلیوں میں کھیلی۔ آج آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹ رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے ظالم، بیرحم سنگدل اور محبت ناآشنا باپ نے اس جھلملاتی ہوئی شمع امید کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جو اس کی زندگی اور روح کا ایک جزو بن چکی تھی۔

نواب فدا حسین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ نجمہ اپنے پھوپھی زاد بھائی اسلم سے مانوس ہے دونوں بچپن میں ساتھ کے کھیلے تھے۔ ساتھ کے پڑھے تھے۔ ساتھ جوان ہوئے تھے لہذا اگر دونوں کے انس نے محبت اور محبت نے عشق کی صورت اختیار کر لی تھی تو کوئی عیب نہ تھا لیکن نواب صاحب جن کے دل میں نجمہ سے زیادہ علاقہ کی محبت تھی ان کے نزدیک، اس کی ناکامیاں اس کی بربادیاں، اس کی زندگی کی تباہی کوئی وقعت نہ رکھتی تھی اور نہ وہ اس پر کبھی غور کرنے کے لئے آمادہ تھے۔

نجمہ بچہ نہ تھی۔ جوان تھی۔ پندرھواں سال تھا۔ جانتی تھی اور جو کچھ گھر میں ہوتا تھا اس کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ مجھے اور میری معصوم دوشیزگی کو بڑی بے دردی سے علاقہ کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے لیکن بے گناہ نجمہ نے اس ہندوستانی ماں کی گود میں پرورش پائی تھی جس میں اپنی شادی کے متعلق کسی قسم کا اظہار عام اس سے کہ وہ کتنا ہی حق بجانب و مذہباً جائز ہی کیوں نہ ہو سوسائٹی کے نزدیک سب سے بڑا جرم تھا۔

زمانہ ہزاروں کروٹیں لینے کے بعد بھی نجمہ جیسی فرشتہ خصلت اور مریم صفت لڑکی پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا اس نے دنیائے محبت میں ایک ایسی حسرتناک مثال قائم کی جس پر طبقۂ نسواں جس قدر بھی فخر کرے کم ہے باپ کی اطاعت گذاری اس کی فرمانبرداری اپنے چاہنے والے کے ساتھ مستحکم عہد وفاداری عزم و ارادہ کی وہ محیر العقول نظیر چھوڑی ہے جو اگر آج کمیاب نہیں تو کم سے کم دنیا کے ہر شخص کے علم میں بھی نہیں ہے۔

۲

نصیر آباد، ۲۶ جنوری،

وفا شعار اسلم، خدا کرے تم اچھے ہو، اُو جس بات کے کھٹکے سے ہم دونوں کی جان لبوں پر تھی اس کی تکمیل کا وقت آگیا۔ رنجیدہ نہ ہونا اور نہ اس کا قصد کرنا کہ تم مجھے حاصل نہ کر سکے۔ اگر تم ایسا خیال کرو تو تمھاری بھول ہے۔ اسلم تم جس چیز کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس کو تم نے حاصل کر لیا۔ باور کرو وہ اب کسی کا نہیں ہو سکتا۔ تم میرے دل ہی کے تو خریدار تھے۔ تو کیا وہ تمھارے

پاس نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے۔ جب میرے پاس نہیں ہے تو پھر بجز تمہارے اور کس کے پاس ہو سکتا ہے؟

دیکھو اسلم انکار نہ کرو، چھپاؤ نہیں۔ میں واپس نہیں مانگتی۔ مگر ہاں حفاظت سے رکھنا۔ بد عہدی نہ کرنا۔ ستانا نہیں۔ ایک ناکام تمنا کا حسرت بھرا دل تمہارے پاس امانت ہے اگر خلوص و محبت سے رکھوگے تو احسان ہے ورنہ کوئی شکایت نہیں۔

تم پریشان کیوں ہو؟ کیا اس لئے کہ میں تمہاری نہیں ہوں۔ لیکن اسلم! میں نے یہ کب تم سے کہا کہ میں تمہاری نہیں ہوں۔ بظاہر دنیا مجھ کو تم سے الگ کر سکتی ہے۔ جسمانی حیثیت سے ہم تم دونوں جدا ہو سکتے ہیں یا کر دیئے جا سکتے ہیں لیکن اسلم! نجمہ کو دولت و علاقہ کی بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے اس کے دل اور اس کی روح کو کوئی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔

میرے جسم کو اباجان نے پرورش کیا۔ اپنے دل کو میں نے پالا وہ اپنے چیز کو علاقہ کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں میں اپنے دل کو تم پر نچھاور کر رہی ہوں۔ پھر اسلم تم کیوں آبدیدہ ہو جس چیز کا اختیار ہی نہیں وہ بھلا میں تمہیں کیسے دیدوں میں نے تم کو وہ انمول چیز دی ہے جس کی قیمت کونین کی دولت بھی نہیں ہو سکتی اسلم چپ کیوں ہو۔ ہاں معلوم ہوا احساس ہے۔ جانتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن بھولے اور خود فراموش اسلم محبت کا مقصد اتصال جسمانی تو نہیں ہے۔ اگر محبت کا مقصد محبوب کا حاصل کر لینا ہے تو اس کو حاصل کر لینے کے بعد محبت کا فنا ہو جانا بھی یقینی ہے اسلم خدا کے لئے اس ناپاک جذبہ کے ماتحت محبت کو مجروح نہ کرو، اپنے خلوص کو داغدار نہ بناؤ۔ ورنہ یاد رکھو محبت کا دیوتا آج جو خوشی و مسرت کے پھول تم پر برسا رہا ہے وہ کل نفرت اور حقارت کے کانٹے تمہارے لئے بچھائیگا۔

بتاؤ اور صحیح بتاؤ کس راستہ پر سب سے پہلا قدم رکھنا چاہتے ہو۔ اسلم خدا شاہد ہے میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ تم مجھ کو کھو دینے کے بعد تجرد کی زندگی بسر کرو۔ شادی کرو اور اپنی زندگی کی خوشیوں کو میرے اوپر برباد نہ کرو۔ ورنہ یہ میرے لئے دوسری تکلیف ہوگی۔

میری زندگی کی ناکامیوں پر مُہر لگ چکی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی اُس کی تقلید کرو اچھا خیر اس کو جانے دو اس کے لئے تم کو مجبور کرنے کے واسطے کافی زمانہ ہے ذرا سرگذشت تو سنو۔ تم کو صرف اس لئے ناپسند کیا جاتا ہے تمہارا جرم صرف یہ ہے کہ تم اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو اور اس طرح میرا دامن تم سے وابستہ کر دینے میں اباجان کی جائداد دو حصوں میں تقسیم ہو جائیگی میرے خیال میں اگر مذہب اور سوسائٹی کا موجودہ قانون اجازت دیتا تو اباجان کی حریص اور دولت پرست طبیعت ہم دونوں بہنوں کو ایک ہی شخص کے حوالے کر دینے میں کبھی پس و پیش نہ کرتی۔

اسلم دنیا کی نیرنگیاں تو دیکھو۔ اباجان کے دماغی توازن کا تو مطالعہ کرو۔ جب ہم دونوں بہنوں کو نصف نصف جائداد دینے پر آمادہ ہیں تو پھر تقسیم یا عدم تقسیم کا سوال ہی کیوں درمیان میں لایا جا رہا ہے۔ مگر نہیں اسلم میں بھول گئی علاقہ کو تعلقہ بنانے کا لالچ اباجان سے میری قربانی کرا رہا ہے اچھا اس کو بھی جانے دو۔ میں جائداد سے باز آئی۔ میری ساری جائداد تو تم ہو۔ بس میری جائداد مجھ کو دیدی جائے مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ لیکن یہ اُن سے کہے کون؟ میں کہوں بے حیا کہلاؤں۔ اماں جان کہیں ناقص العقل کہلائیں۔ گاؤں کی عورتیں کہیں جاہل کہہ کر دھتکار دی جائیں۔ تم کہو تو ناجائز تعلقات کا الزام لگایا جائے۔ پھر محبت کی یہ کشتی علاقہ کے بھنور سے پار ہو تو کیونکر ہو۔ اچھا اسلم اس کو اسی میں ڈوب جانے دو۔ ہم تم دونوں اس چکر سے نہیں نکل سکتے۔

آؤ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائیں۔ اس کا کیا علاج جس باپ نے بچپن میں میرے جھولنے کے لئے پالنا بنوایا تھا وہی آج میرے لئے قبر کھود رہا ہے۔

آؤ ہم تم دونوں اپنی تمناؤں کو اس میں دفن کر دیں۔ میرا خط پڑھتے پڑھتے تم گھبرا تو نہیں گئے۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اس میں بھلا کون سی ایسی بات ہے جس سے تم کو خوشی ہوئی ہوگی۔ لیکن ابھی اور لکھوں گی۔ کچھ اور سنو اپنے رونے کا سامان اسی خط میں کچھ اور تلاش کرو۔ اچھا اگر تم کو نہیں ملتا تو لو۔ ہم دونوں بہنوں کی شادی میری خالہ کے دونوں لڑکوں اصغر اور اطہر کے ساتھ بالکل آخری طور پر طے ہو گئی۔ سنا اسلم! ایک مہینہ کے بعد برات آئیگی۔ ہمیں دولہن بنایا جائیگا۔ لیکن جانتے ہو فرق کیا ہوگا ایک بہن کا سہرا شاداب اور دوسری کا اس کی آہوں سے مرجھایا ہوا ہوگا، اسلم! اس میں کا ایک پھول تم کو بھی دونگی۔ احتیاط سے رکھنا۔ میری موت کے بعد جب قبر پر آنا تو اسی کو چڑھا دینا۔ اچھا اسلم معاف کرنا تمہاری بڑی سمع خراشی کی۔ اجازت دو کہ خط ختم کروں۔ دعا کرو یہی میرا پہلا اور آخری خط ہو

"تمہاری نامعلوم نصیب نجمہ"

۳

نواب صاحب کی بیوی ۔ آخر میں کہتی ہوں کہ اسلم میں کیا عیب ہے؟ ۔ دیکھا بھالا گھر کا لڑکا ہے اگر نجمہ کی شادی اس کے ساتھ اور ناظمہ کی شادی اصغر کے ساتھ کر دی جائے تو کیا حرج ہے؟

نواب صاحب ۔ تم سمجھتی تو ہو نہیں بلا وجہ ضد کرتی ہو ۔

نواب صاحب کی بیوی ۔ جب ایک کھلی ہوئی بات ہے تو پھر اس میں سمجھنا کیا ۔

نواب صاحب ۔ (ترشرو ہو کر) تم اپنی کو اس ختم نہ کرو گی ۔

نواب صاحب کی بیوی ۔ اور تم اس معمہ بازی سے باز نہ آؤ گے؟

نواب صاحب ۔ اس کا کیا مطلب؟

بیوی ۔ یہ کہ تم اپنے دل کا حال کھل کر کیوں نہیں بتلاتے آخر میری بھی تو اولاد ہے کیا مجھے اس کے صرف پالنے کا حق تھا اس کی شادی بیاہ میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں؟

نواب صاحب ۔ (نرمی سے) بھئی تم سمجھتی تو ہو نہیں اور . .

بیوی ۔ (بات کاٹکر) جب تم سمجھاتے ہی نہیں تو کیا خاک سمجھوں؟

نواب صاحب ۔ (متانت سے) دیکھو بات یہ ہے کہ جب دونوں لڑکیوں کی الگ الگ شادی کی جائیگی تو جائداد تقسیم ہو کر نہ صرف زمینداری کی صورت میں تبدیل ہو جائیگی بلکہ اس کے تلف ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے لیکن جب دونوں لڑکیاں دونوں بھائیوں کے ساتھ ہونگی تو اس کا خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا ۔

بیوی ۔ اچھا اب میں سمجھی ۔ تم کو جس قدر اپنے علاقہ کا خیال ہے اتنا میری بچیوں کا خیال نہیں ۔

نواب صاحب ۔ برافروختہ ہو کر ۔ تم نے پھر وہی الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کیں

بیوی ۔ بڑے تعجب کی بات ہے جن بچیوں کے لئے تم جائداد کی حفاظت کر رہے ہو اسی جائداد کی مالک بچیوں کی شادی تم ان کی مرضی کے خلاف کر رہے ہو ۔ کیا دونوں بھائیوں یا ان دونوں بہنوں میں جائداد کے لئے جھگڑا نہیں ہو سکتا ۔ تم نے بھی تو اپنے بھائی سے لڑ کر اپنا حصہ الگ کرا لیا تھا اس وقت بھائی کا خیال کیوں نہ کیا ۔ میری بھی تو سگی بہن تھیں ۔ صرف آموں کی تقسیم پر انھوں نے اپنا باغ کیوں الگ کرا لیا ۔ پھر ان لڑکیوں کے متعلق یہ رائے کیوں قائم کر رہے ہو ۔ بھائی ایسا دوست نہ بھائی ایسا دشمن کی مثل مشہور ہے ۔ پھر اگر جائداد ہی کا خیال ہے تو اسلم کے پاس بھی کافی جائداد ہے اس کے ساتھ نجمہ کی شادی کر دینے سے وہ جائداد بھی تمھاری جائداد میں شامل ہو جائیگی ۔ پھر تم جن دو بھائیوں سے اپنی لڑکیوں کی شادی کر رہے ہو ۔ یہ بھی تو دیکھو ان میں جائداد کی حفاظت کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں؟ ان کے پاس ایک بسوہ بھی نہیں ہے ان کو زمینداری کا حال کیا معلوم ۔ لڑکے کچھ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں"

نواب صاحب (درشت آمیز لہجہ میں) یہ کہکر بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے کہ میں نے جو رائے قائم کی ہے اس کو تبدیل نہیں کروں گا ۔

نواب صاحب کی بیوی پر نواب صاحب کے اس آخری جملے سے سناٹا سا چھا گیا ۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ غور کریں بھولی نجمہ کسی ضرورت سے ان کے سامنے آ گئی ۔ ناز و نعم سے پالی ہوئی بچی کو دیکھ کر اور اس کی بربادیوں کا تصور کر کے مجبور ماں کا دل بھر آیا ۔ جب ماں بیٹی کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں آبدیدہ تھیں ۔ ماں نے فرط محبت سے نجمہ کو گلے لگا لیا اور ہائے میری بچی کہہ کر ان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی ۔ ہونہار نجمہ تاڑ گئی کہ شفیق ماں کا کلیجہ کیوں پھٹا جا رہا ہے لیکن مجبوری کی ایک ہی زنجیر میں دونوں جکڑی ہوئی تھیں نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن ۔

دل کا بخار بجز آنسوؤں سے نکالنے کے اور کر ہی کیا سکتی تھیں ابھی دل کو سکون نہ ہوا تھا کہ اسلم آ پہونچا پھوپھی جان آداب کہہ کر بیٹھ گیا پھوپھی کی مزاج پرسی کے بعد اس نے نجمہ سے پوچھا کہ نجمہ تمھاری آنکھیں کیوں سرخ ہیں ۔ نجمہ چپ سی ہو گئی وہ بھلا اس سوال کا جواب ہی کیا دے سکتی تھی، لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں نے اسلم کے سوال کا جواب دے ہی دیا ۔ نجمہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اسلم کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہدیا کہ اسلم نجمہ کا آخری نظارہ جی بھر کر کر لو ۔ شاید اب وہ پھر کبھی تمھیں دیکھنے کو نہ ملے چمنستان زندگی کا یہ پھول آج ہمیشہ کیلئے مرجھا رہا ہے ۔

دل گرفتہ اسلم بھلا اس منظر کو کب برداشت کر سکتا تھا ۔ گر وہ اس کو بھی گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی محبت کا راز اس کے آنسو فاش کر دیں وہ اپنے آنسوؤں میں نجمہ کی عزت و ناموس کو غرق کرنا نہیں چاہتا تھا ۔ بے اختیاری کے عالم میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا ۔ پھوپھی کو سلام کیا اور نجمہ پر مایوس نگاہیں ڈالتا ہوا باہر چلا گیا ۔

نجمہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس کی ماں یہ سوچنے کے لئے

تنہا رہ گئی کہ نجمہ کی کشتی حیات کو اس منجدھار سے کیونکر نکالا جائے۔ لیکن وہ کسی کامیاب نتیجہ پر نہ پہونچ سکی۔

نجمہ کی معصومیت اس کی بیزبانی اور ایک مقید پرند کی طرح اس کی مجبوری بیکس ماں کا دل پاش پاش کئے دیتی تھی اسی اثنار میں نواب صاحب آگئے اور ان کی بیوی نے بھرائی ہوئی آواز میں ایک مرتبہ پھر نواب صاحب رحم کی التجا کی لیکن اس مرتبہ پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ انھوں نے اپنی بیوی کو مزید اظہار خیال سے منع کردیا۔

۴

اسلم جس عالم میں وہاں سے چلا تھا اور جس حالت میں گھر تک پہونچا، اس کا صحیح احساس کوئی وہ شخص نہیں کرسکتا جس کا دل جذبات محبت سے خالی ہو۔ جس قدر رو سکا رویا۔ اپنی قسمت پر جس قدر ماتم کرسکا کیا۔ نجمہ کے خط سے اس کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ نجمہ کے لئے اس کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ اس کے بعد عالم خیال میں خود بخود نجمہ سے باتیں کرنی شروع کردیں۔

آہ نجمہ! تمھارا حاصل کرنا جس قدر آسان تھا افسوس کہ آج اسی قدر مشکل ہے۔ اگر تم خدا بن جاتیں تو میں تمھیں حاصل کرنے میں کبھی ناکامیاب نہ ہوتا۔ میری کوششیں تمھیں میرا بنا دیتیں مگر تم انسان ہونے کے بعد بھی میرے لئے ایک عقدہ لاینحل بن گئیں افسوس!

ریاض دہر میں ناآشنائے بزم عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محروم مسرت ہوں

کسی کا گلہ نہیں، کسی کی شکایت نہیں۔ جب اپنی ہی قسمت اپنے ساتھ دغا کررہی ہے۔ جب زمانہ ہی دھوکا دے رہا ہے تو پھر شکوہ کس سے اور کیوں جو پھول میرے چمن میں کھلا تھا وہ کل ہی ایک دوسرے کے باغ زندگی کی رونق بڑھائیگا۔ آہ! مجبور نجمہ تیرا بدنصیب اسلم موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ آ، اور دیکھ، جو اسلم ماں باپ کی موت اور خاندان کی تباہیوں پر کبھی نہیں رویا۔ اس کے دل کے آج پرخچے اڑے جارہے ہیں۔ نجمہ میں آج پھر تجھ سے تجدید وفا کرتا ہوں کہ دنیا کی طاقتیں اگر تجھ کو مجھ سے چھین لینے پر قادر ہوسکتی ہیں تو ہوا کریں لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا اور دنیا کی کوئی طاقت

مجھے مجبور نہیں کر سکتی کہ جس دل میں تیری یاد ہے۔ جس دل میں تو ہے اس میں میری زندگی کے کسی لمحے میں کوئی دوسری ہستی جگہ پا سکے۔ کم از کم میں انسان ہوں اور تجھ سے بدعہدی کر کے اپنی انسانیت کو مجروح نہ کرونگا۔

بخمہ! اسلم تیرا اور محض تیرا ہے۔ تیرا ہو کر رہیگا اور اگر زندہ رہیگا تو تیرے نام پر۔ اچھا بخمہ خدا حافظ' خوش رہو۔ شادی مبارک ہو۔ خدا کرے کامیاب و خوشگوار زندگی کی مالک بنو۔ اپنے اسلم کو بُھلا نہ دینا۔ ہر وقت نہیں، ہمیشہ نہیں۔ روزانہ نہیں۔ کبھی کبھی گاہے ماہے یاد کر لیا کرنا۔ یہ کہتے کہتے اسلم کی آواز بھرا گئی بے تابی سے اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جب کسی قدر سکون ہوا تو سامنے کی میز سے قلم دوات، کاغذ اٹھایا اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کے بعد ایک مضبوط لفافہ میں اس کو بند کیا اور اس پر لاکھ کی مہر لگا کر حفاظت کے ساتھ اپنی کوٹ کے اندرونی جیب میں رکھ لیا اور پھر دیوانہ وار ٹہلنے لگا۔

۵

نصیر آباد، ۱۰ مارچ،

پریشان اسلم، خط ملا، کہہ دیا تھا پریشان نہ ہو گھبراؤ نہیں، ہراساں مت ہو قسمت پر شاکر رہو۔ مقدر جو تماشہ دکھلائے دیکھو اور چپ رہو۔ زمانہ کے مظالم برداشت کرو اور چپ رہو۔ میرے باپ کی سنگدلی اور بے رحمیوں کا شکار بنو اور تلملاؤ نہیں۔ کلیجہ اور دل پر خاندان کی سرد مہریوں کا زخم کھاؤ مگر تڑپو نہیں۔ لیکن تمھاری بے صبری دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیا محبت اسی دن کے لئے کی تھی کہ اپنی جان دو۔ اسلم، جان دُنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ اپنے لئے نہیں، میرے لئے زندہ رہو۔ تم کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا سہارا تم اور صرف تم ہو۔ کیا مجھکو تم اس دنیا میں بے سہارہ چھوڑنا چاہتے ہو۔ کیا تمھاری لغت میں حق وفا کے یہی معنی ہیں؟ کیا میری امید کے اس آخری تار کو بھی تم توڑ دینا چاہتے ہو۔ نہیں اسلم خدا کے لئے ایسا نہ کرو میری مسرتوں کو خاک میں نہ ملاؤ۔ آج دنیا کی تمام مسرتوں میں یہی تو ایک خوشی مجھے حاصل ہے کیا تم اس کو بھی فنا کر دینا چاہتے ہو؟

اسلم! لِلّٰہ باز آؤ۔ میری اور اپنی بربادیوں کا ماتم کرو مگر زندہ رہو، مرنے کی اجازت مانگتے ہو اور پھر مجھی سے۔ نہیں اسلم مرنے کی نہیں اگر مارنے کی اجازت مانگو تو دے سکتی ہوں۔ ہاں میں سنگدل ہوں۔ بیرحم ہوں سفاک ہوں، سبھی کچھ ہوں۔ لیکن تمھاری تھی، تمھاری ہوں اور تمھاری رہونگی۔

اسلم شک نہ کرو، شبہ کو دل میں جگہ نہ دو۔ تم کو معلوم نہیں میرا کیا حال ہے اگر لکھنے کے قابل ہو تو لکھوں لیکن میں اپنی حالت لکھ کر یا اپنے خون کے آنسوؤں سے بھرا ہوا پیالہ تمھارے سامنے پیش نہیں کر سکتی۔

تمھاری بخمہ جس حال میں زندگی بسر کر رہی ہے خدا کے لئے اس کو دیکھنے کی کبھی جرأت نہ کرنا۔ ورنہ تم برداشت نہ کر سکوگے۔ یہ تم نے بالکل صحیح لکھا کہ تم میرے ہو۔ مگر اسلم تم میرے کب نہیں تھے۔ ہمیشہ سے تھے ہمیشہ رہوگے کیوں؟ کیا ایسا نہیں ہے؟ کلہ شام کو اس دروازے پر جہاں ہم تم کھیلا کرتے تھے بارات آئیگی۔ کس کی؟ تمھاری نہیں، میری۔ اچھے اسلم تم نہ آنا۔ اور آکر کیا کروگے۔ جس دروازے پر تم کو میری بھیک نہیں دی گئی اس پر قدم نہ رکھنا ــــ "سمند ناز پر ایک تازیانہ" کے مصداق تم کو مدعو کیا جائیگا اس لئے نہیں کہ تم مجھکو لے جاؤ بلکہ اس لئے کہ اپنے ہاتھوں سے میرا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں دیدو۔ آنے والوں کی خاطر مدارات کرو اور جب میں اس گھر کو چھوڑنے لگوں تو ایک آنسو بھی اپنی آنکھ سے گرانے کا تم کو اختیار نہ ہو۔

اسلم! یہ وہی تو دروازہ ہے جہاں شام کے جھٹپٹے میں ہم تم دونوں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ ہاں اسی دروازے پر اسی جگہ بارات آئیگی نکاح ہوگا۔ میں ہمیشہ کیلئے دوسرے کی کنیزی میں دیدی جاؤنگی۔

اسلم! کیا تمھیں اس دن کی خبر تھی۔ آہ، اگر تھی تو اس وقت تم نے کیوں نہیں بتایا!۔ اس وقت تو موت بڑی آسان تھی نہ ننگ ہنسائی کا خوف نہ رسوائی کا ڈر۔ نہ ذلت کا اندیشہ، نہ بدنامی کا خطرہ کچھ بھی تو نہ تھا۔

خیر جو وقت گذر گیا اس کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ جب نہ سہی تو اب سہی۔ گھر بھر میں، گاؤں میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ ہر شخص مسرور ہے جانتے ہو اسلم کیوں؟ اس لئے کہ پرسوں میری زندہ نعش اس گھر سے نکلے گی۔ باغ کے پھول میرا انتظار کر رہے ہیں۔ سرو کا درخت میری ناکامیوں پر ساکت کھڑا ہے۔ نرگس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری تباہیوں کو دیکھ رہی ہے لیکن اسلم! دنیائے انسانیت کی جو ہستی مجھ پر رحم کرنے کے لئے تیار نہیں وہ خود میرا باپ ہے۔

اچھا' ہاں اسلم' تو پھر میں کل دولھن بنائی جاؤنگی مجھے سنوارا جائیگا لیکن اسے یاد رکھو جس رات میرا یہ سہاگ قائم ہوگا اسی رات یہ اجڑے گا

اسلم ہو تو نہیں۔ تم سے کہا تھا، نہیں وعدہ کیا تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ میں تمھاری ہو
پھر کس کی دلھن۔ کیسی دولھن۔ کس کا سہاگ۔ جو سہاگ اسلم سے وابستہ
نہیں ہو سکتا وہ کسی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ شہانی چوڑیوں کی وہ آنکھوں کو
خیرہ کر دینے والی چمک اگر اسلم کے دل کو منور نہیں کر سکتی تو سارے گھر کو ہمیشہ
کے لئے تاریک بنا سکتی ہے۔ پہنانے والے پہنا دیں۔ سہرا باندھنے والے
باندھ دیں۔ نکاح کرنے والے نکاح کر دیں۔ خوشیاں منانے والے میری
بربادیوں پر جس قدر چاہیں نغمیں بجالیں لیکن اسلم وہ دن بھی اب زیادہ دور
نہیں ہے کہ ان سب کو اگر اپنی حماقتوں پر رونا نہیں تو کم سے کم افسوس کرنا
اور پچھتانا ضرور پڑیگا۔ میں تم سے عہد کرتی ہوں اور تم کو یقین دلاتی ہوں کہ
اپنی دوشیزگیت کو کبھی مجروح نہ کرونگی۔ جس طرح اباجان نے اپنی جائداد کی
حفاظت کی ہے میں اپنی عصمت کی حفاظت کرونگی۔ اپنی عفت کی رکھوالی
کرونگی۔ اپنی شرم و حیا کی لاج رکھوں گی اور کوئی ہاتھ وہاں تک پہونچنے میں
کامیاب نہیں ہو سکتا جہاں خود تم کو پہونچنے سے روکا گیا۔ چلو اچھا ہوا روز کے
جھگڑوں سے نجات ملی۔ فکر سے آزادی ہوئی۔ جائداد لینے والے لیں۔ خدا
ان کو مبارک کرے۔ مگر میں نصیبوں جلی آگ کے جن دہکتے ہوئے انگاروں
پر لوٹ رہی ہوں وہ ہمیشہ میرا بستر رہینگے۔

اچھا، اسلم، کم سے کم آج سے اس دنیا میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت:
اگر یہ صحیح ہے کہ قیامت میں ملاقات ہوگی تو پھر وہیں ملیں گے۔ اگر میں تمھیں
تلاش نہ کر سکوں تو تم مجھے ڈھونڈھ لینا اس وجہ سے کہ میرا دامن وفا بظاہر
داغدار ہو چکا ہے لیکن تمھارا دامن اب بھی اس قابل ہے کہ اس پر فرشتے
نماز پڑھیں۔ میں اب کچھ نہ کہونگی۔ اس خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں
اب مجھے کبھی دیکھنے کی کوشش کرنا۔ میں یہ بھی تم کو ممانعت کرتی ہوں کہ
تم کبھی میرے مکان پر نہ آنا۔ زخموں پر اپنے ہی ہاتھوں نمک چھڑکنا کوئی
عقلمندی نہیں۔ پھر آکر کیا کروگے۔ اچھا خدا حافظ۔

تمھاری حسرت نصیب نجمہ

۶

شام کو بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے بارات آئی اور رات کے
گیارہ بجے کے قریب نجمہ کا نکاح اطہر سے ہو گیا۔ نجمہ پر کیا گذری کوئی نہیں بتا
سکتا۔ نواب صاحب نے صبح کو بھی بارات روک لیا اور بڑے اعلیٰ پیمانہ پر
مہمان نوازی کی۔ گاؤں کے جس قدر غریب غربا تھے سب کو کھانا تقسیم کیا گیا
اور بڑی اولوالعزمی، فراخدلی اور فیاضی سے روپیہ صرف کیا گیا۔ لیکن لوگوں
کو معلوم نہ تھا کہ جس لڑکی کی شادی کے لئے اس قدر بے پایاں خوشیوں کا
اظہار کیا جا رہا ہے خود اس کا دل اندر سے رو رہا ہے لیکن جب اس کی فکر
باپ ہی کو نہ تھی تو پھر دوسروں کو کیوں ہونے لگی۔

باراتی اپنی مختلف دلچسپیوں میں مصروف تھے کہ اسلم کا مخصوص خدمتگار
گھبرایا ہوا آیا اور اس نے آتے ہی نواب صاحب سے کہا کہ چلئے دیکھئے بھیا کو کیا
ہو گیا ہے۔ نواب صاحب بغیر ایک لمحہ تامل کئے ہوئے نوکر کے ساتھ ہو لئے
وہاں جاکر دیکھا تو اسلم کا بدن سرد تھا اور وہ ابدی گہری نیند سو رہا تھا نواب
صاحب نے اسی وقت قریب ترین ڈاکٹر کو لینے کیلئے کار بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب
نے دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ شدت غم سے قلب کی حرکت بند
ہو جانے سے موت واقع ہوئی۔

چند لمحوں میں بزم عشرت بزم ماتم بن گئی۔ جو لوگ نجمہ کو لینے آئے تھے
وہ اسلم کو قبرستان لے جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گاؤں کا ذرہ ذرہ اسلم
کی بیکسی اور اس کی جواناں مرگی پر ماتم کر رہا تھا۔ در و دیوار سے حسرت برس
رہی تھی اور اس گاؤں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والا اسلم ان سب
سے بے نیاز آنکھیں بند کئے ہوئے اطمینان کی نیند سو رہا تھا۔ ہاں اس کے
لبوں پر معصومانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ
اپنی جس زندگی کی ناکامی پر عمر بھر آنسو بہاتا رہا آج اسی کے اختتام
پر مسکرا رہا ہے۔

نجمہ پر کیا گذری لکھنے کی ضرورت نہیں دیکھنے والے جانتے ہیں کہ نجمہ کے منہ سے
اُف بھی نہ نکلی۔ نہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو تھا نہ لب پر آہ تھی۔ ہاں
دھڑکتے ہوئے کلیجہ کی آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔ سارے گھر میں سارے محلہ
اور گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا ہر شخص پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا مگر اس کی
یہ حالت تھی کہ نہ خنداں تھی نہ گریاں۔

اسلم کا حسرت بھرا اور پر ارمان پھولوں سے لدا ہوا جنازہ جس وقت
قبرستان جانے کے نواب صاحب کے مکان کے اس حصہ کے نیچے سے ہو کر
گذرا جس کے بالائی حصے پر نجمہ کا کمرہ تھا تو نجمہ کھڑکی پر آکر کھڑی ہو گئی اور
اسلم کی آنے والی لاش کا انتظار کرنے لگی۔ جب عین کھڑکی کے مقابل اسلم

کی لاش پہونچی ہے تو اس نے ایک تحکمانہ لہجہ میں نعش کو رکوا دینے کا حکم دیا اپنے سہرے سے چند پھول توڑے اور یہ کہہ کر نعش پر ڈال دیئے کہ اسلم لو جن پھولوں کے دینے کا وعدہ کیا تھا افسوس ان کو تمہاری زندگی میں نہ دے سکی - مرنے کے بعد دے رہی ہوں اچھوتے پھول ہیں قبول کرو اتنی بھی جانے کی جلدی اچھی نہیں - منع کیا تھا کہ مجھ سے پہلے جانے کی جلدی نہ کرنا - لیکن تمہاری عجلت پسند طبیعت نہ مانی اور چلدیئے کیا اکیلے ہی جاؤ گے تنہائی میں گھبرا گئے تو نہیں مجھے بھی اگر ساتھ لئے چلتے تو بھلا کیا حرج تھا - یہ میں نے کب کہا تھا تمہارے ساتھ نہ جاؤنگی کیا یہی شرط وفا تھی - خوب نباہا بڑے وفادار نکلے - اپنی جس نجمہ کے ساتھ عمر بھر نباہ دینے کا وعدہ کیا تھا آج اس کو بے سہارا اور بے یار و مددگار چھوڑ کر جانے میں کچھ پس و پیش بھی نہ کیا اچھا چلو میں بھی آتی ہوں گھبراؤ نہیں زیادہ دن نہیں لگاؤنگی - نجمہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی اس کی زبان سے ایک دلدوز اور فلک شگاف آہ نکل گئی اور اسی جگہ گر کر بیہوش ہوگئی - اس کو کب ہوش آیا کیسے آیا کسی کو نہیں معلوم لیکن اس واقعہ کے بعد سے اس لمحہ تک جس میں کہ یہ افسانہ قلمبند کیا جا رہا ہے نجمہ کو شاید کبھی کسی نے ہنستے ہوئے بھی نہ دیکھا ہوگا - وہ جیسی المناک زندگی بسر کر رہی ہے اس کا صحیح نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچا جاسکتا

یہ محض ایک افسانہ نہیں ہے - بلکہ ایک خاندان کی بربادیوں کی زندہ داستان ہے جس کے کل افراد بجز نواب صاحب و اسلم کے آج بھی بقید حیات ہیں نجمہ بھی موجود ہے لیکن وہ اپنی زندگی سے اس درجہ برداشتہ خاطر ہے کہ آج بجز موت کے کوئی دوسری آرزو اس کے دل میں گھر نہ کر سکی - تاریخ نکاح سے اس وقت تک شاید اس کے شوہر سے اگر دریافت کیا جائے تو وہ اس کی صورت اور صحیح خد و خال بھی نہ بتا سکیگے اور نجمہ نے تو شاید عمر بھر اپنے شوہر کی جھلک بھی نہ دیکھی ہو - وہ اس وقت ایک پاکیزہ زندگی بسر کر رہی ہے اور دنیا کی وہ تمام لغویات جن کا تعلق ازدواجی زندگی سے ہے ان سے بالکل بے نیاز ہے نہ اس کو کپڑوں کا شوق ہے اور نہ کھانے کا - ہاں غربا کو کھانا کھلانا محتاجوں کی امداد و اعانت کرنا اس کی زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ ہے - بہرحال شادی کا جو مقصد ہوا کرتا ہے وہ تو پورا نہ ہوا لیکن جس غرض کیلئے یہ شادی کی گئی تھی وہ ضرور پوری ہوئی اسلم کے انتقال کے ایک ہفتہ کے بعد ڈپٹی کمشنر ضلع کی ایک چٹھی بدیں مضمون موصول ہوئی کہ محمد اسلم زمیندار نصیر آباد نے اپنی کل جائداد منقولہ غیر منقولہ آپ کی چھوٹی لڑکی نجمہ کے نام اپنے اس وصیت نامہ کے ذریعہ سے منتقل کیا ہے جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں میرے پاس سر بمہر داخل کیا تھا اور جو میرے پاس محفوظ ہے - میں آپ کو اور آپ کی لڑکی کو مبارکباد دیتا ہوں -

ایوبی

گلزار خلیل!

حضرت خلیل بیگو سرائی

ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے، جام ہے
لطف کا دن ہے، مزے کی شام ہے

دیکھئے کس کس کے سر جاتی ہے آج
وہ ہیں، مقتل ہے، ہجوم عام ہے

ہے جہاں تک کوچہ قاتل کی حد
کربلا اتنی زمیں کا نام ہے

شیخ، جنت میں یہ شغل مے کہاں
موت ہے اس کی جو مے آشام ہے

آنکھ سے لڑنا، الجھنا زلف سے
کام یہ ہے بھی تو دل کا کام ہے

مرنے والے کا نشاں تک بھی نہیں
وہ سمجھتے ہیں کہ زیر بام ہے

مے نہیں تو مے کی تلچھٹ ہی سہی
کچھ چڑھا لینے سے مجھکو کام ہے

جس کو دیکھو ہے کفن بر دوش وہ
آج کیا اُس در پہ قتل عام ہے

دل کی چوری پر وہ یہ کہنے لگے،
جھوٹ ہے، بہتان ہے، الزام ہے

تھا وہ جلوہ، ہے مگر یہ جلوہ گاہ
طور سے بڑھ کر بتوں کا بام ہے

سکہ بیٹھا ہے وہ تیرے حسن کا
جو بھی ہے وہ بندۂ بے دام ہے

کیوں نہ مٹی میں تن خاکی ملے،
خاک ہے آغاز، خاک انجام ہے

توبہ کرنے کو تو کر لیتے خلیل
کیا کریں برسات کا ہنگام ہے

"خاک کا ڈھیر" اور "زندگی کا اصل مقصد"[1]

جناب مولانا مقبول حسین صاحب بی۔اے احمد پوری

جس طرح غسل سے جسم پاک ہوتا ہے شست وشو سے ہر قسم کی غلاظت کا ازالہ ہوتا ہے دوا سے امراض کا دفعیہ ہوتا ہے اور جس طرح ریاضت وعبادت سے گناہگار آدمی پرہیزگار اور پاک ہوتا ہے۔ نیک عادتوں سے انسان فرشتہ خصلت اور سچے خیالات سے پاک باطن اور ولی کامل ہو جاتا ہے اسی طرح غالباً صداقت اپنا مشن زندگی کے ہر شعبہ تک پہونچاتی ہے اور ہماری روح کو بلندی کا راستہ دکھاتی ہے۔ صداقت وخلوص سے بڑھ کر نہ تو کوئی پیغمبر ہے نہ کوئی ریفارمر اور "سوسائٹی" جس کو اہل یورپ کی اصطلاح میں فیشن ایبل لوگوں کی تفریح کہنا چاہئے جو ابھی ہندوستان میں چند مخصوص طبقوں ہی تک محدود ہے (یعنی وہ جو صرف دولتمند ہی نہیں بلکہ تھوڑے بہت تماشبین بھی ہیں) وہ سوسائٹی ہمارے لئے ابھی دور ہے اور خدا اسے دور ہی رکھے تو اچھا ہے۔ بقول شاعر ؎

غنیمت ہے کہ ہمصورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہمارے [illegible] تو دو چار ہم صورتوں کا باہم بیٹھنا ہی دراصل سوسائٹی ہے جو آج کل کے صاف دل لوگوں کو مشکل سے نصیب ہے اور اس دو چار ہم صورتوں کے باہم مل بیٹھنے میں جو صداقت کا مشن ہے وہی دراصل ہماری سوسائٹی کی جان ہے۔ خدا معلوم اس کا پرچار اور اس قسم کی پاک معاشرت کی تبلیغ اب دن پر دن کیوں کم ہوتی جاتی ہے۔ کیا ہندوستان کی قسمت ظلمت کے دھواں دھار میں جاکر معدوم ہو گئی کہ اب کوئی گرونانک، کوئی کبیر کوئی پیر عطا یا ملہا شاہ یا اسی طرح کا کوئی اور پیشوا پیدا نہیں ہوتا۔ زمانے کا تقاضا بھی عجیب ہوا کرتا ہے۔ تاریخ کے دیکھتے ہی دیکھتے دین وحدانیت کے رائج ہوتے ہی ہوتے سچائی کے مشن نے بھی کتنے پہلو بدلے۔ خصوصاً ہمارے اس برگشتہ قسمت ملک میں اول وہ وقت تھا جب مسلمانوں نے کہا تھا کہ خدا ایک ہے سب اسی سے ہیں اور اسی میں سب کو لے ہو جانا ہے تو اس وقت کبیر نے گرونانک نے، ولبھ سوامی نے غرض ایسے ہی نہیں معلوم کتنوں نے کہا تھا کہ جو کچھ ہے سب برہم ہی برہم ہے اور اس پر بہت سے ہیل میل والے ہاں کہنے کو تیار ہو گئے تھے۔ یہ ایک زمانہ تھا جو منجملہ دیگر زمانوں کے محض ایک "زمانہ گذشتہ" ہو کر رہ گیا۔ ایک یادگار پارینہ جو اب ہم کو متعجب کرتی ہے کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی سوسائٹی بھی ہوا کرتی تھی۔

دوم[2] وہ وقت آیا کہ لوگ کہنے لگے "وحدانیت ہمارا مشن ہے۔ کوئی اس میں اور دخل نہ دے" پھر کیا تھا۔ آریہ سماج پیدا ہوئے۔ گو تبلیغ وحدانیت اب ایک ملکیت ہو گئی اور لوگ اس کے قبضہ تامہ کے لئے رائے عامہ کی عدالت میں مقدمات دائر کرنے لگے۔ "آریہ سماج" "قادیانی سماج"۔ اور علیٰ ہذا القیاس نہیں معلوم کتنے سماج پیدا ہو گئے۔ ہندوستان نے سوسائٹی کا یہ دور بھی دیکھ لیا۔

سوئم[3]۔ وحدانیت کا مشن دماغوں سے فراموش ہوتے ہوتے آخر مٹ گیا۔ اب کیا رہا۔ ہم مسلمان، ہم سکھ، ہم سناتن دھرم، ہم شیعہ، ہم سنی، ہم یزیدی، آفریدی، علوی، سقلی، نجوی، بطلیموسی، قندوسی، چغتائی۔ الٰہی توبہ! انتہا کی بھی کوئی انتہا ہے۔ "کجا وحدت، کجا کثرت"۔

نتیجہ ظاہر ہے اب وہ خلوص وصداقت سے متعلق سوسائٹی کا دائرہ محدود ہو کر زبان کی نوک پر آ رہا۔ گویا ہماری سوسائٹی

---

[1] علوم ادب میں علوم اخلاقی کی وہ صنف بھی شامل ہے جن کو مذہب اور معاشیات کے مابین تصوف سے الگ مگر اسی کی روشنی میں منجملہ علوم الٰہی کے "مجاز حقیقت نما" کے دلچسپ اور متضاد الفاظ کے ساتھ یاد کیا کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس قسم کی بحث Humanitereanizam سے متعلق سمجھی جائیگی۔ مقبول

اب مسخ ہوکر یا خودی کے جوش میں مست ہوکر انانیت کے خار میں تو تو میں میں کی پکار میں اور ایک دوسرے کے ساتھ آپس کی جوتی پیزار میں خوار ہوکر یہ کہہ رہی ہے کہ ؏ بہ نوک خارمی رقصم، بہ نوک خارمی رقصم۔

یہ تو ہوئی معاشرت کی ایک معمولی سی مثال جس کو زمانے کی ادا کرشمہ سازی روش دنیا یا انقلاب جو کچھ کہئے بجا اور درست ہے اس کا شکوہ کرنا گویا مرنے کے سرہانے آہ و بکا کرکے یہ کہنا ہے کہ ؎

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

لیکن اب کیا ہوتا ہے ؏

تلسی داس بھو بھگوان، اب کا کرہو کاگد (کاغذ) پھاٹ

بڑے بڑے مذاہب، پنتھ، معاشری اور اور قوموں کی دلولہ انگیز ذہنیتیں اسی طرح انقلاب پذیر ہوتی رہیں اور ہوتی رہینگی۔ پھر بھی اصل مقصد ہر زمانہ کا یہی رہا ہے کہ —— دیکھو —— "ہم سے پہلے دنیا کی حالت اچھی تھی۔ موجودہ وقت ناگفتہ بہ ہے اس کو سنوارو اور آئندہ کی فکر کرو —"

آخر اس قسم کی زحمت کیوں گوارہ کی جائے؟ یہ سوال تو نہایت بے تکا سا ہے کیونکہ ہر جاندار یہی کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ "اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اور اس کے بعد راحت و عیش کا سامان بہم پہونچانے کے لئے موجودہ وقت کو سنوارو اور آئندہ کی فکر کرو"

ہاں تو کیا واقعی اصل مقصد یہی ہے۔ حال کی بہبودی اور آیندہ کی فکر اور وہ بھی صرف ضروریات بہم پہونچانے اور عیش و راحت کے لئے۔ بادی النظر میں سب یہی تکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر ہاں میں ہاں ملاتا ہوا نظر آتا ہے کہ یہ اصل مقصد ہے۔

مگر آج ایک آدمی۔ ایک بے نوا غریب آدمی۔ سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا بیمار و لاچار کہتا ہے۔ "خدایا مجھ کو اتنی صحت دے کہ اٹھ بیٹھ سکوں"۔ اس کی حالت سنبھلتی ہے طرح طرح کی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں۔ چلنے پھرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ لیکن اب وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے اگر اس وقت میرے پاس ایک روپیہ ہو تو کیا اچھا ہو۔ اس کو روپیہ مل جاتا ہے۔ وہ ایک سے دو کرتا ہے، دو سے چار، چار سے پانچ، چھ، سات، دس بیس، پچاس، سو، دوسو، ہزار اور آخر اتفاقات زمانہ سے وہ لکھ پتی ہوجاتا ہے۔ لیکن اب وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ وہ ملک ملک گھومتا پھرتا ہے دنیا بھر کی سیر سے جی سیر کرتا ہوا واپس آتا ہے مگر دنیا سے اس کا جی نہیں بھرا وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کیا ہیں۔ ہزاروں روپے پیدا کرتا ہے اور ہزاروں اس تلاش میں خرچ کرتا ہے کہ چاند کیا ہے؟ سورج ایسا کیوں ہے[1] اور گویا اس کی زندگی اسی طرح کسی نہ کسی شغل میں لگی رہتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اصل مقصد ضروریات کا بہم پہونچانا ہی نہیں بلکہ کچھ اور ہے، عیش و راحت ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ۔

کیا یہ مثال ہماری زندگی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہم جواب "ہم" ہیں۔ کبھی شیر خوار بچے تھے۔ پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ پیسہ کی لالچ نے ہمارے دل میں جگہ کی تھی۔ پڑھنا لکھنا ہم کو سکھایا گیا تھا۔ ہم مال ار ہوئے یا نہ ہوئے، غرض ہاتھ پیر والے ہوگئے۔ ہماری حیثیت کے موافق خدا نے عیش و آرام بھی دیا تھا۔ لیکن ہم مطمئن نہ تھے نہ اب ہم کو اطمینان ہے۔ ہم کچھ چاہتے ہیں اور مرتے وقت تک اور غالباً اس کے بعد تک اور شاید اس کے بعد ابعد تک کچھ چاہتے ہی رہینگے۔ شاید اصل مقصد وہی ہے۔

وہ کیا ہے؟

یہ بڑی غلطی ہے کہ ہم عیش و راحت کی زندگی کا اصل مقصد سمجھیں۔ انسان کی انسانیت کا دار و مدار اس پر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ حصول عیش کے تھوڑے ہی عرصہ بعد محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہماری کوششیں اتنی سی شے کے لئے نہ تھیں تو اصل مقصد سچائی ہے۔

"سچائی"!! اس لفظ پر تو قسم خدا کی ہنسی آتی ہے بھلا یہ زمانہ اور سچائی کا دعظ۔ ؏ دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار۔ لیکن اصل مقصد یہی ہے یعنی "سچائی کا کھوج" اور عیش و راحت کی امید محض ایک بہانہ ہے جو ہمیں صداقت کی تلاش کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کوشش میں اس جد و جہد میں نہیں معلوم کتنی مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ سب تکلیفیں اور مصیبتیں بھی ہمائی کرتی ہیں اس "سچائی کے کھوج" کیلئے۔ ہم سب تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔ عیش و راحت کے لئے نہیں یہ تو بہانہ ہیں۔ بظاہر دل کو سمجھانے کے لئے دنیا تصویر بنانے کیلئے۔ ہم امتحان پاس کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہم پاس ہوجائینگے بلکہ آگے امتحانوں اور مزید تعلیم کے لئے۔ لیکن ہماری محنتوں

---

[1] ظاہر ہے کہ آج کل کی [illegible] کائنات [illegible]
شیخ صاحب [illegible] دونوں ہاتھ سے تھامئے دستار (مدیر)

اور کوششوں کا عارضی مطمح نظر امتحان کا پاس کرنا ہی ہوتا ہے یہی حال راحت و سکون کا ہے۔ یہ تو زندگانی کے مرحلے ہیں۔ آگے بڑھنے کے لئے۔ جس طرح میر صاحب نے مرنے کے متعلق یہ کہا ہے اور غالباً بالکل سچ کہا ہے کہ ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہاں تو ہمارا اصل مقصد "حق کی تلاش" ہے جو ہمیں باطل کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رکھ کر ہم کو اپنے لئے اور بھی زیادہ گرویدہ بنا رہی ہے۔ یہ گویا تعلیم ہو رہی ہے۔ ع کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

اور یہ "حق" ہے کہاں؟ شاید اس نیلے آسمان سے پرے عرش اعظم پر انوار لاہوتی سے گھرا ہوا۔ دور، اس کوہ کائنات کی سب سے اونچی چوٹی پر جس کے پرے کچھ نہیں۔ اے وا! ے خیال خام! کاش اب گھر وندا بنانے کی عادت کو بچپن کی عادت سمجھتے اور منصور کے ہم نوا ہو کر کہہ اٹھتے کہ "انا الحق" اس دور انانیت میں جبکہ ہماری دنیا ہماری زبان کی نوک پر ہے ہمیں یہ کہنے میں کیا لگتا تھا۔ رنگیلے صوفیوں میں ایسی ہی کچھ ہوا چلی تھی ؎

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم صنم ہم دیر ہم بتخانہ ہم بت ہم برہمن ہم

مگر نہیں صوفیوں کے "حق" اور ہمارے اصل مقصد سے متعلق "حق" میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارا اصل مقصد "تلاش حق" ہے۔ "حق" سے مطلب "حقیقت" ہے۔ جس کے متضاد کو "مجاز" کہا کرتے ہیں۔ یہی "حقیقت" ہم کو اس "حق" کی جھلک بھی دکھاتی ہے جس کو سب لوگ کسی زمانے میں "خدا" کہا کرتے تھے اور اب بھی منجملہ اساطیر پارینہ کے "خدا" کا نام ہی لیا جاتا ہے۔ مگر خیر وہ بہت دور ہے اور چونکہ ہم ابھی یہ بھی نہیں جانتے کہ "حقیقت" جو خود انسان کے اندر نہاں ہے وہ کیا ہے اور در اصل اس کو حقیقت کہنا بھی چاہیئے یا نہیں چہ جائیکہ "حقیقت مطلق" پر رائے زنی کرنا۔ اس لئے اسی حقیقت تک محدود رہ کر پہلے خود کو دیکھیں کہ جس انانیت کی طرف ہم جا رہے ہیں وہ کہاں تک حق بجانب ہے۔

ہاں تو "حق" یا "حقیقت" جس کا خود انسان حامل ہے اور جس کو بعض لوگ کبھی کبھی خواہ مخواہ آج کل "روح" بھی کہہ دیا کرتے ہیں وہ انسان کا اصل مقصد ہے۔ اسی پر انسانیت کا دار و مدار ہے اور اسی سے انسان انسان ہے ورنہ تودۂ خاک۔ اس حقیقت کا رہنما کون ہے "علم" اور اس حقیقت سے ساز باز پیدا کرنے والا کون ہے؟ "سچائی یا خلوص"۔ گویا زندگی کا اصل مقصد اول "علم" ہے جس کی طلب "ہر انسان مرد اور عورت پر فرض ہے"[1]

اس کے بعد اس پر عمل جو سچائی اور خلوص سے ممکن ہے اور یہ علم خود انسان کے دماغ میں ہے کہیں باہر سے نہیں آتا۔ دنیا تو محض ایک تمثیل ہے۔ جیسے کوئی معلم اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ دیکھو حشر کے دن دوزخ کی پشت پر جو پل صراط ہوگا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا تو یہ "بال اور یہ تلوار" دنیا ہے اور دنیا کی تمثیل اور "پل صراط" ابھی تمہارے دماغ میں ہے لیکن ابھی خود تمہارا دماغ پل صراط ہو سکتا ہے کیونکہ بقول خدا بخشے غالب کے

ع عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔

اس طرح علم اور علم سے "صداقت عمل" اور صداقت عمل سے "حقیقت" اور حقیقت سے "وحدانیت" یہ سب مدارج اسی دماغ کے ذریعے طے ہو سکتے ہیں ان سب سے متعلق علم انسان کے دماغ میں نہاں ہے جو کچھ معلوم ہو جاتا ہے گویا اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے اور اس حد تک ہی ہم عالم ہو جاتے ہیں۔ منصور صاحب کو بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا مگر تھے طبیعت کے منچلے۔ خورشید حقیقت کے طلوع کی گہری کرنوں نے ان کے دل کی آنکھ میں چکا چوندھ پیدا کر دی۔ جس طرح تجلی طور نے موسیٰ علیہ السلام کو بیخود کر دیا تھا وہی حشر منصور کا ہوا اور وہ علم جو ان کو وحدانیت کی سوسائٹی کی طرف لے جا رہا تھا ان کی زبان کی نوک پر آ رہا۔ جیسے آج کل ہم سچے مسلمان ہونے کے مدارج طے کئے بغیر "ہم مسلمان"۔ "ہم مسلمان"۔ "ہمارے باپ مسلمان"۔ "ہمارے دادا پردادا مسلمان" کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور نوے فی صدی حق انہی کے لئے لڑے مرتے ہیں یہی حال میاں منصور کا ہوا۔ شریعت کی گورنمنٹ نے آخر ان کو دکھا ہی دیا کہ وہ کتنے پانی میں تھے۔ جس طرح ہماری گورنمنٹ ہم کو بتا رہی ہے کہ ہم کس حد تک آزادی وطن کے حصہ دار ہو سکتے ہیں، یہی حال ان کا بھی ہے جو خود کو ہندوا اور آریوں کا سپوت کہتے ہیں۔

غرض جو علم ہم حاصل کرتے ہیں خود ہمارے دماغ سے آتا ہے اور مجاز و حقیقت کا غیر فانی دار العلوم اس طرح ہمارا دماغ ہی ہے۔ یہ کائنات محض ایک تمثیل ہے۔ کس لئے خیال و فکر کے لئے گویا کائنات دماغ کی یونیورسٹی کے لئے ایک دار التمثیل ہے۔

کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے۔

---

[1] حدیث طلب العلم فریضۃ الخ

ان فی اختلاف اللیل والنھار لآیات لاولی الالباب

یہ رات اور دن کی تبدیلیاں نشانیاں ہیں سمجھ والوں کے لئے،

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون

وہ جو خدا کا ذکر قیام، قعود اور سجود میں کرتے ہیں اور فکر (بچار) کرتے

فی خلق السمٰوات والارض۔

ہیں آسمانوں اور زمینوں کے تخلیق کے متعلق۔

اس طرح دماغ کی لائبریری کے لئے کائنات ایک دارالتمثیل ہے جو دماغ سے متعلق علم حاصل کرنے کے لئے رہنمائی کا کام انجام دیتی ہے۔ لیکن ہر حالت میں ہماری تعلیم کا اصل مقصد خود ہمارا دماغ ہے یعنی وہ حقیقت جس کی ایک ادنیٰ خاصیت دماغ ہے جس طرح پتھر میں شرارہ پنہاں رہتا ہے اسی طرح ہمارے دماغ میں وہ حقیقت پنہاں ہے۔ اس نے برگد کے پیڑ کے نیچے گوتم سدھارتھ کے دماغ میں بجلی کی سی چمک ظاہر کی اور گوتم کی آنکھ جھپکی اور کھلی اور ایسی کھلی کہ حقیقت سامنے نظر آنے لگی، لیکن گوتم نے صرف اس حقیقت کو دیکھا جو مجاز کی ضد ہے خدا معلوم اس حقیقت نے وحدانیت کی سوسائٹی کی جانب بھی اس کی رہنمائی کی یا نہیں۔ اس کا ذکر تاریخ میں نہیں۔

ہاں تو ہر وہ گناہ اور ثواب جو ہمارے تجربے میں آتا ہے محض اس لئے ہے کہ ہماری کوششوں کو برسرکار رکھے۔ اسے گناہ کو یاد کرکے رونے والے خوش ہو کہ وہ تیری روح کے پتھر پر ایک ضرب تھے تکالیف آزمائش کی آہنی ہتھوڑے کی تاکہ اس سے چنگاری پیدا ہو اور تو نادم ہو کر جہالت کے خس وخاشاک کو جلا سکے۔ اپنی نیکیوں کو یاد کرکے خوش ہونے والے انسان۔ بہت بھولا! سا کیونکہ امید کا سبز باغ تیری روح کو آزمانے کیلئے ایک طلسم ہے کہ کہیں تو بھٹک کر صراط مستقیم سے پرے نہ ہو جائے۔ سنبھل اور تکالیف کی سنگ خارا ضربیں اپنے اوپر برداشت کر۔

ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات (اور ہم تم کو کسی قدر بھوک، جان، مال اور ثمر (مقاصد) کے خسارے سے آزمائیں گے)

یہ آزمائش اس لئے ہے کہ دیکھیں تمہاری راکھ میں کچھ شرر بھی ہے اور یہ ضرب تمہارے جسمانی وروحانی سنگ خارا پر اس لئے ہے کہ دیکھیں کوئی چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ مبارک ہو اگر تم ایسے وقت حقیقت کی تلاش سے منہ نہ موڑو اور کہو کہ ہم تو اسی حقیقت منتظر کے متلاشی ہیں جس کی طرف ہیں پھر لوٹ کر جانا ہے۔

ہاں تو تمہاری بڑائی اس میں نہیں کہ تم دولتمند ہو جاؤ۔ اتنا روپیہ لے کہ ہنری فورڈ سے بڑھ جاؤ یا شہرت میں شیطان سے بازی لیجاؤ، یا عبادت میں بایزید وقت کہلاؤ۔ یا شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال اور ٹیگور سے ٹکر کھاؤ۔ تمہاری خوبی تو اس میں ہے کہ اپنے آپ کو انسان بناؤ۔ ایک انگریزی کہاوت ہے۔

"موقع موقع سے ہر احمق ہیرو ہو سکتا ہے"

لیکن انسان ہونے اور ہیرو ہونے میں بہت فرق ہے اور انسان کے خواص تو یہ ہیں کہ اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ فرائض کی تکمیل سے غافل نہ رہا جائے یہی راستہ ہے اصل حقیقت کی طرف لیجانے کا جو زندگی کا مقصد ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ادنیٰ واقعات ذرا ذرا سی حرکات یہی زینے ہیں منزل صداقت کے خدارا ان سیڑھیوں کو پھاندنے کی کوشش نہ کرو آہستہ آہستہ چڑھو دیکھیں تو بھلا مقام مقصود تک کیوں نہ پہونچےگے پھر وہاں سے مقام محمود کا زینہ بھی ہے،

"علم، علم سے صداقت عمل اور اس سے حقیقت اور

حقیقت سے وحدانیت کی سوسائٹی .... یہی مرحلے اصل منزل تک پہنچنے کے اور یہی زندگی کا اصل مقصد ہیں۔

انسان مرکز ہے اور تمام کائنات دائرہ۔ بقول حافظ ؎

"در دائرہ قسمت چوں نقطہ پرکارم"

ہر شے اپنے مرکز کی طرف مائل ہوا کرتی ہے اور اپنے مرکز میں لٹو کے مانند ہے یا ایک مقناطیس ہے۔ مصائب، آلام، نیکی، بدی، عیش آرام سب اس کی طرف آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ وہ تکلیف و راحت، امید و بیم، عیش و غم کو اسفنج کی طرح جذب کرتا ہے اور اسی طرح اپنے سے خارج بھی کر دیتا ہے، لیکن اس نکالنے اور داخل کرنے میں وہ ایک بڑی مشق کرتا ہے جس کو تجربہ کہتے ہیں اور جو اس کو اس مقصد تک لے جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی صفت کا حامل کہلائے۔ خاصیت جس کو انسانیت کہتے ہیں۔ جب انسان میں انسانیت آگئی تو علم، صداقت عمل، رویت حقیقت اور وحدانیت کی سوسائٹی تک پہونچنا کچھ مشکل نہیں۔ "وحدانیت کی سوسائٹی ہی وہ سوسائٹی ہے جس کے متعلق اشارہ ہے کہ۔

یا ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیہ،

اس لئے خدا کے واسطے ہم کو چاہئے کہ ہم خود اپنے آپ کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ یہ انانیت نہیں بلکہ اس لئے کہ پہلے ہم کو خود اپنے پر اعتماد ہونا چاہئے۔ اس معنی کر کے کہ آیا ہم آگے بڑھنے میں ہچکچاتے تو نہیں اور یہ کہ راہ پر صعب میں ہمارے دماغی قوی ہمارے ساتھ دینگے۔

ڈوب اے غواص دریائے طلب
وصل جاناں گو ہر نایاب ہے

(مقبول حسین احمدپوری)

عالمگیر بکڈپو کی چند قابلِ دید کتابیں!

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرز تحریر کا تازہ ترین شاہکار نہایت ہی پرمذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ لنکران اعظم کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہولناک و قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی و دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے قیمت صرف عہ محصولڈاک ۵ر

خطوط کی ستم ظریفی مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ ہنسانے والی یہ کتاب چغتائی صاحب کے مخصوص اور انوکھی طرز تحریر کی دلچسپ تصویر ہے فوراً طلب فرمائیے۔ قیمت ۱۲ر

کتاب التقدیر علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلندپایہ ادیب تھے آپ نے تقدیر کے مسئلہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب مرحوم نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا۔ کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دانان ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب بقضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوگئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا اب ہمارے پاس بہت تھوڑی جلدیں اس کی موجود ہیں۔ اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو یہ قابلِ دید کتاب عہر علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔ کتاب کا حجم پونے آٹھ سو صفحات ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر علامہ شبلی مرحوم کا ایک لاجواب تحقیقی و تاریخی کتاب جس میں تمام الزامات تاریخی کی روشنی میں رد کئے گئے ہیں جو اورنگ زیب پر لگائے جاتے ہیں۔ قیمت ۴ر

شادی آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے مزعفری حالات خود ملا صاحب کے فاؤنٹین پن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھائیے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف عہ دو روپیہ آٹھ آنے

صبح لطافت ملا رموزی صاحب کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابلِ دید مجموعہ کتاب کے صفحات زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں پڑھتے جائیے اور ہنستے جائیے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف عا

نوٹ:۔ ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت یکجا خریدنے پر تین روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک میں ملیگی ہے

روزنامچے (ایڈیٹر) دو حاضرہ کی بہترین تصنیف۔ کوثر میں دھلی ہوئی زبان نفسیات ادبیات مزاحیات کا نادر ترین مرقع۔ چند روزنامچوں کے عنوان ملاحظہ ہوں۔ بادشاہ کا روزنامچہ۔ فقیر کا روزنامچہ۔ ممبر اسمبلی کا روزنامچہ شوہر کا روزنامچہ۔ بیوی کا روزنامچہ۔ حکیم کا روزنامچہ۔ شاعر کا روزنامچہ۔ ایڈیٹر کا روزنامچہ وغیرہ

علامہ جرجی زیدان مصری کے دو بہترین تاریخی ناول

موتیوں کا درخت حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر

مجموعہ قیصر و اں حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲ر

دفتر عالمگیر کی طرف سے ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں پہلی مرتبہ بصرف زر کثیر شایع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے کتاب کی دلچسپی کے لئے زیدان کا نام کافی ہے۔ آج سے پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔

شاہد رعنا مصنفہ مولانا قاری سرفراز حسین صاحب عزمی مرحوم دہلوی ایک زبردست ناول لائق مطالعہ کتاب جس کی خوبیوں کا ذکر سلسلہ طلسم ہوشربا کے برابر ہے ضرور پڑھئے قیمت عہ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ) عالمگیر بکڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد (٢٤) فہرست مضامین ماہ مئی ١٩٣٦ء نمبر (١)

[illegible] دفتر رسالہ عالمگیر بازار صدر متھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ زیر نظر اشاعت کے ساتھ عالمگیر اپنی زندگی کے پورے بارہ سال بخیر و خوبی ختم کر رہا ہے اس دوازدہ سالہ دورِ حیات میں گوناگوں تکالیف - اقتصادی بدحالی - دشمنانِ عالمگیر کی معاندانہ روش عالمگیر نے بفضلہ تعالیٰ جس جرأت اور ہمت سے مقابلہ کیا اور اپنی معمولی حیثیت سے ترقی کی جو وقیع اور قابلِ رشک منزلیں طے کیں اس سے بہی خواہانِ عالمگیر بوجوہ احسن واقف ہیں - اب مناسب نہیں کہ میں عالمگیر کے گذشتہ دورِ حیات کے ناسامد اور پریشان کن حالات اور معاندین کی مذبوحی حرکات یہاں اعادہ کروں۔ ؎

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب ؍ ؍ ؍ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کے لئے

غالباً یہ عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ میں نے حتی الوسع عالمگیر کو زندہ رکھنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے نہایت نیک نیتی کے ساتھ ان تمام حقیر کوششوں کو بروئے کار لایا - جو میرے حیطۂ امکان میں تھیں - اب بھی میں یہی چاہتا ہوں کہ عالمگیر کا آئندہ دورِ حیات اتنا درخشاں اور ایسا شاندار ہے کہ عالمگیر کی موجودہ حیثیت اس کے سامنے نہایت غیر وقیع ہو کر رہ جائے +

دسمبر ۱۹۳۵ء میں سنہ ۱۹۳۶ء کے عالمگیر کا جو خاص نمبر - خاص نمبر سنہ ۱۹۳۶ء کے نام سے بڑے یعنی جہازی سائز پر شائع ہوا تھا - اگرچہ میں نے اسپر بہت معقول رقم زائد خرچ کی لیکن اس کی قابلِ رشک کامیابی میرے لئے اسقدر حوصلہ افزا ثابت ہوئی کہ میں موجودہ کساد بازاری کے باوجود

عالمگیر کے سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء کو بھی اسی سائز پر شائع کرنے کا اعلان کر چکا ہوں اور زیرِ نظر تحریر میں پھر اسی اعلان کا اعادہ کرتا ہوں کہ "عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء وسط جون میں اپنے خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح جہازی سائز پر شائع ہوگا"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے - کہ کیا واقعی عالمگیر اس قدر مستطیع ہوگیا ہے کہ وہ بآسانی سیکڑوں روپے خلافِ معمول زائد خرچ کرسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ اور صرف یہ ہے کہ عالمگیر کو اپنا الیکٹرک پریس ہو جانے کے سبب سے واقعی کچھ سہولتیں ناقابلِ بیان پریشانیوں کے بعد حاصل ہوگئی ہیں - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عالمگیر اسقدر متمول اور مستطیع ہوگیا ہے کہ وہ ایک کثیر و خطیر رقم کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی رقم میرے لئے بہت وقیع ہے - لیکن میں "دل کی خوشی کی خاطر" ہر ممکن قربانی اور ایثار کے لئے تیار ہوں - ؎

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال و دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

بہر حال - عالمگیر کا سالانہ نمبر وسط جون میں انہی تمام نمایاں خصوصیات کے ساتھ بڑے سائز پر شائع ہوگا جو عالمگیر کے خاص نمبروں کیلئے مخصوص ہیں +

یہ واقعہ ہے کہ عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۶ء کو جس نے بھی دیکھا وہ اس کی تعریف کرنے پر مجبور رہا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر بھی ہر حیثیت سے بہت شاندار اور مہتم بالشان خوبیوں کا حامل ہوگا۔ اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنے فی پرچہ ہوگی۔ لیکن اس کی صرف ایک تصویر یا ایک مضمون پر یہ قیمت سو مرتبہ قربان کی جاسکتی ہے میرے اس اعلان کو مبالغہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے اور ایسی حقیقت جو ناقابل تردید ہے۔ میں مضامین اور تصاویر کو دیکھ چکا ہوں۔ عالمگیر کے اس سالانہ نمبر پر کئی ہزار روپیہ کی جو خطیر رقم خرچ کر رہا ہوں۔ اس کا مجھے علم ہے۔ اس لئے میں یہ عرض کرنے میں یقیناً حق بجانب ہوں کہ عالمگیر کا سالانہ نمبر فی الحقیقت عدیم النظیر اور لاجواب ہوگا۔

میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں اس مختصر گنجائش میں سالانہ نمبر کی تصاویر یا مضامین کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کرسکوں۔ بلکہ مجمل طور پر کچھ لکھنا بھی ناممکن ہے۔ اس لئے جو کچھ سالانہ نمبر کے متعلق عرض کیا جاچکا ہے اسے کافی سمجھئے۔

چند یوم کے بعد جب عالمگیر کا یہ معرکہ آرا اور ہنگامہ پرور سالانہ نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ تو مجھے یقین ہے کہ آپ خود اس کی خوبیوں کا اعتراف فرمائیں گے۔

اس تحریر کو ختم کرنے سے پیشتر میں آپ کی خدمت

....

....

....

میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے حلقہ احباب میں بھی عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرما کر کاربردازان عالمگیر کی حوصلہ افزائی کیجئے۔ آپ کی اس مدد سے عالمگیر زیادہ سے زیادہ خدمت گذاری کے قابل ہوسکے گا۔

عالمگیر کے آئندہ دور حیات کے متعلق جو خاکہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اگر حالات کی مساعدت نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی اجازت دی تو آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ آپ کا عالمگیر مستقل طور پر ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین رسائل کی صف اول میں جگہ حاصل کرسکے گا۔

اگرچہ عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۳۷ء کے متعلق کوئی اعلان سردست قبل از وقت ہے۔ لیکن یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ جون کے سالانہ نمبر کے بعد میں اس کی تکمیل و ترتیب کا کام پوری سرگرمی کے ساتھ شروع کردینا چاہتا ہوں۔ اور نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالے عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۷ء تمام رسائل کے خاص نمبروں کے لئے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے قابل رشک ہوگا۔

میں اس پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اس میں ایسی ہنگامہ خیزی۔ ایسی جدت اور ایسا تنوع پیدا کرنے کا آرزومند ہوں۔ جو میرے عزائم اور حوصلوں کے عین مطابق ہو۔

وما توفیقی الا باللہ

حافظ محمد عالم عفی عنہ

ضروری اطلاع اگر آپ کی میعاد خریداری ختم نہیں ہوئی تو عالمگیر کا معرکہ آرا اور مہتم بالشان سالانہ نمبر بحفاظت حاصل کرنے کیلئے چار آنہ کی ٹکٹیں برائے محصول ڈاک بھیجئے تاکہ سالانہ نمبر رجسٹری کے ذریعہ ارسال کیا جائے۔ نمبر خریداری بھی ضرور لکھئے جن حضرات کی میعاد خریداری ختم ہوچکی ہے۔ وہ ٹکٹیں نہ بھیجیں۔ ان کی خدمت میں سالانہ نمبر آئندہ سال کے لئے بذریعہ وی پی ارسال ہوگا۔

مینیجر عالمگیر لاہور

تبرّکات

(از حضرت شاد عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ)

دل اپنی طلب میں صادق تھا، گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا، دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

پیری میں جوانی کا قصہ! کس منہ سے کہوں؟ شرم آتی ہے
وہ جوش گیا، وہ آن گئی، انداز گیا، اسلوب گیا

بے راحلہ و بے زادِ سفر، رحمت پہ بھروسا کر کے فقط
دنیا کی سرا سے جو اُٹھ کر۔ اِس طرح گیا وہ خوب گیا

طاقت جو نہیں، اب حیرت سے، تصویر کا عالم رہتا ہے
وہ آخر شب کی آہ گئی، وہ نعرۂ "یا محبوب" گیا

کوچہ میں ترے اب شاد نہیں، اللہ نے کر دی پاک زمیں
صد شکر سرائے فانی سے، آخر وہ سگِ معیوب گیا

شاد

سچی کہانی

(از جناب طالب علی صاحب)

ہم نے تو سنا ہے آپ نے بھی سنا ہوگا کہ اپنی بیتی ہو یا پرائی بیتی جو مزہ سچی باتوں میں ہے وہ کہانی میں کہاں - آج میں چاہتا ہوں کہ اپنے ایک سنا بچھڑے ہوئے بڑے بھائی کی کہانی آپ کو سناؤں - جاننے والے پہچان جائیں گے - پر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ نہ جاننے والے بھی سمجھتے ہیں کہ نہیں +

کوئی آج سے ۴۰ برس ادھر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا - گھر میں اور بچے بھی تھے - اور یہ تو سدا ہی سے ہوتا آیا ہے - کوئی جاتا ہے کوئی آتا ہے - پر وہ سماں ہی اور تھا - ہندو مسلمان کے جھگڑے ٹنٹے کہیں نہ تھے دونوں ایک دوسرے کے دکھ اور انند میں دل کھول کر ساتھ دیتے تھے اور جب تک کوئی مائی کا لال اپنے منہ سے نہ قبولے کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان کسی نئے آدمی کو کوئی پہچان نہیں ہوتی تھی - مسلمان ہوں یا ہندو - کریا کرم اور شادی بیاہ کی بہت سی باتیں ایک سی ہوتی تھیں -

یہ بچہ پیدا ہوا تو گاؤں بھر میں خوشی ہوئی پٹی داروں نے بھی مبارک سلامت دی جسے دیکھو ہنستا چلا آرہا ہے - پرجا کی بن آئی - بات بات میں دان پن کی کلیاں پھوٹنے لگیں - سوہلے گائے گئے - ڈھولکیاں بجائی گئیں - کیا دن تھے کیا زمانہ تھا کیا لوگ تھے +

بچہ کا نام سید ساجد علی رکھا گیا - گھر میں سب سے چھوٹا تھا - آنکھوں کا تارا بنا ہوا کھیلتا کودتا - ہنستا ہنساتا پلوں اور دنوں بڑھتا رہا - باپ طبیب تھا اور چھوٹا موٹا ہندو مسلم برکت کے دن تھے - سستے کا زمانہ تھا - سنتے ہیں روپیہ کا ڈیڑھ ابھرا اچھا گھی ملتا تھا - اس وقت کی زمینداری نہ تھی - اچھی خاصی نوابی تھی - راجہ اور پرجا میں باپ بیٹے کا سا بیوہار رہتا تھا آج کل کا حال نہ تھا کہ زمینداری جلتے جیئے سونے کی ہنسیا ہے نہ نگلی جائے نہ اگلی جائے ٭

ساجد کی بیمار ماں پوری پانچ بہاریں بھی اپنے چھوٹے لاڈلے کی سیر نہ دیکھ سکیں - مالک نے بلایا - چپ چاپ چلی گئیں بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی - ساجد کا بھائی اور ساجد کی بھاوج دونوں اپنی آنکھ کی ٹھنڈک اور اپنے کلیجے کا چین سمجھ کر پالنے لگے بڑی بہن بھی چاہنے والی ہو تو ماں سمان ہوتی ہے - ساجد کی بہن کا بیاہ ہو چکا تھا پر ابھی تک گود خالی تھی - ماں کے اٹھتے ہی بھگوان نے اسے اپنے لال کی طرح من موہن بھائی دیدیا - اب کیا تھا - ساجد ہی ساجد تھے - اور بچہ بھی ایسا سندر - ایسا ہنس مکھ کہ دیکھتے ہی بنے - چلبلی چال - موہنی صورت - انمول چنچل پنا سارے شریر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی - پھر پڑھنے لکھنے میں ایسا تیز - کہ مولوی کی گھڑ کی کیسی آنکھ بھی کبھی نہیں دیکھی - بھاوج اور بہن کے پاس بیٹھتا تو بارہ تک کے پہاڑے سنا دیتا - کلام پاک اردو اور فارسی کا آموختہ اور سبق مینا کی طرح دہرا دیتا ٭

بڑے بھائی نے شہر میں وکالت شروع کی تو ساجد کا سن گیارہ بارہ سال کا ہوگا - واہ رے بچہ - حافظ خاقانی اور عرفی کے سینکڑوں شعر ازبر تھے - رٹے ہوئے طوطے کی طرح نہیں - بلکہ جو چیز پڑھی پتھر کی لکیر ہوگئی - ایسا حافظہ ایسی

یاد تو وہی جسے دے وہ پائے کسی کا اجارہ نہیں ؏

اردو کی نہ پوچھئے وہ تو گھر کی لونڈی بھی اے بی سی ڈی کرنے لگے - اسکول میں نام لکھ گیا - آٹھویں درجے میں وظیفہ پایا دسویں میں اول درجہ میں پاس ہوئے - کالج میں مضمون نویسی اور تقریر میں بہت سے تمغے پائے - بائیس برس میں وکالت پاس کی -

باپ سماں بھائی زاہد کی وکالت کے ڈنکے بج رہے تھے - بحث اور جرح - خوش کلامی اور واقعاتی چھان بین میں کوئی گرد کو بھی نہ پہونچتا - جفاکشی اور ذہانت ایسی تھی کہ موکل نے مقدمہ سپرد کیا اور تمام جھنجھٹوں سے آزاد ہوگیا ضلع کی عدالتوں میں جھنڈے گڑے ہوئے تھے - شہر بھر میں دھوم تھی - باپ دادا کا قرضہ کوڑی کوڑی چکایا اور ساری جائداد پر حصہ سمجھ کر بہن بھائیوں کا نام چڑھوا دیا - شہر میں کوٹھی بن گئی - سچ ہے داتا جسے چاہے دے اور جتنا چاہے دے - وہی زاہد جو طالب علمی میں کرائے کی ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری لیکر سرائے رہتے تھے - آج وہی لاکھوں کی جائداد اور ہزاروں روپیہ کے مالک تھے ؏

ساجد نورس کلی تھے - سچا سونا - محبت کی آگ میں تپا تو کندن کی طرح چمک گیا - بھائی کی سرپرستی میں ساجد کی وکالت بھی ایسی چلی کہ دھوم دھام مچ گئی - سرکاری وکیل ہوئے - ولایت گئے - خان صاحب کا خطاب ملا - ہزاروں کے ساتھ سلوک کئے - گاؤں میں ایک کوٹھی بنوائی - اور ایسے مشہور ہوئے - اتنے ہر دلعزیز ہوئے کہ بیماری میں ہزاروں دیکھنے آئے - اور جنازہ میں ہندو مسلمان - رئیس امیر - غریب اور متوسط لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے -

مگر بے عیب ذات اسی معبود کی ہے - ساجد میں جہاں تمام خوبیاں تھیں وہیں ایک کمزوری بھی تھی کہ روپیہ کو مٹی سمجھتے تھے - کبھی اپنی چادر اور اپنے قد کا حساب ان کو نہیں سوجھا - اگر بے تکان خرچ پر کوئی تل جائے تو لاکھ دو لاکھ کیسے قارون کا خزانہ بھی چک جائے - قرض لینے کی عادت پڑ گئی - لیا اور صرف کر دیا کمایا بہت مگر ایسا لٹا کہ کچھ باقی نہ رکھا ؏

آٹھ مہینے بیمار رہے - آخری مہینے میں حسن پرستیوں سے توبہ کی اور ۴۸ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے پاس ہمیشہ کے لئے سو گئے - کاش ابھی اور نہ مرتے تو دنیا کو دکھاتے کہ جب کسی کی کایا پلٹ ہوتی ہے تو ساری برائیاں اچھائیوں سے بدل جاتی ہیں - ساجد نے سچے دل سے توبہ کی اور وہ قبول ہوگئی - پہلی محرم کا دن گزرا رات آئی اور وہ حسین کا شیدائی ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا - ؎

بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

. . . .

"طالب"

جہازی سائز پر عالمگیر کا سالانہ نمبر

جون ۱۹۳۶ء کے وسط میں خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح جہازی سائز پر شائع ہو رہا ہے

باصوٰنواز تصاویر، بلند پایہ مضامین، بیحد دلکش افسانوں، اور کیف بار نظموں کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر بفضلہ تعالیٰ اپنی نظیر آپ ہو گا۔

اگر آپ عالمگیر کے خریدار ہیں

تو

اپنا سلسلہ خریداری قائم رکھ کر اردو زبان کے ایک پرانے اور بلند پایہ رسالہ کی مدد کیجیے۔ اس طرح کارپردازان عالمگیر کی حقیر مساعی کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ زیادہ جرأت، زیادہ ہمت اور زیادہ استقلال کے ساتھ آپ کی دلچسپیوں کا سامان بہم پہنچائیں گے ؁

عالمگیر کی مدد اردو زبان کی مدد ہے

خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء بھی سال بھر کے خریداروں کو مفت ملے گا۔ عالمگیر پورے بارہ سال سے جاری ہے آج تک اس کی ایک اشاعت کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ ہر سال اپنے خریداروں کی خدمت میں دو بہترین خاص نمبر جن کی علیحدہ قیمت ۱۲/ روپیہ ہوتی ہے بالکل مفت پیش کرتا ہے ؁

اور اس پر طرّہ یہ کہ

بعض رسائل کی طرح دو ماہ کی اشاعتوں کو یکجا کر کے اس مشترکہ اشاعت کا نام خاص نمبر نہیں رکھ دیا جاتا۔ بلکہ جس ماہ میں عالمگیر کا خاص نمبر شائع ہوتا ہے۔ وہ صرف اسی ایک ماہ کا شمارہ متصور ہوتا ہے ؁ مختصر یہ کہ

عالمگیر کے خاص نمبر فی الحقیقت خاص نمبر ہوتے ہیں

چندہ سالانہ چار روپیہ چار آنہ (للعہ) علاوہ محصولڈاک ہے۔ اسی چندہ میں خاص نمبر اور سالانہ نمبر مفت ملتے ہیں۔ خاص نمبر ہمیشہ دسمبر میں اور سالانہ نمبر ہمیشہ جون میں شائع ہوتا ہے ؁

اگر آپ

عالمگیر کے خریدار نہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے فرمائش خریداری بھیجیے ؁

نیازمند

منیجر عالمگیر لاہور

یاد تو وہی جسے دے وہ پائے کسی کا اجارہ نہیں ؂

اردو کی نہ پوچھئے وہ تو گھر کی لونڈی بھی اے بی سی بھی کرنے لگے - اسکول میں نام لکھ گیا - آٹھویں درجے میں وظیفہ پایا دسویں میں اول درجہ میں پاس ہوئے - کالج میں مضمون نویسی اور تقریر میں بہت سے تمغے پائے - بائیس برس میں وکالت پاس کی -

باپ سماں بھائی زاہد کی وکالت کے ڈنکے بج رہے تھے - بحث اور جرح - خوش کلامی اور واقعاتی چھان بین میں کوئی گرد کو بھی نہ پہونچتا - جفاکشی اور ذہانت ایسی تھی کہ موکل نے مقدمہ سپرد کیا اور تمام جھنجھٹوں سے آزاد ہو گیا ضلع کی عدالتوں میں جھنڈے گڑے ہوئے تھے - شہر بھر میں دھوم تھی - باپ دادا کا قرضہ کوڑی کوڑی چکایا اور ساری جائداد پر حصہ سمجھ کر بہن بھائیوں کا نام چڑھوا دیا شہر میں کوٹھی بن گئی - سچ ہے داتا جسے چاہے دے اور جتنا چاہے دے - وہی زاہد جو طالب علمی میں کرائے کی ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری لیکر سرائے رہتے تھے - آج وہی لاکھوں کی جائداد اور ہزاروں روپیہ کے مالک تھے ؂

ساجد نورس کلی تھے - سچا سونا - محبت کی آگ میں تپا تو کندن کی طرح چمک گیا - بھائی کی سرپرستی میں ساجد کی وکالت بھی ایسی چلی کہ دھوم دھام مچ گئی - سرکاری وکیل ہوئے - ولایت گئے - خان صاحب کا خطاب ملا - ہزاروں کے ساتھ سلوک کئے - گاؤں میں ایک کوٹھی بنوائی - اور ایسے مشہور ہوئے - اتنے ہر دلعزیز ہوئے کہ بیماری میں ہزاروں دیکھنے آئے - اور جنازہ میں ہندو مسلمان - رئیس امیر - غریب اور متوسط لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے -

مگر بے عیب ذات اسی معبود کی ہے - ساجد میں جہاں تمام خوبیاں تھیں وہیں ایک کمزوری بھی تھی کہ روپیہ کو مٹی سمجھتے تھے - کبھی اپنی چادر اور اپنے قد کا حساب ان کو نہیں سوجھا - اگر بے تکان خرچ پر کوئی تل جائے تو لاکھ دو لاکھ کیسے قارون کا خزانہ بھی چک جائے - قرض لینے کی عادت پڑ گئی - لیا اور صرف کر دیا کمایا بہت مگر ایسا لٹا کہ کچھ باقی نہ رکھا ؂

آٹھ مہینے بیمار رہے - آخری مہینے میں حسن پرستیوں سے توبہ کی اور ۴۸ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے پاس ہمیشہ کے لئے سو گئے - کاش ابھی اور نہ مرتے تو دنیا کو دکھا دیتے کہ جب کسی کی کایا پلٹ ہوتی ہے تو ساری برائیاں اچھائیوں سے بدل جاتی ہیں - ساجد نے سچے دل سے توبہ کی اور وہ قبول ہو گئی - پہلی محرم کا دن گزرا رات آئی اور وہ حسین کا شیدائی ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا - ؎

بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

....

"طالب"

جہازی سائز پر عالمگیر کا سالانہ نمبر

جون ۱۹۳۶ء کے وسط میں خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح جہازی سائز پر شائع ہو رہا ہے

باصو نواز تصاویر، بلند پایہ مضامین، بے حد دلکش افسانوں، اور کیف بار نظموں کے اعتبار سے یہ سالانہ نمبر بفضلہ تعالےٰ اپنی نظیر آپ ہو گا۔

اگر آپ عالمگیر کے خریدار ہیں

تو

اپنا سلسلہ خریداری قائم رکھ کر اردو زبان کے ایک پرانے اور بلند پایہ رسالہ کی مدد کیجئے۔ اس طرح کارپردازان عالمگیر کی حقیر مساعی کی حوصلہ افزائی ہو گی اور وہ زیادہ جرأت۔ زیادہ ہمت اور زیادہ استقلال کے ساتھ آپ کی دلچسپیوں کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

عالمگیر کی مدد اردو زبان کی مدد ہے

خاص نمبر ۱۹۳۶ء کی طرح عالمگیر کا سالانہ نمبر ۱۹۳۶ء بھی سال بھر کے خریداروں کو مفت ملے گا۔ عالمگیر پورے بارہ سال سے جاری ہے آج تک اس کی ایک اشاعت کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ ہر سال اپنے خریداروں کی خدمت میں دو بہترین خاص نمبر جن کی علیحدہ قیمت ۱/۸ روپیہ ہوتی ہے بالکل مفت پیش کرتا ہے۔

اور اس پر طرہ یہ کہ

بعض رسائل کی طرح دو ماہ کی اشاعتوں کو یکجا کر کے اس مشترکہ اشاعت کا نام خاص نمبر نہیں رکھ دیا جاتا۔ بلکہ جس ماہ میں عالمگیر کا خاص نمبر شائع ہوتا ہے۔ وہ صرف اسی ایک ماہ کا شمارہ متصور ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ

عالمگیر کے خاص نمبر فی الحقیقت خاص نمبر ہوتے ہیں

چندہ سالانہ چار روپیہ چار آنہ (للعہ) علاوہ محصولڈاک ہے۔ اسی چندہ میں خاص نمبر اور سالانہ نمبر مفت ملتے ہیں۔ خاص نمبر ہمیشہ دسمبر میں اور سالانہ نمبر ہمیشہ جون میں شائع ہوتا ہے۔

اگر آپ

عالمگیر کے خریدار نہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے فرمائش خریداری بھیجئے۔

نیازمند

مینیجر عالمگیر لاہور

جذباتِ لیہ

(اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری)

سکون و ضبط رخصت ہو گئے پر آرزو دل سے
الٰہی کون اُٹھ کر چل دیا ہے آج محفل سے

حجابِ حسنِ دل کش اُٹھ گیا خود جذبۂ دل سے
نگاہِ قیس میں لیلیٰ اتر آئی ہے محمل سے

حواس و ہوش ایسے ہو گئے گم بحرِ الفت میں
ہوا ہوں بے نیاز اب رازِ طوفاں سعیِ حاصل سے

زمانہ میں جب آدھی رات کو ہوتا ہے سناٹا
صدا اک گونج اُٹھتی ہے مرے ٹوٹے ہوئے دل سے

فضا میں پھول برسائے ہیں اندازِ تبسم نے
نشاطِ روح ہو جانے نہ دیں گے تم کو محفل سے

اسی عالم کو فردوسِ تمنا ہم سمجھتے ہیں
بدل جاتی ہے اک دنیا جہاں دل مل گیا دل سے

رخِ زیبا سے اس نے مسکرا کر جب نقاب اُلٹی
اٹھا اک نغمۂ پُر کیف میرے بربطِ دل سے

جنوں کی شورشیں اس حد میں مرے قافلے والو
جرس ہے مائلِ فریاد آوازِ سلاسل سے

یہ عالم ہے دلِ وارفتہ کی آشفتہ حالی کا
سرِ منزل پہنچ کر بھی ہوں میں بیگانہ منزل سے

فضا اپنی نظر ہے اب آلِ سوزِ پنہاں ہے
غضب ڈھائیگا شعلہ بھڑک کر مضطرب دل سے

فضا جالندہری

آخی[1]

از محترمہ خالدہ ادیب خانم

یہ دلچسپ اور پراز معلومات مضمون جامعہ کی کسی گزشتہ اشاعت میں شائع ہوا تھا ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے اس گراں قدر مضمون کو عالمگیر میں درج کرتے ہیں :-

جب ماضی اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتا مستقبل میں جو ہونے والا ہے اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہوتا - اور حال ہزاروں متضاد قوتوں کا شکار ہوتا ہے - کچھ لوگ مذہب سے تسکین حاصل کرنے کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور کچھ موجودہ شورش و بے نظمی میں جو کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اسے غنیمت سمجھ کر اس کے جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں یہی وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا کی تماشا گاہ پر معاشرت کے نئے نظام کا مقدمۃ الجیش نمودار ہوتا ہے -

اناطولیہ کی تاریخ میں تیرھویں صدی کا ابتدائی حصہ اسی قسم کا زمانہ تھا - سلجوقوں کی ریاست کی بنیادیں ہل چکی تھیں - اناطولیہ کے مسلمان ترک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہو گئے تھے - ملک کے باہر صلیبی جنگجوؤں کے حملہ کا خوف تھا - اور ملک کے اندر ہر شخص کے حق پر دوسرے کی نظر تھی - ان قوتوں میں جو باہم دست و گریباں تھیں کبھی آپس میں ٹکراتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی تھیں - حلقۂ اخیلر کی قوت (جس کا دوسرا نام ارباب فتوت تھا) ایک خاص اہمیت رکھتی تھی - اس میں اس عہد کی تمام معاشرتی، معاشی اور تصوف کی قوتیں جمع ہو کر ایک ہم آہنگ رشتہ میں منسلک ہو گئی تھیں - کیونکہ یہ زمانہ ایسا تھا جب کہ روحانی تسکین - اور اخلاقی قوت کی ضرورت اتنی ہی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جتنی کہ امن اور انتظام کی -

پہلی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تصوف کی ایک تحریک[2] جاری تھی جو اناطولیہ میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی - ارباب فتوت یا حلقۂ اخی پر اس کا جو اثر پڑا اسے بتانے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ تیرھویں صدی کی اس ممتاز تحریک کی اصلیت تنظیم اور ادب کی وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی جائے -

اس عہد کی تحریک تصوف کا آغاز تین بڑی شخصیتوں سے ہوتا ہے، تینوں کی تعلیمات کی بنیاد اسلام پر ہی رکھی گئی تھی لیکن ان کے عقائد پر ایک حد تک ایرانی - نوفلاطونی اور البیرونی کی معرفت ہندی فلسفہ اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات مثلاً مذہب عیسوی اور مذہب مانی وغیرہ کا بھی اثر پڑ رہا تھا -

اناطولیہ کے خیالات پر جن تین صوفیوں کا اثر پڑ رہا تھا ان کے حالات زندگی ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) مولانا جلال الدین رومی (۶۰۴ھ تا ۶۷۲ھ) ان کے والد بلخ کے ایک ترک تھے اور ان کی والدہ خوارزم کے شاہی خاندان کی ایک رکن تھیں - یہ اپنے والد کے ساتھ اناطولیہ آئے تھے اور اپنے عہد

[1] ابھی کچھ عرصہ پیشتر تک اخی اسکے نام کی اصلیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ عربی لفظ اخی ہے جس کے معنی بھائی کے ہیں لیکن پروفیسر جین ڈینی نے اپنے ایک تازہ مضمون میں جو سوسائٹی ایشیاٹک دی پیرس" میں شائع ہوا ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کی اصلیت دراصل ترکی ہے - بہرحال اس کے ہجے ا - خ - ی - جو عام طور پر جرمن اور فرانسیسی مضمونوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس لفظ کے ترکی تلفظ کو صحت کے ساتھ ظاہر نہیں کرتے ترکی تلفظ کا اظہار زیادہ بہتر طریقہ پر "اخی" اور "اخیہ" سے کیا جا سکتا ہے -

[2] جرمن اور روسی عالموں نے چند سال سے تحریک اخیلر سے بہت دلچسپی لینا شروع کی ہے فرانس بھی پروفیسر جین کی عنایت سے ان کی پیروی کر رہا ہے چونکہ تیرھویں صدی میں اس جماعت کے اہم مرکز انقرہ میں تھے اور چونکہ انقرہ اب جدید ترکی کا دارالسلطنت بن گیا ہے اس لئے ترکی علما بھی اس مسئلہ سے بہت دلچسپی لے رہے ہیں اور اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لئے پرانے ماخذوں کو چھان رہے ہیں -

جوانی میں قونیہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور عالم مثنوی فارسی میں لکھی تھی۔ ان کی اس تصنیف سے مشرقی ممالک بہت متاثر ہوئے۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی زندگی پر آج بھی یہ مثنوی اپنا اثر ڈال رہی ہے لیکن ترکی ذہن پر اس کا جو اثر پڑا وہ اور بھی زیادہ تھا۔ یہ ان کے ذہن پر چھ سو سال سے برابر حاوی ہے اور صوفیا کے جو سلسلے اس سے چلے (جو اب معدوم ہو گئے ہیں) ترکی کے بہترین شاعر اور ماہران موسیقی انھیں میں سے پیدا ہوئے۔ کچھ غالباً اس وجہ سے کہ فارسی سرکاری زبان تھی اور کچھ اس لئے کہ مولانا جلال الدین رومی کو ایرانی فلسفہ سے بڑی محبت تھی۔ انھوں نے اپنی اس عظیم المرتبت تصنیف کو فارسی زبان میں ہی لکھا لیکن وہ ترکی اور عربی زبانوں سے بھی خوب واقف تھے۔ اور ان میں تصنیف و تالیف بھی کر سکتے تھے۔ ان کی فارسی تصنیفوں کے ترجمے اور شرحیں خود ان کے بیٹے نے کی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے عہد میں اس بات کی ایک عام خواہش پائی جاتی تھی کہ مذہبی علوم کو سادہ ترکی زبان میں منتقل کیا جائے اور عوام میں پھیلایا جائے۔ مولانا کی تصنیف پر ترکی میں جو شرحیں لکھی گئی ہیں وہ بے شمار ہیں اور مثنوی کا ترکی میں جو ترجمہ نحیفی نے کیا ہے وہ ابھی تک بہترین سمجھا جاتا ہے۔

بایں ہمہ اپنے عہد میں مولانا کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صرف خواص کے لئے لکھتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق خیال تھا کہ ان کا خطاب عوام سے ہے۔ مگر ان کی بین الاقوامیت نسل و مذہب کے حدود کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان کا قول ہے "شاعر، ساقی اور شراب کو میں عالم مستی میں ایک ہی سمجھتا ہوں۔ میں وحدت کی مہر اسلام اور کفر دونوں پر لگاتا ہوں" حقیقت یہ ہے کہ اپنی تعلیمات میں انھوں نے کل انسانیت پر وحدت کی مہر ثبت کر دی۔ علاوہ ازیں اپنی صلح جوئی اور امن پسندی میں وہ کسی قسم کی پابندی گوارا نہ کرتے تھے۔ انھیں کسی ایسے جھگڑے سے جو آدمیوں کے درمیان تفرقہ ڈالے کبھی کوئی ہمدردی نہ ہوتی تھی اور ان کی تعلیم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتی تھی۔ اس لئے ان کے فلسفہ سے انفرادی طور پر چاہے جس قدر بھی روحانی، خیالی اور جمالی تسکین کیوں نہ حاصل ہوتی ہو لیکن اس عہد کی منتشر اور غیر منظم معاشرت کی کوئی تنظیم بڑے پیمانے پر نہ ہو سکتی تھی۔

(۲) محی الدین عربی: (۱۱۶۵ء تا ۱۲۴۰ء) اس عہد کے دوسرے صوفی تھے جنھوں نے اناطولیہ میں تصوف کے خیالات کو پھیلایا۔ یہ اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ اسپین پر جب حملہ ہوا۔ اور مسلمانوں پر ظلم کئے جانے لگے اس وقت انھوں نے اپنا ملک چھوڑ دیا اور اناطولیہ میں آ کر پناہ لی ابتداً میں انھوں نے قونیہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک ترکی بیوہ سے شادی کی لیکن بعد کو وہ دمشق چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے فلسفہ کے متعدد پہلوؤں اور ان کی تصانیف کے بیشتر حصہ میں پیش گوئی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کے سوتیلے ترکی فرزند 'صدر الدین قونوی' نے ان کی تصانیف کے ترجمے اور شرحیں لکھیں اور ان کے خیالات کی اشاعت کی۔ ضیا جلمی اپنی تصنیف "ترکی خیالات کی تاریخ" میں ان کا شمار بھی ان لوگوں میں کرتا ہے جنھوں نے ترکی تصوف پر بہت اثر ڈالا ہے لیکن عوام میں جس تصوف کو قبولیت حاصل ہوئی اور جس سے اس عہد کی معاشری، معاشی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صوفیوں کے حلقے پیدا ہوئے اس کا مبدا اور مرجع دراصل خواجہ احمد یسوی ہیں۔

(۳) خواجہ احمد یسوی سمرقند اور بخارا کے قرب و جوار میں پیدا اور فوت ہوئے۔ وہ کبھی اناطولیہ نہیں آئے۔ ان کی تعلیمات کو ان کے مرید تیرھویں صدی میں اناطولیہ لائے۔ اور ان کی ایک وسیع رقبے میں اشاعت ہوئی۔ ان کی خاص تصنیف دیوان حکمت ہے۔ اگرچہ یہ دیوان پورا ان کا لکھا ہوا نہیں ہے لیکن اس کا اثر بہت گہرا اور وسیع ہے۔ یہ ترکی میں لکھتے تھے اور ان کی تعلیمات میں مابعد الطبیعیات کی کوئی پیچیدگی یا ایرانی تصوف کی موضوعیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب اعمال اور کردار کا نام ہے۔ ان کے اور ان کے مریدوں کی تعلیم سے تمام اناطولیہ میں باعمل صوفیوں کے حلقے پیدا ہو گئے۔ جن بیک تاشی اور اخی حلقے بھی شامل تھے اخیوں کا سلسلہ بیک تاشیوں کے سلسلے سے بعض باتوں میں مشابہ تھا کم سے کم کپرولوزادہ فواد کا یہی خیال ہے۔ جو اپنی تصنیف "ترکی ادب کے ابتدائی صوفیا" میں اس بات پر خاص زور دیتے ہیں۔

لہ ان کے سلسلۂ تصوف سے جو لوگ وابستہ تھے انھیں ترکی میں "مولوی" اور یورپ میں "رقصاں درویش" کہتے تھے۔

ان صوفیوں کے حلقے میں ہر طبقے کے لوگ شہزادے، سپاہی، تاجر سب ہی شامل ہوتے تھے۔ چونکہ اخیوں کو ارباب فتوت بھی کہا جاتا ہے اس لئے اس کے معاشی پہلو پر بحث کرنے سے پہلے جو غالباً اس کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت ہے یہ مناسب ہوگا کہ اس اصطلاح کا مفہوم بتلا دیا جائے۔

"فتوت" کے معنی ہیں اسلامی جذبۂ شجاعت و جاں بازی۔ اس کی ابتدا ان دو عظیم شخصیتوں سے ہوتی ہے جو بعض عہد رسالت میں موجود تھیں یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ۔ بصورت مجموعی حضرت علیؓ کا اقتدار زیادہ تھا۔ اس کا کچھ سبب تو یہ تھا کہ جاں بازوں کے تمام خواص مثلاً اژدہا کا مارنا، کمزوروں کی حمایت کرنا وغیرہ وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ان کے ساتھ ہی منسوب کئے جاتے تھے اور کچھ اس لئے کہ رسول اللہ نے ان کے متعلق کہا تھا کہ "لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار" یعنی علیؓ کے مقابلہ کا کوئی جاں باز نہیں ہے۔ اور ذوالفقار کے مثل کوئی تلوار نہیں ہے"

بعد کے خلفاء کے زمانے میں فتوت نے عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لی تھیں لیکن اناطولیہ میں ان کی شجاعت اور جاں بازی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ مشرق قریب کے مسلمان جاں باز صلیبی افواج کے نائٹوں (عیسائی جانبازوں) کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ بہت مشہور تھے۔ صلاح الدین ایوبی جیسے شیر دل کا فیاض دشمن جس نے مغربی ادب اور خصوصیت کے ساتھ والٹر اسکاٹ کے "تلسمان" میں اپنے لئے ایک لازوال نام پیدا کر لیا ہے۔ ترکوں کے مسلمان جاں بازوں کے لئے ایک نمونہ اور مثال تھا۔ ان لوگوں کا تعلق یا تو کسی نہ کسی زوال پذیر سلجوق ریاست سے ہوتا تھا یا ان جاں بازوں سے جو ترکوں اور ترکمانوں اور خصوصیت کے ساتھ عثمانی قبائل کے ساتھ اناطولیہ میں آتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کا بانی عثمان خود بھی ایک اخی تھا اور جب وہ سلطان ہوا تو ایک مشہور اخی ہی نے تلوار اس کی کمر سے باندھا تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام تاریخی سواد سے یہ بات ثابت ہے کہ حلقہ اخی کے فوجی اور جاں باز عنصر کا سلطنت عثمانیہ کے قیام میں بہت بڑا حصہ ہے۔ "خونی خراج" کے نظام (یعنی عیسائی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرنے کے طریقہ) سے پہلے ینی چری۔ اخی اور بیک تاشی ہی ہوا کرتے تھے سپاہی اور سوار جو اناطولیہ کے ترک زمینداروں پر مشتمل ہوتے تھے سب سلسلہ اخی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ کا امتیازی نشان ایک خاص قسم کی شلوار (پاجامہ) ہوتی تھی۔

مگر اس کے برعکس یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ان حلقوں کے لڑنے والے عناصر کو جذب کرنے کے بعد عثمانیہ حکومت نے اس کے سیاسی اقتدار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گو جہاں کہیں مرکزی حکومت کمزور ہوتی تھی اخی یا ارباب فتوت حکومت کیا کرتے تھے۔ انقرہ اور کرشہر میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھی جب عثمانیوں نے چودھویں صدی کے وسط میں انقرہ کو فتح کیا تو وسط اناطولیہ میں حلقۂ اخی کی سیاسی حیثیت ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سے یہ لوگ اپنی معاشی قوت اور تنظیم کی بنا پر اٹھارہویں صدی تک بااثر رہے۔ بلکہ ان کی تجارتی انجمنیں جنگ عظیم کے آخری ایام تک باقی رہیں۔ اگرچہ مغربی تجارتی طریقوں اور مشین کی بنی ہوئی اشیاء کے رواج سے ان کی حالت بہت زیادہ مائل بہ زوال ہوگئی تھی۔

چونکہ حلقہ ہائے اخی کا طویل ترین اور موثر ترین رخ ان کا معاشی رخ ہے۔ اس لئے ہمیں ان کا سراغ تیرھویں صدی تک جب اخی اور ارباب فتوت کا آغاز ہوا تھا لگانا چاہئے۔ اپنی کتاب "ترکی خیالات کی تاریخ" میں ضیا علمی خیالات کے اس رخ کو "تنظیمی تصوف" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

معاشی تنظیم کی ابتدا اخی ایوران سے ہوئی جو ان ہی برادریوں میں سے ایک کے رکن تھے اور ان کا پیشہ چمڑا رنگنا تھا۔ انھوں نے چمڑا رنگنے والوں کی انجمن قائم کی اور خود اس کے پیر و مرشد بن گئے۔ دوسرے پیشے والوں نے بھی یکے بعد دیگرے ایوران کی انجمن کے نمونہ پر انجمنیں بنانا شروع کیں لیکن گزشتہ تمام صدیوں میں چمڑا رنگنے والوں کی انجمن کو برابر بزرگی و برتری حاصل رہی۔ یہ انجمنیں تمام اناطولیہ میں پھیلی ہوئی تھیں اور سترہویں صدی میں اولیا چلبی نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ استنبول کے پیشوں کی تنظیم بھی اسی قاعدے کے ماتحت ہوئی تھی۔ سترہویں صدی تک اخی ایوران کی کرامات اور خرق عادات کے بہت سے افسانے زبان زد خلائق ہوگئے تھے۔ ان کا مقبرہ اگرچہ حقیقتاً کرشہر میں تھا لیکن اس کے متعلق اناطولیہ کے متعدد شہر دعوے کرنے لگے تھے اور اخی ایوران مستقل طور پر ایک زبردست جاں باز، پیر، شہید اور اس پیشہ کے تنظیم دینے والے بن چکے تھے اور ان سے اژدہوں کے مارنے اور دوسری ان صفات کو جن کا اسی ذات میں

اجتماع ضروری ہے منسوب کی جانے لگی تھیں۔

چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ[1] کے تعلقات اخی کے حلقوں سے بہت گہرے تھے۔ اور وہ ان کے طریقۂ زندگی کے متعلق بہت مفصل اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کے ورود کے وقت تک ان حلقوں میں معاشی خصوصیت کے ساتھ ساتھ جاں بازی کی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ ان شہروں کے رواج کے مطابق جب کوئی سلطان نہ ہوتا تھا تو اخی حکمراں کے فرائض انجام دینے لگتا تھا۔ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق "اس کا حکومت کا اقتدار، سزا کا حق اور شان و جلوس بادشاہوں سے کم نہیں ہوتا تھا" علاوہ ازیں وہ اس بات کو بھی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ ہر قسم کے ناجائز مطالبات کے خلاف جد و جہد کرتے رہتے۔ ابن بطوطہ کو اس قسم کی انجمنیں ہر جگہ شہر و دیہات میں جہاں جہاں ترکمان آباد تھے موجود ملیں۔ وہ انھیں تمام پیشوں اور حرفوں کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ نوجوانوں کی انجمنیں کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ معاشی اور جاں بازوں کی انجمنوں کے سردار کو اخی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے مشترکہ دسترخوان، مشترکہ کام اور اجتماعی زندگی کو وہ نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برادریاں گلڈ سوشلزم (حزب العمال کی اشتراکیت) کی ایک مکمل مثال تھیں۔

ابن بطوطہ کے بیان کے علاوہ ہمیں اخی یحییٰ بن خلیل کی تصنیف میں ان انجمنوں کا ایک نہایت سیر حاصل بیان ملتا ہے[2]۔

ان کی زندگی کے مکمل مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخیوں کی انجمنیں صحیح معنی میں ایک جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ جمہوریت موجودہ عہد کی جمہوریت نہ تھی جس میں دیوانہ وار مسابقت اور انفرادی خود غرضی کا دور دورہ نظر آتا ہے بلکہ ایک ایسی جمہوریت تھی جس میں قناعت، منصفانہ تقسیم دولت اور جماعت کی بہبودی کو سب سے زیادہ مقدم سمجھا جاتا ہے۔ حلقۂ اخی کا ایک سخت قانون یہ تھا کہ ان کی انجمن کا ہر آدمی اپنی ذاتی کوشش سے بنا ہو۔ اگر کسی کو اپنے نسب پر ناز ہو تو وہ اس دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کا قول تھا: "خواہ انسان پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ جوہر ذاتی نہیں رکھتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں"۔

ان کے نزدیک سات کا عدد متبرک سمجھا جاتا تھا۔ جب کوئی امیدوار کسی انجمن میں شریک ہوتا تھا تو اسے داخلہ کی تقریب کے موقع پر سات قسمیں اس بات کی کھانا پڑتی تھیں کہ وہ سات نیکیوں پر عمل کریگا اور سات برائیوں سے بچے گا۔ ان کے استعارے میں اسے سات دروازے کھولنا اور سات بند کرنا پڑتے تھے:۔

(۱) بخل کا دروازہ بند کرنا اور سخاوت کا دروازہ کھولنا۔
(۲) ظلم و جور کا دروازہ بند کرنا اور لطف و کرم کا دروازہ کھولنا۔
(۳) حب جاہ کا دروازہ بند کرنا اور قناعت کا دروازہ کھولنا۔
(۴) عیش کا دروازہ بند کرنا اور زہد و ریاضت کا دروازہ کھولنا۔
(۵) تالیف قلوب کا دروازہ بند کرنا اور عدل کا دروازہ کھولنا۔
(۶) "ہرزہ و ہذیان" کا دروازہ بند کرنا اور علم و حکمت کا دروازہ کھولنا۔
(۷) جھوٹ کا دروازہ بند کرنا اور سچ کا دروازہ کھولنا۔

جو لوگ اخی کے حلقے میں شامل نہیں کئے جاتے تھے ان کی فہرست حسب ذیل تھی:۔

---

[1] ابن بطوطہ کو اخی کے حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔ شہر بردک میں اخی سنان اور اخی ترمان کے پیروؤں کو اس عرب سیاح کی ضیافت کے لئے قرعہ اندازی کرنا پڑی۔ عید یرم کا دن تھا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ میں عیدگاہ گیا جس طرح سلطان اپنی افواج کے ہمراہ آتا ہے۔ اسی طرح اخی کے حلقے بھی مسلح ہو کر آتے ہیں۔ ہر تجارتی انجمن کا ایک ڈھول، بگل، اور جھنڈا ہوتا ہے۔ اور ان میں اپنے پیروؤں کی ظاہری زینت اور اسلحہ کی تکمیل کے لئے باہم مقابلہ ہوتا ہے:۔

[2] فتوت نامہ۔ ۱۰۰۔ فاتح کتب خانہ۔ اخی کے حلقوں نے جو تصانیف چھوڑی ہیں انھیں فتوت نامہ کہتے ہیں۔ اس خاص فتوت نامہ کا مصنف جو ترکی زبان میں سب سے زیادہ قدیم ہے (ابن بطوطہ سے بھی ربع صدی پہلے کا) کہتا ہے:۔ "میں اپنی ... زبان میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا (صفحہ ہذا کا دوسرا کالم ملاحظہ ہو)

(بقیہ کالم اوّل) لیکن میں نے دیکھا کہ اخی کی انجمنیں کاہل ہوتی جا رہی ہیں اور انھیں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں کہا ہے "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ" (ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ سب اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے) میں نے بھی اہل فتوت کو ان ہی کی زبان میں تعلیم دینی چاہی۔ میں نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور کئی کتابیں پڑھ لیں اور اب میں کتاب لکھ رہا ہوں۔

دروغ گو غیر مومن بکجمی۔ بھاٹ۔ جراح۔ قصائی مچھلی اور سود خوار

ہر انجمن کی مجلس عاملہ کے سات ارکان ہوتے تھے۔ اور ان کے

کاروبار میں جمہوریت اور مساوات کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا لیکن

اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اوصاف کی بنیاد پر فرق مراتب بھی ملحوظ رکھا

جاتا تھا اور درجہ بدرجہ حق حکومت تسلیم کیا جاتا تھا۔

ان انجمنوں میں جو نام رائج تھے وہ تجارت اور تفریح کی اصطلاحوں میں

داخل ہوگئے تھے جو آج تک باقی ہیں۔ گارڈلیوسکج[1] کا قول ہے کہ

ان برادریوں کی بنیاد کاریگروں پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ان کا سیاسی اقتدار

عثمانی سلطنت کے قیام کے بعد کم ہوگیا تھا لیکن صنعت کی انجمنوں کی

حیثیت سے انھوں نے اپنی اہمیت اور مشاغل کو باقی رکھا تھا۔

انجمن کا پہلا درجہ امیدوار کا ہوتا تھا۔ ایک نوجوان یا تو خود کسی انجمن میں

شریک ہوتا تھا یا اس کے والدین امیدوار کی حیثیت سے اس کا

داخلہ کراتے تھے۔ ایک ہزار ایک دن تک اسے کسی استاد کے ماتحت

تربیت حاصل کرنا پڑتی تھی جس کے بعد اس کی امیدواری کا زمانہ ختم

ہوجاتا تھا۔

اسی اثنا میں اس کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم تردیبا (مذہبی مرکز)

میں دو اخوان طریقت (یول کرونشی) اور ایک پدر طریقت (یول

اتاسی) کی نگرانی میں ہوتی رہتی تھی۔ امیدوار کو مزدوری نہیں ملتی تھی

لیکن اس کا استاد اسے وظیفہ دیتا تھا۔ جسے وہ اس دعوت کے لئے

جمع کرتا رہتا تھا جس میں اس کا درجہ بڑھا کر استاد کر دیا جاتا تھا۔

امیدواری کا زمانہ ختم کرنے کے بعد اسے چھ مہینہ تک رفیق

طریقت (جس کا نام کلفہ تھا) کے درجے میں رہنا پڑتا تھا۔ بزرگوں کی

پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے اسے کوئی خاص کام کرنا پڑتا تھا۔ اگر

پیشہ کی اہلیت کے اس امتحان کا نتیجہ تشفی بخش ہوتا تھا تو اسے استاد کا

خطاب دے دیا جاتا تھا اور دستار فضیلت باندھ دی جاتی تھی۔ اس کی انجمن

کے بزرگ اس کے لئے اتنا سرمایہ فراہم کر دیتے تھے جو ذاتی طور پر کام شروع

کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ درجہ بدرجہ ترقی کی ہر منزل پر ایک

مذہبی تقریب منائی جاتی تھی۔

ہر انجمن کی جماعت عاملہ کی صدارت تاجروں کا سردار (اخیاباشی) کرتا تھا۔ صرف چمڑا رنگنے والوں کی انجمن کے سردار کو اخی بابا (حیوں

کا باپ) کہا جاتا تھا۔ اس کا حلقہ اقتدار چمڑا رنگنے والوں تک محدود نہ ہوتا

تھا بلکہ وہ انجمنوں میں جتنے اختلافات ہوتے تھے۔ ان میں حکم کے فرائض

انجام دیتا تھا۔ اس کا قول تمام انجمنوں کے لئے قانون کا مرتبہ رکھتا تھا وہ

عموماً ان استادوں میں سے منتخب کیا جاتا تھا جن کے سامنے تین استادوں

کی دستار بندی کی رسم ادا ہوچکی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری

تھا کہ اس کی پاکبازی۔ وجاہت اور نیکی کی تمام انجمن معترف ہو۔ ہر دو

ہفتہ کے بعد مجلس جمع ہوتی تھی۔ ہر انجمن آزادی سے اپنے معاشری

بیت المال کی رقوم اور بہبود کے مشترکہ ذخیرہ کو خرچ کر سکتی تھی۔ ہر جلسہ میں

معاملات و مسائل کے متعلق فیصلے کئے جاتے تھے جن میں سزا کے

فیصلے بھی شامل ہوتے تھے۔ مجلس کو چونکہ اپنے کام کی اعلیٰ نوعیت کا بہت

پاس تھا اس لئے ہر ایسے کاریگر کو سزا دی جاتی تھی جو بید(اقسام) اشیاء کے حیا

موصوبت کرتا تھا اس کی دکان عارضی طور پر بند کر دی جاتی تھی۔ اور اس کا

خراب کام اس کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا اور وہ انجمن کی رکنیت سے

بھی خارج کر دیا جاتا تھا۔ ترابیزانڈ میں اس تعزیری کارروائی کو انوروز

یعنی برادری سے خارج کے نام سے موسوم کرتے تھے

انجمن سال میں ایک مرتبہ کسی مقام پر ایک عام جلسہ کا بھی انتظام

کرتی تھی جو تفریحی جلسہ (تفرج) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس میں

تمام اختلافات دوستانہ طریقہ پر طے کر دیئے جاتے تھے۔

مشین کی بنی ہوئی اشیاء کے سیلاب نے ترکی بازاروں پر قبضہ کر لیا

اور ترکی حکومت نے تمام معاشی اداروں کو اپنی نگرانی میں لینے کا تہیہ کر لیا

اور دستی صنعتیں ختم ہوگئیں تو ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے بعد ان

انجمنوں میں سے جو انجمنیں آخری سانس توڑ رہی تھیں وہ بھی ختم ہوگئیں +

---

[1] "LES DERVICHES DE L'ORDRE D'AHI EN TURQUIE" BULLE GORDLEVSKIJ EYRAN ET LES CORPS DE METIER DES SCIENCES DE L.U.R S.S. 1927 P 1172 TIN DE L'ACADEMIE

حدیثِ غم

(عزیز صدیقی رام پوری)

یاد آیا ہے کہ جب میں شاد تھا آباد تھا
فکرِ دنیا تھی نہ کچھ عقبیٰ کا تھا مجھ کو خیال
عیش کے دن تھے۔ خوشی تھی مجمعِ احباب تھا
دل نے سمجھے ہی نہ تھے کچھ معنیٔ شامِ فراق
قصۂ آزارگانِ عشق جب سنتا کہیں
اب وہی میں ہوں کہ رنج و درد سے معمور ہوں
وہ زمانہ عیش کا جب یاد آتا ہے مجھے
اب تو ہر دم ہر گھڑی رونے سے مجھ کو کام ہے
یہ عنایت دل کی ہے۔ اور یہ کرم آنکھوں کا آہ
کاش پڑے ہی میں رہ جاتا وہ روئے مہ جبیں
جس نے مجھ کو کر دیا یوں مبتلائے سوز غم
میں سمجھتا تھا کبھی تو رحم بھی آ جائے گا
بس اسی امید پر قائم تھی اپنی زندگی
مدعائے دل جو کچھ لکھا تھا باصد اضطراب
مدتوں تم سے رہی پھر رسم تحریر و پیام
مدعا اکثر دلِ ناشاد کا کہتا تھا میں
تم نے اکثر آ کے خود شرمندۂ احساں کیا
آسماں پیر کو یہ رنگ جب بھایا نہیں
میں نے فرقت میں تمہاری جس قدر جھیلے ستم
الغرض مر مر کے کاٹا وہ زمانہ ہجر کا
لیکن اب پہلی سی شان لطف فرمائی نہ تھی
غیر کی جھوٹی محبت پر ملال آیا تمھیں
یک بیک ناواقفِ بیمارِ ہجراں ہو گئیں
دل کو کیا کہہ کر سنبھالوں ہجر کی راتوں میں اب
اب نہ جینے کی خوشی ہے اور نہ مرنے کا ہے غم

آفتِ قیدِ غمِ الفت سے دل آزاد تھا
ناشناسِ دردِ تھا ناواقفِ رنج و ملال
چاندنی راتیں تھیں فرشِ گل تھا لطفِ خواب تھا
آنکھ تھی ناآشنائے گردشِ جامِ فراق
عقل کی کوتاہیاں ہوتی تھیں دل میں جاگزیں
ہوش سے بیگانہ ہوں عیشِ طرب سے دور ہوں
ابرِ باراں کی طرح پہروں رلاتا ہے مجھے
آنکھ میں آنسو ہیں اور لب پر تمھارا نام ہے
دل کے ان رونوں نے مجھ کو کر دیا یکسر تباہ
کاش وہ آوازِ خوش کانوں تک آتی ہی نہیں
جس نے مجھ کو کر دیا یوں پیکرِ رنج و الم
خود نہ آئیں گی تو مجھ کو ہی بلایا جائے گا
کیا خبر تھی زندگی سے ہو گی یوں شرمندگی
مہربانی سے دیا تھا تم نے تسکیں وہ جواب
اور اکثر شربتِ دیدار کے بھی پائے جام
اور تمھاری صحبتوں میں بیشتر رہتا تھا میں
حالِ دردِ دل سنا اور درد کا درماں کیا
کچھ دنوں کے واسطے مجھ سے جدا تم ہو گئیں
ہو نہیں سکتے ہیں وہ کاغذ کے پرزے بے رقم
جب تم آئیں شربتِ دید رخِ زیبا ملا
میرے دل میں درد تھا۔ تم میں مسیحائی نہ تھی
کچھ نہ اپنے مرنے والے کا خیال آیا تمھیں
اور پھر تم زینتِ بزمِ رقیباں ہو گئیں
جی اگر گھبرائے تو بہلاؤں کن باتوں میں اب
قابلِ تقدیر ہوں مر جاتا ورنہ کھا کے سم

مجھ پہ صادق ہے یہ قولِ بیدلِ شیریں سخن
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

خاص برائے عالمگیر

گناہِ محبت

(۱)

رشیدہ۔ نواب غضنفر کی چہیتی بی بی تھی۔ دنیا کا ہر آرام اور عیش اسے میسر تھا۔ نواب صاحب کو دن رات یہی فکر تھا کہ وہ رشیدہ کے چہرہ کو بشاش دیکھیں۔ جب رشیدہ کے ہونٹوں پر وہ تبسم رقصاں پاتے مسرت در زندگی کی ایک تازہ روح ان کے جسم میں دوڑ جاتی محبت نے نواب صاحب کو اس درجہ وارفتہ کر دیا تھا کہ ان کی نگاہ اس کے کسی عیب پر پڑتی ہی نہ تھی۔ اس کی پرفریب باتوں کو وہ معصوم فرشتوں کا پریم گیت سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں سوائے محبت کے کسی اور جذبہ کی گنجائش نہ تھی۔ ان کی محبت ہر دم اس کے قدموں پر جھکی ہوئی خراجِ عقیدت وخلوص پیش کیا کرتی تھی لیکن رشیدہ صرف اس محبت کی قائل تھی جو اس کے جذبات کو بیدار رکھے۔ اس کی لغت میں محبت نام تھا اس کھلونے کا جس سے وہ تھوڑی دیر کھیلے اور اس کے بعد اس وقت تک کے لئے اسے بھول جائے جب تک اس کا شوق پھر اس کے دل میں چٹکیاں نہ لے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ بھونرہ پھول پر صرف اس وقت تک بیٹھتا ہے جب تک اس میں رس رہتا ہے اسی بنا پر بلبل کے عشق پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ اس کا عشق لالہ صحرائی نہ تھا جس کو تخم پاشی سے علاقہ ہو جس کی نگہداشت باغبان قدرت کرے اور جو خود ہی پروان چڑھے بلکہ وہ اس پودے کے مانند تھا جو صحن گلستان میں اپنے پھل پھول اور آب ورنگ کی بنا پر لگایا جائے۔

(۲)

سعید۔ نواب صاحب کے یہاں سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اسکی پرورش نواب صاحب کے یہاں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہر شخص کے دل میں وہ اپنے برتاؤ سے جگہ کر لیتا تھا ہر شخص اس امر کا متمنی تھا کہ وہ اپنا تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ صرف کرے خود نواب صاحب کی یہ حالت تھی کہ بغیر سعید کے مشورہ کے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھا حسن سیرت کے ساتھ ساتھ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اسے حسن صورت بھی عطا فرمایا تھا۔ جو اسے دیکھتا اس سے ہم کلام ہونے کو اپنا فخر سمجھتا تھا۔ رشیدہ بھی اس پر صد درجہ مہربان تھی۔ اس کی عنایتوں اور مہربانیوں کو لوگ مشکوک نگاہوں سے دیکھتے اگر سعید کا چال چلن انھیں اس بات کی اجازت دیتا! اگر سعید تھوڑی دیر کے لئے بھی اس سے علیحدہ ہوتا تو یہ لمحات رشیدہ کے لئے ویسے ہی ہوتے جیسے قفس نصیب بلبل کے لئے موسم بہار۔ اس کی تمام رنگینیاں اور سرشاریاں اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی تھیں اور وہ اسی صورت سے سعید کی منتظر ہوتی جیسے ایک تھکا ماندہ مسافر شام کی آمد کا انتظار کرے ——

وہ اظہار عشق کے ہر طریقہ کو اختیار کرتی کبھی اس کے چہرے پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتی کبھی اس صورت سے اس کو دیکھتی جیسے ایک بھکاری۔ ایک ذی حس دولتمند کو اپنی التجا کے بعد دیکھتا ہے۔ آہیں بھرتی۔ پھر فوراً آئینہ کے روبرو کھڑی ہو کر اپنے جذبات کا جائزہ لیتی۔ پھر یکبارگی کچھ گنگنانے لگتی۔

سعید پر ان باتوں کا اثر نہ ہوتا اور وہ مطلق نہ سمجھ سکتا کہ رشیدہ کا ان حرکتوں سے کیا مطلب ہے۔ آخر تنگ آ کر ایک دن رشیدہ نے پوچھا کہ وہ اپنی شادی کیوں نہیں کرتا جس کا جواب سعید نے یہ دیا کہ وہ ایک معمولی آدمی تھا۔ اس کی التجائیں فقیر کی صدا سمجھ کر ٹھکرا دی جائیں گی ان کا مضحکہ اڑایا جائے گا۔ اس کا دل بے حد نازک تھا۔ اگر اس کی التجا ٹھکرا دی جائے۔ اس کا شیشۂ دل چور چور ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی شادی کی درخواست پیش نہ کرے گا۔

رشیدہ "فرض کرو کہ قسمت تمہاری یاوری کرے۔ اور میں خود بنفسِ نفیس تم سے درخواست کروں . . . . ؟"

سعید۔"سرکار کا ایک ادنےٰ غلام . . . .

رشیدہ نے اپنے تمام وار خالی جاتے دیکھ کر کہا "گستاخ کمینہ بے وقوف۔ مجھ سے یہ التجا کس نے کی تھی ؟ . . خیر

(۳)

نواب۔"میرے دل کی آرام۔ تم رنجیدہ کیوں ہو؟

رشیدہ۔"جلے کو اور جلانے سے فائدہ ؟!

نواب۔"یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا رنج میری موت کا دوسرا نام ہے۔ شاید میری موت تمہارے رنج کا بھیس بدل کر میرے سامنے آئی ہے۔"

رشیدہ۔"میرے پیارے کم از کم یوں ہنس ہنس کر میرے زخموں پہ نمک پاشی نہ کرو۔ ایک رنجیدہ دل یہ طنز نہ برداشت کر سکے گا۔ آہ . . "

نواب۔"خدارا مجھے کچھ بتاؤ تمہیں کیا ہوگیا۔ تم ایسے کلمے زبان پر نہ لاؤ۔ اپنے رنج کا اظہار کرو۔

رشیدہ کی ان آنکھوں میں جن میں ہمیشہ شرابِ مسرت چھلکا کرتی تھی آنسو بھر آئے۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔ الٰہی تو مجھے اس دن کے لئے زندہ نہ رکھ کہ میرے نواب کی میری وجہ سے رسوائی ہو۔ - - - - - -"

نواب۔"رشیدہ۔ پیاری رشیدہ۔ صاف صاف بیان کرو۔ خدا کے لئے تمہیں اپنی محبت کی قسم میرے اضطراب کو سکون سے بدل دو"

رشیدہ۔ تمہیں تعجب ہوگا مہینوں سے سعید مجھ سے اظہارِ محبت کر رہا ہے۔ میں اسے ٹھکراتی رہی اور محض اس خیال سے تم سے نہ کہہ سکی کہ ممکن ہے تم مجھے جھوٹی سمجھو۔ اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ میں تمہاری محبت میں کسی غیر کو شریک نہیں کر سکتی اور اپنی جان دے دوں گی۔ - - - -

نواب عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ اگر وہ رشیدہ کا پرستار تھا تو سعید کا بھی شیدائی تھا۔ آج تک سعید نے اسے بدگمان ہونے کا کوئی موقع نہ دیا تھا۔ وہ انتہائی رنج و غصہ کی حالت میں اپنی نشستگاہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ اور سعید سے ایسی باتیں کرنے لگا جن کی اسے کبھی توقع ہی نہ ہو سکتی تھی۔

آخر کار سعید نے اپنی معصومیت کے بھروسہ پر التجا کی کہ کم از کم اسے یہ تو معلوم ہو جائے کہ اس کو مجرم بنانے والی ہستی کون ہے ؟

نواب۔ کیا تو مجھے اب بھی فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے؟ گستاخ! اگر رشیدہ نے تیرے واقعات مجھ سے نہ بیان کئے ہوتے کہ تو نے اس سے اظہارِ محبت کی کس طرح جرأت کی تو میں کبھی باور نہیں کر سکتا تھا

سعید۔ سرکار بیگم صاحبہ جو فرمائیں بجا و درست ہے لیکن خطا معاف کیا عشق بھی چھپائے چھپ سکتا ہے ! ؟

نواب کا غصہ مہربانی سے بدل گیا۔ اس نے رشیدہ کو کسی غلط فہمی کا شکار سمجھ کر سعید کو معاف کر دیا۔

(۴)

رشیدہ۔ آخر تم اس جادوگر کی باتوں میں آ گئے۔ رشیدہ کو تم نے ذلت دی اور اس کی عزت افزائی کی !!

نواب۔ تم کیا کہتی ہو۔ تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیا تم اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتی ہو کہ میں فرشتہ کو شیطان سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں

رشیدہ۔ ثبوت۔ اور مجھ سے۔ ایک ادنےٰ غلام کے مقابلہ میں خیر۔ یہ میری قسمت ہے۔ کیا اس کی جوانی اور پاک بازی اس کا ثبوت نہیں کیا شادی سے بار بار اس کا انکار کرنا اس کی دلیل نہیں کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔ تم اس سے دریافت کرو کہ وہ کسی پر فریفتہ ہے یا نہیں۔

نواب نے سعید کو فوراً تخلیہ میں طلب کیا۔ اور اس سے پوچھا کہ وہ دنیا میں کسی سے محبت کرتا ہے۔

سعید۔ عالیجاہا میں محبت کرتا ہوں لیکن . . . .

نواب۔ کس سے ؟ . .

سعید۔ سرکار ہمارا معاہدہ ہے کہ اگر میں راز فاش کروں تو وہ مجھ سے عمر بھر کے لئے علیحدہ ہو جائے۔ اور اگر وہ راز فاش کرے تو یہی حق مجھے حاصل ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر حضور اس کا نام نہ دریافت فرمائیں تو زیادہ مناسب ہے۔

رشیدہ نے نواب کو سعید سے بیزار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آخر نواب پر اس کی نگاہ ناز نے ایسا افسوں کیا کہ وہ سعید سے یوں مخاطب ہوا۔

کیا تم اس وجہ سے نہیں بتانا چاہتے کہ تم خود اقراری مجرم ہوجاؤ گے ؟

سعید۔ یہ الزام میں نہ برداشت کرسکوں گا۔ میں نے ہمیشہ وفاداری کے دائرہ سے اپنے قدم باہر نہیں نکالے۔ میں نام بتاتا ہوں لیکن مجھ پر اتنا رحم فرمائیے گا کہ اسے دوسرے سے نہ کہئے گا۔ میں صرف آپ کے اطمینان کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ آپ کی بھتیجی نرگس کو بیوہ ہوئے چار سال کا زمانہ گزرا۔ میری نہی حالت شادی میں مانع تھی۔ اس وجہ سے ہم نے عہد کیا کہ ہم خفیہ ملاقاتوں پر قناعت کریں گے۔

نواب۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تمہاری رسائی وہاں کس طرح ہوسکتی ہے تم اس سے اتنی آزادی سے کیسے مل سکتے ہو۔

سعید۔ سرکار جب میں نرگس سے رخصت ہوتا ہوں تو دوسری ملاقات کا دن مقرر کرلیتا ہوں اور تاوقتیکہ نرگس کا کتا پائیں باغ میں پہنچ کر مجھے اس کی اطلاع نہ دے کہ نرگس اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئے میں وہیں چھپا رہتا ہوں۔ آج بھی مجھے نرگس سے ملنا ہے۔

نواب۔ میں بچشم خود دیکھنا چاہتا ہوں۔ پائیں باغ سے میں واپس آجاؤں گا۔"

پائیں باغ میں پہنچ کر نواب نے وہی دیکھا جو اس سے مجبور سعید نے بیان کیا تھا۔ اس نے دو معصوم دلوں کی محبت میں رخنہ اندازی پسند نہ کی اور وہ چپکا واپس چلا آیا۔

رشیدہ۔ اب تک میں سمجھ رہی تھی کہ میں اور تم ایک دل ایک روح اور ایک ہی جسم کے مالک ہیں لیکن تم اس کا ثبوت پیش کر رہے ہو کہ تم مجھے اجنبی ہی سمجھتے ہو۔ آہ۔ ——

اگر تم اس راز سے مجھے واقف کرتے تو تم کو یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ تم نے اپنے دل میں اس کا اعادہ کرلیا ہے۔ اب مجھے اس وقت کی آرزو ہے جب میری موت ہمیشہ کے لئے مجھے تم سے علیحدہ کردے۔

نواب۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے لیکن محبت مجبور کرتی ہے یہ سمجھ لو کہ اگر تم نے اپنی زبان سے ان الفاظ کو نکالا تو میں تمہارا قاتل بھی ہوں گا۔

(۵)

یوں تو ہمارے نواب صاحب کے یہاں روز ہی چہل پہل رہتی تھی لیکن آج جشن سالگرہ کی وجہ سے محل کے ذرہ ذرہ سے عشرت ٹپک رہی تھی۔ دوشیزہ لڑکیاں جام بدست و مینا دربغل شراب ارغوانی کے ساتھ ساتھ صہبائے جوانی چھلکاتی پھر رہی تھیں فطرت کی تمام کرداری کے قائل اس کی رنگ نگاری کے قائل ہو رہے تھے۔

رشیدہ۔ نرگس کو اپنے ساتھ لئے ہوئے رقص و سرود سے لطف حاصل کر رہی تھی۔ اس منظر نے نہ جانے اس کے دل میں کیسی چٹکیاں لیں کہ وہ نرگس سے یوں ہم کلام ہوئی۔

رشیدہ۔ میری پیاری بھتیجی۔ تیرا افسانہ زندگی محتاج عنوان ہے تو نے ابھی سترہ بہاریں دیکھی ہیں ——

نرگس۔ چچی چچی !!

رشیدہ۔ شمع کے لئے پروانہ۔ گل کے لئے بلبل۔ قمر کے لئے چکور۔ غرض ہر حسن کا ایک شیدائی ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تیرا حسن محتاج ہو۔ پرستار کا۔ ناممکن ...

نرگس۔ چچی مجھے معاف فرمائیے۔ مرحوم کی وفات کے .....

رشیدہ۔ بے وقوف نرگس اپنی پرخمار آنکھیں کھول۔ عشق۔ اور رازداری —— کیا کوئی کتا اس قدر مہذب بنایا جاسکتا ہے کہ اس کی آواز نہ سنی جاسکے ——

یہ طنز غضبناک آندھی کا وہ جھونکا تھا جس نے نرگس کو کھلا دیا۔ —— سعید نے اپنے الفاظ کا پاس نہیں کیا۔ کیا رشیدہ کی محبت نے اسے مجبور کر دیا تھا —— آہ ——

وہ کمرے سے انتہائی اضطراب کی حالت میں باغیچہ کی جانب روانہ ہوگئی۔ ایک خادمہ نے جب اسے اپنے دل سے ہم کلام پایا تو وہ درپیں چھپ کر سننے لگی ——

نرگس —— آہ —— میں نے ابھی کیا سنا؟ محبت کا یہی صلہ تھا۔ اے میرے دل کیا تو نے ایسا خطرناک انتخاب کیا تھا؟ او میرے بے زبان رازدار (کتا) تو نے میرے راز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن رکھا۔ لیکن آہ مرد نے جس کے پہلو میں درندہ کا دل تھا

اسے فاش کر دیا ـــــ ... اے میرے رفیق حیات! کیا تجھ پر رشیدہ کی آنکھوں کا جادو چل گیا۔ اس نے تجھے انسان سے درندہ بنا دیا شرافت کو رذالت سے بدل دیا۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اپنے وجود کو غم بے پایاں کے سپرد کرتی ہوں۔ وہی اس کا خاتمہ کرے گا۔

رشیدہ! تو اپنے طنز پر کس درجہ مسرور تھی۔ اے خدا رحم میں نے اس جرم کا ارتکاب فرط محبت میں کیا میرے روٹھنے والے خدا حافظ میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تو ......

سعید کے محلسرا میں داخل ہوتے ہی نواب صاحب نے اس سے فرمایا کہ نرگس اس وقت کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ باغ میں جا کر ذرا اسے دیکھو کہ کیا بات ہے۔

سعید فوراً نرگس کے پاس پہنچا لیکن آہ۔ اس وقت جب وہ اپنا آخری جملہ ادا کر رہی تھی۔

سعید۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میرے مالک رحم۔ نرگس کیا تم مجھ سے علیحدگی اختیار کر رہی ہو ؟!

پہچانی ہوئی آواز سن کر نرگس نے اپنی آنکھیں اس کے آخری دیدار کے لئے کھولیں جو اس کی موت کا باعث تھا لیکن اس جانکاہ نظارہ نے اس کی تکالیف اور رنج میں یکبارگی اضافہ کر دیا۔ اور اس کی معصوم روح کو قفس تن سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔

خادمہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے تمام باتیں بیان کر دیں۔ سعید پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ نرگس سے لپٹ کر خاموش روتا رہا۔ آخر کار چیخ اٹھا۔

میں نے تجھ سے دغا کی فریب کیا۔ آہ۔ میری فریب کاری کی سزا ایک معصوم کو کیوں مل رہی ہے جس دن میں نے اپنی زبان سے تیرا راز فاش کیا۔ قہر و غضب کی بجلی نے مجھے خاک کیوں نہ کر دیا۔ تم مجھ سے آخری وقت بدگمان ہوئیں۔ نواب پر میں نے اعتماد کیا اور یہ نہ سمجھا کہ میرے راز کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں چھپا سکتا۔ خدایا! از دیاد محبت کے ساتھ مجھے ایسا ناسمجھ دل کیوں دیا۔ مجھ سے وہ بے زبان ہی بہتر جس نے اپنی مالکہ کے راز کو راز ہی رکھا۔

اے محبت کی دیوی! میرے اشک وفا تجھے غسل دے چکے عشق کے دیوتا نے تیری قربانی کو قبول کر لیا لیکن آہ وہ مجھے نہ قبول کرے گا۔ میں نے اس کی حکم عدولی کی ہے۔ مجھے خود اپنے کو قربان کرنا چاہئے۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے ایک چھری اپنے دل کے قریب پیوست کر دی اور نرگس سے اس طرح لپٹا کہ مسرت اور شادمانی اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی اور وہ کبھی نہ جگنے کے لئے سو رہا تھا۔

خادمہ نے نواب صاحب کو اطلاع دی کہ نرگس اپنی جان دے چکی اور سعید اپنی جان دے رہا ہے

نواب سعید سعید یہ کیا ـــــ اس کا سبب ؟!

"میری اور آپ کی زبان" سعید کے مردہ ہونٹوں سے آواز آئی۔

نواب صاحب دیر تک ان کشتگان محبت سے لپٹے روتے رہے اپنی خطاؤں کی معافی چاہتے رہے۔ اس کے بعد سعید کے جسم سے چھری نکال کر رشیدہ کے دل میں یہ کہتے ہوئے گھونپ دی کہ تیری آتش حسد کو اس کا پانی بجھائے گا۔

(ترجمہ) (وسیم انصاری ردولوی)

ہائے جوانی

(از حضرت دعاڈبائوی)

لطف دیتی تھی بدگمانی بھی — دل ربائی تھی جانستانی بھی
تھی عجب عشق کی کہانی بھی — خوب کٹتی تھی زندگانی بھی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

دل لگانے میں لطف آتا تھا — آنے جانے میں لطف آتا تھا
ہر فسانے میں لطف آتا تھا — غم اٹھانے میں لطف آتا تھا
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

ہر گھڑی عیش ہر گھڑی آرام — نہ خیال سحر نہ فکرِ شام
تھا فقط ہم کو اپنے کام سے کام — کچھ سمجھتے نہ تھے حلال و حرام
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

نہ کوئی فکر تھی نہ کچھ کھٹکا — جی میں جو آیا کام کر ڈالا
کس قدر دل میں جوش رہتا تھا — کچھ عجب رنگ تھا طبیعت کا
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

کوئے جاناں کے رات دن چکر — دل پہ ہوتا نہ تھا کسی کا اثر
بس وہی اک خیال آٹھ پہر — کہدیا جس نے کر لیا باور
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

رات دن دلدہی وفا کوشی — چشم جاہل سے شغل مینوشی
وہ طبیعت کی اپنے سرجوشی — بے خودی اور خود فراموشی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

وہ تمنا وہ جوش کا عالم — عالم و تاؤ نوشش کا عالم
نالہ ہائے خموشش کا عالم — بیہوشی میں بھی ہوش کا عالم
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

وہ محبت میں مشغلے دل کے — کارنامے وہ من چلے دل کے
وہ نئے روز حوصلے دل کے — وہ امنگیں وہ ولولے دل کے
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

بیٹھتے اٹھتے ذکر الفت کا — سر میں ہر وقت عشق کا سودا
وہ بھی واللہ وقت تھا کیسا — جور میں خاص لطف آتا تھا
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

وہ مجھے دوستوں کا سمجھانا — وہ مرے دھیان میں نہ کچھ آنا
کوئے جاناں میں ہر گھڑی جانا — سختیاں سہ کے بھی نہ گھبرانا
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

وہ دعا ہر گھڑی الم سہنا — وہ کسی سے نہ رازِ دل کہنا
اشک آنکھوں سے متصل بہنا — رنج و غم سہنا اور خوش رہنا
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

افلاطون کی جمہوریت کا ایک باب

(ازجناب مولانا خلیل - بی اے)

(افلاطون کی شہرۂ آفاق کتاب "جمہوریت" اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک غیرفانی شاہکار ہے۔ جس کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو زبان اس عظیم ترین مفکر کے جمہوریت پسند جذبات سے ہنوز تشنہ ہے۔ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ عنقریب یہ کتاب اردو کا جامہ پہن کر دنیائے ادب میں ایک انقلاب برپا کرے گی۔ خلیل)

کل میں ارسطو کے بیٹے غلاسو کے ہمراہ پرایم میں دیوی کے حضور میں عقیدت کے پھول چڑھانے کے لئے گیا۔ نیز یہ خواہش بھی تھی کہ دیکھوں لوگ اس تہوار کو کسطرح منائیں گے کیونکہ یہ سب سے پہلا تہوار تھا۔ میرے ہموطنوں کے جلوس کی قطاریں نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھیں اور دیگر یونانیوں کے پرے بھی نہایت دلکش تھے

اظہارِ عقیدت اور تہوار کا منظر دیکھنے کے بعد ہم لوگ واپس شہر کی طرف جا رہے تھے۔ کہ صفالس کے بیٹے پول مارکس نے ہم کو دور سے واپس جاتے ہوئے دیکھا تو اس نے ہمارے پیچھے اپنا غلام دوڑایا۔ غلام نے میرے چغے کا دامن تھام کر کہا کہ پول مارکس ہم لوگوں سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے

"جناب! وہ ابھی آیا چاہتے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔"

"بہت اچھا۔" غلاسو نے کہا۔

اتنے میں مارکس بھی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ غلاسو کا بھائی ندی منطاس بھی تھا۔ پیچھے سے نفسراطس اور دیگر رفقا بھی آ گئے۔

پول مارکس نے کہا۔ "سقراط! ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا تم واپس جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تمہارا قیاس ٹھیک ہے"

"ہم تمہیں نہ جانے دیں گے۔ اگر تم ہم سب سے طاقتور ہو تو جا سکو گے"

"کیا اچھا ہوتا اگر آپ مجھے جانے دیتے۔"

"ہرگز نہیں۔ تم سے باتیں کر کے مجھے بہت مسرت حاصل ہوگی۔"

"بہت اچھا! میں بھی عمر رسیدہ انسانوں سے باتیں کرنے میں خاص دلچسپی لیتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نئی باتیں سیکھ رہا ہوں اور اس خارزار وادی کے متعلق جس میں سے وہ گزر چکے ہیں۔ مجھے تحقیق و تدقیق کا موقع ملتا ہے۔ اور یقیناً تم سے میں بہت کچھ حاصل کر سکوں گا کیونکہ اس وقت تم بقول شخصے بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ بڑھاپے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا یہ ساری عمر کا دردناک اور غم انگیز حصہ ہے؟

"سقراط! میں بلا کم و کاست اپنی رائے کا اظہار کروں گا ہم بوڑھے ایک مجلس میں اکٹھے ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ اور جب ہم اکٹھے ہوتے ہیں تو ہمیشہ اپنی جوانی کے عشرتناک لمحوں کو یاد کر کر کے بڑھاپے کو کوستے ہیں۔ جب شباب کی مسرت انگیز گھڑیاں ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں تو ہم جھنجھلا کر چیخ اٹھتے ہیں گویا ہماری زندگی کی عظمت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ اس وقت ہم کہتے ہیں کہ جوانی کے دن کیا خوب تھے! ہم اس وقت صحیح معنوں میں زندہ تھے اور اب تو مردوں سے بھی بدتر ہیں۔ لیکن سقراط۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ صحیح راز کو نہیں پا سکتے۔ بڑھاپے کو مطعون کرنا دانشمندی نہیں۔ چونکہ حقیقت مجھ پر بے نقاب ہے اس لئے بڑھاپے کے تصور سے مجھے کبھی کوفت نہیں ہوئی۔

سفوکلس شاعر سے کسی نے پوچھا تھا۔

"کہو جی! اس بڑھاپے میں کیا حال ہے؟ وہ محبت کے نغمے اور شباب کی رنگینیاں یاد آتی ہوں گی؟" اس نے کیا اچھا جواب دیا تھا۔

"میں ان رنگینیوں سے دور رہ کر نہایت مسرور ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں نے ایک جابر اور وحشی آقا سے نجات حاصل کر لی ہے

بلاشبہ بڑھاپا اک سکون اور طمانیت کی زندگی ہے۔ شباب کے جوش و خروش۔ تشنگی اور گرسنگی کے دور کے بعد انسان سکون محسوس کرتا ہے اور سفوکلس کی تمثیل نہایت خوب ہے۔ بڑھاپا مایوسی اور دلآزاری کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ انسان کا اپنا اخلاق اس کی مسرت اور غم کو ترازو میں تولتا ہے۔ اگر انسان جوانی میں دوراندیش اور دانشمند رہا ہو تو بڑھاپے میں اس کو ندامتوں اور ملامتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ورنہ جوانی اور بڑھاپا دونوں عمریں اس کیلئے ... ہان روح ہو جائیں گی۔

میں نے اس کے دلائل میں دلچسپی لیتے ہوئے اور بحث کو جاری رکھنے کی غرض سے کہا۔

"ممکن ہے آپ درست کہ رہے ہوں۔ لیکن عام نظریہ سے یہ امر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کے پاس کافی دولت ہے اور دولت کے ہوتے ہوئے بڑھاپے میں کیا آزار ہو سکتا ہے!"

"ایک حد تک آپ لوگوں کا اختلاف پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن طامسطوسلاس کا قول اس موقع پر کیا خوب تھا جبکہ ایک حریف نے اس کو ملامت کے طور پر کہا کہ وہ اتنی شہرت حاصل نہ کر سکتا تھا اگر ملک اس کا ساتھ نہ دیتا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ کسی ملک میں بھی ہوتا شہرت اس کے پاؤں چوم لیتی۔ وہ لوگ جو دولتمند نہیں ہیں اور بوڑھے ہیں ان کی بیقراری کا یہی حال ہے۔ بڑھاپے کی کمزوریاں وہی برداشت کر سکتا ہے جس کا ادراک درست ہو۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔"

"جو دولت اس وقت تمہارے پاس ہے کیا یہ تمہیں ورثہ میں آئی ہے یا تمہاری اپنی محنت کا ثمرہ ہے؟"

"اس میں تھوڑا حصہ میری اپنی کمائی کا نتیجہ ہے۔ میں اپنے باپ دادا کے درمیان آگیا ہوں۔ میرے دادا نے بہت دولت جمع کی تھی۔ لیکن میرا باپ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت میں کچھ نہ بڑھا سکا بلکہ وہ بہت کچھ اصل سرمایہ میں سے کھا گیا۔ میں نے اس میں اضافہ کیا۔ آج میرے پاس اتنی دولت ہے جتنی کہ میرے دادا کی وفات کے وقت جمع تھی۔"

"میں نے تم سے یہ سوال اس غرض سے کیا تھا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم دولت سے زیادہ محبت نہیں کرتے اور صرف وہ لوگ محبت نہیں کرتے جنہوں نے دولت اپنے گاڑھے پسینے سے جمع نہ کی ہو۔ جو لوگ اپنی کمائی سے دولت جمع کرتے ہیں وہ نہایت حرص سے دولت پر جان دیتے ہیں جیسا کہ شاعر اپنے اشعار سے اور ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے"

"تم درست کہتے ہو۔"

"لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کیا زیادہ دولت جمع کرنے سے انسان اپنے آپ کو بہتر بنا سکتا ہے؟"

"میں اپنی رائے دوں گا اور میری رائے ایک اصول کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ سقراط! جب انسان کے دماغ میں موت کا تصور آتا ہے تو ایک ہلکا سا خوف اس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ یہ روایات کہ جو انسان اس دنیا میں ناانصافی اور ظلم کرے گا۔ عاقبت میں اس کی پاداش کرلی ہے اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ گو جوانی میں ان روایات کو مضحکہ میں اڑا دیا جاتا ہے لیکن بڑھاپے میں انسان ان کو متانت سے دیکھتا ہے اور خوف سے کانپ اٹھتا ہے اور وہ اپنی گذشتہ زندگی پر غور کرتا ہے کہ اس نے کون کون سے گناہ کئے ہیں اور کتنے معصوم دلوں کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ اس وقت کئی بار خواب میں بھی چونک اٹھتا ہے اور بچوں کی طرح ہراساں ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص اس بات کا احساس نہیں کرتا یعنی جو شخص انصاف اور تقدس کی زندگی بسر کرتا رہا ہے وہ بقول شاعر۔

میٹھی نیند میں سلانے والی امید جس سے اس کے دل میں مسرت کا دریا لہریں لیتا ہے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

"اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دولت اس دنیا میں ایک نہایت قیمتی چیز ہے لیکن صرف اس شخص کے لئے جو اس کا اہل ہو۔ اگر دولت ایک ایسی نعمت ہے جو ہمیں گناہ، فریب، دھوکا۔ خوف اور قرضہ سے نجات دلاتی ہے۔ اسکے علاوہ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ اور اگر ایک شخص دولت حاصل کر کے گناہ کی دنیا خریدتا ہے تو حیف ہے اس شخص پر اور اس کی دولت پر۔"

"آپ نے نہایت بہترین طریق پر دولت کی تعریف کی ہے۔ لیکن کیا اسے ہم صداقت اور حق شناسی پر محمول کر سکتے ہیں؟ کیا وراثت کی دولت کو آپ جائز تصور کرتے ہیں؟ کیا ایک ہی بات کبھی انصاف اور نا انصافی پر مبنی ہوتی ہے؟ میں ایک مثال سے وضاحت کرتا ہوں۔ ایک شخص اپنے دوست سے ایک پستول مستعار لیتا ہے۔ تھوڑے دنوں بعد وہ دوست دیوانہ ہو جاتا ہے اور اسوقت وہ اپنا پستول واپس مانگتا ہے کیا اسوقت اس کا ہتھیار واپس دینا موزوں ہوگا یا نہیں؟" "نہیں ..."

طوفانِ نوح

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

بہ طور یادگار زہد مے خانے میں رکھ دینا
مری ٹوٹی ہوئی توبہ کو پیمانے میں رکھ دینا

کہا تھا اے دلِ کج فہم و ناداں تجھ سے یہ کس نے
خدا خانے کی حرمت کو صنم خانے میں رکھ دینا

پسند آئے نہ آئے منحصر ہے یہ طبیعت پر
کسی کے سامنے دل ہم کو نذرانے میں رکھ دینا

مرے تاریک دل کو داغِ الفت کی ضرورت ہے
یہ جلتی شمع لا کر تم سیہ خانے میں رکھ دینا

دوبارہ پھر کسی دن میرے کام آئے گی اے ساقی
جو مے پینے سے بچ جائے وہ پیمانے میں رکھ دینا

کہیں آئیں کہیں جائیں کہیں اٹھیں کہیں بیٹھیں
قدم ہر پھر کر اپنا ہم کو بت خانے میں رکھ دینا

چراغ انجمن اپنی ضیا پھیلانے والا ہے
اٹھا کر شعلۂ الفت کو پروانے میں رکھ دینا

کہاں ہم ڈھونڈتے تجھ کو پھریں گے اس گھڑی ساقی
صبوحی کیلئے تھوڑی سی پیمانے میں رکھ دینا

حفاظت ہو اگر منظور اے اہلِ جنوں اس کی
خزانہ درد و غم کا دل کے ویرانے میں رکھ دینا

ہمارے دل کی رونق جلوۂ رخ سے سوا ہو گی
یہ آئینہ بھی تم اس آئینہ خانے میں رکھ دینا

خطائے عشق پر کیوں نوح اپنی جان کھو بیٹھے
رقم اتنی بڑی اور اس کو جرمانے میں رکھ دینا

پرایا پاپ

(از قلم ۔ آسی رام نگری)

"وہ سول سرجن ڈاکٹر ہے۔ اس کا خاندان کچھ ایسا بڑا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک بوڑھی ماں اور سات آٹھ سال کا ایک بچہ ہے۔ ڈاکٹر اور معالج عام طور پر سخت دل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مریضوں کی کچھ اس طرح دیکھ بھال اور خدمت کرتا ہے۔ جیسے اس کے حقیقی بھائی ہوں۔ اس کی ہمدردی۔ خدمت اور دلجوئی دیکھ کر سب لوگ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انسان نہیں دیوتا ہیں!"

ڈاکٹر اپنے بچہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کو پوری کرتا اور اسے راجکماروں کی طرح بنا سنوار کر رکھتا ہے۔

اسے ہنستا ہوا دیکھ کر اس کا دل محبت و مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور یہ پیار و محبت کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے نرم و نازک رخساروں کو گدگداتا اور اس پھول سے بچے کو ہر وقت سایہ کی طرح اپنے ساتھ رکھتا ہے اسے دیکھتا ہے اور دیکھتا ہی رہتا ہے۔ جیسے اس کے حسین چہرے پر اپنے ایام رفتہ کی تاریخ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ درحقیقت بچہ کے ساتھ اس کی زندگی کی ایک حیرت انگیز کہانی وابستہ ہے۔

بہت زمانہ کی بات ہے۔ جب اس کی بیوی لاڈلی پہلے پہل سسرال آئی تو اپنا گھر دیکھ کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسے ایک لمحہ بھی ٹھہرنا دوبھر تھا جیسے عیش و عشرت اور ناز و نعم کی آغوش میں پلی ہوئی لاڈلی کو جیل خانہ بھیج دیا گیا ہو۔ مکان میں برقی روشنی تھی۔ نہ کافوری بتیاں۔ مٹی کے تیل کی ڈبیوں پر صبر کرنا تھا۔ گھر کچے تھے۔ سیمنٹ کی دیواریں تھیں۔ نہ پتھر کے ستون۔ لاڈلی کی آنکھیں تلاش کر کے تھک گئیں۔ لیکن اونچی کھڑکیوں اور الماریوں کا کہیں سراغ نہ لگا۔ ایسی حالت میں جاذبِ نظر تصویروں۔ قد آدم آئینے اور مسہری کا ذکر ہی فضول ہے۔

بوڑھی ساس بہو کو ہر وقت ہاتھوں ہاتھ لئے رہتی۔ لیکن آرام و آسائش کے یہ سامان کہاں سے لاتی؟ خوشبودار تیل۔ قیمتی صابن۔ قد آدم آئینہ ٹیبل۔ کرسیاں۔ غریب کہاں سے پاتی؟

قسمت کی بات نازوں میں پلی۔ اور لاڈ و پیار میں پروان چڑھی لاڈلی کو غریب گھر میں جانا تھا۔ اس کی دو بیوہ بہنوں کی شادی دوان پڑھ دولتمندوں سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لاڈلی کی ماں نے اسے رہتی زندگی تک سہاگن بنی رہنے کے لئے غریب ہی سے بیاہنا طے کر لیا تھا۔

لاڈلی کی بوڑھی ساس اس امید میں تھی کہ بہو آئی ہے۔ اب اسے کچھ آرام ملے گا۔ کبھی سر میں تیل ڈال دے گی۔ کبھی پیر دبا دے گی۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ اب اسے رسوئی گھر میں جلنا نہ پڑے گا۔

لیکن جب اس نے بہو کا یہ رنگ دیکھا کہ اس کی خدمت تو کجا رہی۔ الٹے اس کے اوپر حکومت جتا رہی ہے تو بہت جھلائی۔

شادی کے تین مہینے بعد۔

"مجھے میکے جانے دیں"

"کیوں جان کھاتی ہو؟ میکے میکے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ یہاں تو تمہارا دل ہی نہیں لگتا۔ اب تو اسی کو تمہیں اپنا گھر سمجھنا چاہئے۔ میں مانتا ہوں کہ یہاں تمہیں اپنے گھر جیسا سکھ نہیں مل رہا ہے۔ لیکن اس سے تمہیں دکھی نہ ہونا چاہئے کچھ دنوں تک اور صبر کرو۔ میں ایک دم نکما ہی نہیں ہوں۔ قسمت کی بات ہے۔ ورنہ اچھے دن بھی....."

میں فضول باتیں سننا پسند نہیں کرتی۔ مجھے سیدھے سے رخصت کر دیں میں ایک سیکنڈ بھی آپ کے ہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ مٹی کے تیل کی ڈبیاں جلاتے جلاتے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہو رہی ہے۔ دن رات لونڈیوں سے بھی

بڑھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ نہ کھانے کا ٹھکانا ہے۔ نہ سونے کا۔ مجھ سے تو میرے یہاں کی لونڈیاں اچھی ہیں۔ ایسا کھانا تو میرے ہاں کے نوکر بھی نہیں کھاتے۔ نہ جانے میں نے اس جنم میں کون سا پاپ کیا تھا جو اس طرح دکھ بھوگ رہی ہوں۔ یہاں بھیجنے کے بجائے اگر میرے ماں باپ مجھے زہر دے دیتے تو میں خوشی خوشی کھا لیتی۔ اس بھکاری.........."

انسان غریب ہو یا امیر عزت سب کو پیاری ہوتی ہے۔ خاصکر بیوی کی پھٹکار۔ وہ تلملا اٹھا۔ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح آنکھوں کی پتلیاں پانی میں تیرنے لگیں۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا آیا۔ اور کچھ دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔

"غریبی........ آہ غریبی ایک لعنت ہے۔ غریبوں کے لئے کہیں ٹھکانا نہیں۔ سماج انہیں ذلیل سمجھتا ہے۔ بھائی بند انہیں ہیچ سمجھ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ انہیں کوئی انسان نہیں گنتا۔ خود اس کے گھر والے بھی اس کی بات نہیں پوچھتے۔ تنکا تک اسے پیس ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ شریک زندگی بیوی بھی........"

چپ ہو کر پھر سوچنے لگا۔ پھر جوش میں آکر بول اٹھا۔ تب تب۔؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ پھر چپ ہو گیا۔ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ طیش میں آکر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آیا۔ مڑ کر ایک بار گھر کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ سوچ کر پھر گھر میں لوٹ آیا۔ اور پیار و محبت کی دیوی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ساری ہمت پانی بن کر آنکھوں سے بہنے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں بوڑھی ماں نے ایک بار نیند میں ہاتھ پاؤں ہلائے۔ وہ چونک پڑا۔ سوئی ہوئی ماں کو فوراً اسلام کر کے باہر نکل پڑا اور اس طرح بھاگ چلا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

خبر پھیلتے دیر نہ لگی۔ گھر میں۔ گھر سے پڑوس میں۔ پڑوس سے گاؤں میں اور پھر ہر طرف اسی کا چرچا ہونے لگا۔ جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں۔

ادھر نریندر کی ماں روتے روتے بے دم ہو رہی تھی۔ غش پر غش آرہے تھے۔ ادھر دروازے پر پالکی کھڑی تھی۔ بدنصیب ماں پالکی دیکھ کر اور بھی پھوٹ پڑی۔ لوگوں نے لاڈلی سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دن رہ کر بوڑھی ساس کے آنسو پونچھے۔ لیکن کون سنتا؟ لاڈلی پالکی میں سوار ہو گئی۔ بدنصیب ساس کھڑی روتی رہ گئی۔

لاڈلی میکے واپس آئی تو گھر کے سب ہی لوگ اس سے ناراض ہوئے۔ لیکن جب اس نے نمک مرچ لگا کر بہت سی باتیں بیان کیں تو نقشہ ہی بدل گیا کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس کی بات پر اعتبار نہ کیا ہو۔ اپنے سسرال والوں کی مار پیٹ کی تہمت لگائی تو سارا خاندان ان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس کی ماں نے تو ان بے گناہوں کو کوسنا شروع کر دیا۔

غرض لاڈلی کی تدبیر بروئے کار آئی۔ اور وہ پھر میکے میں عیش و آرام کی زندگی گذارنے لگی۔

نریندر کے بمبئی میں دس مہینے کام کرنے کے بعد اس کے صاحب ولایت جانے لگے۔ اس کے حسن قابلیت سے خوش ہو کر صاحب نے اسے بھی ولایت چلنے کے لئے کہا۔ پھر کیا تھا اس کی تو منہ مانگی مراد بر آئی۔ وہ اپنی آئندہ اسکیم سوچ کر پھڑک اٹھا۔ لیکن بوڑھی ماں...... پیارے وطن.... اور کسی کو ...... جسے وہ اب بھی بہت عزیز رکھتا ہے۔ چھوڑتے ہوئے اسے بے حد رنج ہوا۔

انگلینڈ پہونچ کر نریندر نے نئی دنیا دیکھی۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹری کی تکمیل کے لئے اس نے میڈیکل کالج میں داخل ہونا چاہا۔ وہ آئی ایس سی تو تھا ہی۔ اس کے صاحب نے سنا کہ وہ آئی۔ ایس۔ سی ہے اور ڈاکٹری پڑھنا چاہتا ہے۔ تو بہت خوش ہوئے۔ اور اسے میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا۔

اس کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت وہاں بھی رنگ لائی۔ اور سرجری کے اسرار و رموز سمجھنے میں وہ انگریزوں سے نمبر لے جانے لگا۔ معلمین ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر اس کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور وہ نہایت قلیل مدت میں نامور سول سرجن ہو کر ہندوستان لوٹا۔

جوان بیٹے کی مفارقت کے غم میں بوڑھی ماں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی جسم پر گوشت کا نام نہ تھا۔ پڑوس کی ایک رحمدل عورت کی مہربانی تھی کہ اسے کبھی کبھی آکر کچھ کھانے کو دے جاتی۔ وہ بدنصیب "نریندر [illegible]"

رٹ لگاتی مرمر کر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔

ایک دن بوڑھیا سوئی ہوئی موت کی آنے والی گھڑیاں گن رہی تھی کہ دروازے پر "ہڑ ہڑ ہڑ ہڑ" موٹر کی آواز آئی۔ وہ سن کر چونک پڑی۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ موت کا فرشتہ آگیا۔ گھر میں ایک موٹے تازے جوان کو آتے دیکھ کر وہ ڈر گئی

"بابو!" اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ آنے والے کی "ماں!" نے اسے ہکا بکا کر دیا۔

نریندر بیٹا! کہکر بوڑھیا رو پڑی۔ دوسرے ہی لمحہ میں ڈاکٹر اس کی گود میں رو رہا تھا۔

ڈاکٹر اپنے دروازے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ایک موٹر دروازے سے کچھ دور پر آکر رکی۔ شہر کے مشہور وکیل بابو اودھ کشور کو آتے ہوئے دیکھ کر ڈاکٹر استقبال کے لئے اٹھا۔ لیکن وکیل صاحب نے لمبا سلام کرتے ہوئے بیٹھنے کے لئے اصرار کیا۔

"کہئے کیسے تکلیف فرمائی اسوقت آپ نے؟ مزاج تو اچھا ہے؟"

"کیا عرض کروں ڈاکٹر صاحب! بات ہی ایسی آپڑی ہے۔ وکیل نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی بیمار ہے؟" ڈاکٹر نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

"ایک دلدل میں پھنس گیا ہوں ڈاکٹر صاحب! اب تو صرف آپ ہی کا بھروسہ ہے۔"

ڈاکٹر نے وکیل پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔

"آپ مجھے معاف فرمانے کا اطمینان دلائیں تو گستاخی کروں۔"

"کہئے بھی!" ڈاکٹر نے ایک لمحہ چپ رہ کر پوچھا۔

پانچسو کا نوٹ کھسکاتے ہوئے وکیل صاحب بولے۔ "ایک زمانے سے تعارف رہنے کی وجہ سے جرات کر رہا ہوں۔ اور پھر اب تو کوئی چارہ کار بھی نہیں...... بات یہ ہے کہ میں ایک خطرناک معاملے میں پھنس گیا ہوں۔ یہ اس کا ساتواں آٹھواں مہینہ ہے۔ آپ سے چھپانا کیا ہے۔ میں امکانی کوشش کرکے تھک گیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کل رات سے اسے نہایت تکلیف دہ درد ہے۔ اب موت اور زندگی کا سوال ہے۔ آپ کی پناہ میں آیا ہوں۔ میں تو.........."

"نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا...... آپ کو شرم نہیں آتی...... بچی بھی اتنے ذلیل۔ اتنے گئے گذرے ہیں آپ......؟"

ڈاکٹر کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے زور سے پکارا۔ "رام دھن!" ایک نوکر سامنے آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ میم صاحب کو جلدی بلاؤ۔ بغل کے کمرے سے نرز لیڈی ڈاکٹر نکلی۔ ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہا۔ اور وہ جاکر موٹر سے عورت کو اتار کر پاس کے کمرے کی طرف لے چلی۔

ڈاکٹر آدھ گھنٹے تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور وکیل صاحب کو تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ یکایک ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔ اس کیس کو میں پولس کے حوالے کروں گا۔ یہ کہکر وہ فون پر جا بیٹھا۔ وکیل صاحب نے پیر پکڑ لئے۔ اس نے انہیں ٹھوکر لگا کر بائیں ہاتھ میں فون کا چونگا اٹھایا۔ اسی وقت میم صاحب دوڑی ہوئی آئیں۔

"بچہ تو ہو گیا۔ لیکن زچہ پر غشی طاری ہے۔ حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ڈاکٹر خود چلا۔ دیکھا کہ ایک حسین عورت بے ہوش پڑی ہے۔ اور ایک نرم و نازک پھول سا بچہ رو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے نوجوان عورت کو دیکھا ایک بار دیکھا۔ دو بار دیکھا۔ آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد عورت نے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اور اس نے بھی ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہ یک وقت مسرت و شادمانی۔ حیرت و استعجاب۔ شرم و ندامت اور رنج و غم کے نقوش نمایاں ہو گئے۔

اس نے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔ کچھ بول نہ سکی۔ صرف اس کے ہاتھ ڈاکٹر کے قدموں کو بیتابانہ چھو چلے اور ڈاکٹر فرط جوش اور وفور حیرت سے چلا اٹھا۔

"لاڈلی......... تم؟؟"

لیکن سننے والا کون تھا۔۔ بہ صرف ننھا سا بچہ اس بدنصیب ماں کی قسمت پر رو رہا تھا۔

(خاص) (آسی رام نگری)

مقالاتِ باسط

(مصور قلم ماسٹر باسط بسوانی)

چھایا ہے تو چمن پر رنگِ بہار ہو کر | دل ہے فدا ہمارا تجھ پر ہزار ہو کر

مٹی میں مل گئے ہیں رنگیں جمال کیا کیا | قصر جہاں کے دو دن نقش و نگار ہو کر

تم خاک کر چکے ہو۔ دل خاک ہو چکا ہے | پہنچے گا تا بہ دامن آخر غبار ہو کر

سیر چمن سے تم کو فرصت ملے تو دیکھو | دل اور کچھ ہوا ہے اب داغدار ہو کر

سفاک تیری چتون۔ قاتل تری نگاہیں | جانبر ہوا نہ کوئی۔ ان سے دوچار ہو کر

گل ہنس پڑے چمن کے کلیاں بھی مسکرائیں | گلشن میں آپ آئے رنگِ بہار ہو کر

دعوائے عشق میرا باطل سمجھ رہے ہیں | جینا عبث ہے باسط بے اعتبار ہو کر

دل دے کے انکو باسط اسطرح چپ ہوا ہوں

رہ جائے کوئی جیسے بے اختیار ہو کر

نپولین اعظم اور ایک ہوا باز عورت

نپولین اعظم کا ہوائی جنگ کے امکانات پر غور کرنے سے انکار کا دلدوز واقعہ

از جناب خانصاحب قاضی محمد شفیع صاحب بی اے علیگ

یہ ۱۸۱۱ء کا واقعہ ہے جب نپولین اعظم کی سلطنت انتہائی عظمت تک پہنچ چکی تھی۔ شہنشاہ کے اقبال کا ستارہ نصف النہار پر تھا۔ اور اس کی زود آئندہ بربادی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

جدید طبقۂ رؤسا نت نئی مہموں کا متلاشی تھا۔ پیرس میں آثار حیات کی فراوانی تھی۔ لوگ نت نئی فتوحات کی اخبار سے ہر وقت ایک ہیجان میں رہتے "باکرہ لینورماں" کی چہل پہل ہے۔ اس کی کمال غیب دانی کے قصے زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس کے کمرۂ ملاقات میں مستفسرین خط و تسنت کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کو ملکہ جوزفین کی نظرِ التفات کا فخر حاصل ہے بلکہ خود شہنشاہ نپولین اعظم اپنے محلِ خاص میں اسکو طلب فرما کر مراحم خسروانہ سے ممتاز فرما چکے ہیں۔

ایک دن اس کے کمرۂ انتظار میں بین الاقوامی سیاست دانوں اور فاخرہ لباس میں ملبوس خواتین کے جھرمٹ میں ایک ایسی عورت نظر پڑتی ہے جس کے بدن پر لباس متوسط درجہ کا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے مگر آنکھیں چمکدار ہیں۔ اس کے انداز سے آزادی نمایاں ہے۔ اس خاتون کا نام صوفیا بلانچرد ہے اور وہ ایک متوفی موجد کی بیوہ ہے۔ اس کے شوہر فرانسس بلانچرد نے جو حال ہی میں انتقال کر گیا ہے۔ ایک ایسی گاڑی ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی جو خود ذاتی طاقت سے بلا گھوڑوں یا دوسرے ذرائع قوت کے چل سکے۔ ہوا بازی سے اسکو خاص شغف تھا۔ حتیٰ کہ چند مرتبہ اپنی بیوی سمیت اُڑن کھٹولا میں پرواز بھی کر چکا تھا۔ یہ خاتون صوفیا بلانچرد ہی تھی جو اس وقت اپنے متعلق باکرہ لینورماں کے الہام آمیز الفاظ سننے کی منتظر تھی۔

الہامی الفاظ

تمہارا مستقبل ہوا سے وابستہ ہے۔ تم اپنے [illegible] طرف پرواز کرو گی۔ فن پرواز کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ اس کے امکانات اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ مستقبل بعید میں جنگوں کا فیصلہ کرۂ ہوائی میں ہوا کرے گا مگر ——— تم خود دیکھنا ایک مکان کے خطرہ سے بچنا۔

یہ الفاظ سن کر صوفیا بلانچرد کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کی امنگوں میں نئی روح دوڑ گئی۔ پرواز! اس میں تو اس کے مرحوم شوہر کو خاص انہماک تھا۔ اس نے دل میں کہا کہ میں اپنے شوہر کی خواہشوں اور ارادوں کی تکمیل کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گی اور کرۂ ہوائی پر قابو پانے کے لئے اپنا تن۔ من۔ دھن قربان کر دونگی۔

اپنے مکان کو واپس جاتے ہوئے صوفیا بلانچرد غیب داں باکرہ عورت کے الفاظ کا اعادہ دل ہی دل میں کر رہی تھی "مستقبل میں جنگوں کا فیصلہ کرۂ ہوائی میں ہوا کرے گا"

اگرچہ شہنشاہ ایک کامیاب مہم کے بعد ابھی ابھی ویٹینا دار الحکومت آسٹریا سے واپس آیا ہے۔ مگر ایک نئی جنگ کا ذکر ابھی سے باخبر حلقوں میں ہو رہا ہے۔ اپنے سابق دوست زار روس کے ساتھ شہنشاہ کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ روس سے ایک ہلاکت آفریں جنگ چھڑ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو کیا کسی قسم کی پرواز کرنے والی مشینوں کے استعمال کے لئے موقعہ نہ نکل آئیگا جس سے نبرد آزماؤں کے دل دہل جائیں۔ جن کی باکرہ لینورماں نے پیشین گوئی کی ہے۔ چند اڑن کھٹولے ——— کچھ ہوائی گولہ باری۔

یقیناً روس کی نیم تربیت یافتہ سپاہ خوف کے مارے بھاگ نکلے گی۔

نپولین سے ملاقات

ایک طویل زحمت اور درباری جوڑ توڑ کے بعد صوفیا بلانچرد کو نپولین اعظم کے حضور میں شرفِ باریابی حاصل ہوگیا۔ آج وہ شہنشاہ کے سامنے استادہ تھی۔ وہ اس کی تجاویز کو بغور سن رہا تھا بلکہ بظاہر ان سے متاثر نظر آرہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے خاتون کے رخسار پر ہلکی سی تھپکی بھی دی۔ جو اس کی عقل و ہمت کی داد دہی کے مترادف تھی اور جو شاہی اطمینانِ قلب کی نادر علامت تھی۔

بالآخر شہنشاہ نے جواب دیا۔

خاتون! اگر تمہارا خیال ہے کہ جنگوں کا فیصلہ کسی قسم کے جدید آلاتِ فضائیہ سے ہو سکتا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ لڑائیوں میں فتح فنِ حرب کی مہارت سے حاصل ہوتی ہے جس کا سبق ہم نے رومی اسلاف سے سیکھا ہے۔ میری کامیابی کا راز ہمیشہ اس حکمتِ عملی میں مضمر رہا ہے کہ متحدہ جیوش سے حریف کے کمزور ترین مقام پر دفعۃً حملہ کر دیا جائے۔ سپاہ کی جرأت۔ جسارت اور گرمجوشی صرف استمداد کی جائے ہوائی غبار کا محض نمائشی کام دے سکتے ہیں۔ وہ بازیچۂ اطفال ہیں۔ معرکۂ فنِ حرب سے ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔"

ملاقات ختم ہوگئی۔ صوفیا بلانچرد شہنشاہ کو قائل کرنے سے قاصر رہی وہ گھر واپس آگئی مگر اس کی ہمت و استقلال حوصلہ و جرأت پہلے سے دوچند ہوگئے۔ اس نے دل میں کہا کہ میں ذاتی طور پر ہی فنِ پرواز کو ترقی دینے کی جد و جہد کروں گی۔ وہ بغیر کسی کی مدد کے اکیلی پیرس کے مضافات میں غبارہ میں محوِ پرواز ہوتی۔ حتیٰ کہ کامیابی پرواز سے اس کی بے حد شہرت ہوگئی۔ بایں ہمہ بقول شہنشاہ نپولین غبارے نمائش گاہ کے کھلونوں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ بادی النظر میں غبارے بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقیع ثابت نہ ہو سکے۔

لوئینز۔ مارسیلز۔ رون۔ اور دوسری مشہور نمائش گاہوں میں "ہوا باز حسینہ" کی غبارہ بازی جاذبِ توجہ ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک انگریز نے بھی انگلستان میں نمائش پرواز کے لئے اس کا اجارہ کر لیا اور صوفیا بلانچرد کا نام یورپ بھر میں مشہور ہو گیا۔

بے سود تاسف

نپولین کی ہزیمت خوردہ فوج روس کے برف پوش پہاڑوں پر سے پسپا ہو رہی ہے۔ صوفیا بلانچرد زہرخندہ کر رہی ہے۔

کاش شہنشاہ نے میری بات پر کان دھرا ہوتا مگر "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلّۂ خود باید زد" ہزیمت خوردہ نپولین سینٹ ہیلینا کی قید میں پڑا سڑ رہا ہے۔ مگر صوفیا بلانچرد کا کوکب بخت ابھی اس کے دامِ اقبال میں ہے۔ وہ اب تک ۶۰ مرتبہ کامیابی کے ساتھ پرواز کر چکی ہے آخر کار اب بڑے بڑے سائنسداں بھی قائل ہو گئے ہیں کہ صوفیا بلانچرد کی مساعی محض بازیچۂ اطفال نہیں۔

۶ جولائی ۱۸۱۹ء کو مشتہر کیا گیا کہ صوفیا بلانچرد پیرس کے نواح میں ایک شاندار پروازی تماشہ دکھائے گی۔ بے شمار مخلوق جمع ہوئی کیونکہ لوگوں میں اب یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ یہ ہوا بازی محض نمائشی ہی نہیں بلکہ یہ بات آہستہ آہستہ واضح ہو رہی تھی کہ فنِ پرواز کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

فوجی باجہ بج رہا تھا۔ صوفیا کے غبارہ نے حرکت کی۔ پرواز میں آیا اور فضا میں بلند ہونے لگا۔ بے شمار آتش گیر مادہ کی شعلیں جنہیں ہوا باز حسینہ چھوڑ رہی تھی اپنی ضیا باری سے منظر کی لطافت میں اضافہ کر رہی تھیں دفعۃً ایک غیر معمولی شعلہ نمودار ہوا۔ یہ کیا تھا۔ سوئے اتفاق سے ایک مشعل غبارہ کے گیس والی (gas bag) سے ٹکرا گئی گیس مشتعل ہوائی۔ شعلے قابو سے باہر ہو گئے ایک لمحہ تک تو تماشائی یہی سمجھتے رہے کہ ان کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے کسی غیر معمولی اتنی بڑی مشعل کے التہاب کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ جو روشنی اور آتشبازی دونوں کا بیک وقت کام دے سکے۔ مگر یکبارگی غبارہ نیچے گرنے لگا۔ وہ اب محض ایک شعلہ ہی رہ گیا تھا۔ بھیڑ سے ہولناک آہیں نکلیں۔ مجمع میں اضطرابی ہلچل مچ گئی۔ ایک کہرام بپا تھا۔ دلدوز چیخوں سے آتشیں منظر بالکل بھیانک ہو رہا تھا۔ غبارہ کی ٹوکری جس میں ہوا باز حسینہ بیٹھی ہوئی تھی ایک مکان کی چھت پر گر کر پاش پاش ہو گئی ——— پیشین گوئی پوری ہو کر رہی ——— آخر لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ وہ ایک فاجعہ کا نظارہ کر رہے ہیں جلتی ہوئی

غزل

(جناب سید جلال الدین صاحب حیدر دہلوی)

اب خیالِ ماسوا سے دور ہو کر دیکھئے — آپ ہی کو ہر طرف ہنگامہ پرور دیکھئے

سامنے اس برق وش کو جلوہ گستر دیکھئے — جس طرف سے گوشۂ فطرت الٹ کر دیکھئے

اس کا قامت کس نظر سے اور کیونکر دیکھئے — جس کے فتنوں کو قیامت کی برابر دیکھئے

تا بکے ظلم و ستم عرضِ وفا پر دیکھئے — اب زمانہ کی طرح کروٹ بدل کر دیکھئے

اپنے دردِ عشق کا اک اک کو خوگر دیکھئے — ہر رگِ تن دیکھئے دل دیکھئے سر دیکھئے

رنگ آہوں سے تصویر میں اُڑا دوں تو سہی — اک ذرا تصویر کی مانند کھینچ کر دیکھئے

میں وہ بدقسمت کہ میرے سائے سے تو رم کرے — تو وہ خود آرا کہ تجھ کو زندگی بھر دیکھئے

دربدر کی ٹھوکریں ہفت آسماں کی گردشیں — کیا مقدر میں دھرا ہے کیا مقدر دیکھئے

ابتدا گر حسن کی اُن سے ہوئی تو کیا ہوا — ختم حجت عشق کی اک روز ہم پر دیکھئے

میرے نالوں کا سبب اپنے تغافل کا اثر — آنکھ سے آنکھ اور دل سے دل ملا کر دیکھئے

جسکا ہر انداز ہو وجہ شکستِ کائنات — کس طرح اُس کی طرف اے دیدۂ تر دیکھئے

کسقدر مضبوط ہے عشق و وفا کا سلسلہ — بے حجابانہ کبھی انگڑائی لے کر دیکھئے

خودنمائی سے نہ دامن چھٹ سکیگا حشر تک — خار بنجائینگے آئینے کے جوہر دیکھئے

ابتو اک چشمِ کرم رنگیں لبوں کا واسطہ — ہو چکا ہے عمر کا لبریز ساغر دیکھئے

سخت غفلت ہے گر اسکو دل سے باہر ڈھونڈھئے — ہر عقیدہ کفر ہے جب حد سے بڑھ کر دیکھئے

حیدر حق دوست سے ہر لحظہ کر ہر وقت ضد — کافروں کے جبر خاصانِ خدا پر دیکھئے

باسی پھول

(از جناب پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے)

صابرہ کو رخصت کئے ہوئے سات برس کا زمانہ گذر چکا تھا۔ میں بھی نوجوانی کی حدوں کو پار کرکے اور طالب علمی کی بےفکری کو خیر باد کہہ کے اب ایک ذمہ دار انسان کی طرح اور ایک باقاعدہ وکیل کی حیثیت سے دن بھر کچہریوں کی خاک چھانتا اور بارہ بجے رات تک۔ صابرہ کی یاد میں نہیں بلکہ محض قانون حفظ کرنے اور نظیریں ڈھونڈھنے کے لئے لیمپ جلائے اپنے دفتر میں بیٹھا کام کیا کرتا تھا۔ میں ہرگز ہرگز دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ صابرہ کی یاد مجھے ستاتی تھی۔ اس لئے کہ امتداد زمانہ نے دل کو اس تکلیف سے اسقدر مانوس بنا دیا تھا کہ اب الم کی جگہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ سن کے بڑھنے کی وجہ سے اعصابی ہیجان مفقود اور جذبات کا وفور معدوم ہوگیا تھا۔ گویا چشمۂ محبت میں برساتی جزر ومد کی جگہ اب موسم گرما کی سبک ونرم روانی تھی — ہیجان وہوسناکی کے خس وخاشاک تہ نشین ہوچکے تھے اور طغیان وطوفان کی جگہ صفائے قلب واستقرار نے لے لی تھی۔ اگر دل میں درد تھا تو وہ بالکل ویسا جیسا کہ محنت شاقہ سے اعضا میں پیدا ہوجاتا ہے اور جس کی وجہ سے جسم کے دبانے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس درد کو چھوڑوں کی اس چوٹ سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جو ترواتی میں چمک اٹھتی ہے۔ صابرہ کی یاد کے لئے پروائی کا کام وہ مرجھائی ہوئی کلی کرتی تھی۔ جو اب بھی ہر سال عقد کی تاریخ کو میرے پاس پرزے میں لپٹی ہوئی بھیجی جاتی تھی۔ پچھلے دو برسوں سے پرزوں نے خط کی صورت اختیار کرلی تھی ان دونوں خطوں میں اظہار خلوص کے ساتھ ساتھ اس امر کی نصیحت کی گئی تھی کہ مجھے اب جلد سے جلد شادی کرلینا چاہئے اور آخری خط میں مشاطگی کے فرائض کی انجام دہی کی آمادگی بھی ظاہر کی گئی تھی!

میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھے شادی کے نام سے نفرت نہ تھی اور نہ اب مجھ میں صابرہ کے متعلق وہ والہانہ کیفیت باقی تھی کہ میں سوائے اس کے کسی دوسرے کے ساتھ اس ذکر ہی کو ناپسند کرتا لیکن پھر بھی صابرہ کی طرف سے اس امر کی سلسلہ جنبانی بجھتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھی۔ غور کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ عورت جو شوہر واولاد وخانہ داری کے علائق میں گرفتار رہنے کے باوجود ہر سال میری محبت کی یادگار مناتی رہے۔ جب میرے لئے رفیق تنہائی کی تلاش کا کام بھی اپنے ذمہ لینے کے لئے خود کوشش کرے تو اس کی اس نئی عنایت سے دل میں جذبۂ امتنان بڑھے گا یا نہیں اور اس کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوگا یا نہیں؟ صابرہ کی محبت کو اگر کوئی شے پھر اس کی پچھلی صورت میں لا سکتی تھی تو اس کی یہ تحریک تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس آخری خط کے پانے کے بعد میں اپنے میں وہی والہانہ کیفیت پانے لگا جو آٹھ برس پہلے مجھ میں موجود تھی۔ گویا آتش محبت کی بجھتی ہوئی چنگاری جو علائق کے خاکستر میں دبی پڑی تھی۔ صابرہ نے اسے پھر اپنے ہاتھوں ایک شعلہ جوالہ بنا دیا۔ میں سات دن متواتر شب وروز اس آگ میں جلتا رہا۔ بالآخر آٹھویں دن میں نے صابرہ کے خط کا جواب بھیجا۔ اس خط میں میں نے خدا جانے کتنی قسموں کے ساتھ اپنے اس عہد کو دہرایا تھا کہ میں اب تمام عمر یوں ہی بیاہا رہوں گا اور خط ختم اس فقرے پر کیا تھا کہ مجھے تاہل کی زندگی سے اپنی یہی زندگی پسند ہے جب اتنی فرصت ہے کہ:۔ ع

بیٹھا رہوں تصور جاناں کئے بغیر"

صابرہ نے جو اس کا جواب لکھا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس لئے اس کی نقل بآسانی ممکن ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"میرے دیوانے! آپ کا خط ملا۔ اسے پڑھ کر مجھے جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ رنج ہوا۔ دنیا میں بھلا کون سی عورت ہے جسے اس یقین سے خوشی نہیں ہوتی کہ اس سے ایک شریف تعلیم یافتہ مرد محبت کرتا ہے اور وہ

بھی شریفوں کی طرح محبت کرتا ہے؟ آپ نے جس شرافت سے میری اور اپنی محبت کو نباہا ہے اس کی قدر نہ کرنا عشق و وفا کا نام رسوا کرنا ہے لیکن واقعات خواہشات کے پابند نہیں ہوتے۔ جو کچھ میرا اور آپ کا جی چاہتا تھا اور جو کچھ میرے اور آپ کے معاملے میں واقعات پیش آئے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں بیاہی جا چکی۔ خیر سے تیچے والی بھی ہوں اللہ اسے زندہ رکھے۔ میرا پتن چار برس کا ہو چکا بیمیائی ضرور ہے مگر اظہار واقعہ اس موقع پر غالباً واجب و لازم ہے اس لئے عرض کرتی ہوں کہ میرے بہار کے دن ختم ہو چکے۔ میری آنکھوں کا رس میرے ہاتھ پاؤں کا کس بل زائل ہو چکا۔ میں نہ اب نوجوان ہوں۔ نہ بن بیاہی الھڑ! آپ ابھی تک گزشتہ ایام کی تصویریں کلیجے لگائے بیٹھے ہیں! آپ کی صابرہ سات آٹھ برس قبل والی صابرہ اس دنیا میں نہیں ہے! پھر اس کی یاد کیسی؟ اور اس یاد پر دنیا کا تج دینا کیسا؟ کیا آپ کی اس محبت۔ آپ کی اس وفا کے بعد بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں آپ کو آرام سے دیکھوں؟ "آپ کہیں گے میرے لئے گذرے ہوئے دنوں کی تصویریں بہت ہیں!" میں عرض کروں گی تصویروں میں وہ گرمی نہیں جو عورت کے دل میں ہے۔ وہ خدمت کی صلاحیت نہیں جو عورت کے نازک ہاتھوں میں ہے اور وہ تسکین دہی کی طاقت نہیں جو زندہ عورت کے سینے میں ہے! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

میں اس لئے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دلاتی ہوں اور آپ کو اپنے ہی سر کی قسم دیتی ہوں کہ اب بن بیاہے رہنے کے خیال کو دل سے نکال ڈالئے اور اپنا گھر بسائیے! زندگی کی گاڑی بغیر دونوں پہیوں کے نہیں چلتی۔ آپ دنیا میں رہ کر سنیاس لئے بیٹھے ہیں اور وہ بھی مجھ نصیب جلی کے لئے! وفا ہو چکی محبت کے امتحان کی حدیں کب کی گذر گئیں۔ اب تو سر بچی خودکشی اور قطع نسل ہے! اگر مجھے آپ کی قدر نہ ہوتی۔ اگر میں آپ کے استقلال اور آپ کی پامردی کی قائل نہ ہوتی۔ یا میں آپ ہی کی صابرہ نہ ہوتی۔ تو میں اپنی جگہ پر اس سے خوش ہوتی کہ آپ نے اپنی زندگی میرے پیچھے تباہ کر دی! لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے آپ کی اس موجودہ زندگی کا جب خیال آتا ہے تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ میری سی حقیر و ذلیل عورت کے لئے آپ سا مرد اور جوگ لے! یہ میرے اوپر اتنا بڑا بار ہے جو میرے کمزور کاندھوں سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ للہ اپنے پر اور مجھ پر رحم کیجئے اور اپنا گھر بسائیے!

آپ اگر یوں نہ مانیں گے تو میں خود کوئی لڑکی تلاش کر کے آپ کے متعلق سلسلہ جنبانی شروع کر دونگی۔ پھر تو آپ اپنی صابرہ کو جھوٹی نہیں بتا سکتے!........ میں آپ کے جواب کا بہت بے چینی سے انتظار کرتی رہوں گی!

اس خط کے پڑھنے کے بعد جو میری حالت ہوئی اس کا اندازہ انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو صاحبِ دل ہیں۔ ایک طرف تو میرے دل میں صابرہ کے اس نئے ایثار اور اپنی یاد کی قربانی کی ترغیب پر مر مٹنے والا پیار آتا دوسری جانب عقل سلیم یہ کہتی کہ صابرہ کی رائے صحیح و درست ہے! پھر عقل کی خشک ہیزمی رائے میں اعصابی ہیجان ہاں میں ہاں ملا کر نرمی اور گرمی شامل کر دیتا۔ مرد ایسا مرد جس کے قوائے عقلی و ذہنی درست ہوں۔ جس کی تندرستی ٹھیک ہو اور جس کو کوئی جسمانی بیماری نہ ہو۔ تاہل کی زندگی کے لئے فطرۃً مجبور رہے۔ یہی فطرت میری عقل کے ساتھ تھی۔ دل کہتا صابرہ کی سی شریف۔ غیور اور باحیا خاتون کی یاد مجھ میں ابتک بسی رہی۔ میں اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس گھر میں کسی دوسرے کو جگہ نہیں مل سکتی! جسم کہتا میں ایک خیال اور ایک تصویر کے لئے اپنے کو کب تک مارتا رہا ہوں؟ پھر یہ امر تو عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی۔ اس بحث میں بوالہوسی بھی آکر شریک ہو جاتی اور اپنے مقصد خاص کے حصول کے لئے اور "شیوۂ اہل نظر" کی شکست کی غرض سے یہ بہانہ پیش کرتی کہ صابرہ تو خود ہی اس پر مصر ہے کہ برہم چاریہ کا بھرم ٹوٹے اور وہ بھی کن الفاظ میں! خدا اور رسول کا واسطہ! اپنے سر عزیز کی قسم!

غرض رات دن میرا سینہ دیوانی کچہری تھا کہ جہاں دو مختلف الخیال وکیلوں کی جرح اور بحث بڑی گھما گھمی سے جاری رہتی اور میں ایک جج کی طرح سب کچھ سننے کے لئے مجبور رہتا! میں نے چوتھے دن اس خانگی جنگ سے عاجز آکر صابرہ کے خط کے جواب میں لکھ بھیجا:-

"نہ فراموش ہونے والی صابرہ! تمہارا خط ملا۔ میں تمہیں اس کے جواب میں کیا لکھوں؟ زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا! میں تمہارا صید۔ تمہارا گرفتار۔ تمہارا غلام! تم مجھے اپنا بنا کے رکھو۔ کسی دوسرے کو تحفتہً دیدو یا ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹ دو! تم مالک و مختار ہو۔ میں نہ اپنے قبضۂ قدرت میں ہوں۔ نہ مجھ میں فیصلہ کرنے کی اور نہ عزم ارادہ کی صلاحیت ہے! بس اتنا جانتا ہوں کہ قفس یا قید خانے کے بدلنے سے میں نہیں بدل سکتا۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا!"

دوسرے ہی دن جواب آیا۔

"بہت خوب میں اپنے ہی اختیار تمیزی سے کام لونگی اور آپ کا گھر بسا کے دم لوں گی۔ اب آپ کو اپیل کا اختیار نہیں!"

اس کے بعد ایک ہفتہ تک کوئی خط نہیں آیا۔ پھر ایک پرزہ ملا۔

"نواب......... کی صاحبزادی میری دیکھی بھالی ہیں۔ حسین۔ سلیقہ شعار۔ پڑھی لکھی اور نیک چلن۔ میں نے ان سے بات طے کر دی ہے۔ شاید اُدھر کے لوگ آپ سے کسی دن ملنے آئیں۔ خدا کے لئے کوئی ایسی بات نہ کہہ دیجئے گا کہ ان لوگوں کو ناگوار ہو اور میری سبکی ہو!"

میں نے لکھ بھیجا "کیا مجال!" اور ان آنے والوں کا اسی جذبہ سے انتظار کرنے لگا۔ جس جذبہ سے ہونیوالا ذبیحہ قصاب کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔

بہر حال وہ حضرات آئے۔ گفتگو ہوئی اور پسند کا اظہار ڈھکے پردوں فرما کر میاں فوراً لے گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست جاوید صاحب کو تاریخ و ساعت کا دن اور وقت کا تقرر اور تمام انتظامات کا اہتمام سپرد کیا اور خود ایک کمیشن کے سلسلے میں دو ہفتہ کے لئے کلکتہ چلا گیا۔

کلکتہ کی سیر و تفریح میں بہت کچھ دل بہل گیا تھا اور ہونے والی شادی کا خیال وہاں کے مختلف اسٹوڈیوں کے دیکھنے کے سلسلے میں ذہن میں دھندلا سا رہ گیا تھا کہ دفعتہً میاں جاوید کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ "عقد کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے اور اب اسکے صرف بیس دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے تمہیں جلد سے جلد واپس آنا چاہئے۔ نیز اپنے ہمراہ وہ چیزیں لیتے آنا جو فہرست منسلکہ میں درج ہیں"۔

جی تو چاہتا تھا کہ میں اس مہمل خط کو "ورق بے معنی" کہہ کر دریائے گنگ میں غرق کر دوں۔ لیکن صابرہ سے زبان ہار چکا تھا اور بوالہوسی اور جسمانی لذات کی خواہش مار آستین بنی موجود تھی۔ اس نے پھر سبز باغ دکھانا شروع کیا اور میں جاوید کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔

تین چار دن بعد جب میں ایک اچھی خاصی دوکان کھولنے کا سامان ساتھ لے کر لکھنؤ واپس آیا۔ تو جاوید اسٹیشن پر موجود ملے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شادی کی تاریخ محض اس لئے بڑھا دینا پڑی کہ لڑکی والوں میں سے کسی عزیز قریب کا دفعتہً انتقال ہو گیا اور اب جب تک کہ انکی برسی نہ ہو جائے شادی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور گھر پہونچ کر میاں جاوید تو اپنی فرمایشات کی فہرست سے خرید شدہ تحائف ملاتے رہے اور میں اس تھکے ہوئے مزدور کی طرح جو بار گراں منزل مقصود تک پہونچانے کے بعد سبکدوش ہو جاتا ہے۔ پڑ کے سو رہا۔ قریب شام جب میں سو کے اٹھا تو جاوید گھر جا چکے تھے۔ منشی جی بھی نہیں آئے تھے اس لئے میں دیر تک حمام میں بیٹھا نہایا کیا۔

اس دیر کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے نہانے میں خاص لطف آ رہا تھا۔ بلکہ حمام میں پہنچتے ہی مجھے اپنا وہ نہانا یاد آ گیا جو مجھے عشق کی ابتدائی منزلوں میں بارہ نبکی کے سفر کے بعد پیش آیا تھا۔ اور پھر آٹھ برس پہلے والی صورت و ماغ نے نظروں کے سامنے پیش کر دی اور پھر وہی ربودگی وہی بدحواسی پیدا ہو چلی تھی کہ یہ خیال آیا کہ ہونے والی سسرال میں موت صابرہ کو خط لکھنے کی نوید لے کر آئی ہے۔ میں نے اس آٹھ برس کے عرصے میں نہ تو صابرہ کے میاں سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ اور نہ خود اسے کبھی خط لکھنے میں سبقت کی تھی۔ لیکن آج بہانہ ہاتھ آ گیا تھا اس حادثہ کے متعلق مزید تفصیلات جاننے کی کوشش نہ کرنا خلاف انسانیت و مروت ہوتا۔ اس لئے میں نے جلدی جلدی جسم خشک کر کے کپڑے پہنے اور صابرہ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ پورا خط مجھے یاد نہیں لیکن بعض حصے اب بھی حافظے میں محفوظ ہیں۔ میں نے کلکتہ سے واپسی کی خبر دینے اور اس کی خوشی کے لئے اپنے کو شادی کی دیوی پر بھلینٹ چڑھا دینے کا تازہ وعدہ کرنے کے بعد اس حادثہ کی نوعیت کے متعلق اطلاع چاہی تھی اور پھر ایک بار لجاجت سے لکھا تھا۔

"صبر آزما صابرہ! یہ یاد رکھو کہ یہ رشتہ میں نے تمہارے حکم سے منظور کیا ہے لیکن یہ میری محبت کا تم سخت ترین امتحان لے رہی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ

ع۔ "بت سامنے رکھ لینا اور یاد خدا کرنا!" مگر دیوی پتھر سے اس کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ جو جسم و جسمانیات سے منزہ ہے نہ کہ اس کی عوض جو حسن مجسم ہو! تمہارے پرستار کے لئے پتھر کی دیوی میں دل پھونکنے والی گرمی کہاں؟ تم کہو گی وہ پتھر کی نہیں انسان کی جوان ہے! مجھے یہ تسلیم ہے پہلو ضرور گرم ہو گا میں کوئی راہب نہیں! لیکن...... لیکن میری صابرہ سمجھنے کی کوشش کرو کیا تم تاہل کی زندگی میں مجھے بھول سکیں؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے جواب دو۔ کیا کسی خیالی تصویر کو دل سے لگائے بیٹھے۔ رہنا اس حالت میں بھی اتنا ہی آسان ہے؟ تم کہو گی میں عورت ذات ہو کر یہ مراحل جھیل رہی ہوں تم مرد ہو کر اس مصیبت سے کیوں ڈرتے ہو۔ میں کہوں گا کہ یہ تو مقتضائے دوستی نہیں کہ کہا جائے۔ "ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے ڈوبیں گے!" تم ایک شریف گھرانے کی بے بس خاتون تھیں اور میں ایک آزاد و مختار مرد ہوں۔ تمہیں زبردستی بیڑیاں پہنائی گئیں۔ تم چاہتی ہو میں خوشی خوشی خود سے پہن لوں۔ لہذا اب سے اپنے بندہ پر رحم کرو!

جب سے میں نے اس حادثہ کی خبر سنی ہے۔ فرصت کے رات دن کے شیریں خواب پھر دیکھنے لگا ہوں۔ کاش یہ خواب تمہارے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر نہ بنتا.........."

غرض مختلف پیرایوں میں بہت سی خوشامد اور لجاجت لکھ کر لفافہ بند کیا۔ مہر لگائی اور اپنے سب سے معتمد آدمی کو بلا کر حوالہ کیا۔ نواب صاحب کی حویلی کا پتہ بتایا۔ اور تاکید کردی کہ سوائے رسولن ماما کے جو میرے اور صابرہ کے خطوط لایا اور لے جایا کرتی تھی کسی دوسرے کو خط نہ دے۔

کوئی دو گھنٹہ بعد صابرہ کا جواب آیا۔ میرے ہی خط پر لکھا تھا۔

"رشید صاحب۔ آپ کی شادی مجھ ہی مانگ اجڑی کی وجہ سے رک گئی آج پانچواں دن ہے کہ میرا بچہ یتیم ہو گیا"۔

اس خبر کا مجھ پر جو اثر ہوا اس کا تجزیہ مشکل ہے۔ میں کبھی روتا تھا اور کبھی ہنستا تھا۔ روتا اس لئے تھا کہ صابرہ نے میرا گھر بسانے کی کوشش کی اور اس کا گھر خود اجڑ گیا۔ ایک رنجور و مہجور انسان میں اپنے کو خاص طور سے قسمت کا ستایا سمجھ لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بہت آسانی سے یقین کر لیتا ہے کہ اس کے دوست احباب پر بھی جو مصائب آتے ہیں ان سب کا باعث وہی ہے۔ میں نے اپنے کو بہت دنوں سے قسمت کا ستایا سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے صابرہ کے اس نئے غم کا سبب بھی اپنے ہی کو مان لینا بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ میں ان مصائب و تکالیف سے اچھی طرح واقف تھا جو ایک ہندوستانی بیوہ کو آئے دن برداشت کرنا پڑتی ہیں میں اس کو خوب جانتا تھا۔ کہ ہمارے اس ملک میں بیوہ کے معنی بعض موقعوں پر بالکل اچھوت کے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس کا سہاگ چھن جاتا ہے اور وہ دنیاوی جنگ کیلئے بالکل یکہ و تنہا رہ جاتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے اس طرح کے آلام و مصائب فراہم کئے جاتے ہیں جو دیگر ممالک کے باشندوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے دولہا کا ہر عزیز اسے سبز پیرا۔ منحوس اور قاتلہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنی اپنی ذہنیت اور صلاحیت کے مطابق اس کے لئے سزائیں تجویز کرتا ہے۔ صابرہ واقعی اسم بامسمیٰ تھی اس کا تحمل۔ اس کی بردباری۔ اس کا استقلال بے عدیل و نظیر تھا۔ لیکن پھر بھی میاں کا سہارا اٹھ جانے اور ایک باعصمت پردہ دار خاتون ہونے کی وجہ سے اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کس طرح اس کے پاس پہنچ کے اسے تسکین دوں۔ اس لئے اپنی اور اس کی بے بسی پر دل کڑھتا اور آنسو امڈتے تھے۔

ساتھ ہی ہنسی بھی آتی تھی۔ اور وہ اس بات پر کہ یہی صابرہ خوشیاں منانے اور مجھے دولہا بنانے چلی تھیں۔ گویا اس صنفی لطافت و نزاکت کے با وجود آپ نے میرے لئے قسام ازل اور کاتب تقدیر سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا! ایک طرف ایک پری چہرہ کے دست سیمیں دوسری جانب مقدر کا فولادی پنجہ! پھر اس خیال پر بھی ہنسی آتی تھی کہ جہاں تک اس ہونے والے رشتہ کا تعلق تھا مجھے اس کے ٹل جانے سے خوشی تھی لیکن ادھر دوسری جانب خدا جانے کیا کیا چہ میگوئیاں ہونگی اور بہت ممکن ہے کہ ناکردہ کار حیو میرے سر منڈھی جانے والی تھی اپنے دل میں سلگتی اور کڑھتی ہو۔ اور اس مخمصے سے چھوٹنے پر اطمینان و امتنان کے جذبات۔ ادھر اس نئی رکاوٹ کے باعث ایک مست شباب حسینہ کے چہرے پر غم کے آثار!

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے دل میں سوائے ان جذبات کے اسوقت تک

کوئی اور خیال نہ آیا تھا۔ لیکن شام کو جب جاوید آئے اور اُن سے گفتگو ہونے لگی تو انہوں نے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا کہ جس سے میرے خیالات و جذبات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔ جاوید میری اور صابرہ کی حالت پر افسوس کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ دیر چپ رہے۔ پھر یکبارگی مسکرا کر بول اُٹھے۔ "ارے یار رشید تم بھی عجیب سودائی ہو۔ اب تو میدان صاف ہے۔ صابرہ بیگم تو اب تمہاری ہیں!"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جاوید نے میرے قلب پر اچانک خنجر کا وار کر دیا ہو۔ میری اور صابرہ کی محبت ایسی نہ تھی کہ میں اس کی مصیبت کے وقت ان لغویات پر غور کر سکتا۔ میں نے اسی لئے جاوید کو بہت ہی تیکھے تیوروں سے دیکھ کر کہا۔ "جب تمہیں شریفوں کے احساسات و جذبات کا علم نہیں ہے تو تم خاموش ہی رہنے کی کوشش کیوں نہیں کیا کرتے۔ جو بھی مہمل بات منہ میں آئی کہہ گزرے!

وہ کچھ شرمندہ و منفعل ہو کر اپنی صفائی میں بحث کرنے کے لئے تیار ہو گئے میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ "بہتر ہے کہ آپ اس وقت خاموش ہی رہیں ورنہ ممکن ہے کہ آپ پھر کوئی ایسی بے تکی بات کہہ دیں کہ میرے لئے اور بھی باعث آزار و تکلیف ہو۔"

انہوں نے آزردہ ہو کر مجھے دیکھا اور اُٹھ کر گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر تو میں ان کو چپکے چپکے خوب برا بھلا کہا کیا۔ پھر بدطینتی اور خود غرضی نے آہستہ آہستہ ان کی وکالت شروع کی۔ میں نے گھبرا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب میں لاکھ لمبے لمبے ڈگ لگاتا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا ہوں۔ مگر دماغ میں وہی ایک فقرہ گونج رہا ہے۔ "اب میدان صاف ہے۔ صابرہ بیگم اب تو تمہاری ہیں!"

شریف جذبات کہتے کہ اس طرح کا خیال بھی اس وقت دل میں لانا کمینہ پن ہے وہ تو میاں کے سوگ میں بیٹھی ہے۔ اسے اپنی خوشیوں کے پامال ہونے کا رنج ہے اور اپنے بچہ کی یتیمی کی اذیت ہے اور تمہیں اپنی خود غرضی سے ظاہر بظاہر نہ سہی مگر خفیہ طور پر مسرت ضرور ہے۔ نہ تو اس کی تکلیف کا خیال اور نہ اس کا دھیان کہ تم اسے کس طرح تسکین دے سکتے ہو بس اپنے حلوے مانڈے کی فکر ہے!

رذیل جذبات کہتے آٹھ برس تک بیٹھے رہے۔ زندگی برباد کی۔ اب جبکہ امید کی جھلک دکھائی دی تو خوش نہ ہونا اپنے کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اب اس ستارۂ امید کو بھی زبردستی اگنی بے تال سمجھ کر اس سے گریز کرنا شرافت و غیرت نہیں بلکہ خودکشی ہے اور نفس کا صریحی خون ہے۔ یہی کرنا تھا تو دنیاوی زندگی اور جد للیقا میں حصہ ہی کیوں لیا۔ راہب بن گئے ہوتے اپنی شخصیت ہی مٹا ڈالی ہوتی۔ اپنے کو اس طرح فنا کر دیا ہوتا کہ بجائے رشید کے خود بھی صابرہ ہو گئے ہوتے!

یہ طعن و تشنیع۔ وار اور رد۔ حملہ اور دفاع۔ میرے سینے کے اندر برابر جاری ہے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اس جنگ زرگری کو بند کیا اور صابرہ کو حسب ذیل تعزیت کا خط لکھا:۔

"میں تمہیں کس منہ سے تسکین دوں۔ نہ میں تمہارے گرد و پیش کے لوگوں سے واقف اور نہ ان واقعات کا مجھے علم جو تمہیں اسوقت پیش آ رہے ہوں گے۔ بے بس ہوں ورنہ تم تک کسی طرح پہونچتا اور اپنا خون بہاتا مگر تمہاری نرگسی آنکھوں سے آنسو نہ نکلنے دیتا۔ لیکن اگر کسی قسم کا کام ہو تو خدارا اپنے غلام کو نہ بھولنا۔ اسوقت یہ نہ سوچو کہ میں کیا ہوں۔ کون ہوں۔ بس اتنی سی بات یاد رکھو کہ خداوند عالم نے تمہاری خدمت کے لئے ایک مشین نما انسان بنا دیا ہے جو تمہاری خوشی کے سامنے دنیا میں کسی امر کی پروا نہیں کرتا۔

خدا ہی تمہیں صبر دے۔ یہ غم عورت کے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ خدا تمہارے بچہ کو اپنی حفاظت و امانت میں رکھے وہ ابھی اس نعمت کی قدر کیا جانے جو اس سے چھین لی گئی ہے۔ تمہیں اب باپ اور ماں دونوں کے فرائض ادا کرنے ہیں۔ ...... میں تمہارے احکام کا ہر وقت منتظر رہوں گا"۔

سابعہ نے اس خط کا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن دسواں۔ بیسواں چہلم وغیرہ جو نواب صاحب مرحوم کے لئے کیا گیا ان سب کی مجھے باقاعدہ اطلاع دی گئی اور میں ہر ایک رسم میں برابر شریک ہوا۔ اس آمد و رفت میں وہاں کے آدمیوں اور داروغہ وغیرہ سے ملاقات ہو گئی۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ نواب صاحب ... پانچسو کا وثیقہ تھا اور شہر میں چند مکانات بھی تھے جن سے خاصا کرایہ آتا تھا۔ جس مکان میں صابرہ مقیم تھی وہ پرانے محلوں کی شان کا تھا۔ مردانہ اور زنانہ حصہ علیحدہ علیحدہ کافی وسیع اور کشادہ لیکن چونکہ نواب صاحب کے

بڑے بھائی ابتک حیات تھے اس لئے یہ مکان دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک میں ان کے عیال رہتے تھے اور دوسرے میں صابرہ بیگم اور اُن کا بچہ۔

چہلم کے بعد عدہ کی مدت تک صابرہ کی والدہ بیٹی کے ساتھ مقیم رہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ مدت ختم ہوئی۔ انہیں اپنے ہمراہ لے کر اپنے گھر چلی آئیں۔ یہاں آنے پر صابرہ نے رسولن کے ذریعہ میرے پاس کہلایا۔ کہ مجھے اُن کے چچا سے مل کر تمام واقعات معلوم کر لینا چاہئے اور وثیقہ و مکان کا داخل خارج بچے کے نام کرا دینا چاہئے۔ نیز اس کی ولایت کے متعلق ساری قانونی کارروائی کر ڈالنا چاہئے۔ میں نے اس سلسلے سے صابرہ کے میکے میں آنا جانا شروع کیا۔ دو ایک بار تو صابرہ کے چچا بڑے صاحب کا درمیان رہا۔ پھر براہ راست صابرہ کے ہاں تمام قضیہ میں نے کہلانا شروع کیا۔ ادھر صابرہ کی سسرال والوں نے طرح طرح کے اُلجھاوے ڈالنا شروع کئے۔ بالآخر مقدمہ بازی تک نوبت آئی میں بحمدہ اس امر میں کامیاب رہا کہ میں نے نواب صاحب کا وثیقہ اور تمام املاک صابرہ کے بچے کے لئے بچالی اور صابرہ کو باقاعدہ اس کی ولیۃ الامر تسلیم کرالیا۔

ان تمام معاملات کے سلجھانے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگا۔ میری ہونے والی سسرال والے چونکہ صابرہ کے فریق مخالف کے ہمدردوں میں تھے اس لئے مجھے ان کے ہاں رشتہ سے انکار کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ اس کی اپیل اگر ہوسکتی تھی تو صابرہ ہی کے ہاں۔ لیکن اب وہاں تک ان لوگوں کی رسائی نہ تھی۔

ہمارے نجی معاملات اتنے ترقی پذیر ہوگئے تھے کہ زنانے اور مردانے حصے میں جو ٹیلیفون تھا مجھے اس پر عادتاً ہو کر ہر ہفتے مقدمات کے سلسلے میں صابرہ سے گفتگو کرنا پڑتی تھی۔ جس دن تک صاحب جج کی عدالت سے مقدمات کا آخری اور قطعی فیصلہ نہیں ہوگیا میں نے کوئی بات سوائے قانون۔ گواہ اور مقدمے کے نہیں کی۔ میں ایک وکیل تھا اور صابرہ موکلہ۔ لیکن...... جب میں نے صاحب جج کی زبان سے فیصلہ اپنے موافق سنا تو میں کچہری کے سارے کام چھوڑ کر سیدھا صابرہ کے مکان پہونچا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی اور صابرہ کے "ہلو" کہنے پر مبارکباد دی۔ وہ اپنے بچے کے حقوق کے محفوظ ہو جانے سے اسقدر خوش ہوئی کہ رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں رُک رُک کے بولی۔

"رشید صاحب آپ نے مجھ پر اور میرے بچے پر وہ احسانات کئے ہیں کہ ان کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا۔ "صابرہ غلاموں کا شکریہ نہیں ادا کیا کرتے"

وہ بے ساختہ بول اٹھی "بکل صاحب میں تو خود کو آپ کی کنیز سمجھتی ہوں آپ میرے محسن ہیں۔ میرے بچے کے محسن ہیں! البتہ اب غلام کا لفظ کبھی اپنے نام کے ساتھ نہ استعمال کیجئے گا۔ مجھے حد درجہ تکلیف ہوتی ہے"۔

میں نے کہا "بہت خوب۔ لیکن پھر تم بھی کبھی شکریہ کا لفظ میرے بارے میں منہ سے نہ نکالنا۔ اس سے بڑی غیرت آتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ میرا قانون پڑھنا اب جا کے ہوا"

صابرہ نے کہا "یہ آپ کی نیکی و شرافت ہے"

میں نے کہا "جی نہیں یہ میری خود غرضی و نفسانیت ہے"

صابرہ کے لب ولہجہ سے استعجاب کا پتہ چلتا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ کیونکر؟"

میں نے کہا "خود غرضی کا یہی تو تقاضا ہوتا ہے کہ جو کام کیا جائے وہ اس غرض سے کہ اس سے اپنی مصیبتیں گھٹیں۔ اپنی فکریں کم ہوں۔ اپنا درد دل کم ہو۔ اپنے قلب کو اطمینان وسکون حاصل ہو! میں نے بھی یہی کیا ہے اور صرف یہی جس کام سے تمہاری تکلیفوں میں کمی ہوسکے۔ جس سے تمہارے آلام دور ہوں۔ جس سے تمہارے آلام دور ہوں۔ جس سے تمہاری راحت میں اضافہ ہو۔ وہ میرے لئے سب سے زیادہ موجب انبساط ومسرت ہے۔ اس لئے میں نے جو کچھ اس معاملے میں کیا وہ محض اپنی ہی تکلیفوں کے کم کرنے کے لئے اور اپنی ہی مسرتوں میں اضافہ کی غرض سے یہ اگر خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں کسی پر احسان کیسا اور مفت مفت کے شکریہ کی کہاں گنجائش؟"

صابرہ دیر تک خاموش رہی۔ پھر رُک رُک کے بولی "تو پھر...... اتنی محبت...... اتنے ایثار کا...... کچھ تو عوض میری طرف سے بھی ہونا چاہئے!"

میں نے کہا "اگر معاوضہ ہی لینا ہے تو پھر منہ مانگا ہی لونگا"

صابرہ نے کچھ گھبرا کے کچھ ڈر کے پوچھا "وہ کیا ہے؟"

میں نے بہت ہی بیتابی سے کہا۔ "کیا آج آٹھ برس کی پرستش کے بعد بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ تم اور صرف تم!"

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر صابرہ آہستہ آہستہ بولی۔ "اگر آپ کی جگہ کسی دوسرے نے یہ بات کہی ہوتی تو شاید میں اس سے زندگی بھر کے لئے خفا ہو جاتی"۔

میں نے عرض کیا۔ "آخر اس خفگی کا نتیجہ کیا ہوتا؟ زائد سے زائد یہی کہ اس سے زندگی بھر نہ ملتیں۔ اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہ دیتیں۔ تو یہ غلام بہ ادب عرض کرے گا کہ خوشنودی کی حالت میں بھی تو اس پر یہ عتاب ہے۔ آخر خفگی و خوشی میں فرق کیا ہے؟"

پھر تھوڑی دیر سکوت رہا۔ اس کے بعد جواب ملا "اور یہ جو میں آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور..........."

جب وہ کہتے کہتے رُک گئی تو میں نے جواب دیا۔ "میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن شاید اتنا تو ہر موکلہ کو اپنے وکیل سے کرنا ہی پڑتا......"

صابرہ نے پوچھا "اسی خلوص سے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں ورنہ خلوص سے کام بھی نہ ہوتا!"

صابرہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔ صابرہ مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے کا نتیجہ! تم جانتی ہو کہ مجھے دنیا میں صرف ایک چیز کی خواہش ہے اور وہ تمہاری ذات ہے۔ مجھے نہ دولت کی ضرورت ہے۔ نہ عزت کی۔ نہ وجاہت کی۔ میرے لئے ساری کائنات سمٹ کر صرف ایک ذات میں محدود ہو گئی ہے۔ مجھے اگر وہ ذات نہ ملی تو میرے لئے زندگی ایک مستقل عذاب ہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی کے لئے نہ مجھے جہنم کا ڈر اور نہ جنت کی پروا!.........."

صابرہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "رشید صاحب میں نے مانا کہ آپ کو میری وجہ سے بڑی اذیتیں ہوئیں۔ مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ دین و ایمان سب بھول کر جہنم و جنت سب سے انکار کر کے کفر بکنے لگیں!"

میں نے غصہ میں کہا۔ "بیگم صاحبہ میں نے خدا اور رسول والی ہی بات کہی تھی جو آپ اس قدر برہم ہو گئیں کہ زندگی بھر کے لئے ناخوش ہونے کو تیار تھیں۔ کیا خدا نے بیوہ سے عقد کا حکم نہیں دیا ہے؟ کیا رسول اللہ نے خود اس پر عمل کر کے نہیں دکھا دیا ہے؟ لیکن آپ نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ سوائے ہندوستان کے کسی ملک میں اسے نہ معیوب سمجھتے ہیں اور نہ خلاف عقل و شرع........."

صابرہ نے پھر بات کاٹ کے پوچھا۔ "اور ہم لوگ اسوقت ہیں کہاں؟ ہندوستان میں یا کسی اور ملک میں؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں ہندوستان ہی میں ہیں۔ لیکن اب ہندوستان کے باشندے بھی نہ اسے معیوب سمجھتے ہیں اور نہ قابل مضحکہ۔ ہندوؤں نے یہ مذموم خیال اپنے دل سے نکال ڈالا۔ اب ان کے ہاں قابل شادی بیوائیں بٹھائی نہیں جاتیں اور نہ ان کے سر مونڈے جاتے ہیں!"

صابرہ نے کہا۔ "لیکن قابل شادی نا؟ یہاں قابل شادی کون ہے؟ جس کا کافی سن آچکا ہو ایک بچہ کی ماں ہو چکی ہو اور اپنے میں بڑھاپے کے تمام آثار پاتی ہو۔ وہ قابل شادی کیونکر ہو سکتی ہے؟"

میں نے کہا۔ "صابرہ خدا کے لئے ہارے ہوئے حریف کی طرح جھوٹ بولنے پر نہ اُتر آؤ۔ تم اپنے سن و سال کے متعلق اس شخص سے گفتگو کر رہی ہو جو ایک سال سے تمہارا وکیل ہے۔ اور آٹھ برس سے تمہارا عاشق ہے۔ کیا مجھے اتنا بھی حساب نہیں آتا کہ میں پندرہ میں آٹھ جوڑ لوں اور اپنی عمر میں بھی اتنے ہی برسوں کا اضافہ کر لوں؟ اگر تم اب ۲۳ برس کی ہوئیں تو میں بھی ۳۰ برس کا۔ پھر شادی سے اور سن سے کیا تعلق؟ کیا میری اور تمہاری محبت بھی بوالہوسی اور حیوانیت پر مبنی ہے کہ ہمارے عقد میں بھی جسمانی حیثیات و کیفیات کا لحاظ کیا جائے؟ صابرہ بیگم یہ جسم کی نہیں روح کی پیاس ہے یہ وہ پیاس ہے کہ اسے سوائے تمہارے سارے عالم کے دریاؤں کا پانی یہانتک کہ کوثر و تسنیم کا آبِ شیریں بھی نہیں بجھا سکتا!"

صابرہ نے کہا۔ "لیکن وہ چشمہ جس سے آپ سیراب ہونا چاہتے ہیں اب خشک ہو گیا!"

میں نے خوفزدہ آواز میں دریافت کیا۔ "کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں رہی؟"

صابرہ نے کہا۔ "میں نے شاید مثال دینے میں غلطی کی۔ چشمہ خشک نہیں ہوا ہے۔ بلکہ وہ اسقدر گندہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اب آپ کی پیاس بجھانے کے قابل نہیں رہا"

میں نے پوچھا "یعنی؟"

وہ بولی "یعنی یہ کہ میری محبت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی اور کی بیوی بننے کے بعد آپ کی بنوں"

میں نے پوچھا "یہ محبت کس کی۔ جس کی بیوی تھیں اس کی یا میری؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "آپ کی!"

میں نے کہا "تو یہ اظہار محبت کا بالکل ہی انوکھا طریقہ ہے چونکہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اس لئے میں ہمیشہ کے لئے محروم بنا دیا جاؤں"

صابرہ نے کہا۔ "جی نہیں یہ آپ کو ایک طرح کی خودکشی سے بچانا ہے!........"

صابرہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک معظمہ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً ادھر متوجہ ہوئی۔ اس لئے کہ کسی نے پوچھا "کون ہے بیٹا۔ وکیل صاحب؟"

صابرہ نے کہا "جی ہاں" انھوں نے کہا۔ "میری طرف سے ان کو دعا کہو"۔

میں ٹیلیفون سے سن رہا تھا۔ میں نے صابرہ کو پیغام کی زحمت سے بچایا اور خود اس سے تسلیم عرض کرنے کو کہا اور مقدمہ جیتنے کی مبارکباد دی۔ وہ خود ٹیلیفون لے کر دعا دے کے بولیں "خدا آپ کو بھی مبارک کرے۔ یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ آپ نے میرے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے محتاجی اور غریبی سے بچا لیا۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا ہم غریب دکھیاریوں کے پاس کیا ہے جو ہم اس کا بدلہ کر سکیں مگر میں اتنا ضرور کہونگی کہ اگر صابرہ اور اس کا لڑکا شریف ہے تو دونوں یہ احسان کسی وقت نہ بھولیں گے اور جان و مال عزت و آبرو کسی چیز سے آپ کے معاملے میں دریغ نہ کریں گے"۔

میں نے عرض کیا۔ "یہ آپ کیا فرماتی ہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

وہ بولیں "میاں یہ تمہاری شرافت ہے کہ تم ایسا کہتے ہو۔ مجھے تو جہاں تک معلوم ہے۔ تمہیں شاید ابتک کوئی فیس بھی نہیں دی گئی ہے"۔

بظاہر معظمہ نے صابرہ سے اس کی تصدیق چاہی اس لئے کہ وہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ امی میں تو کہتے کہتے تھک گئی۔ اب آپ بھی ارشاد فرما کے دیکھ لیجئے"

معظمہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "کیوں میاں میں یہ کیا سنتی ہوں کہ تم فیس نہیں لینا چاہتے؟"

میں نے حجاب و شرم کو بالائے طاق رکھ کر موقع سے فائدہ اٹھایا اور عرض کیا۔ "بیگم صاحبہ یہ کس نے کہا کہ میں فیس نہیں لینا چاہتا میں تو حضور خود مانگ رہا ہوں۔"

وہ بولیں "صابرہ کہتی ہے میں فیس دینا چاہتی ہوں۔ وہ نہیں لیتے"

میں نے عرض کیا۔ "جی ان کا بھی فرمانا ایک حد تک صحیح ہے اور جو کچھ میں نے عرض کیا وہ بھی صحیح ہے"

وہ بولیں "بھئی میں یہ پہیلی نہیں بوجھی۔ وہ بھی سچی آپ بھی سچے۔ وہ کہتی ہے آپ فیس نہیں لیتے آپ کہتے ہیں میں مانگ رہا ہوں وہ نہیں دیتیں۔ آخر یہ معمہ کیا ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "بیگم صاحبہ آپ نے ابھی ابھی عزت افزائی اور بندہ نوازی سے یہ فرمایا تھا کہ تو نے وہ کام کیا ہے کہ صابرہ بیگم اور ان کے صاحبزادے کو چاہئے کہ وہ تیرے لئے جان و مال عزت و آبرو تک سے دریغ نہ کریں"۔

وہ فرمانے لگیں "میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو شریف نہیں۔ جس شخص نے کہ ایک سال سے اپنا خون پانی ایک کر دیا ہو۔ اپنے پیشہ کا کام ان کے پیچھے خراب کر دیا ہو۔ دنیا بھر سے ان کے کارن دشمنی مول لی ہو جس نے ویسی ہمدردی کی ہو جیسی سگا باپ اور حقیقی بھائی مشکل سے کرتا ہو۔ اس کا احسان بھول جانا کمینوں کا کام ہے شریفوں کا نہیں"۔

میں نے کہا۔ "تو معظمہ اس طرح کے کام کی فیس تو صابرہ بیگم نہیں ادا کر سکتی ہیں حضور ہی عطا فرما سکتی ہیں"

وہ بہت ہی سادگی سے بولیں۔ "تو میاں تم بتاؤ تو سہی آخر کیا فیس ہوئی میں ہی ادا کرونگی۔ تم میرے ہی ہاتھوں لینا"

میں نے رکتے رکتے عرض کیا۔ "تو حضور میں تو اپنی محنت کی فیس یہی سمجھتا ہوں کہ حضور مجھے اس کا حق عطا فرمائیں کہ میں تا عمر اسی طرح آپ کی صاحبزادی اور آپ کے نواسے کی خدمتیں کرتا رہوں"

وہ بیچاری اس گھماؤ کی بات کو نہ سمجھیں۔ گھبرا کے بیٹی سے پوچھنے لگیں کہ "یہ وکیل صاحب کیا فیس مانگتے ہیں۔ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔

وہ بولیں۔ "امی ٹیلیفون پر آپ سے انہوں نے کیا کہا۔ میں اسے کیا جانوں۔ آپ انہیں سے پوچھئے وہ خود ہی اپنا مطلب بتائیں گے"

جتنی دیر میں ماں بیٹی میں گفتگو ہوئی اتنی دیر میں میں نے جملہ ذہن میں ترتیب دے لیا تھا اس لئے قبل اس کے کہ بیگم صاحبہ مجھ سے کچھ پوچھیں میں نے عرض کیا۔ "جناب معظمہ نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور اپنے اس غلام کو اپنی فرزندی میں لے لیں"

بیگم صاحبہ میرا یہ فقرہ سنتے ہی ساکت ہو گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سکوت کا باعث استعجاب تھا یا غصہ۔ البتہ میری حالت یہ تھی کہ پنکھے لگے تھے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا دیکھئے اتنے دنوں کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے یا سوکھے دھانوں پانی پڑتا ہے۔ ساری ساری عمروں کا اضطراب چند لمحوں میں آکے جمع ہو گیا تھا میں نے پیشانی سے پسینہ پوچھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ شاید حشر کے دن قبل فیصلہ یہی کیفیت ہوگی! ـــــ بارے مہر سکوت ٹوٹی۔ بیگم صاحبہ آہستہ آہستہ بولیں"

"میاں تم نے اس وقت اچانک ایسی خواہش پیش کر دی جو خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ میں بڑے سوچ میں پڑ گئی کہ تمہیں کیا جواب دوں"۔

میں نے جلدی سے عرض کیا کہ "حضور میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے اسوقت جواب مل جائے حضور میری ذات میرے خاندان کے متعلق فرمالیں۔ میرے چال چلن کی تحقیق کر لیں۔ . . . ."

وہ بولیں۔ "نہیں میاں تمہارے چال چلن۔ تمہاری شرافت اور نیکی سے کون واقف نہیں ہے۔ پھر پڑھے لکھے۔ دال روٹی سے خوش اللہ رکھے تم ہو ہی۔ مجھے ان باتوں کی فکر نہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اب صابرہ کنواری بن بیاہی نہیں ہے۔ بیوہ بچے والی ہے اب اس کی خواہش و رضامندی ضروری ہے۔ ذرا اس کا عندیہ لے لوں اور دوسرے اعزا سے پوچھ لوں . . . ."

میں نے کہا۔ "تو مجھے اس وقت اجازت دیجئے۔ پھر انشاء اللہ ضرورت ہوگی تو حاضر ہوں گا"

انہوں نے فرمایا "اچھا خدا کو سونپا۔ سدھارو" میں نے تسلیم کی اور وہاں سے چلا آیا رات کو رسولن ایک خط لے کر آئی۔ صابرہ نے لکھا تھا۔

"یہ آخر آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے کہ دوستی اور دشمنی کی باتوں میں فرق نہیں سمجھا جاتا۔ اور اپنی دھن میں چھوٹے بڑے کی تمیز بھی کھو بیٹھے۔ امی سے بھلا اس طرح کی خواہش کا کیا موقع تھا۔ وہ میرا بھلا دیکھیں گی یا آپ کا؟ میں آپ سے منت کرتی ہوں کہ اب سے اپنے خیال سے باز آیئے۔ میں ڈھلتی ہوئی دھوپ ہوں جس میں نہ آپ کو کوئی چمک دمک نظر آئے گی اور نہ کسی قسم کی گرمی محسوس ہوگی۔ میرے ہاں اچھی طرح خزاں آچکی ہے۔ آپ کے ابھی بہار کے دن ہیں۔ اپنی جوانی پر رحم کیجئے اور اس خیال بد کو دل سے نکال ڈالئے"۔

میں نے جواب میں لکھا۔

"مجھے ڈھلتی ہوئی دھوپ اور خزاں یافتہ بہار پسند ہے خود میری محبت میں اتنی حدت ہے کہ وہ ہر وقت کے سارا مخزن جلا سکتی ہے۔ میرے دل کی آگ تو تم ہی ہو جو برف کی قاش میں بھی حرارت پیدا کر سکتی ہے!

صابرہ بیگم صاحبہ! آپ میری ناصح مشفق نہ بنیں بلکہ اس محبت کا مظاہرہ فرمائیں جس میں علیحدگی جدائی

جگہ اتحاد و اتصال کی خواہش کی جاتی ہے۔ میں
صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر اب بھی
انکار کیا گیا تو مجھے اس امر کا یقین آ جائے گا کہ میں
آج ہی نہیں بلکہ پورے آٹھ سال سے بیوقوف
بنایا جا رہا ہوں اور پژمردہ کلیوں کے تحفے نے جس
امید کو ہر سال تازہ کیا تھا وہ محض موہوم تھی۔
اس یقین کے بعد میرا کیا حال ہو گا اس کا علم خدا ہی کو
ہے۔ ابھی تک تو خیال تھا کہ "بریں زلیستم و بریں
بگذرم" لیکن جب یہ امید بھی جاتی رہے تو میری
حالت اس عمارت کی ہو گی جس کا ستون اچانک
گرا دیا جائے اور جس کی بنیاد کھود کر پھینک دی جائے
لہذا بے زیادہ دل نہ دکھایئے! ع
"رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے!"

اس خط کا کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن تیسرے دن بیگم صاحبہ کی مہری ایک
خط لے کر آئی۔ لکھا تھا۔

"جس رشتے کی خواہش کی تھی وہ مجھے اور تمام اعزا کو دل و
جان سے پسند ہے۔ مگر صابرہ نہ سر سے کھیلتی ہے
اور نہ منہ سے بولتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں
کیا کروں"

میں نے مہری سے کہا کہ "اچھا تم جاؤ میں جواب بھیجدوں گا اور
صابرہ کو خط لکھا۔

"بیگم صاحبہ کی رضامندی کا صحیفہ آ گیا۔ لیکن آپ کے
ہاں ابھی وہی ضد جاری ہے۔ خیر میں نے بھی
فیصلہ کر لیا ہے۔ آج آپ کے سارے پچھلے
خطوط اور ہر سال کی پژمردہ کلیاں اسی
لفافہ میں ارسال ہیں یا تو آپ ان کی عوض
ایک تازہ پھول بھیجکر میری استدعا قبول
فرمائیں گی یا پھر اپنے سکوت سے اس امر کو
واضح فرما دیں گی کہ میری زندگی کا سب سے
بہتر و شیریں خواب منت کش تعبیر نہ ہو گا!
میں ۲۴ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس طرح
روپوش ہو جاؤں گا کہ انشاءاللہ تمام عمر آپ کو
پتہ بھی نہ مل سکے گا۔"

کچھ ہی دیر بعد جواب آیا۔ "آپ ننھے نہ ہوں پھول
جاتا ہے۔ مگر باسی ہے!

میں نے بڑی سرمستی و خوشی سے لکھا! "کچھ پروا نہیں۔ میں
اسی پھول کو خون دل سے سینچکر پھر تازہ کر لوں گا!

اسی دن بیگم صاحبہ کو بھی اطلاع ہو گئی۔ اور......
......اور ...... آج تک وہ پھول میری دستار کی
زیب ہے اور بحمدہ ابتک تر و تازہ ہے!

ان کے گلے کے باسی ہار دیتے ہیں بنے جانفزا
جن پر خزاں ہی آ چلی ہیں وہی گل بہار پر!

....

....

.... (ادب).

کلام نواب

(مسٹر ایم۔ آر۔ نواب دہلوی)

عبث ہے ناصح یہ سر کھپانا کہے کا تیرے اثر نہیں ہے
بھلے برے کو وہ خاک سمجھے جسے خود اپنی خبر نہیں ہے

ستم یہ ان کا ہے یا کرم ہے ہمیں کچھ اس کی خبر نہیں ہے
ہو جس میں احساس رنج و راحت وہ دل نہیں وہ جگر نہیں ہے

نگاہ تم سے ٹلی ہے جب سے ہوا ہے بیگانہ خو زمانہ
یہ دل بھی اپنا نہیں ہے اپنا جگر بھی اپنا جگر نہیں ہے

کہاں تک آخر اٹھائے صدمے یہ دل ہے آخر نہ سمجھو پتھر
یہ شامِ غم شامِ زندگی ہے جہاں میں اس کی سحر نہیں ہے

طبیب ساکت رفیق صامت مریضِ فرقت کی غیر حالت
دوا میں کوئی شفا نہیں ہے دعا میں کوئی اثر نہیں ہے

رہِ عدم پر چلا ہوں تنہا ترے کرم کا ہے بس سہارا
کٹھن یہ رستہ ہے دور منزل پھر اس پہ زادِ سفر نہیں ہے

نصیب کو ہم جگا رہے تھے نصیب جاگا تو سو گئے خود
ہوئے ہیں پرسانِ حالِ دل وہ تو اب ہمیں کچھ خبر نہیں ہے

خدا کا شاکی عبث ہے ناداں قصور ہے یہ تری سمجھ کا
دعا میں بیشک اثر ہے لیکن زباں میں تیری اثر نہیں ہے

خدا ہی جانے مآل کیا ہو سمجھ میں نوابؔ خاک آئے
کہاں ہے جانا کدھر چلا ہوں جنوں میں اتنی خبر نہیں ہے

چیخوف کے خطوط گورکی کے نام

چیخوف کے خطوط کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ہم وہ مکتوب جو گورکی کے نام لکھے گئے ہیں۔ یہاں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے قارئین انہیں دلچسپ پائیں گے۔

یالٹا۔ ۳ر دسمبر ۱۸۹۸ء

سلہ ...... آپ اپنے افسانوں کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ میری رائے؟ ...... آپ بلا شبہ نہایت بلند ذکاوت کے مالک ہیں۔ مثال کے طور پر "دشت کی رات"سلہ میں یہ ذکاوت اس غیر معمولی قوت سے ظاہر کی گئی ہے کہ میں یہ افسانہ مطالعہ کرنے کے بعد رشک محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے قلم سے نہیں ہے۔۔۔ آپ آرٹسٹ ہیں اور نہایت ہوشمند انسان۔ آپ کا "احساس" باعظمت ہے۔ آپ ہیئت گر (Plastic) ہیں۔ یعنی جب آپ کسی چیز کو بیان کرتے ہیں تو آپ اسے دیکھتے ہیں اور ہاتھوں سے چھوتے ہیں یہ فن صحیح ہے۔ یہ ہے میری رائے آپ کے متعلق اور میں خوش ہوں کہ میں اسے ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں دوبارہ کہتا ہوں کہ میں بہت مسرور ہوں۔ اگر ہمیں ایک دوسرے سے ملنے اور ایک دو گھنٹے گفتگو کرنے کا موقع ملے تو آپ یقیناً معلوم کر سکیں گے کہ میرے دل میں آپ کی کس قدر وقعت ہے اور آپ کی ذکاوتِ طبع سے میں نے کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

کیا مجھے چند خامیوں کا تذکرہ کرنے کی اجازت ہے؟ مگر یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ کسی کے جوہر کی خامیاں نکالنا اس عظیم الشان درخت کی خرابیاں بیان کرنے کے مرادف ہے جو باغ میں اُگ رہا ہو۔ اس وقت زیر غور چیز درخت نہیں ہوتی بلکہ اس شخص کا مذاق جو اس درخت کو دیکھ رہا ہے۔ کیا میں صحیح نہیں کہہ رہا ہوں؟

میری رائے میں آپ بقدر کفایت ضبط کام میں نہیں لاتے آپ تھیٹر میں ایک ایسے تماشائی کے مرادف ہیں جو اپنے وجد کا اس بے پرواہ انداز میں اظہار کرتا ہے کہ نہ تو وہ خود سن سکتا ہے اور نہ دوسروں کو سننے دیتا ہے۔ ضبط کا یہی فقدان نیچر کو بیان کرنے کی تفصیلات میں عام ہے۔ یہ آپ کے مکالموں میں مخل ہوتا ہے۔

نزاکت۔ غدوبت۔ طراوت۔ اور سرگوشیوں کا عام تذکرہ ان تفصیلات کو یک آہنگی اور عامیانہ رنگین کلامی کا رنگ چڑھا دیتا ہے یہ چیز قارئین کو اچاٹ اور بد دل کر دیتی ہے۔

یہ فقدانِ ضبط عورتوں سے متعلق تفصیلات میں بھی جھلکیاں لیتا ہے۔ اسے شبابِ فکر یا وسعتِ نظر نہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ محض عامیانہ پن ہے آپ کے افسانوں میں ایسے الفاظ کا کثرت سے استعمال پایا جاتا ہے جو اس قسم کی تحریروں میں بالکل نامناسب ہیں۔ یہ الفاظ خوبصورتی کو مسخ کر دیتے ہیں۔ آپ اکثر لہروں سلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں

سلہ یہ خط لکھتے وقت چیخوف کی عمر ۳۸ برس کی تھی اور گورکی ۲۹ برس کا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں گورکی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا اور اس نے چیخوف سے اپنے افسانوں کے متعلق رائے دریافت کی تھی +

سلہ "روسی افسانے" میں جو راقم کی مرتب کردہ کتاب ہے یہ افسانہ شامل ہے +

سلہ گورکی کے بیشتر افسانوں میں لہروں کا ذکر عام ہے ہم یہاں چند افسانوں سے مثال کے طور پر کچھ جملے پیش کرتے ہیں +

.... یہاں سمندر کی آزاد لہریں سنگین دیواروں میں قید اور بھاری وزنوں کے نیچے دبی ہوئیں جھاگ بن کر اپنی چھاتی کوٹتی ہیں۔ شکایت کرتی ہیں (از چلکاش)

...... ہم نے الاؤ روشن کیا اور اس کے قریب لیٹ گئے۔ رات بہت شاندار تھی

تعلیم یافتہ کرداروں سے متعلق تفصیلات میں ایک قسم کا کھنچاؤ پایا جاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ نے تعلیم یافتہ طبقے کا اچھی طرح مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ آپ ان افراد کو بخوبی جانتے ہیں۔ لیکن آپ قطعی طور پر اس راستے سے آشنا نہیں ہیں جو ان کی صحیح نفسیات کی طرف لے جاتا ہے۔

آپ کی عمر کیا ہے؟ — میں آپ کو نہیں جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور کون ہیں۔ بہرحال میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ جو ابھی جوان ہیں۔ نزہنی[1] نوگورڈ چھوڑ کر دو ایک برس کے لئے ادب کا بنظر غائر مطالعہ کرنا اور اکثر وقت انشاپردازوں کی صحبت میں رہنا سزاوار ہے۔

اس لئے نہیں کہ آپ بھی ان کی طرح گائیں کا ئیں سیکھیں بلکہ صرف اس لئے کہ بحر ادب میں غوطہ لگا کر آپ اس کی لہروں کے دام الفت میں گرفتار ہو جائیں۔

یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ شہری زندگی انسان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیتی ہے۔ ..... کارنلکو[2]۔ پوٹا نیلو۔ مامن۔ اور آرٹل بہت شاندار لوگ ہیں۔ شروع شروع میں شاید آپ انہیں بالکل غیر دلچسپ پائیں گے۔ لیکن بعد ازاں ایک دو سال کے عرصے میں آپ ان سے مانوس ہو کر ان کی صحیح قدر و منزلت کا اعتراف کرلیں گے۔ ان کی صحبت آپ کے لئے یقیناً مفید ثابت ہو گی۔

"انطون چیخوف"

یالٹا۔ ۲ر جنوری ۱۸۹۹ء

— معلوم ہوتا ہے آپ نے میرا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ میں نے اپنے خط میں خامہ کاری کے متعلق نہیں لکھا تھا۔ میرے پیش نظر غیر روسی الفاظ کا نامناسب استعمال تھا۔ دوسرے انشا پردازوں کی تحریروں میں اس قسم کے غیر مانوس الفاظ نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کے ادبی پاروں میں جو موسیقی اور ہم آہنگی کا اجتماع ہوتے ہیں۔ آپ کے قلم کی معمولی سے معمولی خام جنبش بھی پوری آواز میں چلا اٹھتی ہے

کیا آپ کی تعلیم و تربیت خود اپنے ہاتھوں کی رہینِ منت ہے؟

آپ کے افسانے اس امر پر شاہد ہیں کہ آپ مکمل آرٹسٹ ہیں اور حقیقی معنوں میں ایک متمدن فنکار۔ کسی حد تک "خامکاری" آپ کی خصوصیت ہے۔ آپ عاقل ہیں۔ آپ کے احساسات نکتہ رس اور لطیف ہیں۔ آپ کی ذکاوت طبع "In the Steppes" اور "On the Rafts" میں نمایاں طور پر جلوہ فگن ہے۔ یہ دونوں افسانے

---

[1] گہرے سبز سمندر کی لہریں نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ قریب ہی کوئی خوش گلو پرندہ راگ الاپنے میں مصروف تھا۔ اس کی نقرئی آواز فضا میں جو لہروں کے تھپیڑوں کی دھیمی اور دلنواز صدا سے معمور تھی آہستہ آہستہ حل ہوتی معلوم ہو رہی تھی (از مائی فیلو ٹریولر) موسم بہار کی سورج کی کرنیں بادلوں سے چھن چھن کر لہروں پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں (از آن اے رافٹس)

[1] گورکی کی جائے پیدائش نزہنی چھوڑ کر وہ عرصے تک روس کی سرحدوں پر آوارہ پھرتا رہا۔ ۱۸۹۰ء میں وہ نزہنی میں رنگروٹ بھرتی ہونے کیلئے آیا مگر اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ [illegible] اپنا قلم اٹھایا۔ کچھ عرصے کے بعد جب [illegible] وہ دوبارہ نزہنی میں داخل ہوا * یہیں سے پھر اس نے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا۔

[2] چیخوف کے ہمعصر ادبا۔ ولیڈیمیر کارولنکو۔ جنوب مغربی روس میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا روس کے دیگر ادبا کی طرح کارولنکو بھی حصول تعلیم میں سیاسی وجوہ کی بنا پر [illegible] سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اسے ماسکو کے زراعتی سکول کو خیرباد کہنا پڑی اور چھ سال کے طویل عرصے تک سائبیریا میں زندگی بسر کرنا پڑی۔ اس زمانہ اسیری کے بعد وہ موضع نزہنی میں اقامت پذیر ہوا۔ جہاں وہ ایک رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ کارولنکو چیخوف کا دوست تھا۔ گورکی سے اس کی ملاقات نزہنی میں ہوئی۔

آئی این۔ پوٹا پنکو۔ چیخوف کے ملنے والوں میں سے تھا۔ اس کی تحریریں ہم تک بہت کم پہنچی ہیں

ڈی این مامن سبیریاک (۱۸۵۲ء – ۱۹۱۲ء) افسانہ نویس جس کی بیشتر تحریریں (Urals) کی کانوں کے مزدوروں کی پُر از مصائب زندگی کی دردناک داستانیں ہیں۔

الیگزانڈر ارٹل: (۱۸۵۵ء – ۱۹۰۸ء) مشہور روسی افسانہ نگار ہے۔ اس کے یہ ناول (Their enimies) اور (Their friends) اچھی ادبی شہرت رکھتے ہیں خاصکر اس کے لئے یہ چیز قابل فخر ہے کہ طالسطائی نے اس کی ایک کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ طالسطائی اس کی تعریف میں کہتا ہے "جو لوگ روسیوں کی زبان سیکھنا چاہتے ہیں وہ ارٹل کی تصانیف کا مطالعہ کریں" غالباً یہی وجہ تھی کہ چیخوف نے گورکی کو اس سے ملاقات کرنے کے لئے کہا۔

فی الواقع صنعت کے بلند مرتبت پا رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ چیز روشن ہوتی ہے کہ آپ نے کسی نہایت اچھی تعلیم گاہ میں دن گذارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں یہ کہتے وقت غلطی نہیں کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی تصانیف میں کوئی نقص ہے تو وہ فقدانِ ضبط اور لطافت کی کمی ہے۔

کسی خاص مقصد کے لئے کم از کم نقوش کا استعمال یہ ہے لطافت۔ آپ کا اسراف ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔

آپ کی نیچر سے متعلقہ تفصیلات صناعانہ ہیں۔ آپ فی الواقع لینڈ سکیپ پینٹر ہیں۔ لیکن ان تفصیلات میں بے جان اشیاء کو جاندار ظاہر کرنے والے استعارات کی فراوانی مثال کے طور پر سمندر رمانس لیتا ہے۔ آسمان دیکھتا ہے۔ جنگل دلنوازی کرتا ہے۔ نیچر سرگوشیاں کرتی ہے۔ روتی ہے۔ بولتی ہے اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ اس قسم کے فقرے یک آہنگی اور تکرار پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ تحریر کی لطافت کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔

نیچر کے بیانات میں رنگ اور اظہار۔ صرف سادگی یعنی اس قسم کے سادہ جملوں مثلاً "سورج غروب ہوا" "تاریکی چھا گئی۔ بارش گرنا شروع ہوئی" — سے پیدا ہوتے ہیں — یہ سادگی آپ کی جبلت میں داخل ہے جو دیگر افسانہ نویسوں کے یہاں نہیں ملتی۔

اب کچھ سیاحی اور خانہ بدوشی کے متعلق۔ سیاحی نہایت دلفریب اور خوشگوار ہے مگر کچھ عرصے کے بعد انسان اس سے اکتا جاتا ہے اور انجام کار ایک جگہ مستقل اقامت اختیار کر لیتا ہے۔ ادبی پیشہ بجائے خود ہی ہمارا خون چوس لیتا ہے۔ ناکامیوں اور یاس میں وقت بہت جلد گذرتا ہے۔ ان کی موجودگی میں حقیقی زندگی دیکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے — ماضی جبکہ میں آزاد تھا ابھی سے میری ملک معلوم نہیں ہوتی بلکہ اسپر کسی غیر کا قبضہ ہے۔

-چیخوف

ماسکو ۲۵ اپریل

...... اتوار سولہ اپریل۔ ایل۔ این طالسطائی[1] کے پاس تھا انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ "آپ بلند مرتبت افسانہ نویس" ہیں۔ وہ آپکے یہ دو افسانے [illegible] "ادب" "[illegible]" بہت پسند کرتے ہیں۔ لیکن انہیں "ماؤ" ناپسند ہے وہ اس کے متعلق کہتے تھے کہ "انسان جو جی چاہے تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن وہ نفسیات اختراع نہیں کر سکتا۔ گورکی کی تحریروں میں "نفسیاتی اختراعات" ملتی ہیں۔ وہ ایسی چیزیں بیان کرتا ہے جو اس نے کبھی محسوس نہیں کی ہوتیں۔"[2] سمجھے آپ!

میں نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ ماسکو تشریف لائیں تو ہم اکٹھے ییرنکو لسوغ کے یہاں چلیں گے۔

"چیخوف"

یالٹا ۳۔ ستمبر ۱۸۹۹ء

...... ایک اور نصیحت ملحوظ خاطر رہے۔ اپنی تصانیف کے پروف پڑھتے وقت جہاں تک ممکن ہو سکے آپ "اسم" اور "فعل" کی تفصیلات کاٹ دیا کریں۔ آپکے یہاں تفصیلات کی اسقدر فراوانی ہے کہ قارئین کے لئے ان کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور انجام کار وہ اکتا جاتا ہے۔ میرا یہ جملہ قابل فہم ہے — "ایک آدمی گھاس پر بیٹھا"۔ یہ اس لئے قابل فہم ہے کہ یہ صاف ہے اور قارئین کی توجہ میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ دوسری طرف اگر میں یہ لکھوں کہ "ایک لانبا۔ چھوٹی چھاتی والا۔ متوسط قد آدمی جس کی داڑھی خاکستری رنگ کی تھی سبز گھاس پر جو راہ گذروں کے پاؤں تلے کچلی ہوئی تھی نہایت خاموشی اور خوف زدہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بیٹھا" — تو یہ جملہ یقیناً قارئین کے ذہن پر گراں گذرے گا۔

...... یہ الفاظ ذہن میں فوراً نہیں آ سکتے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ افسانہ نویس کے الفاظ فوراً قارئین کے ذہن پر منتقل ہو جائیں۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ فطرتاً مائل بہ سرود ہیں۔ آپکی روح نازک ترین آب و گل سے تخلیق ہوئی ہے۔ خامہ نگاری۔ بیباکی۔ شور آفرینی۔ ان تینوں چیزوں سے آپ کی ادبی شاہراہ بیگانہ ہونی چاہئے

"چیخوف" مترجمہ "سعادت حسن منٹو"

---

[1] مشہور و معروف افسانہ نگار طالسطائی جس کی یہ تصانیف بہت مشہور ہیں (Anna Karenina) اور (War and peace) (Yasnaya Polyana) طالسطائی کی علالت کی وجہ سے [illegible] یعنی اپنا ملک چھوڑ کر تبدیلی آب و ہوا کی خاطر یالٹا جانا پڑا۔ یہاں ان کی صحت کسقدر اچھی ہو گئی چیخوف۔ ماسکو سے انکی مزاج پرسی کیلئے جایا کرتا تھا کچھ عرصے کے بعد گورکی اور چیخوف دونوں یالٹا میں چلے آئے۔ اب ان کا اکثر وقت اس عظیم مفکر کی صحبت میں گذرتا تھا۔

[2] طالسطائی اس دماغی تخلیق کو [illegible] تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہے جس کے خالق نے بغیر محسوس کئے

اعجازِ سخن

سو طرح گرفتار ہے دل اس کی ادا کا
شوخی کا، شرارت کا، تبسم کا، حیا کا

کتنا کفِ قاتل پہ کھلا خون شہدا کا
ممنون نہیں تا روزِ ابد رنگِ حنا کا

جو آنکھ بہ آغاز محبت تھی فسوں ساز
منظر نہیں کچھ سکتا ہے اس چشم حیا کا

کشکولِ نگہ دولت دیدار سے پُر ہے
پھر عرش پہ ہے آج دماغ ان کے گدا کا

مرجائیں نہ کیوں جب تری آنکھوں میں جھلک جائے
ہائے وہ تبسم کہ ہے پروردہ حیا کا

اے ماہ جبیں! دیکھ کے گردوں پہ مہِ عید
اٹھنا بھی کوئی دیکھے ترے دستِ دعا کا

اک شمع تھی سو گل ہوئی اب خاک اڑے گی
پھر زور بندھا گورِ غریباں پہ ہوا کا

ہوں رندِ بلانوش میں، لا رطلِ گراں دے
کیا چیز غمِ دہر ہے کیا خوف فنا کا

وہ تند شناور ہوں کہ ہمت کو ہے جس کی
کچھ بیمِ تلاطم نہ حذر موجِ بلا کا

کرتی ہے تری یاد یونہیں دل کو فرحناک
جس طرح علی الصبح کوئی جھونکا صبا کا

کھولے ہوئے بالوں کو وہ نکلے پئے ماتم
اے چشم ذرا دیکھ یہ منظر بھی عزا کا

صد حیف کل اس شوخ نے پتھر پہ دے مارا
اعجاز وہ شیشہ کہ تھا پیمان وفا کا

سعید احمد اعجاز

ساحرہ

(شہرۂ آفاق روسی افسانہ نگار چیخوف کا ایک دلچسپ افسانہ)

رات کی تاریکی چھا رہی تھی کلیسا کا محافظ سیفلے گیکن اپنی جھونپڑی میں
جو گرجا کے ساتھ ملحق تھی۔ اپنے لمبے چوڑے بستر پر دراز تھا۔ گو اسے مرغیوں کی
طرح جلد سو جانے کی عادت تھی۔ مگر وہ ابھی بیدار تھا۔ اس کے سرخ اور بکھرے
ہوئے بال میلے کچیلے لحاف سے باہر نکلے ہوئے تھے اور بھاری غلیظ پاؤں
دوسری طرف سے نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ سننے میں مصروف نظر آتا تھا اسکی
جھونپڑی اس دیوار سے ہم کنار تھی جو کلیسا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔
اس کے دریچے میدان کی طرف کھلتے تھے۔ باہر میدان میں ایک ہنگامۂ کارزار
برپا تھا۔ یہ معلوم کرنا کہ کس کی ہستی صفحۂ گیتی سے نابود کی جا رہی ہے۔ یا کس کی
تباہی کے لئے قدرت اس قدر مضطرب و ہنگامہ آرا ہے بہت دشوار تھا لیکن
پھر بھی پیہم چیخ و پکار سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور گرفتار بلا ہے ——
میدان میں کوئی فاتح لشکر پورے جوش و خروش سے اپنی سرگرمی کا مظاہرہ کرتا
معلوم ہوتا تھا۔ تند ہوائیں جنگل، اور کلیسا کی چھت سے دست و گریباں ہو رہی
تھیں۔ اور کھڑکیوں کو اپنے گھونسوں کا تختۂ مشق بنا رہی تھیں اور اپنے
مہیب پنجوں سے ہر چیز کے بخیئے ادھیڑنے میں مصروف تھیں۔ اسی محشر خیز فضا
میں محسوس کسی مفتوح کی رقت انگیز آہ و زاری اور نالہ و بکا کی صدا آ رہی تھی ..
چھت۔ آتش دان یا دریچے میں کوئی غیر مرئی چیز سسکیاں بھر رہی تھی،
یہ صدا کسی مدد کی طالب معلوم نہ ہوتی تھی۔ بلکہ انتہائی صدمے کی ایک مایوس
چیخ تھی جو اس بات کی مظہر تھی کہ اب وقت گزر چکا ہے اور تلافی کا خیال عبث ہے۔
برفانی تودوں پر یخ کی باریک چادریں بچھی تھیں۔ ان پر اور درختوں
کے پتوں پر آنسوؤں کے قطرے تھرتھرا رہے تھے سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر
کیچڑ اور پگھلتی ہوئی برف کا سیلاب کروٹیں لے رہا تھا۔ قصہ مختصر یہ منظر سخت
ہولناک تھا۔ مگر شاید افلاک کی نظروں سے ظلمت شب نے اس بلا خیز طوفان
کو اوجھل کر رکھا تھا کہ وہ بدستور برف باری میں مشغول تھے۔ ہوا کسی مجنون کی طرح
دہاڑ رہی تھی۔ جو برف کے گالوں کو ہر طرف آوارہ و پریشان کر رہی تھی۔

سیفلے نے ان طوفانی آوازوں کو سنا اور بہت متفکر ہوا۔ بات
دراصل یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ یہ تمام ہنگامہ کسی کے دست قدرت کا متحرک
ہے۔ بہرحال اسے اس بارے میں شبہ ضرور تھا۔ اس نے لحاف کے اندر
غصے میں اپنی انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے اس کی وجہ اچھی طرح معلوم ہے"

کھڑکی کے پاس محافظ کی بیوی رئیسہ نلونا ایک اسٹول پر بیٹھی
ہوئی تھی۔ ایک دوسرے سٹول پر لالٹین پڑی تھی جس کی مدھم اور لرزاں روشنی
اس کے چوڑے شانوں، سڈول اور جاذب نظر جسم کے نقشے اور سیاہ بالوں
پر جو دراز ہونے کی وجہ سے فرش کو چوم رہے تھے۔ رقص کر رہی تھی۔ وہ موٹے
اور کھردرے ٹاٹ کی بوریاں بنانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھ پھرتی سے
کام کر رہے تھے لیکن اس کے تمام اعضاء۔ ابرو۔ ہونٹ اور سپید گردن ساکن
تھے ایسا معلوم ہوتا۔ گویا وہ محو خواب ہیں۔

کبھی کبھی وہ اپنا سر اوپر اٹھاتی تاکہ گردن کی تکان دور کر سکے اور چند
لمحوں کے لئے دریچے کی طرف دیکھ کر جس کے باہر طوفان باد و باراں غضب ڈھا
رہا تھا۔ وہ پھر گردن جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔

اس کے خوبصورت چہرے، ابھری ہوئی ناک اور گالوں کے گڑھوں
سے کسی قسم کی مسرت۔ خواہش یا غم کے آثار ہویدا نہ تھے ——
خوبصورت فوارہ اگر جاری نہ ہو تو کچھ ظاہر نہیں کرتا۔

آخر کار اس نے ایک بوری کو ختم کر لیا اور اسے ایک طرف پھینک
دیا پھر اپنے جسم کو بڑے تکلف سے سیدھا کر کے اس نے اپنی غیر متحرک اور
بے نور آنکھیں کھڑکی کی طرف گاڑ دیں —— کھڑکی کے شیشے
اشک آسا قطروں کے ہمراہ تیرتے معلوم ہوتے تھے اور برف کے ان گالوں

سے سپید ہو رہے تھے جوان پڑ گرتے۔ رضیہ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے اور چپ ہو جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محافظ نے با آواز بلند کہا "بستر پر آ جاؤ" مگر رضیہ خاموش بیٹھی رہی یکایک اس کی پلکیں کانپنے لگیں اور آنکھوں میں توجہ کی ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

سیفلے جو لحاف کے اندر اس کے چہرے کی نیرنگیوں کا بغور ملاحظہ کر رہا تھا بستر سے اپنا سر نکال کر بولا "کیا معاملہ ہے" "کچھ نہیں" ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے خیال کیا تھا کہ شاید کوئی آ رہا ہے" رضیہ نے جواب دیا۔

یہ سن کر محافظ نے لحاف کو اپنے بازوؤں اور ٹانگوں سے ایک طرف کو دھکیل دیا۔ اور گھٹنوں کے بل جھک کر اپنی بیوی کی طرف متعجب نگاہوں سے دیکھنے لگا لمپ کی سہمی ہوئی روشنی۔ اس کے ریش دار چہرے اور بکھرے ہوئے مکدر سے بالوں پر پڑ رہی تھی۔

"سن رہے ہو کچھ"

آندھی کے شور میں محافظ کو ایک مدھم جھنکار کی آواز سنائی دی جو اس مچھر کی صدا کے مرادف تھی جو کسی کے گال پہ بیٹھنا چاہتا ہو اور ہٹانے پر غصے میں پورے زور سے بھنبھنائے۔

"غالباً ڈاک جا رہی ہے" سیفلے نے اپنی ایڑیوں کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

گرجے سے دو میل کے فاصلہ پر وہ سڑک واقع تھی جس پر ڈاک گاڑی گزرا کرتی تھی۔ آندھیوں کے موسم میں جب ہوا سڑک سے کلیسا کی طرف رُخ بدلتی تھی تو گھنٹی کی آواز جھونپڑی کے مکینوں تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

"میرے اللہ! ذرا خیال تو کرو لوگ اس موسم میں بھی گاڑیوں پر سوار پھرتے ہیں" رضیہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ سرکاری کام ہے۔ اس میں کسی کی مرضی کو کیا دخل ؟"

"اب گاڑی گزر چکی ہے" سیفلے نے لحاف اوڑھتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ ابھی اچھی طرح لحاف اوڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے گھنٹی کی آواز کو صاف طور پر سنا۔ اس پر اس نے اپنی بیوی کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھا بستر سے باہر نکل آیا اور آتشدان کے پاس ٹہلنے لگ گیا۔ گھنٹی کی آواز کچھ دیر تک سنائی دیتی رہی پھر یکایک بند ہو گئی۔ جیسے وہ پھر کبھی سنائی نہ دے گی۔

"میرے خیال میں اب آواز قطعاً بند ہے" سیفلے نے ٹھہر کر اپنی بیوی پر نظریں جماتے ہوئے کہا لیکن جونہی ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا گھنٹی کی ٹن ٹن دوبارہ سنائی دینے لگی۔ سیفلے کا رنگ زرد پڑ گیا گلا صاف کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف ننگے پاؤں لپکا۔

"ڈاکیہ آندھی میں اپنا راستہ کھو بیٹھا ہے" وہ اپنی بیوی کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلایا۔

"سنتی ہو؟ ڈاکیہ راستہ بھول گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ۔ ۔ ۔ معلوم ہے! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اسے بالکل نہیں سمجھ سکتا؟" پھر وہ گنگناتا ہوا بولا "میں اس حرکت کو خوب سمجھتا ہوں ——— لعنت ہو تم پہ!"

"کیا سمجھتے ہو تم" رضیہ نے اپنی نگاہوں کو کھڑکی سے جدا کئے بغیر اپنے خاوند سے دریافت کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ سب تیری کارستانی ہے ——— تیری شیطان کی خالہ ——— یہ تیری چالاکی ہے لعنت ہو تم پہ! یہ بھٹکا ہوا اور ڈاکئے کی گمراہی سب کچھ تیرا ہی کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیرا!"

"تم دیوانے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ احمق!" اس کی بیوی نے آہستہ جواب دیا۔

"میں ایک عرصہ سے تیرا مشاہدہ کر رہا ہوں اور اب میں آخری نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی کے پہلے روز ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ تیری رگوں میں کسی کتے کا خون موج زن ہے"

"اُف!" رضیہ نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف خدا سے ڈرو"

"جادوگرنی ہمیشہ جادوگرنی ہوتی ہے" سیفلے نے آنسوؤں بھری آواز میں اپنی ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ تم میری بیوی ہو اور پادری خاندان سے تعلق رکھتی ہو لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ تمہیں مذہب سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا ہم پر رحم فرمائیو! پچھلے سال سینٹ پیغمبر کی برسی پر برف باری ہوئی، بتاؤ اس روز کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ ——— ایک مستری پناہ لینے کے لئے ہمارے گھر میں آ دھمکا۔ پھر سینٹ ایلکسی کے عرس پر برف کا تودہ دریا میں ٹوٹ گیا اور مقامی تھانے دار ہمارے یہاں داخل ہو گیا اور ساری رات تیرے ساتھ سرگوشیاں کرتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ملعون حیوان! جیتے

صبح کو باہر نکلا اور میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار تھے۔ گال اندر پچکے ہوئے تھے۔ اگست کے دنوں میں دو آندھیاں آئیں اور ان کے ساتھ ہی یہاں دو شکاری آن موجود ہوئے۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لعنت ہو ان پر!! ——— تم اب تم کیکڑے کی طرح سرخ کیوں ہو رہی ہو؟"

"تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے"

"کیا معلوم نہیں ہے ——— تو اس سال سردیوں میں کرسمس کے موقع پر جب دن رات آندھی چلتی رہی تھی۔ کیا ہوا تھا؟ ایک منشی راستہ بھول کر یہاں آگیا

سگ ناہنجار: ——— یہ خیال کرتے ہوئے کہ تمھیں وہ پسند آگیا! لعین کہیں کا! بیہودہ، تا زمین سے ایک فٹ اونچا چہرے پر پھنسیاں اور گردن مڑی ہوئی! ——— اگر شکیل ہوتا تو علیحدہ بات تھی ——— مگر وہ ——— اُف ——— وہ تو شیطان کی طرح مکروہ صورت تھا؟"

یہ کہہ کر محافظ نے سانس لیا اور ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے سلسلہ

لگا گھنٹی کی صدا سنائی نہ دے رہی تھی لیکن ہوا بدستور چھت کے ساتھ ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھی۔ یکایک تاریکی میں پھر وہی جھنکار نمودار ہوئی۔

"اب وہی کچھ ہونے والا ہے" سیفلے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "ڈاکیہ یونہی گمراہ نہیں پھر رہا ہے، میری آنکھیں نکلوا دینا اگر وہ تمھاری تلاش نہ کر رہا ہو۔ آہ، شیطان اپنے کام سے اچھے بیسے بنا لیتا ہے اور تمھاری اچھی طرح مدد بھی کر سکتا ہے۔ وہ پھر پھرا کر یہیں آ جائیگا میں جانتا ہوں ——— خوب سمجھتا ہوں، تم اسے چھپا نہیں سکتی ہو ——— تم شیطان کی خالہ ——— چالاک کافرہ!

جونہی آندھی شروع ہوئی مجھے پتہ لگ گیا تھا کہ تم کس لئے جاگ رہی ہو"

——— "اب تم اور کسی احمق میں کیا فرق ہے؟" بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا کہہ رہے کہ یہ آندھیاں میں لاتی ہوں ——— دماغ میں بجھ سے بھرا ہے تمھارے۔"

"ہوں! ——— دانت دکھاؤ رہو! ———

تمھارا ارادہ یہ ہے ... میں تو سمجھتا ہوں کہ جب کبھی تمھیں راخون جوش مارتا

سے تو طوفانی موسم یقینی ہے۔ اور جب موسم طوفانی ہو تو سرپھرے نوجوانوں کی یہاں پر آمد مسلمات میں سے ہوتی ہے جب اسی قسم کے واقعے کئی بار پیش آ چکے ہیں تو یقینی امر ہے کہ تم ہی ان سب کی محرک ہو!"

اپنی گفتگو کو زیادہ موثر بنانے کی خاطر محافظ نے اپنی انگلی پیشانی پر رکھی، بائیں آنکھ کو بند کر لیا اور ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کرنے لگا: "اگر تم واقعی نسل انسانی سے تعلق رکھتی ہو اور جادوگرنی نہیں ہو تو تمہیں غور کرنا چاہئے کہ یہ سب مسافر، منشی اور شکاری انسان نہیں تھے بلکہ شیطان ان کا بھیس بدلے ہوئے تھا ——— آہ! تمہیں اس کے متعلق ضرور غور کرنا چاہئے۔

"وسیفلے، یہ جاہلانہ بات ہے" اس کی بیوی نے اس کے چہرے کی طرف ہمدردانہ نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جب ابا زندہ تھے تو ہمارے یہاں ہر قسم کے لوگ ملیریا کے علاج کے لئے آیا کرتے تھے۔ وہ ہر روز ہی آتے مگر اس وقت کسی نے بھی انہیں شیطان کے نام سے نہ پکارا، مگر ان دنوں جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر طوفانی موسم میں پناہ لینے کے لئے یہاں آ جاتا ہے تو تم اس کی آمد پر حیرانی ظاہر کرتے ہو۔ اور جاہلوں کی طرح ہر قسم کے شبہات کو اپنے دل و دماغ میں جمع کر لیتے ہو۔"

بیوی کی منطق و استدلال سیفلے پر اثر انداز ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں کھڑا سر جھکائے اس پر غور کر رہا تھا۔ دراصل ابھی تک اسے اپنے شبہات کی صحت پر پورا یقین نہ تھا۔ بیوی کی معنی خیز گفتگو نے اس کے شک کو تھوڑی دیر کیلئے بالکل رفع کر دیا۔ مگر فوراً ہی اسے کچھ خیال آیا اور وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔ "مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ بوڑھے، لنگڑے یا اپاہج پناہ لینے کے لئے آئے ہوں بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ نوجوان ہی رات کاٹنے کے لئے یہاں آ دھمکے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ——— اگر ان کی آمد آرام طلبی تک ہی محدود ہو تو الگ بات ہے۔ مگر وہ تو شرارتیں کیا کرتے ہیں ——— نہیں، دنیا میں تمہاری صنف سے بڑھ کر چالاک اور ریاکار اور کوئی مخلوق نہیں ہو سکتی! عقل سلیم کا مادہ تم میں رتی بھر بھی نہیں۔ مگر ریاکاری اُف۔ اُف اُف، کچھ پوچھو ہی نہیں ——— خدا بچائے، پھر ڈاکئے کی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے! آندھی شروع ہونے پر ہی میں تمہارے دل کی بات جان گیا تھا . . . یہ سب تیری فسوں سازی ہے ——— مکڑی"

"تم خواہ مخواہ مجھے اپنا تختۂ مشق کیوں بنا رہے ہو؟ بے ایمان کہیں کے:" اس کی بیوی صبر کھو چکی تھی: "آخر تم کُتّا کی طرح اس بات پر کیوں جمے ہوئے ہو؟"

"میں اپنی بات پر اس لئے جما ہوا ہوں کہ اگر خدا بچائے . . . . . . اسی قسم کا واقعہ پھر ظہور پذیر ہوا سنتی ہو؟ اگر آج رات پھر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں صبح اٹھتے ہی سیدھا فادر نکوڈم کے پاس جاؤں گا اور ساری رام کہانی کہہ سناؤں گا۔ میں صاف الفاظ میں کہہ دوں گا "گستاخی معاف۔ مگر بیوی ضرور جادوگرنی ہے" وہ پوچھے گا "کیسے؟" ہوں، کیا تم جاننا چاہتی ہو کہ تم کیسے جادوگرنی ہو؟ . . . . . . میں اسے بتا دوں گا مگر لعنت ہو تم پر اے عورت۔ روزِ محشر ہی کو نہیں بلکہ تم اسی زندگی میں ہی اپنے کئے کی سزا بھگت لو گی! میں یونہی نہیں کہہ رہا۔ تمہاری نوعیت کے لوگوں کے لئے مقدس کتاب میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔"

یکایک کھڑکی پر ایسی بلند اور غیر معمولی دستک ہوئی کہ سیفلے کا رنگ زرد پڑ گیا اور قریب تھا کہ وہ خوف کے مارے پیچھے کی طرف گر پڑے۔ اس کی بیوی بھی سخت خوف زدہ ہو گئی۔

"از راہِ خدا ہمیں اندر آنے دیجئے۔ ہم باہر سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔" محافظ اور اس کی بیوی نے ایک لرزاں اور بھدی آواز کو یہ کہتے ہوئے سنا "یہاں کون صاحب رہتے ہیں؟ خدا کے لئے رحم فرما کر ہمیں اپنے یہاں پناہ دیجئے۔ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔"

"تم کون ہو؟" رئیسہ نے دریافت کیا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے سے خائف تھی۔

"ڈاکئے" دوسری آواز نے کہا۔

"تم اپنے شیطانی ارادے میں کامیاب ہو گئی ہو" سیفلے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "غلطی کا کوئی امکان نہیں، میں بجا کہہ رہا ہوں خیر اب دروازہ کھول دو"

یہ کہہ کر محافظ دو چھلانگوں میں اپنے بستر پر پہنچ کر پروں والی چٹائی پر لیٹ گیا۔ اور دیوار کی طرف منہ موڑ کر بڑبڑانے لگا۔ فوراً ہی اس نے اپنی پشت پر سرد ہوا کا جھونکا محسوس کیا۔ دروازہ کھلا اور ساتھ ہی ایک لمبا

ترنگا جوان برف سے لت پت دہلیز پر نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی اسی ہیئت کذائی میں دکھائی دے رہا تھا۔

"تھیلے بھی اندر لے آؤں کیا" دوسرے آدمی نے اپنے ساتھی سے بھدی آواز میں کہا۔

"تم انھیں باہر کیونکر چھوڑ سکتے ہو" یہ کہتے ہوئے پہلے شخص نے اپنی برساتی کو اتارنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی یہ عمل ترک کر کے اسے اپنی ٹوپی سمیت کھینچ کر انگیٹھی کے پاس پھینک دیا۔ پھر اپنا بڑا کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکنے کے بعد علیک سلیک کئے بغیر جھونپڑی میں ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

یہ ڈاکیہ ایک خوب رو نوجوان تھا۔ ایک بھدی سی وردی اور بڑے بڑے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے سے جب اس کے سرد جسم میں حرارت عود کر آئی تو وہ ایک میز کے قریب بیٹھ گیا۔ کیچڑ آلود پاؤں بوریوں پر پھیلا دیئے اور ٹھوڑی کو ہاتھ کا سہارا دے کر خاموشی سے سوچنے لگا۔ اس کا چہرہ بعض جگہوں پر سردی کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس طوفان کی کوفت کے آثار بھی اس کے چہرے پر نمایاں طور پر ظاہر تھے جس سے وہ ابھی ابھی رہائی حاصل کر کے آیا تھا۔ گو غم و غصے نے اس کی حالت میں ایک تغیر پیدا کر رکھا تھا مگر وہ اس پگھلتی ہوئی برف کے باوجود۔ جو اس کے ابروؤں۔ مونچھوں اور داڑھی پر جم رہی تھی خوش شکل معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ بھی کتوں ایسی زندگی ہے!" ڈاکئے نے دیواروں پر اس انداز میں نگاہیں گھماتے ہوئے دبی زبان میں کہا جیسے وہ یقین نہیں کر رہا ہے کہ وہ کسی گرم جگہ میں محفوظ ہے۔ "اگر آپ کو روشنی دکھائی نہ دیتی تو ہماری تباہی یقینی تھی! خدا ہی جانتا ہے یہ طوفان کب تھمے گا! اس ذلیل زندگی کا کوئی انجام نہیں! ہم اس وقت کس جگہ موجود ہیں۔ اس نے محافظ کی بیوی سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔

"گلوسکی پہاڑی پر - - - - - - جذبی کالی نوفکی کی جاگیر کے پاس" رعیسہ نے چونک کر شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"سن رہے ہو سی مین؟" ڈاکئے نے مڑ کر اپنے ساتھی کوچوان کو کہا۔ جو ابھی تک اپنے کاندھوں پر ڈاک کا تھیلا اٹھائے دروازے میں کھڑا تھا۔

"ہم لوگ گلوسکی پہاڑی پر پہنچ چکے ہیں"

"جی ہاں . . . . . پھر تو ہم کافی دور پہنچ گئے ہیں" ان الفاظ

کوکوچوان نے ایک بھدی آہ نما آواز میں کہا اور ساتھ ہی باہر جا کر ایک اور تھیلا اٹھا لیا۔ ایک بار پھر باہر گیا اور ڈاکئے کی تلوار اور پیٹی اٹھا لایا۔

ان چیزوں کو احتیاط سے دیوار کے ساتھ رکھ کر وہ باہر والے کمرے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر سگریٹ پینا شروع کر دیا۔

"شاید آپ اس سفر کے بعد تھوڑی سی چائے پسند فرمائیں گے؟" رعیسہ نے ڈاکئے سے دریافت کیا۔

"ہم یہاں چائے پینے کے لئے کیونکر ٹھہر سکتے ہیں" ڈاکئے نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا "ہمیں جلدی کرنی چاہئے تھوڑی دیر آگ تاپنے کے بعد ہمیں جلد روانہ ہو جانا چاہئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ہم ڈاک گاڑی کو کھو بیٹھیں گے۔ دس منٹ اور سستانے کے بعد ہم یہاں سے اپنی راہ لیں گے۔ آپ ہمیں راستہ دکھا دیجئے گا۔ یہی آپ کی عنایت ہوگی"

"یہ موسم بھی ایک عذاب ہے" رعیسہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہوں — — — جی ہاں . مگر کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔

"ہم یہاں گرجے کے ساتھ رہتے ہیں۔ پادری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں . . . . وہ میرا خاوند ہے جو سو رہا ہے —— تسیفلے! اٹھو اور اپنے مہمانوں کی خیر و عافیت دریافت کرو ——— آج سے اٹھارہ مہینے پہلے یہ گرجا ہوا کرتا تھا ——— بے شک جب یہاں شرفا سکونت پذیر تھے تو عبادت کے لئے بہت سے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے مگر اب کہ شرفا قریب قریب یہ جگہ چھوڑ چکے ہیں میرا کہنا غالباً فضول ہوگا کہ اب پادری کا ذریعہ معاش بالکل محدود ہو چکا ہے ——— تسیفلے ریٹائر ہونے کے قریب ہے۔ ان دنوں وہ گرجے کی رکھوالی کر رہا ہے"

اس کے بعد فوراً ہی ڈاکئے کو یہ بھی بتایا گیا کہ اگر تسیفلے جنرل کی بیوی کے پاس جائے اور لاٹ پادری کے نام ایک سفارشی چٹھی کی درخواست کرے تو ایک اچھی نوکری مل جانا یقینی ہے ———

"لیکن تسیفلے جنرل کی بیوی کے پاس جاتا ہی نہیں وہ سخت کاہل ہے اور لوگوں سے ڈرتا ہے ——— بہرکیف ہم گرجے سے منسلک ہیں۔" رعیسہ نے اپنی گفتگو میں ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی گزر کیسے ہوتی ہے؟" ڈاکئے نے دریافت کیا۔

"اس کلیسا کے ساتھ ایک باغ اور مرغزار ملحق ہے مگر ہم اس زمین سے کچھ زیادہ حاصل نہیں کر سکتے" رعیسیہ نے سرد آہ بھری "بوڑھا فادر نکوڈم سینٹ نکولس کی برسیاں منانے کی خاطر سال میں دو دفعہ یہاں آدھمکتا ہے اور تمام فصل اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔ اس صورت میں ہمارے لئے کیا خاک باقی رہتا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" سیفلے نے لیٹے لیٹے بلند آواز میں کہا "فادر نکوڈم خدا رسیدہ بزرگ ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی ہے تو یہ اس کا حق ہے"

"تم میاں بیوی آپس میں ناراض معلوم ہوتے ہو" ڈاکئے نے رعیسیہ سے دریافت کیا "تمہاری شادی کو بھلا کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟"

"پچھلی اتوار کو پورے تین سال گزر چکے ہیں

میرا باپ اس گرجے کا محافظ ہوا کرتا تھا جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے گرجے کے متعلقین کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے یہاں سے کوئی گنوار آدمی بھیج دیں تا کہ اس کی وفات کے بعد وہ شخص میرے خاوند کی حیثیت میں اس کی جگہ پر بدستور قابض رہے ——— یہ ہے ہماری شادی کا قصہ"

یعنی ایک پنتھ دو کاج" ڈاکئے نے سیفلے کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیوی بھی مل گئی اور ملازمت بھی"

یہ سن کر سیفلے غصے میں اپنی ٹانگوں کو جنبش دے کر دیوار کے زیادہ قریب ہو گیا۔ اسی اثنا میں ڈاکیہ میز سے اٹھ کر ڈاک کے تھیلے پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے دونوں تھیلوں کو آپس میں ملا دیا اور تلوار کو ایک طرف رکھنے کے بعد فرش پر پاؤں لٹکائے ان پر لیٹ گیا۔

"یہ کتوں ایسی زندگی ہے" اس نے اپنے ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھتے ہوئے اور آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"وحشی تاتاری کو بھی ایسی زندگی نصیب نہ ہو!!"

دفعتہً کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی سوائے سیفلے کے خراٹوں اور ڈاکیہ کے تنفس کی آواز کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ڈاکیہ ہر سانس کے ساتھ ہا ہا ہا۔ ایسی آواز پیدا کرتا تھا وقتاً فوقتاً اس کے گلے سے کھنچتے ہوئے پہیے ایسی کھڑکھڑاہٹ بھی سنائی دیتی تھی اور اس کے پاؤں تھیلوں پر متحرک رہتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد سیفلے نے چپکے سے لحاف کے باہر سر نکال کر کمرے میں نگاہ دوڑانی شروع کی۔ اس کی بیوی سٹول پر بیٹھی اپنی گالوں پر ہاتھ جمائے ڈاکئے کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی خوفزدہ یا متحیر انسان کی طرح غیر متحرک تھا۔

کسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو تم؟" سیفلے نے دبی زبان سے غصہ آمیز لہجہ میں کہا۔

"اس سے تمہیں کیا واسطہ؟ تم سوئے رہو!" اس کی بیوی نے ڈاکئے کے چہرے پر سے اپنی نظریں جدا کئے بغیر جواب دیا

اس پر سیفلے نے غصے میں اپنی چھاتی سے ساری ہوا سانس کے ذریعے سے باہر نکالی اور کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا تین منٹ کے بعد وہ پھر مضطرب ہو کر اٹھا اور بستر میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور سرہانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی بیوی کی طرف استفہامی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سٹول پر خاموش بیٹھی ڈاکیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے گال زرد اور آنکھیں کسی پراسرار آگ سے دہک رہی تھیں۔ محافظ نے اپنا گلا صاف کیا اور پیٹ کے بل چارپائی سے نیچے اترنے کے بعد ایک رومال لے کر ڈاکئے کا چہرہ اس سے ڈھانپ دیا۔

"یہ کس لئے؟" رعیسیہ نے اپنے خاوند سے دریافت کیا۔

"لیمپ کی روشنی اب اس کی آنکھوں سے دور رہے گی!"

"اس سے بہتر ہے کہ لیمپ کو ہی گل کر دو"

سیفلے نے غیر متیقن نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا لیمپ کی جانب پھونک مارنے کی خاطر اپنے لب بڑھائے مگر فوراً ہی کچھ سوچ کر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ بھی تمہاری شیطانی چالاکی نہیں ہے ——— آہ! دنیا میں عورت ذات سے بڑھ کر اور کوئی ریاکار نہیں ہو سکتا!"

"آہ! تم بھدے شیطان" اس کی بیوی غصے میں غرائی "ذرا ٹھہر تو جاؤ تم . . ."

یہ کہتے ہوئے اس نے پھر ڈاکئے کی طرف بغور دیکھنا شروع کیا۔

رعیسیہ کو اس امر کی چنداں پروا نہ تھی کہ ڈاکئے کا چہرہ ڈھنپا ہوا ہے وہ صرف چہرے ہی میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی بلکہ اس کے سارے جسم میں ڈاکئے کی چھاتی چوڑی اور مضبوط تھی۔ ہاتھ خوش شکل اور نازک تھے۔ ٹانگیں گوشت

سے بھری ہوئی اور سیفلے کی بھدّی اور بکری جیسی ٹانگوں سے کہیں ملائم۔ و خوب صورت تھیں۔ حقیقت سیفلے اور ڈاکیئے کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

"میں بھدّا شیطان ہی سہی" سیفلے نے چند لمحات کے توقف کے بعد کہا "مگر ان لوگوں کا یہاں سونے سے کیا مطلب ہے؟ . . . . . . وہ سرکاری کام کرتے ہیں۔ اگر دیر ہو گئی تو اس کے لئے ہمیں جواب دینا پڑے گا۔ اگر کسی کا فرض خطوط کے تھیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہے۔ تو پھر سو جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ فرض کی ادائیگی لازم ہے ———

اے میاں" سیفلے نے باہر والے کمرے کی طرف رُخ کر کے پکارا۔ "اے میاں کوچوان . . . . . . تمھارا نام کیا ہے؟ آؤ میں تمھیں راستہ بتا دوں۔ ڈاکیئے کو اس طرح سونا نہیں چاہیئے!"

سیفلے جواب بستر پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکیئے کی طرف لپکا۔ اور اسے آستین سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

"جناب ڈاکیہ صاحب، اگر آپ کو جانا ہے تو اب روانہ ہو جایئے . . . . . . اگر جانے کا ارادہ نہیں تو یہ درست طرز عمل نہیں ہے۔ اس طرح سو رہنے سے کام نہیں چلے گا"

ڈاکیہ اچھل کر بیدار ہو گیا اور تھوڑی دیر اِدھر اُدھر متحیر نگاہوں سے دیکھ کر پھر سو گیا۔

"مگر جاگ رہے ہو تم میاں؟" سیفلے بولتا گیا "تمھاری نوکری یہی ہے کہ وقت مقررہ پر ڈاک لے کر پہنچو ——— سن رہے ہو کیا؟ چلو آؤ۔ میں تمھیں راستہ دکھا دوں!"

ڈاکیئے نے آنکھیں کھولیں جسم گرم ہونے اور تھوڑی دیر سو لینے کے بعد اس کا جسم آرام کا عادی ہو گیا تھا نیم خوابیدہ حالت میں اسے محافظ کی بیوی کی سپید گردن اور غیر متحرک آنکھیں نظر آئیں۔ وہ مسکرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

"مگر اس موسم میں آپ کیونکر گھر سے باہر قدم رکھ سکتے ہیں" ڈاکیئے نے نیم خوابی کی حالت میں ایک زنانہ آواز سنی"

"آپ کو تھوڑی سی نیند اور لے لینی چاہیئے۔ مفید ثابت ہوگی"

"مگر ڈاک کی ترسیل کا کیا انتظام ہو گا؟" ساتھ ہی عزیہ کے خاوند کی آواز آئی "یہ ڈاک کون لے جائے گا؟ ———

کیا تم کاندھوں پر اٹھا کر لے جاؤ گی ——— خدارا یہ تو بتاؤ؟"

ڈاکیئے نے اپنی آنکھیں پھر کھولیں۔ عزیہ کے گالوں اور جاذب نظر کی گنپٹی کی طرف توجہ دی۔ اپنی موجودہ حالت پر غور کیا اور سیفلے کا مطلب سمجھ گیا۔ اس خیال نے کہ اب اسے باہر تاریکی اور منجمد کر دینے والی سردی میں نکلنا پڑے گا اس کے جسم پر ایک سرد لہر دوڑا دی۔ وہ آنکھیں جھپکنے لگ گیا۔

"یہ تو ہر حالت میں ہو ہی جائے گی" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "تو پھر کیوں نہ دو گھڑی اور سو لوں"

"شاید ہم وقت پر پہنچ جائیں" باہر والے کمرے سے آواز آئی "شاید آج ڈاک گاڑی بھی دیر سے آئے"

یہ سن کر ڈاکیہ اٹھا اور ایک سست آواز میں انگڑائیاں لیتا ہوا اپنا کوٹ پہننے لگا۔

سیفلے یہ دیکھ کر جامے میں پھولا نہیں سما رہا تھا کہ اس کے ناخواندہ مہمان جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

"خدا حافظ، تو بتائیے گا" کوچوان نے ڈاک کا ایک تھیلا اٹھاتے ہوئے سیفلے سے کہا۔

محافظ نے فوراً ہی تعمیل کی اور کوچوان کے ساتھ مل کر ڈاک کے تھیلے باہر برآمدے میں رکھوا دیئے۔ اسی اثنا میں ڈاکیہ اپنی برساتی پہن رہا تھا۔ اور محافظ کی بیوی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ملائے اس کی روح میں جھانکنے کی سعی کر رہی تھی۔

"چائے کا ایک پیالہ تو پی لیجیئے گا . . . . . ." عزیہ نے ڈاکیئے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی عذر تو نہیں ہے مگر آپ دیکھ رہی ہیں کہ اب ہم رخصت ہونے والے ہیں ——— یہ جدا بات ہے کہ ہمیں دیر ہو چکی ہے"

"آپ ضرور ٹھہریئے" عزیہ نے آنکھیں جھکا کر ڈاکیئے کی آستین پکڑتے ہوئے کہا۔

ڈاکیہ جس نے اب برساتی پہن لی تھی عزیہ کے پاس کھڑا ہونے میں ایک خاص لطف محسوس کر رہا تھا۔

"کیسی . . . . کیسی حسین گردن ہے!" یہ کہہ کر اس نے اپنی

دو انگلیوں سے رعنیہ کی گردن کو چھوا۔ اور یہ دیکھ کر کہ وہ بُرا نہیں مان رہی اس کی گردن اور شانوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

"تم بہت . . . . . . "

"تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرو . . . چائے تو پیتے جاؤ"

"اسے یوں نہ رکھئے ——— اس طرح لٹا دیجئے" باہر سے کوچوان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"آپ کو ٹھہرنا ہوگا . . . دیکھئے نا ہوا کس تیزی سے چل رہی ہے"

یہ سن کر ڈاکیہ ایک ایسی خواہش سے بالکل مغلوب ہو گیا جس کی موجودگی میں ڈاک کے تھیلے . ڈاک کی گاڑی . . . . . . دنیا کی ہر ایک چیز بھول جایا کرتی ہے۔ اس نے خوف زدہ انداز میں دروازے کی طرف نگاہیں اٹھائیں جیسے وہ اپنے آپ کو چھپانا چاہتا ہے۔ یا وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا ہے پھر رعنیہ کو کمر سے پکڑ کر روشنی گل کرنے کے لئے لیمپ کی جانب جھکا مگر فوراً ہی پرے ہٹ گیا۔ باہر والے کمرے میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی کوچوان دہلیز میں آ نمودار ہوا۔

"گاڑی تیار ہے" اس نے آتے ہی ڈاکئے سے کہا ———

یہ سن کر ڈاکیہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر عزم کرنے کے بعد کوچوان کے ہمراہ باہر چل دیا۔ رعنیہ اب اکیلی رہ گئی۔

"آئیے اب ہمیں راستہ بتا۔ بیٹھئے" اس نے برآمدے میں ڈاکئے کو اپنے خاوند سے گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھنٹی کی صدا آئی کچھ توقف کے بعد دوسری بجی پھر گھنٹیوں کی ٹن ٹن کا ایک سلسلہ فضا میں پھیل گیا جب تھوڑی دیر کے بعد گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ غائب ہو گئی۔ تو رعنیہ اٹھی اور اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل وہ زرد تھی مگر اب اس کے چہرے پر سرخی رقص کر رہی تھی۔ سانس پھول رہی تھی۔ اور آنکھیں کسی وحشت خیز غصے سے چمک رہی تھیں جھونپڑی میں اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح معلوم دے رہی تھی جسے کسی نے پنجرے میں سلاخ سے چھیڑ دیا ہو! ایک لمحے کے لئے کھڑی ہو کر اس نے اپنی جائے رہائش کا جائزہ لیا۔ کمرے کا قریب قریب نصف حصہ چارپائی نے روکا ہوا تھا جس پر ایک غلیظ سا بستر اور میلے تکئے اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے بستر جو چیتھڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ بالکل سیفلے کے منتشر اور کھردرے بالوں کے مانند معلوم ہو رہا تھا بستر سے اس دروازے تک جو باہر والے سرد کمرے کی طرف کھلتا تھا آتشدان بنا ہوا تھا جس کے آس پاس برتن بکھرے پڑے تھے۔ کمرے کی ہر شے مع غیر حاضر سیفلے کے اس درجہ غلیظ۔ بھدی اور مکروہ تھی کہ اس گدلی فضا میں کسی عورت کی سپید گردن اور نازک بدن کی موجودگی سخت حیرت خیز تھی۔

رعنیہ دوڑ کر بستر کی طرف لپکی اور اس انداز میں ہاتھ پھیلائے جیسے وہ اس بستر کو ہوا میں اچھال اچھال کر اس کی دھجیاں بکھیر دینا چاہتی ہو مگر فوراً ہی غلاظت سے ہاتھ بھرنے کا خیال کر کے وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اور پھر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

جب دو گھنٹے کے بعد سیفلے تھکا ہوا اور برف سے لت پت واپس آیا تو اس وقت رعنیہ کپڑے اتار کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی گو اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر اس کے چہرے کے رنگ کا تغیر و تبدل صاف طور پر چغلیاں کھا رہا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے مگر واپس آتے وقت سیفلے نے قسم کھائی تھی کہ وہ دوسرے روز تک اپنی بیوی سے ہم کلام نہ ہوگا۔ بلکہ اسے ہاتھ تک نہ لگائے گا۔ مگر وہ طنز کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"دھری رہ گئی نا تمھاری سب جادوگری ——— کہاں ہے۔ اب وہ تمھارا ؟"

اس کی بیوی خاموش رہی۔ مگر ٹھوڑی پر ایک ہلکی سی لرزش نمودار ہوئی سیفلے نے لباس اتارا۔ اور رعنیہ کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔

"میں کل ہی خاوند نکوڈم کو تمھاری ساری کرتوت کہہ سناؤں گا"

اس پر رعنیہ نے کروٹ بدلی اور اس کی طرف چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"کسی جنگل میں دوسری بیوی کی تلاش کرو ——— مرد و کہیں کے! میں تم ایسے کمینے۔ مسخرے اور افیونی انسان کی بیوی نہیں بن سکتی ——— خدا مجھے معاف کرے!!"

"بس بس اب سو رہو"

"میں کس قدر جلے نصیب والی ہوں!" رعنیہ روتی آواز میں بولی "اگر تم نہ ہوتے تو میں یقیناً کسی اچھے مرد کے پلے بندھتی! تم برف میں کیوں منجمد نہ ہو گئے! تیری برف کے نیچے قبر کیوں نہ بن گئی!!"

تھوڑی دیر اور چلا کر رعسیہ نے ایک آہ بھرنے کے بعد خاموشی اختیار کرلی ——— باہر طوفان بدستور جاری تھا جھونپڑی کی دیواروں۔ دودکش اور انگیٹھی میں سے کسی غیر مرئی چیز کے سسکیاں بھرنے کی آواز آرہی تھی۔ ستیفلے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صدا اُسے گریہ خود اس کے کانوں اور سینے میں موجود ہے۔ آج رات کے واقعہ نے اس کے دیرینہ شبہات کو صحیح ثابت کردیا تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی شیطان سے مل کر آندھیاں لاتی ہے۔ مگر اس کے غم میں یہ امر اور اضافہ کرتا تھا کہ یہ اسرار، یہ محیرالعقول قدرت۔ اس عورت کے حسن کو زیادہ تابانی بخشتے ہیں جو اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ جب وہ بلا ارادہ اس کی طرف شاعرانہ انداز میں نگاہیں اٹھاتا ہے تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے۔

"ساحرہ ——— ذلیل عورت!" اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

مگر تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد جب وہ خاموش ہو کر سوگئی تو ستیفلے نے اس کے سر کو اپنی انگلیوں سے چھوا . . . . اس کی ایک گھنی زلف کو چند لمحوں کے لئے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ وہ نیند میں اپنے خاوند کی اس حرکت سے بے خبر تھی۔ یہ دیکھ کر ستیفلے نے اور جرأت پاکر اس کی گردن تھپکنا شروع کردی۔

"ہٹو پرے" رعسیہ چلائی اور ساتھ ہی اپنی کہنی اس شدت سے اس کی ناک پر ماری کہ ستیفلے کو آنکھوں کے سامنے تارے نظر آگئے۔

اس کی ناک کا درد بہت جلد رفع ہوگیا۔ مگر دل کا درد بدستور سابق موجود ہے۔

(چیخوف) (سعادت حسن منٹو)

ہوش ہے

(از سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی ٹریبل ایم۔ اے (گولڈ میڈلسٹ) ایڈوکیٹ)

دم لبوں پر آچکا ہے غم کا ایسا جوش ہے
نام اس کا لے رہا ہوں پھر بھی اتنا ہوش ہے

تیرا دیوانہ نئے عالم میں ہے وہ جوش ہے
جذب ہے، وارفتگی ہے، بے خودی ہی ہوش ہے

جب خودی کو کھو کے ہم بیخود ہوئے سمجھے یہ راز
رخنہ گر دیدارِ جاناں میں جو ہے وہ ہوش ہے

تیرے صدقے اے مرے ساقی کی چشمِ نیم باز
مجھ کو آدھی بے خودی ہے اور آدھا ہوش ہے

جب گرا میں لڑکھڑا کر پائے ساقی پر گرا
نشہ میں سرشار ہوں اس پر بھی اتنا ہوش ہے

ہم صفِ محشر میں بھی ہیں محوستِ چشمِ یار
دادخواہی کس کی ہو کس سے ہو کس کو ہوش ہے

ساری محفل مستِ چشمِ نازِ جاناں ہے رسا
بزم سے اب کیا اُٹھے گا کوئی کس کو ہوش ہے

خاموشی

(از سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی ٹریبل ایم اے گولڈ میڈلسٹ، بی ایل ایڈوکیٹ)

چور ہے زخموں سے کوئی خاک پر بیہوش ہے — بال بکھرائے ہوئے بالیں پہ وہ خاموش ہے

شمع کو ضبطِ غمِ الفت میں کتنا ہوش ہے — گھل کے پانی ہو گئی لیکن زباں خاموش ہے

پردہ داری رازِ الفت کی دمِ آخر بھی کی — دل میں اس کی یاد ہے لیکن زباں خاموش ہے

خندۂ گل نغمۂ بلبل ہے ہر سو باغ میں — محوِ حیرت صرف اک نرگس ہے وہ خاموش ہے

دیکھو وہ بیٹھا ہوا ہے کوئی بزمِ یار میں — دور سے تکتا ہے منہ آنکھیں ہیں تر خاموش ہے

ایک پاؤں پر کھڑی ہے شمع اس کی بزم میں — شام سے تا صبح جلتی ہے مگر خاموش ہے

بات اک پُر لطف کہہ کر روک لی اپنی زباں

لطف یہ ہے سب مُصر ہیں اور رسا خاموش ہے

عالمگیر بکڈپو کی قابلِ دید کتابیں!

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار جناب عظیم بیگ صاحب چغتائی کے طرزِ تحریر کا تازہ ترین شاہکار نہایت ہی پُر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف نے اپنے شوخ اور مذاقیہ طرزِ بیان کے ساتھ انگران انلم کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک و شرمناک سازشوں کے ہولناک و قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں۔ یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت میں اچھوتے ہیں نیز طرزِ بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا چڑھا ہے کھرپا بہادر کو پڑھ کر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائینگے۔ بہترین لکھائی چھپائی، ٹوٹو بلاک کا رنگین سرورق قیمت عہ محصول ۵ر

خطوط کی ستم ظریفی مصنفہ مرزا عظیم صاحب چغتائی۔ ہنسانے والی نئی کتاب چغتائی صاحب کے مخصوص اور انوکھے طرزِ تحریر کی دلچسپ تصویر۔ بالکل نئی کتاب جو ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ فوراً طلب فرمایئے۔ قیمت ۱۲ر

کتاب التقدیر علامہ ابن القیم عربی کے ایک بلندپایہ ادیب تھے آپنے تقدیر کے مسئلہ پر عربی زبان میں ایک بے نظیر اور ضخیم کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا کتاب طبع ہونے پر شائقین اور قدر دانان ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی افسوس کہ مولوی صاحب بفضلے الہی راہی ملک بقا ہوئے اور ان کے بعد کسی نے اس کتاب کا اشتہار نہ دیا اب ہمارے پاس پانچسو کے قریب اس کی جلدیں موجود ہیں۔ اس کتاب کی اصلی قیمت پونے چار روپے ہے مگر ناظرین عالمگیر کو صرف عہ علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔ کتاب کا پونے آٹھ سو صفحات سائز بڑا ہے۔

شادی آپ کی یا ہماری نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے دلفی حالات خود ملا رموزی صاحب کے فاؤنٹین پن سے لکھے ہوئے۔ کتاب کی دلچسپی کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے بس پڑھئے اور لطف اٹھایئے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے ۸؍عہ

صبح لطافت ملا رموزی کے چیدہ اور بہترین مزاحیہ مضامین کا نایاب و قابلِ دید مجموعہ کتاب کے صفحات زعفران زارِ کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں پڑھتے جایئے اور ہنستے جایئے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف دو روپے عہ

نوٹ:۔ ناظرین عالمگیر کو شادی اور صبح لطافت ایک ساتھ خریدنے پر تین روپے چار آنے (ہے) علاوہ محصولڈاک میں ملیگی۔

علامہ جرجی زیدان کے دو بہترین تاریخی ناول

موتیوں کا درخت حجم ۲۰۰ صفحات	**مجبوبہ قیروان** حجم ۲۷۵ صفحات
قیمت:۔ ۱۲ر	قیمت:۔ ۱۲ر

دفتر عالمگیر کی طرف سے بصرف زر کثیر ان کتابوں کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ کتاب کی دلچسپی کیلئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے۔ آج سب سے پہلی فرصت میں طلب فرمایئے۔

رسالہ عالمگیر کے مستقل خریدار ہو کر آپ مطبوعات عالمگیر بکڈپو سے رعایت حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ہی ایک سال کیلئے خریداری قبول فرمایئے سالانہ للعہ صر

ملنے کا پتہ

عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا

Alamgir Book Depote
Bazar Said Mitha

طرہ

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی، باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۵ فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۳۶ء نمبر ۱۲

حافظ محمد عالم صاحب اڈیٹر۔ پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سرہمالا سے شائع کیا۔

مُلاحظات

اُردو دان حضرات کی نگاہوں سے مولانا عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) آنریری سیکریٹری انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن کا حقیقت افروز مقالہ "بھارتیہ سہاتیہ پرشد کی اصل حقیقت" گزر چکا ہوگا اور انھیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہمسایہ قوم کے وہ جلیل القدر افراد جن کی کوششوں کو فرقہ دارانہ عصبیت کے زہر سے بالکل پاک ہونا چاہئے کس طرح ملک کی لسان عمومی یا مشترکہ زبان اُردو کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں برادران وطن، اُردو دشمنی کے اتحاد سوز مظاہرات کرنے میں مصروف ہیں اور ملک کی وسعتوں میں نہایت سرگرمی کے ساتھ اُردو کو مٹا کر ہندی کی نشرواشاعت میں شبانہ روز مشغول !

یہ ایک حقیقت واضح درخشن ہے کہ ہندوستان بھر میں اگر کوئی زبان، تمام اقوام ہند کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے تو وہ اُردو کے سوا اور کوئی نہیں بنگالی بنگال کے حدود سے آگے نہیں بڑھی۔ گجراتی گجرات کے لئے وقف ہے۔ غرض کہ ہر صوبے کی مخصوص زبان اسی صوبہ کی آبادی تک محدود ہے مگر ایک زبان اُردو ہی ہے جو ملک کے ہر ایک حصے میں بآسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اُردو کے گذشتہ ادوار ترقی پر نظر ڈالئے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس نے کتنی عجب خیز سرعت، کس قدر تحیر زا تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اس کی نشرواشاعت، ترقی و ترویج، استحکام و فروغ کے سلسلے میں ہندوستان کی ہر ایک قوم نے پوری ہمدردی کے ساتھ حصہ لیا ہے اور آج بھی یہی حال ہے مگر یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان ہی میں بسنے والی ایک مقتدر و معزز قوم جس نے مادر وطن کی بہتری کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے اور کر رہی ہے کیوں اُردو دشمنی کا افسوسناک مظاہرہ کرکے ایک ایسے زریں

موقع کو جو ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد و معاون ہندوستان کی مختلف قوموں میں سیاسی اتحاد پیدا کرنے کی قابلیت تامہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہاتھوں سے کھو رہی ہے، ایک ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں رہنے والوں میں اتحاد کی یہ تین صورتیں موجود ہوں۔

۱۔ اتحاد مذہبی ۲۔ اتحاد سیاسی ۳۔ اتحاد لسانی

یہی وہ عناصر ضروریہ ہیں جن کی موجودگی ایک ملک کو بام ترقی پر لے جا سکتی ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اتحاد لسانی کی صورت سب سے زیادہ ضروری صورت ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے مذہبی معتقدات ہی سے واقف نہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے مذہب پر حملے نہ کرے۔ لاعلمی تعصب کی جڑ ہے۔ لسانی اتحاد سے سیاسی اتحاد کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔

آج سے کچھ عرصہ پیشتر ہمارے محترم برادران وطن کو اُردو سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں ہی کے مانند اس کی ترقی کے خواہاں تھے اس کی نشرواشاعت کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے مگر آج کیا وجہ ہے کہ وہ اُردو کے مٹانے کے درپے ہیں۔ اس کا جواب ہم اوپر درج کر آئے ہیں یعنی فرقہ دارانہ عصبیت اور کچھ نہیں، ان کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے یا بٹھا دی گئی ہے کہ اُردو قرآنی حروف کی صورت میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں کی کوششیں ہی اس کی تخلیق کا باعث ہوئیں۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اسی زبان کو انتہائی فروغ دے سکتے تھے مگر انھوں نے یہ سمجھ کر کہ اُردو کے ذریعہ ہندوستان کی تمام قوموں میں اتحاد ہو سکتا ہے اپنی مادری زبان کی محبت کو قربان کر ڈالا اور اُردو کی نشرواشاعت کی طرف اپنی توجہات

خصوصی منبذ دل کیں، اُردو میں جہاں عربی فارسی کے حروف ہیں وہاں یہ سنسکرت اور ہندی کے الفاظ سے بھی محروم نہیں! اُردو زبان کے مصادر کی بیشتر تعداد ہندی حروف ہی کی ہے اس صورت میں یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان ہے وہ اگر چاہیں تو اسے ترقی دے سکتے ہیں! یہ ہندو دوستوں کی غلط فہمی ہے اور نہایت خوفناک غلط فہمی۔ اُردو کے حامیوں کو استقامت کے ساتھ اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئے کیونکہ ممکن ہوسکتا ہے کہ برادران وطن کی متعصبانہ کوششیں کامیاب ہوکر ملک کو سخت نقصان پہونچائیں!

قارئین عالمگیر یہ سن کر بے حد خوش ہونگے کہ عالمگیر کے انتظامی معاملات میں نہایت خوشگوار اضافہ کیا جارہا ہے اور آئندہ اس کے صوری و معنوی خاص ترقی پذیر — !

عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۷ء انشاء اللہ آپ کی توقعات سے بھی بڑھکر کامیاب ہوگا۔ اس کے لئے ابھی سے کوششیں کی جارہی ہیں ہندوستان کے چوٹی کے ادباء کے نگارشات جمیلہ دفتر میں پہونچ رہے ہیں۔

[illegible] افسوس ہے کہ بعض انتظامی وجوہ کی بنا پر قارئین عالمگیر کی خدمت میں [illegible] تاخیر ارسال ہوا اور دفتر میں متعدد شکایتی خطوط پہونچے [illegible] وفیات [illegible] ان کے جواب بھی نہ دیئے جاسکے اب ان کی خدمت میں سالنامہ [illegible] پرچہ بھی انہیں وجوہ کی بنا پر تاخیر سے شایع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ [illegible] پرچہ بروقت شایع ہوکر ناظرین کی خدمت میں ارسال ہوگا!

(ادارہ)

ایک ستم اور لاکھ ادائیں۔ اف ری جوانی! ہائے زمانے
ترچھی کُلاہیں تنگ قبائیں۔ اف ری جوانی! ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم۔ ابرِ بہاراں، دیدۂ پُرنم،
ضد کہ ہمیں وہ آپ پلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ہوا سے آپ جھجکنا، اپنی ادا سے آپ کھٹکنا!
چال میں لغزش، مُنہ پہ حیائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا!
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن، آپ نہ آئیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے کرنے
جو نہیں جائز اُس کی دعائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے

یہود اور موسیقی!

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غیر مذہبی موسیقی کی ممانعت سقوطِ یروشلم کے ساتھ ہی وارد ہوئی اور اس کے متعلق تمن یہ پیش کیا جاتا ہے، "اے اسرائیل قوموں کی طرح مارے خوشی کے مت پھول۔" (توراۃ، ہوسیع باب ۹ آیت ۱) لیکن واقعہ یہ ہے کہ آلات موسیقی اور غیر مذہبی غنا کی ممانعت سقوطِ یروشلم سے بہت پہلے کی ہے۔ یسعیاہ، عموس اور عیسیٰ بن سیراخ نے اس سے قبل ہی "شراب، عورت اور موسیقی" کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس شدید مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ فن موسیقی سے متعلق بہت سے غیر ملکی رواج بنی اسرائیل کے ملک میں داخل ہو گئے تھے، چنانچہ جب یونانی موسیقی نے فلسطین میں بڑھنا شروع کیا تو یہود نے حقیقتاً اس کو روکنا چاہا۔

معبد کی تباہی کے بعد یروشلم کا نالہ و بکا ہونے لگا۔ موسیقی کے معنی تھے مسرت اور یہود کے نزدیک برباد شدہ معبد کی موجودگی میں کسی مسرت کا امکان ہی نہ تھا۔ یہ اور وہ قدیم ممانعت جو "شراب، عورت اور موسیقی" سے متعلق چلی آتی تھی دونوں نے مل کر غیر مذہبی غنا کو حرام قرار دیدیا۔

اسلام کی آمد کے بعد موسیقی کی مخالفت کو اور تقویت پہونچی اور ائمہ اربعہ[1] نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں علمائے یہود اور اکثر علمائے اسلام کی رایوں میں بہت کم فرق ہے چنانچہ جس طرح یہود کے نزدیک لفظ زمرتی (بانسری بجانے والا) اوباش کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا اسی طرح مسلمانوں میں لفظ زمّارہ (بانسری بجانے والی عورت) فاحشہ کے ہم معنی ہو گیا۔

تاہم جس طرح مسلمانوں میں موسیقی کی حرمت پر کامل طور سے عمل نہ ہو سکا، اسی طرح یہود میں بھی اس کی ممانعت کا اثر محدود ہی رہا۔ حجاز اور یمن کے یہود میں یہ حرمت تسلیم نہیں کی گئی، روما میں چوتھی صدی تک پیشہ ور یہودی گانے والے ایکٹر اور شاعر ملتے ہیں، سلطنت بابل اور دوسری جگہوں میں غیر مذہبی موسیقی کے عدم جواز کی مخالفت کی گئی اور یہ مخالفت اتنی پرزور رہی کہ بالآخر اس مسئلہ میں ترمیم ہو کر رہی، اب جو ممانعت باقی رہ گئی، وہ صرف اس قدر کہ آلات موسیقی عام طور پر ممنوع قرار دیئے گئے اگرچہ تقریب پیورم (PURIM) اور شادی کے موقعوں پر ان کے استعمال کی عام اجازت دی گئی۔ بعض یہود نے اس قانون سے بچنے کی یہ صورت نکالی کہ مسلمان اور عیسائی گانے والے رکھ لئے۔

مشرق میں بارہویں صدی عیسوی تک یہود میں موسیقی کا پیشہ پایا جاتا تھا۔ اور عراق میں تو نوجوان واقعتہً تعطیل کے دنوں میں موسیقی کے ساتھ زبور پڑھتے تھے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اطراف میں موسیقی کا اثر بہت کم رہ گیا تھا۔ مغرب میں علاوہ اسپین کے یہود نے موسیقی کو پیشہ کے طور پر اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ البتہ اسپین میں عرب سلاطین اور خلفاء کے دور میں یہود نے اسے پیشہ اور علم دونوں حیثیتوں سے ترقی دی چنانچہ جب عیسائی اس ملک کے مالک ہوئے تو انھیں یہود کا عیسائی امراء سے شان و شوکت میں بڑھا ہونا ناگوار ہوا اور انھوں نے اس امر کی شکایت کی کہ یہود اپنے بچوں کو فن موسیقی میں دوسروں پر فوقیت لے جانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ نویں صدی میں المنصور سے لیکر بارہویں صدی میں

---

[1] موسیقی سے مراد اگر گانا (غنا) ہے تو متشدد علمائے احناف کے سوا اور کسی کے ہاں وہ ناجائز نہیں اور اگر اس سے مراد ساز اور باجے ہیں تو گو بعض علمائے ظاہر اس کی حرمت کے قائل نہیں، مگر جمہور آئمہ و علماء اس کو حرام کہتے ہیں۔ ابن حزم ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ مذہبی موسیقی حرام ہے اور غیر مذہبی مباح!

اسحق بن سمعان تک متعدد یہود ہیں جو فن موسیقی کے نہایت ممتاز ماہر شمار
ہوتے جاتے ہیں۔ [illegible] اشخاص بھی مثلاً یوسف بن افرائم جو الفانسو
[illegible] شاہ [illegible] کا خازن تھا اس فن کے ماہر تھے۔ بارھویں
صدی سے چودھویں صدی تک اسپین کے عیسائی دربار [illegible] یہودی موسیقی
داں پائے جاتے تھے۔

جہاں تک علم موسیقی کا تعلق ہے یہ علم اسحق بن سلیمان (متوفی ۹۳۲ء)
کے وقت سے جو اسحق اسرائیلی کے نام سے زیادہ مشہور ہے اعلیٰ تعلیم کے نصاب
میں داخل تھا۔ اسحق کا قول تھا کہ موسیقی علوم ریاضی میں آخری اور بہترین
علم ہے۔ بعض دوسرے اکابر یہود نے بھی علم موسیقی کی تحصیل فضل و
کمال میں شمار کی ہے۔

چند مصنفین کا خیال ہے کہ موسیٰ بن میمون جو قرون وسطیٰ کا مشہور
یہودی فلسفی تھا" ہر قسم کی شاعری اور موسیقی کا سخت مخالف تھا" لیکن
یہ خیال صحیح نہیں، اور موسیٰ کے کسی قول یا تحریر سے اس کی تصدیق نہیں
ہوتی۔ برخلاف اس کے اس نے بعض حالات میں معبد کے لئے موسیقی کی
اجازت دی ہے۔ وہ خود شعر کہتا تھا اور اس کی طرف سے گانے کی مخالفت
دراصل نفس شاعری کی مخالفت نہ تھی بلکہ مضمون شعر کی مخالفت تھی،
غیر مذہبی موسیقی کے متعلق موسیٰ بن میمون کی رائے تھی کہ رواج عام نظر
انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ "عقل قانونی صرف
اکثریت اور رائے عامہ کی موافقت کرتی ہے"۔ اسپین کے یہود کا ذکر اوپر آچکا ہے
مصر کی بھی تقریباً وہی کیفیت تھی۔ ایک ایسے فن کو جو متعین طور پر یہود کی مذہبی
اور معاشی زندگی کا جزو بن گیا تھا مذہباً حرام قرار دیدینا بے اثر رہتا۔ ان حالات
میں جو ممکن تھا وہ صرف اسی قدر کہ اس کو ایک معین حد سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے
علاوہ بریں موسیٰ پر متقدمین کا بھی کافی اثر تھا۔ جن یونانی مصنفین سے
وہ عربی زبان کی وساطت سے واقف تھا ان میں اس نے افلاطون اور
ارسطو کو فن موسیقی کا مداح پایا تھا۔ عرب مصنفین میں حنین بن اسحق —
(متوفی ۸۷۳ء) الفارابی (متوفی ۹۵۰ء) ابن سینا (متوفی ۱۰۳۷ء)
الغزالی (متوفی ۱۱۱۱ء) اور ابن باجہ (متوفی ۱۱۳۸ء) نے موسیقی کی عملی،
نظری، اور اخلاقی حیثیتوں سے بحث کی تھی۔ ان دلائل کی موجودگی میں موسیٰ
بن میمون موسیقی کی قدیم ممانعت کی مطلق تائید نہیں کرسکتا تھا۔

اسپین کے ایک دوسرے ممتاز یہودی ابن جبیرول متوفی ۱۰۵۸ء نے
اس مشکل کو آسان کر دیا تھا اس نے اپنی اصطلاح الاخلاق میں لکھا تھا کہ صرف
نغمات کا سننا ممنوع نہیں بلکہ ان ناشائستہ باتوں کا سننا ممنوع ہے جو ان
نغمات کے ساتھ کسی گیت میں شامل ہوں تاہم جیسا کہ اس نے لکھا ہے "انسان
کو ان مقامات سے واقف ہونا چاہئے جہاں گانے پر توجہ کرنے کی ضرورت
ہے اور جہاں مطلق گانا سننا ہی نامناسب ہے"!

موسیٰ بن میمون کہتا ہے کہ جس طرح اعتدال سے انحراف کرنے سے
جسم بیمار ہوجاتا ہے اسی طرح روح بھی بیمار ہوجاتی ہے اور جس طرح جسمانی
طبیب انسان کے جسم کا علاج کرتا ہے اسی طرح روحانی طبیب انسان کی روح
کا علاج کرتا ہے چنانچہ بحیثیت ایک اخلاقی طبیب کے وہ حواس کی اصلاح کیلئے
حسب ذیل ہدایات پیش کرتا ہے:

سامعہ۔ ستار اور بانسری کا نغمہ سننا!

باصرہ۔ خوبصورت تصویروں کا دیکھنا!

شامہ۔ خوبصورت باغوں میں چہل قدمی کرنا!

لامسہ۔ نفیس پوشاک پہننا!

ذائقہ۔ نہایت مزیدار غذائیں کھانا!

وہ کہتا ہے کہ ان چیزوں کو غیر اخلاقی یا غیر ضروری نہ سمجھنا چاہئے اور
قدیم ربیوں کے خیالات اپنے دعویٰ کی دلیل میں پیش کرتا ہے۔

اس باب میں موسیٰ بن میمون بعض مسلمان ارباب فکر سے متفق تھا۔
اس کے وقت میں اس موضوع پر عربی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود
تھا ان میں سے بعض کتابوں مثلاً ابن ابی الدنیا (متوفی ۸۹۴ء) کی ذم الملاہی
میں موسیقی کی شدید مخالفت کی گئی تھی، دوسری کتابوں مثلاً امام غزالی رحمۃ کی
"احیاء العلوم" اور آپ کے بھائی ابوالفتح مجدالدین کی "بوارق الاسماع" میں
اس فن کی موافقت میں معقول دلیلیں دی گئی تھیں۔ امام غزالی اور دوسرے
مصنفین جنھوں نے موسیقی کے جواز میں لکھا ہے یہ بھی لکھا ہے کہ حسب ذیل
صورتوں میں موسیقی ممنوع ہے!

(۱) اگر گانے یا بجانے والی کوئی عورت ہو!

(۲) اگر آلہ موسیقی پہلے سے ممنوع اور ناجائز ہو!

(۳) اگر گانے کا مضمون ناجائز ہو!

(۴) اگر موسیقی کسی شخص کو ایک ایسے کام پر آمادہ کر دے جو ممنوع ہو۔
(۵) اگر کوئی صرف فن کیلئے گانا سنے اور تفریح مقصود نہ ہو۔
حقیقتاً یہی چیز موسیٰ بن میمون کے یہاں بھی ہے یعنی آلہ اور راس کے درمیان فرق و امتیاز کرنا وہ دماغ کو تیز کرنے کی غرض سے علم ریاضی کی تحصیل مناسب خیال کرتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ریاضی کی مدد سے حساب کتاب یا تغلب کرنا چاہے جو ایک ممنوع فعل ہے تو اس سے علم ریاضی ناجائز نہ ہو جائیگا یہی صورت موسیقی کی ہے، اس کے نزدیک مطلق فن موسیقی ناجائز نہیں لیکن اصلی سوال یہ ہے کہ
"اس کا استعمال کیونکر کیا جا سکتا ہے؟"
"معارف"

خریداران عالمگیر کیلئے!

اشد ضروری اعلان!

عالمگیر کے انتظامی معاملات میں ردوبدل اور رجسٹروں کی ترمیم و تنسیخ کے باعث تمام خریدار حضرات کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں۔ آئندہ ہر قسم کی خط و کتابت کے وقت جدید نمبر خریداری (جو اس ماہ میں آپ کے نام کی چیٹ کے اوپر چھپا ہوا ہے) تحریر کیا کریں۔ آپ اپنی یادداشت کی کتاب پر سابقہ نمبر کاٹ کر جدید نمبر درج کر لیں تا کہ خط و کتابت میں سہو نہ ہو۔ نمبر خریداری کے ساتھ (ش-س) دو حروف چھپے ہیں جن حضرات کے نمبر کے ساتھ ش ہے ان کی میعاد خریداری خاص نمبر (دسمبر) سے شروع ہو کر نومبر میں ختم ہوتی ہے اور جن نمبروں کے ساتھ س ہے ان کی میعاد خریداری جون سالانہ نمبر سے شروع ہو کر مئی میں ختم ہوتی ہے۔

ہر قسم کی خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری تحریر کرنا ضروری ہے۔ ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف ــــ!

نیازمند منیجر عالمگیر لاہور۔

تخیلاتِ عالیہ

معلی القاب عالیجناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر دام اقبالہ امیر پائیگاہ

اس ستم کیش نے کی ترکِ جفا میرے بعد
للہ الحمد کہ اتنا تو ہوا میرے بعد

دہر سے نام محبت کا مٹا میرے بعد
اٹھ گئی رسم و رہِ مہر و وفا میرے بعد

خلق کہدے نہ اشارے سے کہ قاتل ہے یہی
ان کے دشمن نہ ہوں انگشت نما میرے بعد

پھول شمعِ سرِ مدفن کے پریشاں کر کے
گل کھلائے گی نئے بادِ صبا میرے بعد

روح بیتاب ہے پھر جسم میں آنے کیلئے
لبِ جاں بخش ہیں مصروفِ دعا میرے بعد

میرے دم تک ہے یہ سب سلسلۂ ناز و نیاز
یاد آئے گا بتوں کو بھی خدا میرے بعد

اڑ گئی آہ سے تاثیر تو نالوں سے کشش،
راس آئی نہ کسی کو یہ ہوا میرے بعد

میرے ہی خون کی پیاسی تھی مگر اے قاتل!
خشک لب کیوں ہے تری تیغِ ادا میرے بعد

خندۂ گل وہ نہیں نغمۂ بلبل وہ نہیں
رنگ بدلا چمنِ دہر نے کیا میرے بعد

قبر میں بھی دلِ صد چاک کو یہ الجھن ہے
کون ہو شانہ کشِ زلفِ دوتا میرے بعد

لے کے جاتی تو ہے مٹی مری اس کوچے میں
ہو نہ جائے کہیں بدنام صبا میرے بعد

میں نے اس رنگ سے کی بادہ کشی عالم میں
لبِ ساغر پہ ہے افسانہ مرا میرے بعد

اس قدر پاس رہا خلق کی راحت کا معینؔ
اپنے جینے سے ہیں دشمن بھی خفا میرے بعد

فاطمہ

از مسٹر حسن عزیز صاحب جاوید!

"آپا ماں! آج فرصت کا دن ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم چند لڑکیاں جنگل میں چھٹی منانے جائیں! اچھی آپا ماں اجازت دیجئے"

اس دن خدا جانے کیوں آپا ماں کی کالی، فولاد کی طرح چمکدار آنکھوں میں ایک ایک بات پر آنسو امنڈ آتے تھے۔ اتنی بات پر ان کی آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ اپنے سفید دوپٹے کے پلو سے بوڑھی آپا ماں نے آنسو پونچھے، فاطمہ پر محبت بھری اور فاتحانہ نگاہ ڈالی پھر کہا — "تمھاری خواہش مسترد کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ اذیت ہوتی ہے بھائی، اچھا جاؤ، لیکن دیکھو خبردار زیادہ دور نہ جانا کیونکہ شاید تمھاری ضرورت پڑے"۔

"ایسا ہے تو ہم نہیں جاتے، لائیے کیا کام ہے کریں"۔

"نہیں نہیں جاؤ، میں بلا لونگی، اور کون کون جا رہی ہیں؟"

"میں ہوں، کنیز، عائشہ ہے، صابرہ، زبیدہ، احفاظ، اور کون ہے بس"

"اچھا جاؤ، دیکھو پھر کہتی ہوں بہت دور نہ نکل جانا۔"

فاطمہ نے "بہت بہتر" کہا اور اچھلتی کودتی اپنی سہیلیوں کو اجازت مل جانے کی خوشخبری دینے کے لئے روانہ ہوگئی۔

فاطمہ کی چھوٹی بہن صدیقہ نے جو دیکھا کہ یہ لڑکیاں یتیم خانے کے باہر جا رہی ہیں تو وہ دوڑی دوڑی آئی، اپنی بہن کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور لجاجت کے ساتھ بولی — "اچھی آپا جان، ہم بھی تو جائیں گے!"

فاطمہ نے اس کے خوبصورت سنہری بالوں پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہا — "نہیں صدیقہ تم یہیں رہو، نعمت کے ساتھ گڑیاں کھیلو ہم بہت دور جنگل کو جا رہے ہیں، تم تھک جاؤ گی"

صدیقہ نے سر اٹھا کر پھر منت کی — "نہیں تھکیں گے، ہمیں لے چلئے اچھی آپا، ہم نے کبھی جنگل نہیں دیکھا۔"

فاطمہ کی سہیلیوں نے کہا "چلنے بھی دو۔ تھک جائیگی تو ہم لوگ تو ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دور گود میں لیں گے"۔

فاطمہ نے مسکرا کر کہا — "خیر جانی چلو، تم نے جنگل نہیں دیکھا ہے"۔

۲

مولوی نجیب الدین کا یتیم خانہ وسط شہر میں تھا۔ نصیر آباد والے نواب کی غدر کی پہلے والی کوٹھی میں واقع تھا جس کے در و دیوار شق ہوگئے تھے، کچھ گر گئے تھے چھت ٹپکتی تھی، کائی جم گئی تھی سفیدی نہیں پھرائی جاتی تھی، کھنڈر کھڑے تھے۔ تاریک کمروں میں منا‌ک بدبو آتی تھی۔ اجابت خانہ لاکھوں ڈھیلوں، نجاست اور مکڑی کے جالوں کا آماجگاہ تھا۔ اور ایک ہی تھا جس کی سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے۔ پنسل سے رہنے والوں نے ایک دوسرے کو بیشمار گالیاں لکھ لکھ کر اپنے گندے اخلاق کا نقش دوام چھوڑا تھا۔ کھٹمل ان گنت تھے اور خدا جانے ان کی کتنی پشتیں اس یتیم خانے میں گزر گئی تھیں مولوی نجیب الدین کا کام تھا، چندے کی رسیدیں چھپوا کر، ہمراہ لیکر جا بجا وعظ کہنا، ریاستوں میں جانا اور رؤسا اور عوام سے یتیموں کے لئے چندہ فراہم کرنا۔ اس کے بعد چونکہ وہ تھک جاتے تھے اس لئے یتامیٰ کو یتیم خانے کے رحم پر اور یتیم خانے کو یتامیٰ کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ ان میں جوش عمل کب پیدا ہوتا تھا جب عید ہو، بقرعید ہو، یا شب برات ہو، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے بچے بچیاں لمبی قطار میں تمام شہر کا گشت کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا علم ہوتا تھا۔ "یتیموں کو نہ بھولئے" ان کے آگے آگے ہوتے تھے خود مولوی صاحب۔ عیدگاہ میں ایک ایک پیسہ "عیدی" نمازیوں سے وصول کی جاتی تھی۔ بقرعید کے وقت قربانی کی کھالیں زکوٰۃ اور شب برات کے وقت حلوہ مانگنے خود مولوی صاحب اپنی فوج کے

سرغنہ بن کر جاتے تھے لوگ کہتے تھے کہ مولوی صاحب کے عالی شان مطبخ میں دس سیر گھی فی ماہ کا خرچ ہے۔ بہترین قورمہ پکتا ہے لیکن کیسا خرچ ہے اور کیسا قورمہ پکتا ہوگا اس کا علم ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو مولوی صاحب اور ان کی معتور اور طاقتور سُرخ و سپید اولاد کو دیکھکر کہتے ہونگے اور ان کے مقابلے میں یتامیٰ کو زردرو، مریض، سست دیکھ کر یہ خیال کرتے ہونگے کہ انھیں شاید ابالی دال کا پانی دیا جاتا ہوگا۔

بہرحال ان کے یتیم خانے کو دیکھنے کیلئے ایک دن مس مُراد بی۔ اے تشریف لائیں۔ ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بٹوہ بھی تھا۔ اگر دوسری کوئی خاتون آتیں تو مولانا اپنے دونوں چوڑے چوڑے ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر نعوذ باللہ منہا پڑھنے لگتے مگر وہ مس مراد کو بے پردہ اور ذرا نہ یتیم خانے میں آتا دیکھکر اور پھر بٹوہ دیکھکر محض اس خیال سے ایسا کرنا، بھول گئے کہ ان کا خیال اس بٹوے ہی میں اٹک کر رہ گیا کبھی ادہر کبھی ادہر گردن ٹیڑھی کر کے مولانا اول سے آخر تک اسی بٹوے کو دیکھتے رہتے شاید وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ اس میں کیا ہوگا؟ اور جب مس مراد نے چلتے وقت اپنا بٹوہ کھول کر بھی نہ بتایا کہ اس میں کیا تھا تب کہیں مولوی صاحب کا خیال دوسری جانب مائل ہوا اور آپ نے اپنی آقلیدس کے حساب سے مثلث داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے الوداعی فقرے چند احادیث سنانے کے بعد فرمائے "بے پردہ پھرنا بڑا عیب ہے"۔

مولوی صاحب بچوں سے زیادہ بالغ ہونے والی یتیم لڑکیوں کا خیال رکھتے تھے اور اگر کسی کے ساتھ ان کا ازدواج بھی عمل میں لاتے تو بدل ناخواستہ، اور پھر دولھا میاں سے خاص یتیم خانے کے لئے سو روپے کے نوٹ سے کسی طرح کم نہیں اپنی جیب میں ڈلوا لیتے تھے۔

مس مراد نے معاینہ کے دوسرے ہی دن شہر سے باہر ندی کے کنارے جس کے اس پار مختصر جنگل تھا ایک نئے یتیم خانے کی بنیاد ڈالی اور چھ ماہ کے اندر اندر شاندار عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ یتیم خانے کے صحن میں سبز لان، پھولوں کی کیاریاں۔ کھیل کے چونے کی لکیروں سے مزین میدان تیار ہو گئے۔ اتنی کمرے اوپر نیچے ملا کر تعلع کئے گئے تھے۔ وہاں پان کوئی نہیں کھا سکتا تھا تاک کی پیلی رطوبت کے نشان تک نہ لگا سکتا تھا۔ ہر کمرے سے ملحق علیحدہ غسل خانہ تھا۔ خوبصورت نیلے رنگ کے سستے کپڑے کے پردے ہر کمرے کے دروازے اور دریچوں میں آویزاں کئے گئے تھے۔ لوہے کا میز، لوہے کی دو کرسیاں، ہر ایک کمرے میں رکھی گئیں۔ پلنگ بھی لوہے کے تھے کیونکہ بقول مس مراد ان میں کھٹمل نہیں ہو سکتے تھے۔ روئی کے دس اور پندرہ برس تک ایک بار بھی نہ دھلنے والے گدیلوں کے بجائے آپ نے یہ ترکیب کی تھی کہ فی پلنگ چند سفید گدیلے نما غلاف بنوائے تھے اور ان میں چاول کا پیال بھر کر بچھا دیا جاتا تھا اور ہفتے کے بعد بدل کر دھونے دیدیا جاتا تھا صبح چار بجے پہلی گھنٹی بجتی تو بلا لحاظ موسم، تمام بچے بچیاں اور استانیاں اٹھ کر حوائج، غسل، لباس، آرائش سے فارغ ہو کر بڑے ہال میں جمع ہو جاتے۔ باجماعت نماز ہوتی۔ پندرہ منٹ تک تلاوت قرآن کی جاتی ٹھیک چھ بجے ناشتے کی گھنٹی بجتی، صاف طشتریاں اور رکابیاں، سادہ جو کے ستو اور شکر اور ایک ایک کانچ کے گلاس میں پانی ہر ایک کے سامنے رکھدیئے جاتے۔ میز پر سے گلاس اٹھا کر اپنے ہاتھ سے سب ستو بنا کر پیتے پھر باہر نکل کر ایک میدان میں پرا باندھ کر سب کھڑے ہو جاتے اور ہمنوائی سے اقبال کا مشہور ترانہ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" پُرجوش پردرد، پرخلوص لے میں گاتے تھے کیونکہ مس مراد کی دانست میں احیائے ملت کے لئے اس ترانے سے بہتر نہ کچھ تک موزوں کیا گیا ہے نہ کیا جاسکے گا۔ پھر خود مس مراد صرف پانچ منٹ تقریر کرتیں جو کبھی اولوالعزمی، صداقت پسندی، نصفت شعاری، اخوت، مساوات پر مبنی ہوتی کبھی پانچ منٹ میں تاریخ اسلام کے کسی واقعے کی یا صحابہ کرام کی سیرت پر ایک اجمالی تعارف ارشاد فرماتیں، اس کے بعد ۱۲ بجے تک درسی تعلیم، پھر کھانا، پھر ۴ بجے تک فنی تعلیم جو متعدد قدیم اور جدید فنون پر مشتمل تھی دی جاتی تھی ۴ بجے سے کھیل کود شروع ہو جاتا۔ رات کو تمام کمرے اندر گھس کر مس مراد خود اپنے اسٹاف کے ساتھ دیکھتی تھیں۔

مس مراد نے شادی نہیں کی تھی۔ عمر بھی تیس کے قریب ہو چکی تھی۔ ان کے والدین کی یہی اکلوتی بیٹی تھیں اور ابھی یہ بی۔ اے پاس بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ دونوں مہینے ہی بھر میں یکے بعد دیگرے دنیا کے بکھیڑوں سے سبکدوش ہو کر عدم کے سکون میں مفقود ہو گئے تھے، مس مراد نے مفارقت کا اتنا گہرا اثر لیا کہ تمام دولت قوم کے یتامیٰ اور مساکین کی فلاح میں خرچ کرنے کا تہیہ کر لیا اور گورنمنٹ کی ضمانت میں ملنے والا

اور اس کے سود سے یتیم خانے کے مصارف پورے کرنے لگیں۔ گو وہ باہر کے چندوں کی شرمندۂ احسان نہیں تھیں لیکن اخبارات میں چند سطور ان کے یتیم خانے کی مدح میں جو شایع ہوتیں انھیں پڑھ پڑھ کر مولوی نجیب الدین کو رونا آتا کہ ہم جو یتیموں کی خاطر مارے مارے پھرتے ہیں دن کو عید اور رات کو شب برات نہیں سمجھتے وہ تو بٹہ کھاتے میں گئے اور توصیف کی مستحق وہ ٹھہریں جو از سر تا پا یتیموں کو اس کروفر سے رکھیں کہ انھیں اپنی یتیمی اپنی غربت اور اپنے افلاس کی یاد بھی بھول کر نہ آنے پائے۔ نیز جس دن سے مس مراد کا یتیم خانہ کھلا مولوی نجیب الدین یتیموں پر زیادہ مہربان رہنے لگے مگر اپنے گھر والوں مثلاً تینوں لڑکوں سعید، اسعد، مسعود پر اور اپنی اہلیہ پر بہت بگڑتے تھے۔ مارتے بھی تھے۔ بکتے بھی تھے اور فقیر کا غصہ فقیر کی جان پر بھی نکالتے تھے۔

۳

جس دن لڑکیاں جنگل کی سیر کرنے گئی تھیں اسی دن کا ذکر ہے۔

فاطمہ نے پوچھا —— "آیاماں! آپ نے عظیمن خالہ کو بھیجکر ہم لوگوں کو اتنی جلدی کیوں بلالیا؟"

آیاماں بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگیں —— "بچی مس صاحبہ نے بلوانے کا حکم دیا تھا۔ صدیقہ کہاں ہے؟ اسے منہ ہاتھ دھلا کر اچھے کپڑے پہنا کر لاؤ تم سے نہ بنے تو میں کنگھی کر دوں گی اور ہاں اس کے سر میں وہ ریشمی لال فیتہ بھی باندھ دینا۔"

فاطمہ نے پوچھا —— "کیوں! کیا بات ہے؟"

آیاماں نے آنسو پونچھکر کہا —— "اب کیا بتاؤں" پھر ٹھنڈا سانس لیا۔

فاطمہ اپنی بہن کو بنا سنوار کر لائی تو آیاماں نے اسے گود میں لے کر دونوں گالوں کا بوسہ لیا اور مس مراد کے دفتر میں لے گئیں جہاں مسٹر رفیق بیرسٹر ایٹ لا اور ان کی انگریزی دلہن مارگریٹ جن کا اسلامی نام زینب رکھا گیا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور مس مراد سے یتیم خانے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی بارہ تیرہ اور بھی لڑکیاں لا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ فاطمہ نے جھک کر سلام کیا آیاماں نے صدیقہ سے کہا تم بھی سلام کرو۔ صدیقہ نے آداب کیا۔ پھر اسے آیاماں نے گود سے اتار کر لڑکیوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

مس مراد نے نو واردوں کو مخاطب کیا —— "لیجئے جناب اب آپ پسند کر لیجئے"

مسز رفیق کہنے لگیں —— "وہ بچہ تو دکھائیے جو آپ کہتی ہیں ابھی آیا ہے۔"

مس مراد نے کہا —— "آیاماں! نرس سنجیدہ کے پاس گوہر ہوگا ذرا اسے لانا۔"

آیاماں گئیں، تھوڑی دیر میں ایک سانولے سے بچے کو گود میں اٹھا لائیں جو بہت ستھرے لباس میں لایا گیا تھا۔ آیاماں نے اسے میز پر بٹھا دیا بیرسٹر صاحب اور ان کی بیوی اس کے قریب گئیں اور اسے ہش ہش کہہ کر چٹکی بجا کر کھلاتی رہیں۔ پھر اپنے شوہر سے انگریزی میں کہا کہ واقعی مس مراد کے یتیم خانے کا معیار کسی جرمنی اور فرانس کے یتیم خانے سے کم درجے کا نہیں ہے انھوں نے آیاماں سے کہا کہ بچے کو لے جاؤ۔ چنانچہ نرس سنجیدہ کو بچہ واپس کر دیا گیا۔

میم صاحبہ نے اپنے شوہر سے کہا —— "رفیق! مجھے تو یہ سنہری بالوں والی بچی پسند آتی ہے۔ کیسے پیارے بال ہیں۔ کتنا خوبصورت اور معصوم چہرہ ہے آنکھیں بڑی چمکدار ہیں۔ بالکل انگریزی بال اور انگریزی آنکھ ہے!" پھر وہ صدیقہ کے بالوں سے کھیلنے لگیں۔

ان کے شوہر بولے —— "مارگریٹ! یہ چمکدار سیاہ پتلیوں والی لڑکی جس کا حسن ہندوستانی خوبصورتی کا مکمل نمونہ ہے اسے لو۔ مجھے تو یہی لڑکی بہت پسند آتی ہے۔"

مارگریٹ کہنے لگیں —— "نہیں میں اسی کو پسند کر چکی ہوں۔ اچھا تمھیں اگر وہ پسند ہے تو دونوں کو رکھ لو۔ ایک میری لڑکی کہلائیگی ایک تمھاری۔" پھر ایک قہقہہ لگایا۔

بیرسٹر صاحب نے بھی اسی طرح قہقہہ لگایا اور مس مراد بھی قدرے متبسم ہوئیں۔

مارگریٹ نے پوچھا —— "اچھا مس صاحبہ ان بچیوں کے نام کیا ہیں؟"

مس مراد بولیں —— "صدیقہ اور ممتاز"

مارگریٹ نے کہا —— "رفیق! ہندوستانی نام بہت بھلے لگتے ہیں اچھا صدیقہ ہم تمھیں اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ ڈرو نہیں، تمھیں اچھے اچھے کپڑے پہنائینگے بہت کھلونے منگا دینگے۔ اچھی اچھی کتابیں دینگے۔ خوب مٹھائی کھلایا کرینگے ڈرو نہیں تمھارے لئے خوبصورت طوطے اور چڑیاں عمدہ پنجرے منگا دینگے تم ہمارے ہمراہ چلنا اچھا.. .. آج سے انھیں ابا جان کہا کرو اور ہم تمھاری ماں بنے جاتے ہیں۔"

سولہ سالہ فاطمہ اب تک متحیر کھڑی ہوئی تھی لیکن آخری کلمات سن کر وہ چونک اٹھی اور صدیقہ کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے گویا ہوئی — "ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میری بہن ہے۔ میں اسے جدا نہ ہونے دونگی۔ ہرگز نہ ہونے دونگی" پھر وہ آبدیدہ ہو کر لرزتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنی سسکیوں کو دباتے ہوئے مس مراد کو خطاب کرنے لگی — "مس صاحبہ! رحم کیجئے ابا کی وفات کے وقت یہ ایک برس کی تھی۔ آج چھ برس ہوگئے میں نے اسے اپنی چھاتی سے لگائے رکھا ہے۔ آپ میری بہن کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں آپ اور دوسری لڑکی دیدیجئے لیکن اسے نہ بھیجئے۔" پھر وہ رونے لگی۔ صدیقہ بھی رونے لگی۔

دونوں میاں بیوی ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے کی پھر مس مراد کی صورت تکنے لگے۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر مارگیرٹ نے اضطراب کے ساتھ پوچھا — "یہ لڑکی کون ہے؟"

مس مراد نے کہا — "صدیقہ کی بڑی بہن۔"

مارگریٹ منہ بنا کر کہنے لگی — "بڑی کریہہ المنظر لڑکی ہے دیکھو کتنی بھدی صورت ہے۔ ناک کیسی چپٹی اور بھونڈی ہے آنکھیں ذرا ذرا سی اندر کو گھسی ہوئی ہیں۔ دانت کتنے بڑے بڑے ہیں جیسے نکلے پڑ رہے ہوں، صدیقہ تو ایسی نہیں ہے۔"

آیاماں بول اٹھیں — "اونہہ! ماں کا پیٹ کمہار کا آوا۔"

فاطمہ کی صورت کالی پڑ گئی۔ اس نے اپنی بدصورتی کی نقشہ کشی آج ہی نہیں سنی اور دیکھی تھی۔ اسے ہمیشہ سے اس قسم کی نکتہ چینیوں کی عادت سی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے جی میں افسوس اور ملامت کر رہی تھی کہ خدا نے مجھے ایسا کیوں پیدا کیا ہے؟

مس مراد کرسی سے اٹھ کر فاطمہ کے پاس گئیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے کہا — "کیوں روتی ہو فاطمہ! پیاری بچی! کیا میں تمہاری دشمن ہوں؟ ایک رئیس اسے اپنی گود میں لے رہے ہیں۔ بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کرینگے۔ تعلیم و تربیت کا بار اٹھائینگے۔ شادی کر دینگے اپنی جائداد اس کے نام سے ہبہ کر دینگے تو اس میں کون سی بری بات ہے تم ناسمجھی کا ثبوت نہ دو۔ آخر ممتاز بھی تو جا رہی ہے۔ دونوں کا دل ایک دوسرے سے بہل جائیگا۔"

فاطمہ گویا پہلے سے بھری بیٹھی ہو۔ وہ زار و قطار رونے لگی اور اٹک اٹک کر کہا — "آپ کو ہم لوگ — اپنی — ماں — اپنا باپ — سمجھتے ہیں — اور آپ ہی ہم پر —"

مس مراد نے شفقت کے ساتھ کہا — "ہاں صحیح ہے، اور میں تمہاری معنوی ماں ہوں مگر فاطمہ! تم جانتی ہو سترہ سال کی عمر ہونے کے بعد یتیم خانے میں نہیں رہنے دیا جا سکتا کچھ نہ کچھ کام دلایا جاتا ہے۔ خود تم کو سال چھ مہینے میں ملازمت دلائی جائیگی یا عقد کر دیا جائیگا۔ اس صورت میں کیا تم صدیقہ کو یہاں اکیلی چھوڑ دوگی کہ نہیں اور اگر اپنی سسرال میں لیجاؤگی تو کتنی مصیبت اور بدمزگی کا سامنا ہوگا؟ مان جاؤ اس میں تمہاری اور صدیقہ کی بھلائی ہے۔ اتنی ضد اچھی نہیں۔ اسکا ساتھ دینے والے قبر میں جا سوئے تو تم کب تک ساتھ دوگی۔؟"

فاطمہ نے رو کر کہا — "خود تو دونوں چل بسے ہمیں تنہا یہ عذاب جھیلنے کیلئے چھوڑ گئے۔"

مس مراد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں بہہ کر رخسار پر جم گئیں وہ سکتے کے عالم میں خدا جانے کیا سوچنے لگیں پھر کہا — "تم قرآن پڑھتی ہو تم روز سنتی ہو، خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس میں بھی کوئی اس کی مصلحت ہوگی۔ ہر مصیبت کے وقت صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا تم راضی برضا نہیں ہونا چاہتی ہو؟"

فاطمہ نے آنسو پونچھ کر کہا — "اچھا تو مجھے اجازت ملنی چاہئے کہ میں صدیقہ کو ہمیشہ دیکھنے جایا کروں۔"

مارگیریٹ نے کہا — "ہمارے بنگلے کا پھاٹک تمہیں خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ کھلا رہیگا۔ تم شوق سے دیکھنے آیا کرو۔"

صدیقہ کو گود میں لینے کیلئے جب مارگریٹ بڑھیں تو وہ مچل گئی اپنی بہن کی ساری پکڑ لی لپٹنے ہاتھ جب ڈالے۔ فاطمہ بولی۔ "تو آپ جبر نہ کیجئے میں خود بہلا کر موٹر میں بٹھائے آتی ہوں۔" پھر وہ صدیقہ کو چھاتی سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

جب سب موٹر کی طرف روانہ ہوئے فاطمہ نے ممتاز سے کہا۔ دیکھو ممتاز تو بھی جا رہی ہے میری صدیقہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔ ممتاز نے جسارت کے ساتھ کہا۔ "بڑی آپا اس دن صدیقہ کو اختر علی مار رہا تھا تو میں نے کیسا پتھر کھینچ کر مارا تھا۔ آج طفیل کو صدیقہ کے بدلے دو تھپڑ مارے کہ نہیں سعید نے صدیقہ کے چٹکی لی تھی میں نے کس بری طرح نوچا تھا۔ اچھی! میرے رہتے کسی کی ہمت ہے جو اسے ستا لے۔"

۴

مسٹر عادل نے اخبار میں نرس کی ضرورت کا جو اشتہار دیا تھا اس کے جواب میں مس مراد نے فاطمہ کو ان کے ہاں اپنا خط دے کر بھجوا دیا اور مسٹر عادل نے اسے رکھ لیا۔ لیکن پہلے پہل تو دونوں میاں بیوی اس کی صورت دیکھ کر کچھ استحقار کی نظر سے اسے دیکھتے تھے ان کی آٹھ سالہ لڑکی ساجدہ اور لڑکا ماجد بھی اس دن باہر سے کھیلتے کھیلتے آئے تھے تو نرس فاطمہ کو دیکھ کر اس کے منہ پر اپنی ماں سے دونوں کہتے تھے۔ امی جان! اس نرس کی کیا بری صورت ہے کیا آبا میاں کو ننھے کے واسطے کوئی اور اچھی کھلائی نہیں مل سکتی تھی۔" مسٹر عادل کی بیوی بہت پشیمان ہوئی ہیں اور ان دونوں کو مارنے دوڑی تھیں۔

فاطمہ نے جاتے ہی چھوٹے ایک سالہ بچے کا چارج لے لیا۔ بچہ بھی اس سے اس قدر ہل گیا کہ ایک لمحہ اس کے بغیر نہ رہتا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر اسے چھاتی سے لگائے گنائے پھرتی۔ ارا روٹ کھلاتی۔ جھولا جھلاتی اور شام کو صاف ستھرے کپڑے پہنا کر ننھی سی گاڑی میں بٹھا کر تمام سول لائن کی سڑک پر ہوا خوری کیلئے لے جاتی تھی۔ صدیقہ میں بہت دن سے اس کا جی لگا تھا۔ فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ اس لئے ایک دن پانچ بجے شام کو اس نے مسز عادل کے ننھے کو اس کی گاڑی میں بٹھایا اور ہوا خوری کے بہانے سے گاڑی ڈھکیلتی ہوئی رفیق صاحب بیرسٹر ایٹ لا کے بنگلے پر جا پہونچی۔ پھاٹک کھلا تھا وہ گاڑی لئے لئے اندر جا پہونچی۔

سامنے برآمدے میں جو دہقانی ملازم کھڑا تھا اس نے ڈانٹ کر کہا ــــ "اے بغیر پوچھے پاچھے کون چلا آتا ہے، ٹھہر جا ــــ" اور خود پاس آکر بولا ــــ "کیا ہے؟"

"میم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میم صاحب کو نرس کی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس ابھی دو ننھی بچیوں کے واسطے دو دو نرسیں لگی ہیں۔"

"میں نرس نہیں ہوں۔"

"تو کیا بھکارن ہے۔ اب تک تو بھکارنیں اپنے بچوں کو میلے کپڑے پہنا کر گود میں لے کر آتی تھیں۔ تو گاڑی میں بڑا بنا سنوار کر لائی ہے۔"

"میری بہن کو میم صاحبہ نے گود میں لیا ہے۔ اس سے ملنا ہے۔ تم اطلاع کردو کہ یتیم خانے کی فاطمہ آئی ہے۔"

دہقانی ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں مارگریٹ برآمدہ میں کھڑی ہوئی ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھیں۔ فاطمہ نے قریب پہونچکر سلام کیا۔ وہ چیں بہ جبیں ہو کر گردن ہلا کر پوچھنے لگیں ــــ "کیا کام ہے؟"

"صدیقہ سے ملنے آئی ہوں ــــ اپنی بہن سے۔"

"تم تو مسٹر عادل کی نرس ہو گئی ہو نا؟ میں اپنی بچیوں کو ذلیل اور بدصورت نرس کا رشتہ دار نہیں ظاہر ہونے دینا چاہتی۔ تم یہاں سے چلی جاؤ لڑکیوں کو نظر مت آؤ ورنہ ان کا جی تھوڑا ہوگا۔ اچھا ٹھہرو ــــ"

مارگریٹ اندر گئی اور پھر آکر پانچ روپے کا ایک نوٹ فاطمہ کے سامنے پھینک کر جلدی سے کہا۔ "آج سے میں تمھاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ خبردار تم مت آنا۔ جاؤ یہ بخشیش لے جاؤ ــــ" اور پھر کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

فاطمہ کو بڑا غصہ آیا اور رونا بھی۔ اس نے زور سے نوٹ کو پھاڑ کر ہتھیلی میں تمام ٹکڑے رکھ کر دروازے کی طرف جہاں درزوں میں سے مارگریٹ جھانک رہی تھی پھونک مار کر اڑا دیا اور کہنے لگی ــ "دھوکے باز اور مکار عورت! کیا میں تیرے نوٹ کی بھوکی ہوں۔ خدا کرے میرا صبر تجھ پر پڑے۔ تو نے مجھے اپنی بہن سے چھڑا دیا۔"

دہقانی ملازم ڈانٹ کر کہنے لگا ــــ "نکلتی ہے کہ نہیں یہاں سے۔"

فاطمہ نے رو کر گرج کر کہا ــــ "جاتے ہیں۔" اور پھر روتی ہوئی بد دعائیں دیتی ہوئی۔ باہر نکل گئی۔ ملازم کہہ رہا تھا۔ "صورت چڑیلوں کی مزاج پریوں کے۔" یہ بھنک فاطمہ کے کان میں پڑی اور اس نے صاف طور پر سنا۔

شیر خوار بچے کو ام الصبیان ہو گیا۔ مسٹر اور مسز عادل سینما دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ فاطمہ گھبرا گئی۔ اس نے فوراً غلام بخش ملازم کو پکارا، پھر ٹیلیفون کا نمبر دیکھ کر سیول لائنس کے پرائیویٹ ڈاکٹر مینر کو فون کیا۔ تھوڑی دیر میں موٹر کار میں بیٹھ کر ڈاکٹر مینر آئے۔ بچے کی نبض دیکھی، دوا دی اور مسٹر عادل اور ان کی بیگم صاحب کے متعلق استفسار کیا۔ فاطمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ آپ جو دوائیں دینے کی ہیں وہ مجھے دیجائیں میں پلاتی رہونگی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس وقت تک موجود رہنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ نہ آجائیں۔

ڈاکٹر نے سگار سلگایا اور دھواں اڑاتے اڑاتے فاطمہ سے پوچھنا چاہا کہ تم کون ہو؟ یہاں کب سے آئی ہو؟ تمھارے والدین کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ مگر فاطمہ نے کسی سوال کا بھی جواب نہ دینا چاہا تو ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ البتہ نرس کے خط و خال دیکھ دیکھ کر وہ مسکراتا رہا۔ فاطمہ کو یہی خیال ہوا کہ وہ اس کی بھدی صورت کا دل ہی دل میں مضحکہ اڑا رہا ہے۔ وہ بہت سنجیدہ، ملول اور خاموش رہی۔

جب مسٹر عادل اور ان کی اہلیہ سینما دیکھ کر آئے تو خبر ملتے ہی پریشان ہو گئے۔ اندر آئے مگر ڈاکٹر کے اطمینان دلانے پر کہ بچہ سو گیا ہے انھیں تسکین ہو گئی، تاہم مسز عادل کا جی نہ مانا "میرے حسین" کہہ کر انھوں نے جونہی بچے کو گود میں لیا وہ چونک گیا اور رونے لگا اور مچلنے لگا۔ نرس فاطمہ نے جب اسے اپنے سینے سے لگا کر اور ہل ہل کر ٹہلنا شروع کیا تو بچہ چپ ہو گیا۔ پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ فاطمہ اگر ذرا لیکر بیٹھے یا اور کوئی گود میں لے تو روتا اور اگر وہ لے کر ٹہلتی تو آنکھیں بند کر کے گردن لٹکا کر اس کی چھاتی سے لگا رہتا اور چپ ہو جاتا۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد فاطمہ تمام رات بچے کو اسی طرح لئے ٹہلتی رہی۔ گھڑی کا تین بجے کا الارم ہو رہا تھا مسز عادل کی نیند کھلی دیکھا کہ فاطمہ برابر ٹہل رہی ہے۔ مسٹر عادل بھی بار بار آ کر دیکھ جاتے اور تحکمانہ لہجے میں اسے کہتے "بس سو جاؤ فاطمہ —!" وہ مسکرا کر کہہ دیتی کہ "مجھے نیند نہیں آتی"

صبح تک وہ ٹہلتی ہی رہی دونوں میاں بیوی اس کی نسبت تعریفی کلمات استعمال کرتے تھے جب دوسرے دن ڈاکٹر منیر دیکھنے آئے تو ان کے سامنے بھی فاطمہ کی خوبیوں کا تذکرہ ہوا۔ وہ سن کر مسکرا کر چپ ہو گئے۔

۵

مسٹر رفیق بیرسٹر کے یہاں اس سے جو بدسلوکی کی گئی تھی وہ مسٹر عادل مسز عادل، ڈاکٹر منیر پر ظاہر کرنے کے بعد وہ اکثر سوچتی تھی کہ ایک دن میں مس مراد کے یہاں بھی جاؤنگی اور ان سے ذکر بیان کرونگی۔ کچھ میں نے صدیقہ کو مول نہیں بیچا ہے لیکن یتیم خانے تک جانے کی اسے مہلت نہیں ملتی تھی کیونکہ بچہ اس سے اس قدر ہل گیا تھا کہ ایک لمحہ اس کے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اسی دوران میں پلیگ نمودار ہو گیا۔ سول لائنس خالی ہونے لگی خود مسٹر عادل اپنے بیوی بچوں کو باہر روانہ کرنے والے تھے۔ فاطمہ کو کسی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ اس کی بہن صدیقہ کو پلیگ ہو گیا ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی، پھر مسز عادل کے پاس جاکر رونے لگی انھوں نے کہا "میں اس گھر میں جہاں پلیگ کا مریض موجود ہے اس وقت تک جانے کی اجازت نہیں دے سکتی کہ تم میرے یہاں کام کر رہی ہو" فاطمہ نے اسی وقت کہا اچھا اب مجھے آپ کی نوکری کی ضرورت نہیں ہے اور پھر باہر نکل گئی۔ وہ اپنی بہن کو اس حالت میں کس طرح چھوڑ سکتی تھی؟ جب وہ پہونچی روتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ صدیقہ کا ننگ مرمر کی مورت کے مانند لاشہ باہر میز پر رکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر منیر اسے بغور دیکھ رہے ہیں۔ وہ جاتے ہی صدیقہ پر جھک گئی اور اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گال چومنے لگی اور چیخیں مارنے لگی۔ وہ مارگریٹ کو دیکھکر چلا کر بولی —

"تم ظالموں نے میری بہن کو مارا ہے"

مارگریٹ سوا اسے گھورنے اور اپنے ہونٹ چبانے کے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ڈاکٹر منیر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کہا "لاش سے الگ رہو تمھیں نہ پلیگ ہو جائے" تو فاطمہ نے کہا میں چاہتی ہوں کہ ہو جائے اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سر میز پر ٹیک ٹیک کر پھوڑ لیا۔ وہ ڈاکٹر منیر کے سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ اس کے بعد وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

مارگریٹ نے کہا — "خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب اس خبیث روح کو کسی طرح یہاں سے دفان کیجئے"

ڈاکٹر منیر نے برہم ہو کر کہا — "اگر یہ خبیث روح ہے تو اسے میں اپنے ہمراہ لئے جاتا ہوں، آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں اور دیکھئے وہ دوسری بچی کے جینے کی بھی آس نہیں ہے وہ صرف ایک گھنٹہ کی مہمان ہے"

پھر ڈاکٹر منیر نے خود فاطمہ کو اٹھا کر موٹر میں ڈالا۔ مارگریٹ نے ملازموں کو ہاتھ لگانے کا اشارہ کیا لیکن ڈاکٹر نے سب کو ڈانٹ بتادی کہ اسے کوئی ہاتھ نہ لگانا۔

۶

فاطمہ ڈاکٹر منیر کے بنگلے پر ایک ہوادار کمرے میں صاف بستر پر چپ چاپ چت پڑی تھی آج دس دن ہوئے جب مسٹر رفیق کے بنگلے سے ڈاکٹر صاحب اسے اٹھا لائے تھے۔ اسے پلیگ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے راتوں کی نیند حرام کی۔ اپنی

بڑی بہن رقیہ پر بھی اعتماد نہیں کیا جو فاطمہ کے آنے کے وقت ہی سے منہ بنائے
بنائے پھرتی تھیں اور دبی زبان سے کہہ دیا تھا کہ یہ لاثانی لڑکی کیوں لائے
ہو؟ دوسروں کی بلا اپنے سر کیوں لے رہے ہو؟ اب یہاں پلنگ پھیلی
جائیگا؟ مگر ڈاکٹر نے درشت نگاہ سے گھور کر کہدیا تھا — "رقیہ آپا تم
میرے معاملات میں ہرگز دخل نہ دیا کرو۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اگر اپنی جان
کا خوف ہے تو اپنی لڑکی کا ہاتھ پکڑو اور جاؤ۔ رقیہ سہم گئی اور پھر کچھ نہ کہا
لیکن درپردہ نوکر چاکر اور آنے جانے والوں سے ڈاکٹر کی حماقتوں اور
مجنونانہ حرکات کا تذکرہ کرنے لگی۔ اسے سب سے بھاری خوف یہ تھا کہ ڈاکٹر
کہیں اس لڑکی کو متبنیٰ بنانے کے لئے تو نہیں لایا ہے کیونکہ اس صورت میں
خود اس کی بیٹی زہرہ کا ٹھکانہ نہ رہے گا جسے ڈاکٹر کے اپنی بیٹی بنالینے کی
امید کی جاتی تھی۔

پلنگ کے بعد اسے سرسام ہوگیا تھا لیکن زندگی کی نحیف کرنیں طلوع
ہو رہی تھیں اور انجام کار فاطمہ روبصحت ہوگئی۔ اس نے ہوش میں آتے
وقت پوچھا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اور "صدیقہ آؤ"۔ "صدیقہ تم ہوا میں اڑ
رہی ہو" وغیرہ براتی تھی۔ ڈاکٹر منیر نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت
کردی تھی اور جب وہ اچھی ہوئی تو ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لیتے ہوئے کہا — "پیاری فاطمہ! آج سے تم ہماری بیٹی کہلاؤگی۔ دیکھو تم
اس گھر کو ناپسند تو نہیں کرتی ہو؟ یہ تمہارا گھر ہے۔"

رقیہ نے سب آڑ میں کھڑے ہوکر سن لیا تھا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں
اڑ رہی تھیں اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اپنی بچی کی راہ میں سے اس
کانٹے کو ہٹا دے۔

ڈاکٹر نے اپنی بھانجی زہرہ کو ہدایت کردی تھی کہ تم فاطمہ کے کمرہ کے
قریب بھی نہ پھٹکنا۔ اپنی بہن کو صاف صاف کہدیا تھا کہ اگر تم میرے ہمراہ
رہنا چاہتی ہو تو فاطمہ کے خلاف کسی قسم کی کوئی حرکت نہ کرنا نہ اسے اذیت
دینا۔ ملازموں کو حکم دیدیا تھا کہ اس گھر کی مالک آئندہ فاطمہ اور صرف فاطمہ
ہوگی اس لئے تم لوگ اس کا حکم نہ ٹالنا اور اس کی خاطر داری میں کوئی
دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔

ڈاکٹر منیر جب کبھی باہر سے آتے سب سے پہلا لفظ یہی نکلتا — فاطمہ!
تم کہاں ہو؟ ادھر آؤ۔" رقیہ اور زہرہ کو ڈاکٹر کی حرکات بہت شاق گذرتی
تھیں۔ ڈاکٹر فاطمہ کی دلجوئی میں اپنا سارا وقت گذار دیتا تھا۔

زندگی کی تیس بہاریں ختم ہوچکی تھیں مگر ڈاکٹر نے شادی نہیں کی تھی
اس کے دن اور راتیں تجرد کے المناک ماحول میں گزر رہی تھیں لیکن جس
دن سے فاطمہ آئی اس کا دل اداس نہیں رہنے لگا۔ جس طرح کوئی اپنے
طوطے سے باتیں کرتا ہو ڈاکٹر منیر فاطمہ سے گفتگو کرتے تھے۔ وہ اس کے بغیر
چائے تک نہ پیتے تھے۔ فاطمہ کو اجازت تھی کہ ان کے خاص کمرہ میں تنہا جب تک
چاہے رہے۔ لکھے۔ پڑھے۔ لیکن رقیہ بہن اور زہرہ بھانجی کو اندر داخل ہونے
تک کی ممانعت تھی۔ وہ دونوں حسد کی آگ میں جل رہی تھیں بھن رہی تھیں

فاطمہ نے بارہا سنا کہ رقیہ آنے جانے والی عورتوں سے اس کی طرف اشارہ
کرکے کہتی کہ بھائی پاگل ہوگئے ہیں۔ کہیں سے اس چڑیا کو پکڑ لائے ہیں اور
اس کی محبت میں لٹے جارہے ہیں۔ پھر سب مل کر قہقہے لگاتے فاطمہ دل
ہی دل میں کڑھتی لیکن کبھی ڈاکٹر سے شکایت نہ کرتی۔ ایک دن زہرہ
کی تمام ہم جماعت لڑکیوں کی دعوت تھی کیونکہ اس کی سالگرہ کا دن تھا فاطمہ
کو شرکت کی دعوت دی گئی مگر وہ قصداً نہیں گئی۔ البتہ اس نے پاس سے
نکلتے ہوئے سنا کہ زہرہ لڑکیوں سے کہہ رہی تھی — "ہاں یہی ہے وہ
لڑکی۔ بہت بدصورت ہے اس لئے صورت دکھاتے شرماتی ہے اس دن مسٹر
عادل نے اس کا ٹرنک اور اس کی نرس گری کی تنخواہ کا بقایا بیس روپے
بھیجے تھے۔ سبحان اللہ ٹرنک دیکھ کر یہی معلوم ہوتا تھا کہ حضرت نوح کی بیوی
نے دس دن کے طوفان کے وقت اپنے کپڑے لتے اسی میں سنبھال کر
رکھے ہونگے۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور فاطمہ خفیف ہوکر
جلدی سے چلی گئی وہ بہت دیر تک اپنے پلنگ پر اوندھے منہ گر کر روتی رہی
اور پھر ٹرنک کھولا۔ جس میں سے صدیقہ کے کچھ پرانے کپڑے بھی نکلے جنہیں
دیکھ کر اس کے جگر اور اس کے دل کے زخم ہرے ہوگئے اور وہ آہستہ
آہستہ اتنا روئی کہ گھگھی بندھ گئی۔

۷

ملازمہ نے آتے ہی کہدیا تھا۔ ڈاکٹر منیر دو دن کیلئے باہر گئے ہوئے
تھے اسی اثنا میں واردات رونما ہوئی۔ فاطمہ نے باوجود رقیہ کی منت سماجت
اور ہاتھ پکڑ کر روکنے کے اپنا مختصر سامان باندھ لیا اور دوبارہ یتیم خانے کو
چلی گئی۔ ڈاکٹر منیر کو رقیہ نے سہمگیں نگاہوں سے دیکھا اور سلام بھی کیا لیکن

اس کے ابروؤں پر بل تھا۔ ماتھے پر شکن تھے۔ دانت پیس رہا تھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کے بجائے قہر آلود نگاہوں سے رقیہ کو دیکھ کر کہا ——— "آپ کی خیریت اسی میں ہے کہ اپنی پہلی فرصت میں یتیم خانے جاؤ اور فاطمہ کو لے کر آؤ۔ اگر وہ نہ آئی تو تمہیں بھی یہاں سے نکل جانا پڑیگا اور اگر وہ آبھی گئی تو میں تمہارے لیۓ اور تمہاری بیٹی کے لئے دوسرا مکان دلا دوں گا لیکن اس کو تمہارے ہمراہ اور تمہیں اس کے قریب نہ رہنے دونگا"

رقیہ نے کانپتے ہوئے کہا ——— "منیر! آپ زبردستی کا اتہام لگا رہے ہیں، میں نے کیا کیا؟" پھر وہ رونے لگی۔

ڈاکٹر منیر نے کہا ——— "کیا تم نے اُسے گالیاں نہیں بکی تھیں۔؟ کیا وہ رو کر نہیں گئی؟ تم نے پھر خوف زدہ ہو کر اس کی منت سماجت نہیں کی اس نے تم سے وعدہ نہیں کیا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے مطلق شکایت نہیں کرونگی البتہ اس گھر سے نکل جاتی ہوں جہاں مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور میری توہین کی جاتی ہے اور آئندہ تمہاری لڑکی کی راہ میں کانٹا بن کر نہ رہوں گی ——— "

رقیہ نے کانپتے ہوئے کہا ——— "تم کیا کھڑے سن رہے تھے؟ پھر کس نے کہا؟ کس نے کہا؟"

ڈاکٹر جواب دیئے بغیر طیش کے ساتھ اٹھا موٹر پر بیٹھ کر اتنی ہی رات کو یتیم خانے گیا۔ آیا ماں، مس مراد اور چند استانیاں گھبرا کر اٹھ کر آئیں کہ اتنی رات کو کون آگیا۔ ہارن بار بار بجایا گیا تو وہ سب باہر نکلیں۔ ڈاکٹر منیر نے ان سے کہا ——— "فاطمہ کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ ورنہ میں خود اندر جا کر اسے تلاش کرونگا۔"

فاطمہ نے سب کو قسم دیدی تھی کہ اگر کوئی آئے تو اسے حوالے نہ کیا جائیگا اور نہ بتایا جائے کہ وہ یتیم خانے میں موجود ہے لیکن ڈاکٹر کو ایک بیخودی کے عالم میں، ایک مجنونانہ کیفیت میں سرشار دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کوئی اسے روک سکے کوئی اسے بہلا سکے۔ مس مراد نے کہا ——— "ڈاکٹر منیر! وہ اندر کے پہلے نمبر کے کمرے میں ہے لیکن وہ آپ سے آنکھ نہیں ملانا چاہتی البتہ وہ آپ کی پدرانہ شفقتوں کے لئے شکر گذار ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا ——— "نہیں میں فاطمہ کو کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتا مس مراد۔"

پھر ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ فاطمہ نے اسے دیکھتے ہی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور رونے لگی۔ ڈاکٹر نے تشفی آمیز طریقے سے چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ——— "اچھی فاطمہ! چلو اسی وقت چلو، دیکھو تمہارا باپ تمہیں لینے آیا ہے اگر تم نہ چلو گی تو خدا کی قسم میں بھی اسی جگہ بیٹھا رہونگا۔"

مس مراد اور ان کا سب اسٹاف آگیا تھا۔ آیا ماں کہہ رہی تھیں ———

"فاطمہ کیوں تم نہیں چلی جاتی ہو بٹیا! ڈاکٹر صاحب کس قدر منا رہے ہیں؟"

فاطمہ نے جوش گریہ کے ساتھ کہا ——— "آپ کیوں اس منحوس اور ڈراونی شکل کی لڑکی کے پیچھے پڑے ہیں ڈاکٹر صاحب! کیوں محبت کرتے ہیں؟ کیوں آپ اوروں پر مجھے فوقیت دیتے ہیں؟ آخر کیوں؟"

ڈاکٹر نے کہا ——— "میری آنکھوں کا تارا فاطمہ! کیوں؟ ہاں اس لئے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ تمام دنیا محض حیوانوں کی بستی نہیں ہے یہاں انسان بھی رہتے ہیں۔ میں تم پر واضح کرنے کے خیال سے محبت کرتا ہوں بیٹا، کہ ابھی جذبہ رحم، جوہر انسانیت، حسن خلق اور وصف شرافت سے دنیا بالکل خالی نہیں ہو گئی ہے۔ چلو اٹھو گھر چلیں۔"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں اشک امنڈ آئے اور جب اس نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو اس وقت اُس کے رخسار تر ہو گئے تھے۔

حسن عزیز جاوید

رباعی

دیکھا تو تھی جان فسونِ دیوانہ

لیکن سمجھے تو حجاب سے بیگانہ

سمجھے تو کیا ایک حقیقت ہے یہ

افسانہ تو افسانہ ہے افسانہ

عابد

ہندوستانی عورت

از علامہ امجد حیدرآبادی

خانۂ دل کی مکیں ہے عورت
ہمہ تن پردہ نشیں ہے عورت

نفی ہستی کوئی اس سے سیکھے
دیکھو ہو کر بھی نہیں ہے عورت

۲
ضبط سے تاب ہی کیوں تھک جائے
اف کبھی منہ سے نہ کرنے والی

کون ہے ایسی فدائے توحید
ایک کے نام پہ مرنے والی

۳
طلبِ نام و نمود اس کو نہیں
کوئی سمجھے کہ وہ جو اس کو نہیں

اب ہے اللہ کے سوا کیا باقی
ماسوا اللہ کا شہود اس کو نہیں

۴
نازِ دلبر بہ اہلِ دل محبوب ست
گرمیٔ زودۂ اسوائے ظلِ محبوب ست

زن چو بی تشوق و طلب محبوب جہت
زن منفعل ست و منفعل محبوب ست

۵
زن ہست اگر ز مرد و مشتق آمد
در عالمِ خلق مظہرِ حق آمد

بنگر بہ خصوص قولِ شیخ اکبر
مرآتِ مرآتِ نورِ مطلق آمد

مرزا حسرت دہلوی!

از جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی،

مرزا جعفر علی حسرت دہلوی خلف مرزا ابوالخیر دہلوی، ان کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ عطارنی پیشہ تھے اور اکبری دروازہ دہلی میں ان کی دکان تھی۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن ۱۱۷۳ھ میں جب عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے اور تمام شعرائے دہلی ان کے دربار میں ملازم ہوئے تو حسرت بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ اسی زمانہ میں غلام قادر خاں افغان خلف ضابطہ خاں کچھ افغانیوں کی فوج جمع کر کے لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کے دارالسلطنت میں آیا اور بادشاہ سے ملازمت کی درخواست کی۔ بادشاہ خود اس سے بدظن تھے اور اسی کے خوف سے مہاراجہ سندھیا کے نام طلبی کا فرمان جاری کیا تھا مگر اتفاق سے بادشاہ کا وہ فرمان اس کے ہاتھ لگ گیا۔ پھر کیا تھا وہ اسی وقت فوج لے کر بادشاہ کی بارگاہ میں گھس آیا اور چند افغانوں نے بادشاہ کو زبردستی تخت سے کھینچ کر بہت ایذا پہونچائی اور چھری سے بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور بیرحمی سے ایک سو اسی محلات کی بیحرمتی کی اور ان کو مارا۔

مرزا جواں بخت اور سلیمان شکوہ اور مرزا اکبر شاہزادوں کو لاٹھیوں سے مار کر قریب بہ ہلاکت پہونچا دیا اور خزانہ دریافت کرنے کے لئے محلات کو سخت تکلیف میں مبتلا کیا۔ شب کو فاقہ دیا۔ ذی الحجہ کے آغاز سے ۳ محرم تک ان بیکسوں پر آب و دانہ بند کیا۔ جب سب محلات کا نقد و جنس لوٹ لیا اور خزانے خالی کر دیئے تو تمام اسباب کشتیوں پر بار کر کے غوث گڑھ کو چلا گیا۔ حسرت نے یہ تمام واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس کا ایک مرثیہ نظم کیا جس میں لکھتے ہیں۔

"جہان آباد کا حال بھی مرثیہ سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ فلک نے اس پر یہ زوال نازل کیا ہے مگر ابر کا رومال منہ پر رکھ کر روتا ہے غنیم کے لشکر نے سارے شہر کو ایسا ویران کیا جیسے باد خزاں سے باغ برباد ہوتا ہے کوئی سیل ایسا نہیں لا سکتا تھا جیسا افغانیوں کے ظلم نے طوفان بپا کیا ہے ایسے حسین جن کی زلفیں سنبل سے بہتر تھیں جن کے خط و خال پر باغ کو رشک تھا ظالموں کے دست تطاول سے ایسے برباد ہو گئے کہ سب نقشہ مٹ گیا۔

جس شہر کی بہار سے کشمیر غرق شرم تھا جس کا ہر مکان بہشت تعمیر تھا۔ جس کے تمام مکان آئینہ خانہ تھے جس کے ہر کوچہ میں نہر جاری تھی۔ نہ اب وہ نہریں ہیں نہ شفاف پانی۔ جہاں عطر گلاب تھا وہاں مزبلہ پڑا ہوا ہے قلعہ معلیٰ کے پتھر اور ستون اور محراب جمنا کے کنارے شکستہ پڑے ہیں جس جگہ فرشتی ادب سے پیشانی گھستے تھے وہاں شریر دجال کا لشکر پڑا ہوا ہے۔

آخر ایسی حالت ہو گئی جو لوگ دولت رولتے تھے وہ خاک چھانتے پھرتے ہیں جہاں بلبل کا آشیانہ تھا وہاں اُلو بولتا ہے۔ اب نہ آئینہ خانہ ہے نہ آئینہ دیکھنے والے۔ پاؤں میں آبلے پڑے ہیں۔ جہاں کی جان شہر کا جسم شاہ عالم بادشاہ کو فلک نے ایسا غم دیا ہے کہ اس کے غم میں ہم مرتے ہیں۔ جس کے سخن میں طراوت اور زبان میں حلاوت تھی جس کی نگاہ سے ہمارا ایمان کو رونق تھی جس کے قدم سے زمانہ میں برکت تھی جو ہر علم و فن میں کامل تھا اور جس کے دم سے ہر فن و ہنر کے اہل کمال جمع تھے، کسی کو حسن پرستی کا شوق تھا۔ کسی کو موسیقی، کسی کو زہد کا ذوق تھا۔ وہ سب دام بلا میں گرفتار ہیں۔ ساری خوش الحانی جاتی رہی۔ تمام بلبل گلستاں اسیر غم ہیں۔ آب و دانہ کی حیرانی ہے۔ وہ شاخ کٹ گئی جس پر کہ یال کرتے تھے۔

بادشاہ صاحب تخت و تاج اپنی اولاد کی روزی کا محتاج ہے جس کو سارا ہند خراج دیتا تھا اس سے غنیم خراج لے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ شیر کو شغال شکار کرے۔

آخر فکر معاش سے تنگ آکر حسرت نے دہلی سے فیض آباد آنے کا قصد کیا کیونکہ اس وقت فیض آباد ہی اودھ کا دار السلطنت تھا اور نواب شجاع الدولہ سریر آرائے سلطنت تھے۔ فیاضیوں کے شہرے ہو رہے تھے۔ اہل دہلی اسی طرف منہ اٹھائے آتے تھے اور برسر روزگار ہوجاتے تھے حسن اتفاق سے ایام گرما میں اودھ کا سفر اختیار کیا جس کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

گرمی کا سفر ہے اور نہ سر پر سایہ　　خورشید نے محشر کا سماں دکھلایا،
جنگل اور دھوپ العطش کی فریاد　　فریاد کہ دشت کربلا یاد آیا،

اتفاق سے بہلی جو کرایہ کی تھی اس کے بیل بھی سست تھے اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

جیسا کہ سفر کیا ہے میں ایکی بار　　ایسا نہ کبھی سفر کیا تھا زنہار
کہتی ہے مجھے دیکھ کے گاڑی ہر بار　　حسرت ہوئے شیطان کے چرخے پہ سوار

راستہ کے گرد و غبار سے تنگ آکر کہتے ہیں۔

جتنے کہ سفر میں ہم کو دن بیتے ہیں　　کھانا نہ تو کھاتے ہیں نہ کچھ پیتے ہیں
اور جینے کا اسلوب جو ہم سے پوچھو　　ہم ان دنوں خاک پھانک کر جیتے ہیں

غرض بعد طے منازل فیض آباد میں داخل ہوئے اور اس شہر کی آبادی دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا اس میں مجملاً شہر اور اہل شہر کی مدح کی ہے۔

"کوئی مصور ایسا ہے کہ مجھے ایک ایسے شہر کا مرقع کھینچ دے جس کی سرخی غیرت گلہائے چمن ہو اور سبزہ اس کا سبزۂ جنت۔ باغ شہر عمارت درخت، گھانس، چاروں طرف ہو۔ قلعہ ایسا ہو جس پر جنگی توپیں چڑھی ہوئی ہوں قلعے کے برج بروج افلاک ہوں۔ ان میں ایسی نقاشی زر ہو جیسے ستارے چمکتے ہیں بارگاہ ایسی جہجاہ ہو کہ خسرو میر تزک بنے۔ فرش پر ایک ایسی مرصع کرسی بچھی ہو جس کی روشنی عرش تک پہونچتی ہو۔ زیب کرسی ایسا جوان ہو جس کا مثل و نظیر آج تک خلق نہ ہوا ہو۔ جابجا قرینہ سے منصبدار کھڑے ہوں۔ در دولت پر فیل سوار اور امیر کھڑے ہوں ایک طرف ارباب نشاط آکر حاضر ہوں کوئی گائے کوئی ناچے کوئی مجرے کو کھڑی ہو کر کے تال دے ڈھولک بجائے۔ سب کے پاؤں سے گھونگرو کی صدا آتی ہو۔ کوئی گت لینے میں ٹھوکر لگائے۔ اس شہر کا نام فیض آباد ہے اور والی اس کا شجاع الدولہ بہادر ہے"

اس قصیدے کے وسیلے سے دربار تک رسائی ہوئی اور کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ جب آصف الدولہ بہادر ۱۱۸۸ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو ان کی خدمت میں بھی ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع یہ ہے۔

یونہی اگر شگفتہ کریگی بہار گل　　لائے نہال خشک تلک ایکی بار گل

۱۱۹۵ھ میں آصف الدولہ بہادر نے بیت السلطنت لکھنؤ کو زینت بخشی تو مرزا صاحب بھی لکھنؤ آئے اور محمد خاں کے اصرار سے لکھنؤ میں گھنڈ بیگ کی گڑھیا پر سکونت اختیار کی۔

نواب محبت خاں ان سے بہت محبت کرتے تھے اور بقدر امکان خدمت سے دریغ نہ کرتے تھے۔ عہد نواب آصف الدولہ بہادر میں دہلی کے تمام شعرا لکھنؤ چلے آئے۔ شہزادہ مرزا جواں بخت، مرزا جہاندار شاہ بھی دہلی سے لکھنؤ میں آئے اور اپنی ناروا حرکتوں کے سبب سے بنارس جانے پر مجبور ہوئے۔

شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ نہایت تزک و احتشام سے لکھنؤ میں وارد ہوئے اور لو علی شاہ کے تکیہ پر قیام فرمایا۔ انھیں کے ساتھ میاں جرات تلمیذ رشید حسرت بھی آئے مگر نواب آصف الدولہ بہادر نے مرزا سلیمان شکوہ کی طرف التفات نہ فرمایا۔ بہت سی سفارشوں کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے چھ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کردی اور بنگلہ مرزا خلیل سکونت کو مرحمت فرمایا۔ بعد چندے مرزا سلیمان شکوہ نے جنرل مارٹین کی کوٹھی خرید کی اور اس میں ان کا دربار ہونے لگا۔

جرات کی بھی تنخواہ مقرر ہوگئی۔ لیکن جرات اپنے استاد کے مکان کے قریب سکونت پذیر ہوئے۔ اس زمانہ میں دہلی کے لوگ خاص خاص محلوں میں سکونت پذیر تھے۔

جرات اور حسرت لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور داد سخن لیتے تھے لکھنؤ اپنے دہلوی مہمانوں کی حد سے زیادہ قدردانی کرتا تھا یہاں تک کہ یہ غریب نصیب اپنے وطن کو بھول گئے اور غریب الوطنی

میں بادشاہی ہوگی۔ حسرت جو ٹوٹی پھوٹی بہلی پر دہلی سے فیض آباد آئے تھے فیض کی بادسے لکھنؤ میں آتے ہی فنس پر سوار ہو کر نکلنے لگے۔ اسی تحرک سے شعراء لکھنؤ نے کہا۔ دیکھئے ایک عطار پیشہ بھی لکھنؤ آ کر شعرا میں داخل ہوگیا۔

دہلی کے شاعر تو ملک الشعرا، میر تقی میر، مرزا سودا، سوز، آنشار میر حسن، شاہ حاتم، میر درد وغیرہ ہیں لیکن اب تو دہلی سے جو کوئی آتا ہے، شاعر آتا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ مرزا حسرت بھی دہلی کے متقدمین میں شامل تھے اور فن شاعری سے بخوبی ماہر تھے کلام بہت اچھا تھا دہلی تباہ نہ ہوتی تو ایسے لوگوں کی صورت لکھنؤ کو دیکھنا نصیب نہ ہوتی غرض کہ لکھنؤ میں وطن فراموشوں کی ایک خاص جماعت ہوگئی تھی آپس میں رقابت کا مادہ پیدا ہوگیا تھا۔ ایک شاعر دوسرے کی منقصت چاہتا ہجویں لکھتا تھا۔ گالی گلوچ اور مار پیٹ کی نوبت آجاتی تھی۔

حسرت کی بہت منقصت کی گئی۔ مرزا رفیع السودا نے ان کی ہجو لکھی ہے مگر حسرت نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ صرف ایک مرتبہ حکیم صاحب نے ان کی روزی کے بارے میں کچھ رخنہ ڈالنا چاہا تو حسرت نے بھی قلم اٹھایا۔ ہجو لکھی اور خوب لکھی جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔

"احتیاج کی بیماری میں ہر شخص مبتلا ہے۔ بہت سے پیٹ کے مارے طبیب بن بیٹھے۔ جس فصل میں بیماری کا زور ہوا دو چار مریض ان کے پاس بھی آنے لگے۔ اپنے گھر میں عطار کو بٹھا کر مریضوں کو لوٹنے لگے۔ نبض پر ہاتھ رکھا۔ کچھ نسخہ لکھ دیا ان میں سے ہمارے بھی ایک آشنا ہیں کہ آدمیوں کو خدا کے واسطے قتل کیا کرتے ہیں۔ خود مجنوں ہیں مگر طبابت کرتے ہیں۔

جب آپ قلم ہاتھ میں لیتے اور نسخہ لکھتے ہیں تو اجل بھی رونے لگتی ہے کہ نہ معلوم کس بیگناہ کے قتل کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ اس غریب کی قسمت میں موت نہ تھی مگر یہاں آ کے بے اجل مرا۔ ملک الموت نے آپ کو ادب سے سلام کر کے کہا کہ ہر چند میرا پیشہ ہے کہ کسی امیر و غریب کو نہیں چھوڑتا لیکن آپ سے ایک عرض ہے کہ خدا کے واسطے اس کی جوانی پر رحم کیجئے۔ آپ اس کی جان سے درگذر کیجئے۔ تمہارا نسخہ، نسخہ سامری ہے۔ ایسی سامری نہ کرو۔ مریض تو نسخہ دیکھتے ہی مر جائیگا۔ اس کے اعزہ و اقربا تباہ ہو جائیں گے تم کو کیا ملے گا۔

غرضکہ حکیم صاحب کی ذات سے موت کا بازار گرم ہے۔ گھر گھر سے رونے کی آواز آتی ہے۔ اس کے ہاتھ سے اتنے ذی حیات فنا ہوئے ہیں کہ مردہ شو اور گورکن دولتمند ہو گئے ہیں چوتھائی کمیشن کفن دوز اور ثلث گورکن سے مقرر ہے۔ جہاں گور و تابوت دیکھئے سمجھ لیجئے کہ حکیم صاحب کی کارستانی ہے ان کے ہاتھ سے قلم سینہ چاک دعا کرتا ہے کہ حکیم صاحب ہلاک ہوں تو میری گردن سے مظلمہ جاتا رہے۔ خدا اس ظالم کو دنیا سے جلد اٹھالے۔

صرف میزان طب پڑھی ہے اور مطب کا نام دان رکھا ہے۔ اس پر ارسطو اور افلاطون کو نام رکھتے ہیں۔ تپ میں ساتویں دن جلاب دیتے ہیں۔ اور بواسیر میں ثنا کی پھلی استعمال کراتے ہیں سنگرہنی کے استعمال میں حب السلاطین بتاتے ہیں۔

مجھے کئی دن سے بخار آتا ہے میرے دل میں خیال آیا کہ یہ شفیق ہیں علاج کرینگے تو سوء مزاج سے مفر ہوگا سب حال اپنا بیان کیا آپ نے نبض پر ہاتھ رکھا بہت غور و فکر کے بعد کہا۔

مہربان میری عقل گم ہے کہ اس درد سے تم کیونکر زندہ ہو۔ اس پر سرسام بھی ہے آپ کی نبض نملی اور مسطرقی ہے اس بیماری کا علاج تو افلاطون سے بھی نہ ہو سکتا مگر میں مزاج پا گیا ہوں کچھ روپیہ خرچ کرو تو علاج ہو سکتا ہے نہیں تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔

میں نے کہا کہ مہربانی سے نسخہ تو لکھ دیجئے۔ حکیم صاحب نے فرمایا مرچ اور کافور ایک ایک دام عشبہ مغربی ۲ ماشہ انھیں کھرل کر کے دہی کے ساتھ پی جاؤ۔ غذا سوئے کا ساگ کھانا پھر کل آ کر نبض دکھانا۔

بھلا بیمار کو شفا کس طرح حاصل ہو جب حکیم صاحب کی تشخیص کا یہ حال ہے کسی نے آج تک صرع اور سرسام کو جمع ہوتے سنا ہے۔ صرع اور سرسام دونوں کے مواد متناقض ہیں۔ دونوں امراض سر ہیں نبض نملی اور مسطرقی ایک جا جمع نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا تعجب ہے۔ مجھے کسی کی ہجو مقصود نہیں ہے حقیقت حال بیان کر دی۔

مرزا حسرت نے دو ایک رباعیاں بھی ہجو میں کہی ہیں۔ ایک دیوان قصائد کا ہے دو دیوان عاشقانہ غزلوں کے ہیں ایک دیوان مخمس مسدس اور ترجیع بند کا ہے۔ ایک دیوان رباعیات کا ہے مختلف صنعتوں میں

رباعیاں کہی ہیں۔ یہ مجموعہ کلیات سنہ ۱۲ ھ میں تیار ہو گیا۔ مدح رسالتمآبؐ میں جو قصیدہ کہا ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

شیخ و سجادہ و اسلام و حرم چاروں ایک
عاشق و بتکدہ و کفر و صنم چاروں ایک

تذکرہ میں لکھا ہے مرزا صاحب رائے سرپ سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ حسرت کی شاعری کا فروغ دہلی سے ہوا۔

حسرت اور جرأت کا مکان دیوار بدیوار تھا۔ ایک اندھے اور ایک ضعیف مگر زمانہ نے دونوں کی قدر کی۔ مرزا حسرت ہمیشہ رؤسا کے دربار میں پالکی پر سوار ہو کر جاتے تھے اکثر اوقات سارا دن ملاقات میں گذر جاتا تھا۔

ایک سال برسات کی شدت سے مرزا حسرت اور شیخ جرأت دونوں کے مکان منہدم ہو گئے۔ بضرورت نواب محبت خان کے بنگلے میں جانا پڑا۔ جو بہت دنوں سے بے مرمت پڑا ہوا تھا۔ اس کے حال میں رباعی لکھی ہے۔

حسرت یہ سخن میری زباں سے نکلا
بنگلے میں رہا سو خانماں سے نکلا
پانی میں جو ڈوبے تو نکل سکتا ہے
پر کیچ میں جو پھنسا نہ یاں سے نکلا

مرزا حسرت بھی مصحفی کی طرح کثیر التلامذہ تھے مگر ان سب شاگردوں میں شیخ جرأت کا مرتبہ بلند ہے اول تو انھیں استاد کی یکجائی نصیب ہوئی ہر وقت کا پاس بیٹھنا پاس اٹھنا۔ دوسرے خدمت گذاری تیسرے طبع خداداد۔

کہتے ہیں کہ سنہ ۱۲۱۷ھ میں حسرت کا انتقال ہوا اگر یہ بات قرین قیاس سے بعید ہے اس واسطے کہ شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ خود سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ آئے تھے اور برسوں کے بعد انھیں وقار حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد حسرت کا سلسلہ ان کے یہاں قائم ہوا اور کچھ تنخواہ مقرر ہوئی۔ بہر حال ان کے سن وفات کا صحیح پتہ نہیں معلوم ہو سکا۔ محلہ گھسنا بیگ کی گڑھیا میں انتقال فرمایا اور وہاں کسی مسجد کے قریب پختہ قبر بھی ہے لیکن کوئی کتبہ اس پر نہیں ہے۔ حسرت کچھ بیمار نہ تھے۔ مدت سے بوجہ ضعف پیری گوشہ نشین تھے۔ شہر کے امرا و رؤسا شاگرد بہت کچھ خدمت کرتے تھے۔ اچھی طرح بسر ہوتی تھی۔ جب سے لکھنؤ آئے ہمیشہ فنس پر سوار ہو کر گھر سے نکلا کئے۔ باوجود اس اعزاز اس جاہ و حشم اس قابلیت کے آج نہ ان کے خاندان کے کسی آدمی کا پتہ ہے نہ کوئی شخص ایسا ہے جو قبر کا صحیح صحیح پتہ بتا سکے۔

کیوں مرے خوں سے شمشیر کو آلودہ کیا
آپ نے تیغ اٹھایا مجھے آسودہ کیا
اٹھ گئے داد جو دیتے تھے سخن کی حسرت
کہہ کے اشعار میں قلم کو بھی فرسودہ کیا

دل پر نہیں اختیار اپنا
افسوس گیا قرار اپنا
لایا نہ کوئی چراغ و گل یاں
بیکس ہی رہا مزار اپنا

کون سا رنج فلک ہم نے گوارا کیا
شہرہ مجنوں کا دیا نام ہمارا نہ کیا

غیر کو عید کے دن تم نے ہم آغوش کیا
سال بھر رشک سے میں خون جگر نوش کیا
روزن در سے جو دیکھا کہ صدا سن کے مری
شمع محفل کے تئیں آپ نے خاموش کیا
ہم نہ کہتے تھے کہ حسرت نہ مل ان خوباں سے
تو نے دیوانے کسی کا نہ سخن گوش کیا

تلف ہونا تھا جی کھونا تھا، گھر اپنا ڈبونا تھا
دلا سب کچھ تجھے کرنا تھا اک عاشق نہ ہونا تھا
کھلے ہے گل سے شبنم باغ میں دونو تھے ہم لیکن،
تری قسمت میں ہنسنا تھا مری قسمت میں رونا تھا
بہایا تو نے حسرت دل کو اس چاہ زنخداں میں
مراجی خوش ہوا ایسی ہی جا اس کو ڈبونا تھا

بھلا یا عشق کی وحشت نے جو دیکھا نہ دیکھا تھا
سبھی آبادیاں دیکھی تھیں اک صحرا نہ دیکھا تھا
خدا جانے کہاں تھی عقل جب میں دل دیا اس کو
کسی نے قدر میرا کام تو بیجا نہ دیکھا تھا

سہواً قلم سے شکوہ جو تیرا رقم ہوا
فوراً زبان چاک ہوئی سر قلم ہوا

نہ ہوتا آہ میں پروردہ چمن اے کاش
قفس ہی ہوتا سدا سے مرا وطن اے کاش

ہم کو نہ درد نے نہ قضا نے کیا ہلاک
اس کے ستم اور اپنی وفا نے کیا ہلاک

لگی سر سے لے پاؤں تک اس کے آتش
کہے شمع سوز نہانی کہاں تک

وہ ہے عمر اور عمر سو بیوفا ہے — یہاں یار کی مہربانی کہاں تک
مرا رنگ دیتا ہے منہ پر گواہی — چھپے عشق کی پھر کہانی کہاں تک

میں کیا کہوں کہ کیا ہے بجھا دیکھیے ہے دل — آتش کدہ بجھا ہے تو ماتم کدہ ہے دل
ناصح تو آہ رونے سے مت منع کر مجھے — کیونکر نہ روؤں میں کہ مرا گم ہوا ہے دل

آہ صیاد تو کیا پوچھے ہے بادل کی خبر — دیکھ تک جاکے چمن میں در و دیوار کا حال

قطعہ

کل روتے ہوئے جو اتفاقاً — حسرت کے مزار پر گئے ہم
پڑھتا تھا یہ شعر وہ تہ خاک — بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم
واماندوں پہ دیکھیے کہ کیا ہو — اپنا تو نباہ کر گئے ہم

گو میں نہیں جلاد کی تلوار سے محروم — پر چشم ہی باندھے رکھا دیدار سے محروم
جب فصل گل آئی تو پھنسے دام میں جاکر — ایسی ہے ہم یوں گل و گلزار سے محروم

غنیمت جانو جو دم یہاں ہیں ہم — کوئی دم میں کہاں تم پھر کہاں ہم
بغیر از گریہ جو آتا ہے گا ہے — نہیں رکھتے کوئی اب مہرباں ہم
نہ ہم کو گل دیا نے کچھ ثمر ہی — کسی لائق نہ تھے اے باغباں ہم

کٹ نہیں سکتی شب غم اور کوئی ہمدم نہیں
یا یہ شب ہے سخت دل یا صبح تجھ میں دم نہیں

یہ غلط گمان کریں ہیں سب کہ فنا کے بعد بقا نہیں
ترے عشق میں جو کوئی موا اسے زندگی ہے فنا نہیں
کسے حسرت اتنا دماغ ہے کہ ہر اک کے ناز اٹھائیے
جو ہے زندگی تو جئیں گے ہم وہ صنم کسی کا خدا نہیں

ہوں چراغ کشتہ مجھکو کیا کرے گل آتشیں — اے صبا پیدا کرے یا لعل دل آتشیں
اے جنوں آنسو بھی اپنے پونچھنے کو کچھ نہیں — جیب و داماں سب ہے تختۂ اشک ہے گل
وصل کا وعدہ کیا تھا اس نے نکلا جو کوئی
کھینچ لی دھوکے سے میں نے بے تامل آستیں

دل کا جگر کا دوستو یا جی کا اپنے غم کریں — کس کس کو روئیں بیٹھ کر کس کس کا ہم ماتم کریں
نالے پہ حکم قتل ہے روئیں تو روئیں کس طرح — فرمائیے جو کچھ ہمیں اے مہرباں اب ہم کریں
کچھ حال حسرت کا مجھے دکھلائی دیتا ہے زبوں
کیا خوف ہے اس وقت گر بیٹھیں اس پر دم کریں

اس لئے میری چشم پر نم ہیں — ایک دل اور سیکڑوں غم ہیں
حسرت اس کی رضا جو ہو سو ہو — ہر طرح ہم تو شاد و خرم ہیں

برنگ لالہ دل داغدار رکھتے ہیں — جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں

ہوئے ہم سب کے بندے برہمن سے راہ رکھتے ہیں — حرم کے رہنے والو تم سے عشق اللہ رکھتے ہیں

دوستوں کا دیکھنا اس دور میں ہر دم کہاں
دم غنیمت ہے عزیزو تم کہاں اور ہم کہاں
لوگ کہتے ہیں کہ ہیں ابرو ترے مانند تیغ
تیغ کے مانند ہیں پر تیغ میں یہ خم کہاں

اب تو یہ دل اک بت ناآشنا کے ہاتھ ہے
جس کے ہاتھوں چھوٹنا اس کا خدا کے ہاتھ ہے

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

وارداتِ رقیق!

حضرت عابد تھانوی

جس کو جہاں میں چشمِ حقیقت نگر ملے
ممکن نہیں کہ ان کو بھی تیری خبر ملے

ہیں ہم بھی کس قدر نگہِ ناز آشنا
ہر شے میں دہر کی ہمیں تم جلوہ گر ملے

کچھ وہ بھی سرگذشتِ محبت سمجھ سکیں
یارب! انھیں بھی لذتِ دردِ جگر ملے

تو نے نیاز مند بنایا، ہزار شکر،
اب اس قدر دعا ہے ترا سنگِ در ملے

ہیں تشنہ ہم بھی دیدۂ میخانہ نوش کے
ساقی! ہمیں بھی جرعۂ جامِ نظر ملے

یہ کیا کہا کہ ہم نہیں جاتے کسی کے گھر
تم جب کبھی ملے ہیں، دشمن کے گھر ملے

اہلِ چمن کو راحت پنہاں کہاں نصیب
گلشن میں چاک چاک گلوں کے جگر ملے

اس درجہ ناتمامیٔ الفت میں لذتیں،
یارب! مری دعا کو نہ بابِ اثر ملے

عابد سناؤں ہجر کی غمناک سرگذشت
گر راہ میں کہیں وہ بُتِ فتنہ گر ملے

آئینہ

ایک بہترین فرانسیسی افسانہ کا معرکۃ الآرا اردو ترجمہ

از جناب ایس اے جلیل صاحب بی۔ اے

بی۔ ٹی

پہلا خط

پیاری اینی!

تمہاری خواہش بھی کتنی عجیب و غریب ہے۔ تم ایک ایسی ہستی کے خط کی آرزو مند ہو جس کو قدرت نے بینائی کی نعمت سے محروم کر دیا ہے اور جو خود نہیں دیکھ سکتی کہ اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے حروف کاغذ پر کیسے نقوش پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ایک نابینا کے لکھے ہوئے خطوط کتنے غیر دلچسپ اور خشک ہوں گے۔ تم ایک بینائی سے محروم ہستی کو بھی اپنی ہی طرح خوش و خرم سمجھتی ہو۔ کاش تم کو ایک اندھی لڑکی کے دل کا صحیح علم ہوتا۔

پیاری اینی، تم ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہو۔ آہ دیکھنا! ہاں صرف دیکھنا —— قوت بینائی بھی کتنی عجیب و غریب شے ہے نیلا آسمان، چمکتا سورج، شام کا جھٹپٹا۔ صبح کا سہانا وقت۔ تاروں بھری رات اور دیگر —— دل خوش کن مناظر، اندھیوں کے نصیب میں کہاں؟ یہ سچ ہے کہ ایک زمانہ میں میں قدرت کے اس بے بہا عطیہ کی مالک تھی مگر اس زمانہ کو بھی زمانہ گذر گیا۔ جس وقت میں نے اپنی بصارت کھوئی اس وقت میں دس برس کی تھی۔ اب میری عمر پچیس سال کی ہے آہ! پندرہ سال کا طویل عرصہ! جن چیزوں کو میں نے دس سال کی عمر تک دیکھا تھا اب ان کا نقشہ تک میرے ذہن میں نہیں۔ میں گلاب کے پھول کو اس کی خوشبو سے پہچان سکتی ہوں۔ میں پھول کو ہاتھ میں لے کر اس کا نام بتا سکتی ہوں مگر میں اس کے دل آویز رنگ کو نہیں دیکھ سکتی جس سے خوبصورت اور حسین عورتوں کے مسحور کن رنگ کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ بعض اوقات تاریکی کی چادر میں مجھے کچھ چمکتے ہوئے دھبے نظر آنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ دوران خون کی علامت ہے اور اسی وجہ سے ان کو امید ہے کہ شاید میں اپنی بصارت —— قدرت کے بے بہا عطیہ کو دوبارہ حاصل کر سکوں! مگر یہ سب مجھ کو مطمئن کرنے کی ترکیبیں ہیں جو لڑکی پندرہ سال سے بینائی کی نعمت سے محروم ہو وہ اب اسے دوبارہ حاصل کر سکے۔ یہ خیال خام ہے۔ ہاں شاید دوسری دنیا میں خدا اتنا نامہربان نہ ہو۔

کل ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جب کہ میں ٹٹول ٹٹول کر اپنے کمرہ میں داخل ہو رہی تھی۔ میرا ہاتھ ایک آئینہ پر پڑا۔ بس اس کے مقابل کھڑے ہو کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ ایک عجیب و غریب خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ کاش میں آئینہ میں اپنی شبیہ دیکھ سکتی۔ کاش میں دیکھ سکتی کہ میں خوبصورت ہوں یا بدصورت کاش مجھ کو معلوم ہو جاتا کہ علاوہ نابینائی کے میرے چہرہ میں اور کوئی نقص تو نہیں۔ بچپن میں سنا تھا کہ جو لڑکیاں دیر تک آئینہ دیکھتی ہیں ان کو اس میں شیطان نظر آنے لگتا ہے۔ مگر افسوس میں اس سے بھی محروم ہوں۔

تم نے اس خط میں جو مجھ کو ابھی پڑھ کر سنایا گیا ہے۔ دریافت کیا ہے

کہ آیا یہ سچ ہے کہ بینک کے فیل ہو جانے کی وجہ سے میرے والدین کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا میرے خیال سے تو ایسا نہیں ہوا! میرے والدین خوش قسمتی سے کافی امیر ہیں میری ہر آرزو فوراً پوری کی جاتی ہے۔ سامان عیش کی کسی وقت کمی نہیں۔ کمرہ میں جس طرف میرا ہاتھ پڑتا ہے۔ مخمل۔ ریشم اور بہترین کپڑے ہی پر پڑتا ہے۔ میرا کمرہ قیمتی ساز و سامان سے سجا ہوا ہے اور مجھ کو ہر روز بہترین سے بہترین اور مزیدار سے مزیدار کھانے کو ملتا ہے اس لئے میری پیاری ایی میں کہہ سکتی ہوں کہ تم کو یہ خبر غلط ملی ہے۔

پیاری ایی! تم ابھی حال میں انگلینڈ کی سیر و تفریح سے واپس آئی ہو کیا اپنی غریب اندھی بہن کو بذریعہ تحریر دوران سفر کی چند تفریحات سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دو گی۔

دوسرا خط

پیاری ایی!

تم نہیں خیال کر سکتیں کہ میں تم کو آج کیا لکھنے والی ہوں۔ تم اتنا ہنسو گی کہ تمھارے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور کچھ عجب نہیں کہ تم کو یقین ہو جائے کہ میں بصارت کے ساتھ ہی ساتھ عقل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔ سنو! میرا بھی ایک چاہنے والا پیدا ہو گیا ہے۔

سچ بہن! مجھ اندھی کو بھی خدا نے ایک عاشق صادق عطا کیا ہے اس میں تعجب ہی کی کون سی بات ہے کیا محبت کا اندھی ہونا ثابت نہیں۔ اگر دو اندھے ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو کیا تعجب ہے؟

وہ ہمارے گھر کس طرح آیا اس کا مجھکو علم نہیں۔ مگر ہاں میں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ کل دوپہر کے کھانے پر میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا اور میرے ساتھ بہت ہمدردی ظاہر کر رہا تھا۔

"یہ پہلا موقع ہے" میں نے کہا "کہ مجھکو آپ سے شرف نیاز حاصل ہوا۔"

"سچ ہے۔" اس نے جواب دیا "مگر آپ کے والدین سے میرا پہلے سے تعارف ہے۔"

"چونکہ آپ کے پاس میرے والدین کیلئے جذبہ ہمدردی موجود ہے لہذا میری طرف سے بھی خوش آمدید قبول فرمایئے۔" میں نے کہا۔

"صرف آپکے والدین ہی سے مجھکو ہمدردی نہیں ہے۔"

"ان کے علاوہ اور کس سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ سے" اس نے مختصر جواب دیا۔

"مجھ سے؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مجھے آپ سے محبت ہے۔"

"مجھ سے؟ مجھ سے محبت ہے؟ آپ کو؟"

"سچی والہانہ محبت!"

ان الفاظ کو سن کر مجھے شرم آنے لگی اور میں نے اپنے منہ پر رومال رکھ لیا۔ وہ خاموش رہا۔

"آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے کہا "کیا میرے الفاظ، میرا چہرہ، اور میرے جذبات میرے اقبال کا ثبوت بہم نہیں پہونچاتے؟"

"ہو سکتا ہے۔" "مگر میں تو اندھی ہوں، نابینا اور بینا میں بہت فرق ہے"

"مجھ کو اس کی پرواہ نہیں نعمت بینائی کی محرومی کی وجہ سے میں آپ کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

اس نے کہا اور اس کے لہجہ سے بناوٹ قطعی نہیں ظاہر ہو رہی تھی "میرا اس سے کوئی ہرج نہیں۔ کیا آپ کا چہرہ مسحور کن نہیں؟ کیا آپ کے اعضا متناسب نہیں؟ کیا آپ کی چال فتنہ انگیز نہیں؟ کیا آپ کا رنگ سفید نہیں؟ کیا آپ کے بال سنہرے اور ملائم نہیں؟ کیا آپ کا تبسم دل خوش کن نہیں؟ بینائی کی غیر موجودگی آپ کے دیگر اعضا کی خوبصورتی پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ آپ یقیناً بہت خوبصورت ہیں۔"

وہ اپنی تقریر ختم کر چکا مگر اس کے الفاظ برابر میرے کان میں گونج رہے تھے۔ کیا سچ مچ میں ایسی ہی ہوں، جیسا اس نے بیان کیا۔ کیا در اصل میں خوبصورت ہوں؟ کیا میں بھی حسین چہرہ، لانبے اور سنہرے بال متناسب الاعضا اور مسحور کن تبسم کی مالک ہوں؟ —— میں ایک اندھی پیاری ایی! دوسری لڑکیوں کے لئے ان کا عاشق کچھ بھی ہو مگر ایک اندھی لڑکی کے لئے اس کا عاشق کسی طرح ایک آئینہ سے کم نہیں۔

میں نے کہا۔ "تو کیا در اصل میں حسین ہوں؟"

"اتنی حسین کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔" اس نے جواب دیا۔

"اور مجھ سے آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں بہت زور سے ہنسی۔ "آپ کی ستم ظریفی کی بھی حد ہو گئی۔ آپ کی میرے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ایسی ہی ہے جیسی دن کی خواہش رات کے ساتھ شادی کرنے کی ہو۔ میں ہرگز کسی کے لئے وبال جان ہونا پسند نہ کرونگی۔ میں کیسی ہی حسین سہی مگر یقیناً میں اپنے شوہر کے لئے وبال جان ہونگی۔ نہیں! مجھے شادی کی کوئی ضرورت نہیں، میرے والدین کافی امیر ہیں۔ میں اپنی تمام عمر اسی طرح گزارونگی۔"

تیسرا خط

میری پیاری اینی!

آج میں تم کو ایک بہت ہی روح فرسا خبر سنانے والی ہوں۔ آہ! جبکہ میں تم کو یہ واقعہ لکھ رہی ہوں میری بے نور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اس اجنبی کی ملاقات سے چند روز بعد ایک دن جبکہ میں اپنی والدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے باغ میں ٹہل رہی تھی ملازمہ نے پریشانی کے لہجہ میں میری ماں کو آواز دی۔

"کیا بات ہے اماں؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں بیٹی۔" اماں نے جواب دیا "امیری کی زندگی بھی ایک لعنت ہے۔ ہر وقت ہم کو سوسائٹی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔"

"اچھا تو آپ جایئے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو اس صورت میں نہیں روک سکتی اپنے ملاقاتی کو شرف ملاقات بخشئے۔"

میں نے اپنی والدہ کے سرد ہونٹ اپنی پیشانی پر محسوس کئے اور اس کے بعد میں تنہا رہ گئی۔

ابھی اماں کو گئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مجھکو ایسا معلوم ہوا گویا دو شخص آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کو میری موجودگی کا علم نہ تھا۔ پیاری اینی جب خدا کسی انسان سے ایک قوت چھین لیتا ہے تو دوسری قوت زیادہ تیز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ ایک بینا کے نابینا کی قوت سامعہ زیادہ زبردست ہوتی ہے اگرچہ وہ دونوں بہت آہستہ باتیں کر رہے تھے مگر میں ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ صاف سن رہی تھی۔

"آہ! ان غریبوں کی حالت یقیناً قابل رحم ہے۔ دلال پھر موجود ہیں" ایک بولا۔

"مگر غریب لڑکی کو اس صورت حال کی قطعاً خبر نہیں۔ اس کو خیال تک نہیں کہ اس کی بصارت کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے والدین اس کو خوش رکھتے ہیں۔"

"آخر تمھارا کیا مطلب ہے؟" پہلے نے پوچھا۔

"یہ سچ ہے" دوسرے نے جواب دیا۔ "کہ جس طرف وہ اپنے کمرہ میں ہاتھ ڈالتی ہے اس کو مخمل اور ریشم ہی ملتا ہے اگرچہ ریشم کا رنگ اور مخمل کے روئیں تک اڑ گئے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنی میز پر اس کو بہترین اور لذیذ کھانے چنے ہوئے ملتے ہیں مگر اس کو کیا معلوم کہ کس کامیابی کے ساتھ اس کے والدین اپنی غریبی کو اس سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس کو کبھی یہ گمان تک نہیں ہو سکتا کہ اس کے ساتھ ہی دوسری میز پر اس کے والدین کو سوکھی ہوئی روٹیوں کے سوائے اور بھی کچھ کھانے کو ملتا ہو۔"

پیاری اینی کیا کہوں! مجھ پر تو بجلی گر پڑی۔ باوجود اپنی تباہ حالی کے وہ مجھ کو خوش کر رہے تھے۔ میرے لئے لذیذ سے لذیذ غذا موجود تھی۔ آہ ماں باپ کی محبت! کیا دنیا میں اس سے زیادہ اور کوئی نعمت مل سکتی ہے؟ بڑی سے بڑی دولت بھی اس محبت کو نہیں خرید سکتی۔

چوتھا خط

میں گھر کی حالت سے واقف ہوں۔ میں نے کسی پر اس راز کو ظاہر نہیں کیا۔ میری ماں کو یہ سن کر کس قدر صدمہ ہوتا کہ ان کی بیٹی کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہم غریبی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں اب تک اسی طرح زندگی بسر کر رہی ہوں جس طرح پہلے بسر کرتی تھی۔ مگر میں نے اپنے والدین کو اس تکلیف سے جو ان کو میری وجہ سے پہونچ رہی ہے نجات دلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

مسٹر اڈمنڈ ایک دن مجھ سے ملنے آئے اور میں نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ چھیڑا "کیا آپ اب تک میرے لئے اپنے دل میں وہی جذبہ رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں" انھوں نے جواب دیا۔ "میں آپ کی محبت سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

"مگر آپ کو مجھ سے کیوں محبت ہے؟ — ایک اندھی سے۔"

"آہ! آپ بہت حسین ہیں۔"
"اور میرا جسم؟"
"سرو کی طرح سیدھا"
"اور میری پیشانی؟"
"ہاتھی دانت کی طرح سفید اور چمکدار"۔
"کیا سچ مچ؟" میں نے کہا اور زور سے ہنسنے لگی۔
"کیوں، آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟"
"مجھے اس خیال سے ہنسی آرہی ہے کہ آپ میرے لئے ایک آئینہ کا کام کر رہے ہیں، میں آپ کے الفاظ میں اپنا عکس دیکھ رہی ہوں۔"
"کاش ہمیشہ ایسا ہو، کاش آپ ہمیشہ کیلئے مجھکو اس خدمت کے لئے منتخب کرلیں۔"
"تو کیا آپ راضی ——— ؟"
"ہاں ہاں! میں آپ کا وفادار آئینہ بننے کے لئے تیار ہوں۔ میں ہمیشہ کامیابی کے ساتھ آپ کے اوصاف اور آپ کے حسن کا عکس اپنے الفاظ کے ذریعہ آپ کے دماغ پر ڈالا کرونگا۔ بس ایک لفظ ہاں! اور اس لفظ کے ساتھ آپ ایک وفادار کو حاصل کرلوں گی۔ خدا کے فضل سے میں کھاتا پیتا ہوں آپ کو میری ذات سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ اور آپ کی ہر خواہش کی تکمیل کو میں اپنا فرض منصبی خیال کروں گا۔"
فوراً ہی مجھ کو اپنے والدین کی بے بضاعتی کا خیال آیا جن کو میری شادی میری فکر سے نجات دلا سکتی تھی۔
"اگر میں آپ سے شادی کا اقرار کربھی لوں تب بھی مجھ کو ایک گو نہ افسوس ہی ہوگا۔ تھوڑے دن بعد آپ کو رنج ہوگا اور آپ کو زندگی بھر اپنے فعل پر پچھتانا پڑیگا۔ خوب غور کر لیجئے میں اندھی ہوں۔"
"آہ! اس نے ایک دلدوز لہجہ میں کہا: مجھے بھی آپسے ایک بات کہنی ہے۔ اب تک میں نے اس کو آپ سے چھپایا۔ مگر اب میں اس کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔"
"کہئے کہئے۔"
"میں بھی خدا کا ایک بدقسمت بندہ ہوں۔ حسن اور خوبصورتی سے مجھے دور کا لگاؤ بھی نہیں۔ چیچک نے میرے چہرے کو خاصہ بگاڑ دیا ہے۔ بدصورت کمزور اور نحیف الجثہ اور اسی وجہ سے ایک اندھی کے ساتھ شادی کا ارادہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ میں خود غرض ہوں۔"
میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔
"جو کچھ آپ نے فرمایا ممکن ہے درست ہو مگر مجھکو یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ ہمیشہ نیکی اور اچھا سلوک کریں گے۔ میں رشتہ کے لئے تیار ہوں۔ میرے خیالات کو کوئی شئے آپ کی طرف سے نہیں بدل سکتی آپ کی محبت میرے تاریک اور بنجر ریگستان میں نخلستان ثابت ہوگی۔"
میں بُرا کر رہی ہوں یا بھلا۔ پیاری اینی میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی مگر ہاں! میں اس طرح اپنے والدین کی نجات کا ذریعہ ضرور بن رہی ہوں۔ شاید بصارت کی عدم موجودگی کے باوجود میں نے سیدھا راستہ ٹٹول لیا ہو۔

پانچواں خط

پیاری اینی!
تمہاری مبارکباد کا شکریہ! ہاں میری شادی کو دو ماہ کا عرصہ ہوگیا اور میں بہت آرام دہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ دنیا میں شاید ہی مجھ سے زیادہ اور کوئی عورت خوش ہو۔ مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بغیر میرے کہے ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے۔ میرے والدین نے بھی مجھ کو نہیں چھوڑا ہے اُدھر میرے ساتھ ہی میرے والدین کا بھی خیال رکھتا ہے۔
جس دن میری شادی ہوئی تو میرے خاوند نے ——— جس کو میں اب تک ایک آئینہ سے مخاطب کرتی ہوں۔ مجھ کو بتایا کہ میری شادی کس شان سے ہوئی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ میری نقاب بہت بہترین تھی۔ میرا لباس امیرانہ تھا اور میرا جسم رنگ برنگ کے پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ جلی آئینہ بھی اور کیا بتاتا؟ شام کو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر باغ میں ٹہلتے ہیں۔ وہ ہر رنگ کا پھول توڑ کر مجھ کو دیتا ہے اور اس کا نام اور رنگ بتاتا ہے۔ چڑیوں کی آواز سے ان کی شناخت کراتا ہے پھل توڑ کر ہاتھ میں دیتا ہے اور ان کا نام بتاتا ہے۔ میں ٹٹول کر اس کو یاد رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بعض اوقات ہم تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں اور وہ اپنی عقل اور قوت بیانیہ سے مجھ کو ہر وہ بات ذہن نشین کراتا ہے

جس کو میں دیکھ نہیں سکتی۔

خود نہیں معلوم کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ مگر ہاں مجھے یہ ضرور معلوم ہو لیا ہے کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔

اچھا بہن الوداع! دعا کرو کہ میری بہار بے خزاں رہے۔

پیاری اینی!

اب میں ایک ماں ہوں۔ ایک چھوٹی سی بچی کی ماں۔ مگر افسوس میں اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ نیلا آسمان دیکھنے کی مجھے خواہش نہیں رنگ برنگ کے پھول اور خوبصورت پرندوں کو دیکھنے کی مجھے آرزو نہیں۔ تاروں بھری رات سے اگر میں لطف اندوز نہیں ہو سکتی نہ سہی۔ شام کا جھٹپٹا اور صبح کا سہانا منظر اگر میری قسمت میں نہیں تو نہ سہی۔ اپنے ماں، باپ، عزیزو اقارب حتیٰ کہ اپنے خاوند کو نہ دیکھنے پر میں صبر کر سکتی ہوں مگر میں افسوس یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی بچی کو نہ دیکھ سکوں۔ جتنے عرصہ تک بجلی کی چمک ٹھہرتی ہے۔ میں تمام عمر خوش و خرم رہوں گی اور میری زندگی آرام و سکون سے گذر جائیگی۔ آہ! —— ماں کی محبت،

اس وقت میرا خاوند بھی میرے لئے آئینہ ثابت نہیں ہو سکتا اس کا یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ میری بچی کے بال چمکدار ہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں اور ہر وقت اس کے ہونٹوں پر تبسم —— ساحرانہ تبسم، کھیلتا رہتا تھا۔ یہ سب کچھ سہی مگر آہ! جس وقت وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ میری طرف پھیلاتی ہو گی —— میں نہیں دیکھ سکتی۔

ساتواں خط

میرا خاوند میرے لئے کسی طرح فرشتہ رحمت سے کم نہیں۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو وہ آج کل میرے لئے کیا کر رہا ہے؟ وہ گذشتہ سال سے میری لاعلمی میں یہ کوشش کر رہا ہے کہ میں کسی طرح اپنی بینائی کو دوبارہ حاصل کر لوں۔ وہ بذات خود ڈاکٹر ہے —— ایک کامیاب ڈاکٹر —— مگر میری خبرگیری کی وجہ سے اس نے اپنے پیشہ کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے اس نے مجھ سے کل پوچھا۔

"کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے خدا کی ذات سے کیا امید ہے؟"

"ہاں ممکن ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ لوشن جس کے متعلق تم نے دریافت کیا تھا کہ کس لئے ہے اور میں نے کہا تھا کہ یہ تمہارے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے میں تیار کر رہا ہوں دراصل وہ ایک اپریشن کے لئے تیار کر رہا تھا یہ اپریشن اپنی نوعیت کا ایک ہی ہوگا۔"

"کس اپریشن کے لئے؟"

"تمہاری آنکھوں کے۔"

"مگر تمہارا ہاتھ تو نہیں کانپے گا؟"

"جو کام دل سے متعلق ہو اس میں ہاتھ نہیں کانپتا۔"

اور میں نے اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا —— "پیارے [illegible] نہیں فرشتہ ہو۔"

"پیاری" اس نے کہا۔ "ایک دفعہ پھر اسی گرمجوشی سے میرا بوسہ لو موجودہ خوشی اور خواب کے دن مجھے اچھی طرح گذارنے دو۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے پیارے؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ خدا کی عنایت سے تم بہت جلد اپنی بصارت دوبارہ حاصل کر لو گی۔"

"اور پھر؟"

"اور پھر، تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ تمہارا خاوند کتنا بدرو، کریہہ المنظر اور نحیف الجثہ ہے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گئی اور میں نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔ "پیارے اڈمنڈ! اگر تم کو میری محبت پر بھروسہ نہیں۔ اگر تم کو یقین ہے کہ بینائی حاصل کرنے کے بعد میں تم سے نفرت کرنے لگوں گی تو تم مجھ کو اس تاریکی ہی میں بھٹکنے دو۔ مجھ کو بصارت کی قطعی ضرورت نہیں۔"

اس نے جواب میں صرف میرا ہاتھ دبایا۔ میری ماں نے مجھ کو بتایا کہ اپریشن ایک ماہ بعد ہوگا۔

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ان روایات کے مطابق جو معتبر کہی جا سکتی ہیں اپنے خاوند کی تصویر اتارنا شروع کی۔ اماں نے بتایا تھا کہ ان کے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے اور گہرے گہرے داغ ہیں۔ پاپا نے کہا تھا کہ ان کے سر پر ایک بال تک نہیں اور ملازم کہتا تھا کہ وہ ——

بڈھے ہیں۔ اگر ان کے چہرے پر چیچک کے گہرے گہرے داغ ہیں تو یہ خدا کی مرضی ہے۔ سر پر بال نہ ہونا عقلمندی کی دلیل ہے۔ مگر ہاں بوڑھا ہونا نفسیاً قابل رحم ہے اور وہ بھی اس وجہ سے کہ کہیں بڑھاپے کی وجہ سے وہ جلد مر گئے تو میری دلدہی کون کریگا۔

پیاری بہن میں اس وقت عجیب چکر میں ہوں۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ میری مدد کرے۔

آخری خط

میری پیاری ایمی!

نتیجہ معلوم کرنے کی خوشی میں کہیں خط کا آخری حصہ نہ دیکھنے لگنا۔ کم از کم تم بھی تو میری طرح رنج اور خوشی کے متضاد جذبات کو برداشت کرو۔ دو ہفتہ گذرے میری آنکھوں کا اپریشن ہوا۔ ایک کانپتا ہوا ہاتھ میں نے اپنی آنکھوں پر محسوس کیا اور دو دلدوز چیخوں کے بعد میں نے دیکھا کہ مجھکو دن کی روشنی صاف نظر آ رہی ہے۔ فوراً ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ میں نے کھوئی ہوئی بصارت پھر حاصل کرلی تھی۔ صرف چند دن کی ہمت اور تھوڑا سا صبر اور درکار تھا۔ زندگی کا بہترین عطیہ حاصل کرنے میں میں اڈمنڈ کی ممنون تھی۔

دوران علاج میں میں نے ایک ایسی بیوقوفی کی کہ سب کی کرائی محنت خاک ہو جاتی۔ ہوا یہ کہ نوکر میری بچی کو میرے پاس لایا تاکہ اسے میں پیار کرلوں۔ جیسے ہی میری بچی نے مجھ کو پیارے لہجہ میں پکارا "ماما" میں ضبط نہ کرسکی اور میں نے پٹی پھاڑ پھینکی۔

"میری پیاری بچی، میری پیاری بچی!" میں نے کہا "آج میں نے تجھے دیکھ لیا" نوکر نے جھٹ سے میری آنکھوں پر پٹی چڑھا دی مگر باوجود آنکھوں پر پٹی ہونے کے مجھکو تاریکی سے اب کوئی الجھن نہ تھی۔ میں نے اپنی بچی کو ایک لمحہ کے لئے دیکھ لیا تھا —— اور یہ ایک لمحہ ہی میری دلچسپی کا سامان تھا۔

کل میری ماں صبح ہی میرے پاس آئی۔ وہ روز صبح آکر میرے کپڑے تبدیل کیا کرتی تھی۔ اس وقت اس نے مجھ کو بہترین ریشمی لباس پہنایا اور بہت ہی انہماک سے میرے بال سنوارے۔ جب وہ بالکل مجھے بنا سنوار چکی تو بولی "بیٹی یہ پٹی کھول ڈالو"۔

میں نے پٹی کھول ڈالی اور اگرچہ ابھی سورج نہ نکلا تھا مگر صبح کی روشنی میں مجھ کو ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنے والدین اور بچی کو باری باری گلے لگایا۔

"بیٹی تم نے سب کو تو دیکھ لیا مگر ابھی تک اپنے آپ کو نہیں دیکھا۔"

"مگر میرے خاوند" میں نے چلا کر کہا "کہاں ہیں وہ"؟

"وہ تم سے چھپ رہے ہیں" والدہ نے کہا۔ "وہ تمھارے سامنے آنے سے شرما رہے ہیں"۔

مجھے یاد آگیا۔ میری نظر کے سامنے ایک منحنی۔ کمزور گنجے نحیف اور بدصورت چیچک زدہ، خمیدہ پشت بوڑھے کی تصویر کھینچ گئی ——

"آہ، غریب اڈمنڈ" میرے منہ سے نکلا۔ "تمنے دوا ہمیں، میرے لئے وہ دنیا کی ہر شے سے زیادہ حسین ہیں"۔

"اچھا جب تک ہم تمھارے خاوند کو تلاش کرکے لائیں تم اپنے آپ کو آئینہ میں تو دیکھ ہی لو" اماں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آئینہ میں تم ایسی منہمک ہو گی کہ تمھیں کسی بات کا دھیان ہی نہ رہے گا۔"

میں کچھ شرم اور کچھ شوق کے ساتھ آئینہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھی جب میں آئینہ کی طرف بڑھ رہی تھی میں نے سوچا کہ اگر میں بھی بدصورت ہوئی تو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ کو اس بارے میں بھی دھوکہ دیا جا رہا ہو۔ میں رک گئی مگر آخر کار ماں کے اصرار سے پھر آگے بڑھی اور ذرا دیر میں ہی میں ایک قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ پر نظر پڑتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ واقعی میں بہت خوبصورت تھی۔ بالکل اپنے خاوند کی کھینچی ہوئی تصویر کے مطابق —— سرو قد، نازک بدن۔ گلرو —— مگر میں زیادہ دیر تک اپنے عکس سے لطف اندوز نہ ہوسکی۔ کیونکہ یکایک آئینہ کو جنبش ہونے لگی اور ساتھ میرا عکس بھی ہلنے لگا۔ میں نے ذرا ہٹ کر آئینہ کے پیچھے نظر ڈالی تاکہ معلوم ہو آئینہ کیوں ہل رہا ہے؟

ایک خوبصورت نوجوان آئینہ کے پیچھے سے نکل کر آئینہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ یہ خیال کرکے کہ ایک اجنبی اتنی دیر سے اور اتنی بے باکی کے ساتھ میرے حسن کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہا ہے میرے رخسار شرم سے سرخ ہو گئے۔

"دیکھو تو" میری والدہ نے بغیر اجنبی کو دیکھے ہوئے کہا۔ "دیکھو تو تم کتنی خوبصورت ہو۔ حور ہو حور، گلاب کی طرح سفید"۔

"اماں" میں نے چلا کر کہا۔

"اور یہ دیکھو"۔ اماں نے میری آستین اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمھارے بازو کتنے زیادہ سفید اور چمکدار ہیں"۔

"اماں" میں نے چپکے سے کان میں کہا۔ "تمھیں کچھ خبر بھی ہے ایک اجنبی ہم کو اتنی دیر سے آزادانہ گھور رہا ہے"۔

"اجنبی؟" اماں نے متعجب ہو کر کہا۔ "کیا آئینہ بھی تمھارے لئے اجنبی ہے"۔

"میرا مطلب آئینہ سے نہیں بلکہ اس خوبصورت مگر بیحیا نوجوان سے ہے جو آئینہ کے قریب کھڑا مجھے اتنی دیر سے گھور رہا ہے"۔

"پگلی کہیں کی"۔ پاپا نے چلا کر کہا۔ "تم کو شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں کوئی بھی اپنے خاوند سے شرماتا ہے"۔

"ہائیں! اڈمنڈ" میں نے کہا اور بغلگیر ہونے کیلئے آگے بڑھی۔

میں نے قریب پہنچکر آنکھیں مل کر دیکھا۔ مجھ کو یقین نہ ہوتا تھا کیا دراصل یہی میرا خاوند ہے مگر یہ تو بہت خوبصورت اور نوجوان ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں لانبا قد گٹھا ہوا جسم۔ بے داغ صاف، شفاف چہرہ، میری مسرت کی کوئی حد نہ رہی اب میرے دل میں اپنے خاوند کیلئے محبت اور زیادہ بڑھ گئی خوبصورت نوجوان اور شریف، مجھ اندھی کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے سب کو ہدایت کردی کہ وہ اس کار دی سے ردی اور کریہ سے کریہ نقشہ میرے سامنے کھینچیں۔

میں دوڑ کر اڈمنڈ سے لپٹ گئی اماں اور پاپا الگ کھڑے ہوئے اپنی آنکھوں سے مسرت کے آنسو صاف کر رہے تھے۔

"پیاری اس وقت تو تم معمول سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی ہو"

"خوشامدی" - میں نے چپکے سے کہا اور آنکھیں نیچی کرلیں۔

"ہرگز نہیں"۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے میرے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جب تک میں تمھارا آئینہ رہا میں نے تم کو ہمیشہ خوبصورت بتایا اور اگر تمھیں یقین نہ ہو تو دیکھو میرا اہم نام جو تمھارے سامنے رکھا ہے میرے بیان کی تائید کر رہا ہے"۔

(ترجمہ)

غزل!

اک کہانی ہے فقط ہستیٔ فانی میری
ایک افسانۂ عبرت ہے جوانی میری،

باعثِ فتنہ و آشوب ہے، قصہ تیرا
سببِ عبرتِ دنیا ہے کہانی میری،

ذوق بخشا ہے مجھے خیشۂ کرم ہے تیرا
عشق کرنا بھی تو عادت ہے پرانی میری،

زخم دل گرمیٔ گریہ سے رواں رہتا ہے
دیکھ جا سیلِ محبت میں روانی میری

سامنے آئے تو ہیں تابِ شکیبائی دے
آبرو رہنے دے اے دردِ نہانی میری

محتسب پینے دے دو چار گھڑی جینے دے
ذوق فانی نہیں ہے زندگی فانی میری

دیدۂ شوق کی رسوائی کا عالم مت پوچھ
ذرّے ذرّے کی زباں پر ہے کہانی میری

زینتِ عرش پرِ مرغِ تخیّل میرا،
مہ و انجم سے درخشاں ہے جوانی میری

نکتہ چینوں کو سخن کے یہ سُنا دے جا کر
فیضِ وحشت ہے ظفر سحر بیانی میری

غیر مطبوعہ

ظفر ہاشمی

ملیٹھی کھچڑی کی مسجد

جناب سید محمد اشفاق حسین صاحب، رضوی لکھنوی،

حضرت مولانا شاہ سید احمد صاحب قبلہ نہایت بزرگ اور صوفی کامل تھے۔ شاہجہاں پور میں آپ کا دولتکدہ تھا۔ جائداد وغیرہ کافی تھی مگر آپ کبھی اس کی دیکھ بھال نہ کرتے جس کا جو جی چاہتا کرتا۔ آپ کے کئی اولادیں تھیں۔ منجملہ اور لڑکوں کے سید عبد العلی صاحب بہت ہوشیار اور باپ کے قدم بہ قدم تھے۔ تعلیم کا بیحد شوق تھا۔ لہو ولعب اور فضول کھیل کود سے سخت نفرت تھی۔ بیس پچیس برس کے سن میں آپ فارغ التحصیل ہوگئے چونکہ سب بھائیوں میں نہایت نیک اور قابل تھے اس وجہ سے علاقہ وغیرہ کے لوگ آتے تو آپ ہی سے ہر معاملہ کی گفت وشنید کرتے تھے اور آپ کو ان معاملات سے دلچسپی نہ تھی۔ یہاں تک کہ عاجز ہو کر اپنے وطن سے لکھنؤ ہجرت کر گئے گھر بار جائداد وغیرہ سب کو خیر باد کہدیا۔

سنہ ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ آئے وہ زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر کا تھا لکھنؤ آکر ڈالی گنج پار کی ایک مسجد میں قیام کیا۔ آپ مثنوی شریف کے تقریباً حافظ تھے اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جو سنتا وہ محو ہو جاتا۔ آپ کا دستور تھا کہ صبح کے وقت وظائف سے جب فرصت ہوتی تو مثنوی شریف پڑھا کرتے۔ سامعین کا مجمع ہو جاتا تھا۔ راستہ چلنے والے محو ہو جاتے تھے لوگ اپنے کاروبار کا ہرج کرتے لیکن مثنوی سننے ضرور آیا کرتے تھے۔

شاہ صاحب جس وقت مثنوی پڑھتے تھے ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آنکھیں بند ہوتی تھیں اور آنسو جاری ہوتے تھے اور یہی حال سننے والوں کا ہو جاتا تھا۔ اپنے حجرہ سے صرف ضرورت کے وقت یا حاجت کے وقت باہر آتے تھے ورنہ حجرہ کا دروازہ بند رہتا تھا۔ عصر سے مغرب تک حاجتمند آتے اور فیضیاب ہوتے تھے۔

محلہ میں ایک مدح خوان نامی متمول آدمی تھے۔ شاہی فیلخانے میں نوکر تھے ایک مرتبہ ان کے ہاتھی نے ایک آدمی کو مار ڈالا جس کی بادشاہ کے طرف سے سخت باز پرس ہوئی۔ مدح خواں نے شاہ صاحب سے اپنی پریشانیاں بیان کیں اور دعا کے خواستگار ہوئے۔ شاہ صاحب نے دعا کی نتیجہ یہ ہوا کہ مدح خواں صاف بری ہوگئے اس وقت سے محلہ والے اور معتقد ہوگئے تھے۔ مدح خواں نے ایک مسجد تعمیر کرانے کا خیال ظاہر کیا۔ محلے کے لوگ بھی متفق ہوئے اور مسجد کی تعمیر کا انتظام ہونے لگا جب مسجد کی بنیاد قائم کی گئی تو معمار بہت پریشان ہوئے جب دیواریں کچھ بن جاتیں تو دوسرے دن وہ منہدم ہو جاتیں اور کسی طرح دیوار قائم نہ رہتی۔ مستری جو کئی بار بنوا چکا تھا اس کو بخار آگیا۔ لوگ بہت خوفزدہ ہوئے اور یہ مشہور ہو گیا کہ یہاں پر جنات رہتے ہیں لوگوں نے شاہ صاحب سے جا کر واقعات بیان کئے دوسرے دن شاہ صاحب صبح کو خود تشریف لے گئے اور معماروں کو غسل کرنے کا حکم دیا جب معمار غسل کر چکے تو شاہ صاحب نے اپنے دست مبارک سے بنیاد رکھدی اور معماروں سے کہا کہ اب بناؤ انشاء اللہ تکمیل ہو جائیگی۔ چنانچہ معماروں نے بنانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مسجد تیار ہو گئی اور کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔ اہل محلہ نے باصرار ومنت شاہ صاحب کو مسجد میں ٹھہرایا۔ مخصوص ایک حجرہ بنوایا گیا تھا۔ اسی حجرہ میں شاہ صاحب مستقل رہنے لگے۔ پہلی جماعت مسجد میں بہت دھوم سے ہوئی دور دور سے لوگ نماز پڑھنے آئے تھے۔ دوسرے دن میلاد شریف بہت شان وشوکت سے ہوا۔

اس مسجد میں اکثر مختلف قسم کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ اور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کنویں سے پانی بھرنے کی آواز آتی تھی جس سے لوگ خوف کھاتے تھے۔ لوگوں نے شاہ صاحب سے بیان کیا۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ یہاں اجنہ رہتے ہیں۔ ایک بار ایک صاحب کو درد کی شدت تھی وہ شاہ صاحب کے پاس آیا۔ اور اپنی تکلیف بیان کی شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور زخم حیات کی پتی باندھنے کو فرمایا۔ اس نے عرض کیا کہ یہاں کہیں قریب میں پتی نہیں ہے کل منگوا سکوں گا۔ چند لڑکے شاہ صاحب سے پڑھتے تھے وہ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک لڑکے نے کہا کہ میں ابھی لائے دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ لڑکا مسجد کے باہر گیا اور فوراً بہت سے ہرے پتے لئے ہوئے چلا آیا اور لاکر دیدیئے۔ اس شخص نے پوچھا کہاں سے لائے ہو؟ پھر بھی لے آیا کرونگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا جب تم کو ضرورت ہو منگوا لینا۔ پوچھنے سے کیا فائدہ۔ اس وقت وہ شخص چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جن کا لڑکا ہے۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں۔ یہ تحقیق ہو گیا تھا کہ اجنہ کے لڑکے شاہ صاحب سے پڑھنے آتے ہیں۔ اکثر نایاب چیزوں کی لوگ فرمائش کرتے اور وہ لڑکے آن واحد میں لا دیتے۔ دیکھنے والوں کو سخت تعجب ہوتا۔

ایک بار شاہ صاحب کے والد محترم کو خیال آیا تو لکھنؤ اپنے صاحبزادہ کو دیکھنے آئے تھے۔ وہ زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر کا تھا۔ شاہ صاحب قبلہ نے اپنے صاحبزادہ کے پاس مسجد میں قیام کیا۔ نواب آصف الدولہ بہادر کو خبر ہوئی کہ شاہجہاں پور کے ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں تو ملاقات کیلئے بلایا۔ شاہ صاحب قبلہ نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ آخر نواب ہاتھی پر سوار ہوکر خود مسجد کے پھاٹک پر تشریف لائے اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ فقیر اور بادشاہ کی ملاقات مناسب نہیں۔ آخر نواب واپس چلے گئے۔ شاہ صاحب قبلہ نے اپنے صاحبزادہ سے شادی کی سخت تاکید فرمائی اور کہا کہ اگر شادی نہ کروگے تو مجھکو سخت رنج ہوگا۔ تمھاری نسل جاری رہے گی اور اسی دن شاہجہاں پور واپس چلے گئے لوگوں نے قیام کا بہت اصرار کیا مگر حضرت نے صاف کہہ دیا کہ اگر میں رہونگا تو نواب پھر آئیں گے میرا رہنا اچھا نہیں۔ یہ کہہ کر روانہ ہوگئے پھر کبھی نہیں آئے۔

شاہ عبدالعلی صاحب نے والد کے حکم کی تعمیل کی اور اپنی پھوپھی زاد ہمشیر سے چالیس سال کی عمر میں عقد کیا۔ یہ عقد شاہ صاحب کی ہمشیر وغیرہ نے طے کیا تھا اور انھیں لوگوں کے اصرار سے ہوا مسجد کے قریب ایک مکان بنوایا اسی مکان میں متعلقین رہتے تھے اور شاہ صاحب مسجد کے حجرہ میں رہتے تھے عشا کی نماز پڑھا کر وظیفہ وغیرہ سے فراغت کرکے صرف گھنٹہ دو گھنٹہ کیلئے مکان میں جاتے اور تہجد کی نماز سے قبل مسجد میں آجاتے۔ یہی دستور آخر وقت تک رہا۔ حجرہ میں رہتے اور دروازہ ہر وقت بند رہتا۔ صرف نماز کے لئے باہر تشریف لاتے اور عصر سے مغرب تک درس دیتے اور حاجتمندوں کو مستفید فرماتے۔

شاہ صاحب کو میٹھی کھچڑی بہت مرغوب تھی۔ زیادہ تر یہی کھاتے شاگرد و معتقد حضرات بھی اکثر تحفہ میں میٹھی کھچڑی لایا کرتے تھے۔ آپنے عمر طبعی کو پہونچکر اس دار فانی سے انتقال فرمایا۔ درد گردہ اٹھا تھا حکیم ذاکر کو شاگردوں نے بلوایا اور دوا کا اصرار کیا۔ مگر شاہ صاحب نے دوا نہیں پی انکار کر دیا اور فرمایا میں نے کبھی علاج نہیں کیا۔ اب میرا وقت آگیا ہے۔ علاج بیسود ہے۔ تم لوگ کسی قسم کی کوشش نہ کرو۔ میں تھوڑی دیر کا مہماں ہوں۔

بقر عید کے روز آپ کا وصال ہوا۔ مہینوں تک اکثر مسجد سے رونے کی آواز آتی تھیں جب لوگ جاکر دیکھتے تو کوئی نہ ہوتا لوگوں کو سخت تعجب اور خوف معلوم ہوتا۔ شاہ صاحب نے پانچ اولادیں اپنے بعد بقید حیات چھوڑیں تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔

دونوں لڑکیوں کا عقد بھائیوں نے کیا جن کی نسلیں موجود ہیں ایک صاحبزادی کی نسل بنارس میں اور دوسری صاحبزادی کی نسل نگرور ضلع بہرائچ میں ہے۔

شاہ صاحب کے تین لڑکے (۱) مولانا سید ناصر علی صاحب ناصر (۲) مولانا سید صادق علی صاحب (۳) مولانا سید امان علی صاحب،

(۱) مولانا سید ناصر علی صاحب ایک قابل ہستی تھے۔ عربی، فارسی کے منتہی تھے۔ شعر و شاعری سے بہت شوق تھا۔ دیوان ناصر فارسی میں مکمل ہو چکا تھا مگر طبع نہیں ہو سکا۔ بوستاں کا حاشیہ بھی آپ نے لکھا ہے جو چھپا بھی ہے۔ آپ کے شاگرد بکثرت تھے۔ لکھنؤ ڈالی گنج یار میں زیادہ تر اسی خاندان سے لوگوں کو علمی فیض حاصل ہوا ہے۔

مولانا کے شاگردوں میں بہت سے پردیسی بھی فیضیاب ہوئے ہیں مولوی ہادی علی خاں میلاد خواں کو بھی تلمذ کا فخر حاصل تھا۔ بہت کچھ واقعات مولوی ہادی علی خاں صاحب سیتاپوری نے خود مولانا اور ان کے والد کے بیان کئے۔ ایک بار مولانا ناصر علی صاحب نے اپنے والد کی حیات میں اپنی والدہ کو تیس روپے لے جاکر دیئے اور کہا کہ ایک شاگرد نے کہا ہے کہ میں تیس روپیہ ماہوار دونگا۔ چنانچہ یہ پہلی تنخواہ دی ہے۔ والدہ نے خوشی میں آکر یہ رقم شاہ صاحب کو پیش کی کہ لڑکے کو کسی شاگرد سے ملے ہیں، شاہ صاحب نے روپے کی پوٹلی کو اٹھاکر پھینکدیا اور فرمایا تم خوش ہو اور میں علم بیچنا اچھا نہیں سمجھتا اور نہ اولاد کی کمائی لینا پسند کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سے مولانا ناصر علی صاحب نے کسی شاگرد سے کبھی رقم نہیں لی مولانا موصوف نے لاولد انتقال فرمایا۔ مولانا نے اجنہ کے عقد بہت پڑھائے جن کی متعدد اور مختلف روایتیں ہیں۔

شاہ صاحب نے چونکہ بقرعید کے دن انتقال فرمایا تھا۔ اس وجہ سے بقرعید کے دن فاتحہ وغیرہ کے سلسلہ میں اچھا خاصہ میلہ ہونے لگا۔ اس میلہ کی یادگار اب بھی ہے گو اس شان سے نہیں ہوتا ہے۔

۲ مولانا صادق علی صاحب بھی عالم تھے اور صرف ایک ہی اولاد مولوی عنایت احمد صاحب جو بقید حیات حیدر آباد دکن میں موجود ہیں معلوم ہوا کہ موصوف کے کوئی اولاد نہیں ہے۔

۳ مولوی امان علی صاحب جو شاہی باورچیخانہ کے داروغہ تھے شاہی کھانا پکوانے میں بہت ماہر تھے اور شاہی دسترخوان پر ایک چیز روز نئی پکوا کر بھیجتے تھے۔ بیشتر انعامات بھی حاصل کئے تھے۔ موصوف کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کا عقد میر حسین الدین شاہ صاحب خلیفہ وجانشین شاہ عاقل سبز پوش کاکوری سے ہوا تھا۔ خلافت کا حال مشاہیر کاکوری میں تحریر ہے۔ میر حسین الدین شاہ صاحب بھی بزرگ اور نیک آدمی تھے۔ شاہ صاحب مذکور نے بھی لاولد انتقال فرمایا۔

مولانا امان علی صاحب کے تینوں صاحبزادوں کی اولادیں اب بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔

۱ مولوی محمد حسین صاحب ۲ منشی سید واجد حسین صاحب۔
۳ منشی سید احمد صاحب،

مولوی محمد حسین صاحب نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ریلوے میں ملازمت کرلی اور گورکھپور میں بسلسلہ ملازمت چالیس سال قیام کیا۔ منجملہ تیرہ اولادوں کے صرف دو اولاد نرینہ بقید حیات لکھنؤ میں موجود ہیں۔ سید خورشید حسن اور سید بخشش حسن۔ خورشید حسن صاحب کی دو لڑکیاں موجود ہیں اور بخشش حسن کے صرف ایک لڑکا اخلاق حسین بقید حیات موجود ہے مولوی محمد حسین صاحب نے بھی عمر طبعی کو پہونچکر گورکھپور میں انتقال فرمایا ان کے شاگرد بھی گورکھپور میں موجود ہیں۔

منشی سید واجد حسین کے تین لڑکیاں ہوئیں اور تینوں لڑکیوں کا عقد ہوگیا۔ سب صاحب اولاد اولاد موجود ہیں۔ موصوف خوشنویس تھے۔

منشی سید احمد صاحب بھی خوشنویس تھے۔ زمانہ شباب ہی میں انتقال ہوا منشی صاحب کے ایک لڑکا منشی سید انوار احمد صاحب مرحوم ہیں جن کے صاحبزادہ نثار احمد بقید حیات موجود ہیں۔

شاہ سید عبد العلی صاحب کے وصال کے بعد معتقدین اسی طرح مولوی امان علی صاحب کو مانتے رہے اور برابر مستفید ہوتے رہے۔ مولوی امان علی صاحب کے زمانہ میں درس وتدریس کا سلسلہ زیادہ ہوگیا تھا۔ ڈالی گنج پار میں اب بھی ان کے شاگرد بکثرت موجود ہیں۔ بسن حضرات اپنے شاگرد ہونے کا فخر بیان کرتے ہیں۔ انھی کے زمانہ میں بقرعید کی شب میں جو میلہ ہوتا ہے بہت شاندار ہوتا تھا۔ شاہ صاحب قبلہ بقرعید کی شب میں وعظ فرماتے تھے اور مثنوی شریف بہت اہتمام سے پڑھتے تھے دور دور سے سامعین آکر شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس اجتماع نے میلہ کی صورت اختیار کرلی اور مولوی امان علی صاحب کے زمانہ میں اس میلہ کا شباب تھا۔ جس کی منتیں مرادیں برآتیں وہ بہت دھوم سے حاضر ہوتا۔ ایک دفعہ ایک بیگم کی مراد برآئی تھی انھوں نے بہت دھوم سے حاضری دی۔ یہاں تک کہ ماسوائے اور لوازمات کے کھچڑی پاؤ بھر چڑھائی تھی جس میں سونے کی دال اور چاندی کے چاول بنوائے تھے، اور تمام سامان منوں کے حساب سے تھا۔ اسی طرح حسب حیثیت جن کی مرادیں پوری ہوتی تھیں لوگ آیا کرتے تھے۔ رات بھر میلہ ہوتا تھا۔ تمام دکاندار کئی دن پیشتر سے اپنی دکانیں سجاتے تھے اور ہر قسم کی دکانیں ہوتی تھیں۔ مسجد میں پردہ کا سخت انتظام ہوتا تھا یہاں تک

کہ ہوشیار بچے بھی اندر نہ جا سکتے تھے اور تمام شریف بیبیاں آتی تھیں۔ یہ میلہ میں بھی شرفاء کا مجمع ہوتا تھا۔

غرض کہ مولوی امان علی صاحب کی حیات تک یہ میلہ بدستور شان و شوکت سے قائم رہا اور مسجد بھی دلھن بنی رہتی تھی۔ مولوی صاحب موصوف کے انتقال کے بعد مولوی صاحب کے لڑکوں نے شہر میں سکونت اختیار کی۔ وہاں کی سکونت بھی ترک کر دی۔ صرف بقرعید کی شب کو دونوں لڑکے منشی واجد حسین اور منشی سید احمد صاحبان جا کر بیٹھتے تھے ان دونوں صاحبزادوں کے بعد اولادیں صغیر سن تھیں۔ بڑے صاحبزادہ گورکھپور میں تھے رفتہ رفتہ وہ سب شان و شوکت جاتی رہی اور مسجد بھی منہدم ہوتی رہی اب مسجد کے صرف آثار باقی ہیں اور سب شہید ہو گئی۔ مولوی صاحب کے شاگردوں میں سے دو ایک صاحب ہیں جو میلہ کے دن جا کر بیٹھتے ہیں میلہ بقرعید کی شب کو اب بھی برابر ہوتا ہے اب صرف مسجد کا نام باقی ہے یہ وہی مسجد ہے جس میں گھی کے چراغ جلتے تھے اب اینٹوں کے ڈھیر لگے ہیں ایسی تاریخی مسجد اس کس مپرسی کے عالم میں منہدم پڑی ہے۔ اس کے متعلق جو زمین تھی وہ بھی ویران میدان ہو گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کے موروثی مکانات بھی صاف میدان ہو گئے۔

مولوی صاحب کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ سب بہت پریشان حال ہیں اپنے موروثی مکانات ہی درست نہ کرا سکے تو مسجد کی تعمیر کیا ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے ادبار کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ مسجدیں بھی ویران نظر آتی ہیں۔ خدا کرے کہ خاندان والوں کو اتنی مقدرت ہو جائے کہ وہ از سر نو مسجد کی تعمیر کرا سکیں، میلہ قائم رہے یا نہ رہے مگر مسجد تو قائم رہے۔

محبّت اور زندگی!
(اشعار منثور)

میں اپنی ہتھیلی پر تھوڑی سی مٹی رکھتا ہوں اور چند بیج چھڑک کر اسے اپنی کھڑکی سے باہر پھیلا دیتا ہوں اور بارش کی آمد کا انتظار کرتا ہوں، میری ہتھیلی کی مٹی نم ہو جاتی ہے۔ اس سے بیشتر کہ میں اس سے واقف ہوں۔

میرے چھڑکے ہوئے بیج اپنی نازک پتیاں پھیلاتے ہیں اور پھر اپنے پھول، میں اپنی ہتھیلی میں گدگدی محسوس کرتا ہوں اور میرا ہاتھ سردی سے ٹھٹھر جاتا ہے۔

سورج میرے ہاتھ کے گرد گندتا ہے اور ہوا اپنی گرم سانس اس پر پھونکتی ہے۔ پھول آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ کی ہڈیاں سخت ہو جاتی ہیں اور گوشت جڑوں سے بھر جاتا ہے۔

جب میں پھولوں کو اپنی ہتھیلی سے جدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو ان کی نازک بیلیں میری انگلیوں کے گرد لپٹ جاتی ہیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ جب مالی آئیگا تو انھیں فروخت کر دونگا۔ لیکن وہ صرف پھول ہی لے جائیگا اور میرے ہاتھ کو تنہا چھوڑ جائیگا۔ اسے خبر بھی نہیں کہ اگر وہ انھیں میرے ہاتھ سے جدا کریگا۔ تو پھول مرجھا جائیں گے۔

اس لئے اگر کوئی انھیں لینا چاہے تو براہ کرم پھولوں کو میرے ہاتھ سمیت لے لے۔ میں یہ سب کچھ خوشی سے دیدونگا.....

میں گرد سے اٹی ہوئی سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوں اور آخر کار محبت کا دروازہ پا لیتا ہوں۔ میں دروازے پر دستک دیتا ہوں محبت نیم وا دروازے سے جھانک کر کہتی ہے۔

"تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟ تمھیں سورج غروب ہونے سے قبل یہاں آنا چاہئے۔ میرے پاس کوئی خالی جگہ نہیں ——— اگر میں تمھیں داخل بھی کر لوں ——— تمھیں کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی چاہئے، مجھے سخت افسوس ہے۔"

محبت ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا دروازہ بند کر لیتی ہے۔ میں سراسیمہ ہو جاتا ہوں۔ میرا دل جدا ہونا نہیں چاہتا! میں محبت کی نرم و نازک آواز دروازے سے کھڑا سنتا ہوں ———،

(یونے نوگوچی۔ مترجمہ محمد فاروق مالیگانوی)

نقش وفا!

جناب شیخ تفضل حسین صاحب وفا

مطلب یہ تھا مریض یونہیں نیمجاں رہے! | آئے ہو وقت نزع ابھی تک کہاں رہے
بالائے آسماں کہ تہہ آسماں رہے! | تیری ہی جستجو میں لیے ہم جہاں رہے
باغِ جہاں میں ہم نہ کبھی شادماں رہے | شبنم کی طرح آنکھ سے آنسو رواں رہے
زلفِ سیہ میں ایسے دلِ ناتواں رہے | جیسے اندھیری رات میں تارے نہاں رہے
خلوت میں بزمِ ناز میں دل میں نگاہ میں | مجھسے الگ الگ سے رہے وہ جہاں رہے
بعد فنا بھی مجھ کو ستانے کے واسطے | یارب یہی زمین یہی آسماں رہے
غربت ہو یا وطن ہو چمن ہو کہ دشت ہو | بیزار زندگی سے لیے ہم جہاں رہے
کہہ ڈالیے اگر کوئی کہنے کی بات ہے | یہ کیا ضرور خلقِ خدا ہمزباں رہے
اشکوں میں کر رہی ہے بیاں داستانِ غم | خاموش کب تلک نگہِ بیزباں رہے
مل کر چلے نہ ہم سے کبھی اہلِ قافلہ | مثلِ غبار ہم عقبِ کارواں رہے
ناکامِ آرزو کا جو سنتے رہیں وہ حال، | محشر تک اُس کے لب پہ یہی داستاں رہے
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے جو در پہ آپ کے | فرمایئے یہاں نہ رہے تو کہاں رہے
چھوڑو نہ تم وفا کو ہماری اگر سنو! | رہنے دو بدگماں جو کوئی بدگماں رہے

مقدس پیار

از:- ابن حسن برنی بہاولپور

تارے آسمان پر قطرات اشک کی مانند چمک رہے تھے .. زندگی کا فرشتہ پرواز کے لئے بیقرار ہے ... سعیدہ! ... سعیدہ! میری نسیمہ کو بلاؤ ... تاکہ محمود ... یہ بدبخت محمود اپنی ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والی زندگی کے روبرو شکریہ کے طور پر ایک آخری سجدہ کرلے ... آہ دیکھو! موت اپنا تاریک بےرحم ہاتھ اس طرف بڑھا رہی ہے ... آہ صرف آخری نغمہ ....."

محمود بستر مرگ پر پڑا تھا - اس کی زندگی دنیا میں اب آخری خواب دیکھ رہی تھی، اس وقت اسے اپنی تمام گذشتہ ناکامیوں کا احساس تھا اس کی روح پابند قفس طائر کی طرح صیاد کے پنجوں سے آزاد ہونا چاہتی تھی - اس وقت اس کا دل ایک گہری کشمکش میں مصروف تھا زندگی کے مایوس لمحات ایک ایک کرکے اس کے سامنے آرہے تھے - اس نے اپنی مختصر حیات میں کئی بار دیکھا تھا کہ نسیمہ نے اس کی پاکیزہ محبت کو ٹھکرایا اس کی رنگین آرزوؤں کو ہمیشہ تباہی کے خوفناک آندھیوں کے سپرد کردیا۔

"سعیدہ! کیا نسیمہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟" محمود نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک لرزتی ہوئی مہین آواز میں کہا۔

"بچے چھوڑو ایسی فضول باتوں کو ..... ناحق اپنے کو پریشان نہ کرو ....." سعیدہ نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

محمود سعیدہ کو اپنی والدہ کی طرح محترم سمجھتا تھا - اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے حقیقی والدین کون تھے - وہ کس طرح سعیدہ کے پاس آیا تھا کیسے وہ اس قدر سرمایہ کا مالک بنا تھا؟ —— یہ سب باتیں اس کے لئے ایک گہرا راز تھیں - وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ سعیدہ کے غریب اور بوڑھے ہاتھوں نے اسے پالا ہے۔

سعیدہ کو بھی نسیمہ کی سرد مہریاں ہمیشہ بےچین اور مغموم کردیتی تھیں، وہ محمود کو اپنے اکلوتے بچے کی طرح سمجھتی تھی، اس کی نگاہوں میں محمود کے لئے ایک مشفق ماں کا نور موجزن تھا - وہ جب دیکھتی تھی کہ محمود اپنی تمام کائنات سمیت، نسیمہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے اور مایوس واپس آتا ہے - وہ کس طرح اپنے عقیدتوں کو اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور کس بیدردی سے ٹھکرایا جاتا ہے تو اس کا دل غم و اندوہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا تھا۔

اس نے بارہا دیکھا تھا کہ محمود بارش میں پڑا بھیگ رہا ہے اور نسیمہ مزے سے اندر نیند کے خراٹے لے رہی ہے - وہ اندر درد سے کراہ رہا ہے اور وہ باہر اپنے سینے پرونے میں مصروف ہے۔

سعیدہ کئی بار ایک مہرباں ماں کی طرح اسے تسلی دیتی اور یقین دلاتی کہ "واقعی نسیمہ اس سے محبت کرتی ہے"۔ مگر درحقیقت نسیمہ کے تاریک دل میں محبت کی روشنی ہی نہیں ہوئی تھی —— حسن تھا، مگر الفت کی چاشنیوں اور رنگینیوں سے بےبہرہ، دل تھا، مگر احساس و مروت کی گہرائیوں سے ناواقف —— اس کے اندر ایک جمود تھا —— وہ ایک لاثانی مصور کا مرمریں شاہکار بت تھا —— جو اپنے پجاریوں اور عقیدتمندوں سے بےخبر تھا - .....

ہونے کو تو محمود کی شادی نسیمہ سے ہوگئی تھی - مگر اس نے ایک لمحہ بھی چین سے نہ گذارہ تھا - دونوں اپنا اپنا راستہ چلتے رہے - دونوں اپنے اپنے نظام کی تکمیل میں کوشاں رہے لیکن دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو مجبور نہیں کیا تھا کہ آپس کے اختلافات کی قربانی کرکے ایک ہوجائیں۔

قربانی جاری رہی لیکن امید کبھی منقطع نہ ہوئی۔ ... آرزو نے دھوکے کو فریب میں رکھا۔ زندگی نے ہمیشہ امید کی رسی دراز کی ۔۔۔۔۔

سعیدہ محمود کے بستر کے نزدیک کرسی پر بیٹھی تھی ــــ وہ اسے اب آخری بار ایک ناممکن چیز کا یقین دلا رہی تھی ــ "نسیمہ تم سے محبت کرتی ہے"

سعیدہ نے محمود کو خاموش دیکھ کر خیال کیا کہ وہ سو گیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آنسو بہا رہا تھا، آہ، ہمیشہ کیلئے جدا ہونے والا محمود اپنے دل ــــ اپنے بیتاب دل کے لئے ایک آخری تسکین کا متلاشی تھا ــ لیکن ناکامی کے طوفانی سمندر میں اس کی کشتی امید الٹ چکی تھی۔ ... تلاش بیسود تھی .. امید موہوم تھی۔ ...

"سعیدہ!" محمود نے مجروح ہنسی سے اس پر نگاہ کی اور یاس انگیز آواز میں کہا "بقا کے مسافر کا سامان بندھ چکا ہے ۔۔ مجھے زندگی کی کوئی امید نہیں ــــ لیکن نسیمہ سے ..... آہ! مجھے پھر بھی ... امید ہے۔ آہ! دیکھو چاند کی چاندنی تمام عالم کو اپنے نور سے منور کرتی ہے ... مگر تمام تاریکی تو یہ بھی نہیں ختم کر سکتی۔ کوئی جگہ ایسی باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تاریکی کا تسلط ہوتا ہے ... ہم بعض اوقات زندگی میں خطرناک غلطیاں کرتے ہیں، لاکھوں دفعہ امید، ناامیدی کا جامہ پہن لیتی ہے، بہت دفعہ ہم حالات کا غلط جائزہ لیتے ہیں، واقعات کا غلط موازنہ کرتے ہیں اور زبردست دھوکہ کھاتے ہیں، لیکن پھر امید باقی رہتی ہے۔ روشنی باقی ہوتی ہے ہماری روح میں کچھ جوش، کچھ احساس، کچھ جرأت باقی رہ جاتی ہے ..... ہم ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح پھر اٹھتے ہیں اور زندگی کی ناقابل فہم، پیچیدہ اور لگاتار جنگ میں نئے سرے سے شریک ہو جاتے ہیں ...... یہ سب امید ہی ہوتی ہے جو ہمت کو مردہ ہونے سے بچاتی ہے۔

"ہاں بیٹا! ....." سعیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے وہ زندگی کی ایسی جنگ میں شکست خوردہ ہو چکی ہے۔"

"سعیدہ!" محمود نے پھر آنسو بہاتے ہوئے کہا "جس دن سے میں نے شادی کی ہے۔ زندگی کی راحت، شادی جیسے حقیقی ملاپ کی خوشی، اور محبت کی آسمانی لطافت سے ہمیشہ محروم رہا ہوں ــ آہ میں نے کئی مرتبہ زندگی کو ظاہری جامہ اتارنے پر مجبور کیا ..... کئی دفعہ میں نے اپنے آپ کو گم کر دینے میں رہائی سمجھی ــ لیکن آہ! یاس اور ناکامی کے بے پناہ طوفان میں خوشی اور رہائی محال ......

"بھولے محمود"، سعیدہ نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا "کیا زندگی میں خوشی کوئی بالکل ہی ضروری چیز ہے۔"؟

"اس کا جواب میں نے کبھی مکمل نہیں پایا۔" محمود نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم زندگی میں ہزاروں انسانوں سے روزانہ ملتے ہیں۔ ہر ایک شخص باری باری سے ہمیں اپنی رنگین دنیا دکھاتا ہے۔ ہم بھی ان میں بعض کے لئے اپنی زندگی تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے لیکن پھر ایک وقت آتا ہے ان میں بعض اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے چل دیتا ہے بعض جو زندہ رہتے ہیں وہ ہمارے خوابوں کی دنیا میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ایک خیال سے زیادہ سے وقعت نہیں رکھتے ہیں۔ نہ انھیں ہماری پروا ہوتی ہے نہ ہمیں ان کی .... آخر ہمارا دل کیوں اتنی جلدی اپنے خوابوں کی دنیا میں بدلتا رہتا ہے، اس میں وہ کونسی لگن ہے، جو اس کے بے چین، اور سیماب کی طرح، بیتاب رکھتی ہے؟ ــــ یہ کیوں اپنی شاہراہیں بدلتا ہے؟ کیا خوشی کی تلاش کیلئے؟ سکون کی امید نہیں؟ ــــ ہم حسین چہروں میں، رنگین پھولوں میں، گہری سرسبز وادیوں میں، شفق کی سرخیوں میں .... کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں؟ ان میں کیا دیکھتے ہیں .... اپنے دل کیلئے خوشی؟ لیکن یہ تو ہمارے دل کے سوئے ہوئے رنگین نغمات بیدار کر دیتے ہیں، ہم پھر کیوں روتے ہیں؟ انھیں میں گم ہو کر اس دنیا اور اس کی زندگی سے بیزار کیوں ہو جاتے ہیں .....؟"

اس نے آنکھیں بند کر لیں، وہ خاموش ہو گیا۔ ایک آوارہ رہرو کی طرح جو ایک عظیم بوجھ اٹھانے سے تھک گیا۔ اور کسی سرسبز درخت کے نیچے ستانے کے لئے بیٹھ گیا ہو ــــ اس نے آنکھیں بند کر لیں ــــ ہمیشہ کیلئے نہیں، بلکہ کچھ دیر اور مصائب کا شکار رہنے کیلئے وہ بظاہر خاموش تھا مگر حقیقتہً اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا .... اب اس کے غم و اندوہ کا علاج، اس کی امیدوں یا مکان کی چار دیواری میں نہیں تھا۔ بلکہ فضا کی بلندیوں میں ــ دور ــ جہاں انسان کی نظریں ناکام ہو جاتی ہیں ....،

"وہ نسیمہ کی سرد مہریوں کی فہرست دہرا رہا تھا..... کہ یکایک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"حضور! بی بی صاحبہ، دیراج پور.... اپنے میکے..... بھائی کی شادی پر تشریف لے جا رہی ہیں۔".... ایک ملازمہ نے مودبانہ آواز میں عرض کی...

محمود بیتاب ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ اُسے آخری موت سے پیشتر ایک "دوسری موت" نے آلیا... اس کے جذبات میں تلاطم اور روح میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انتہائی یاس کے وقت انسان کے قابو سے ہر چیز آزاد ہو جاتی ہے.... اس نے بیتابانہ ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہا.... "کیا میرا دل محبت سے تہی دست تھا"

محمود اگر چاہتا تو نسیمہ پر جبر کر سکتا تھا۔ اسے اکراہ سے اپنے قابو میں رکھ سکتا تھا ــــ اس کی محبت اور وفا حاصل کرنے کے لئے اسے "شوہرانہ اختیارات" برتنے کا حق حاصل تھا ــــ لیکن یہ محمود کی فطرت سے بعید تھا، وہ ایک ناقابل حصول چیز کے لئے کوشش کرنا بیوقوفی سمجھتا تھا.... وہ ایسے دروازے پر جانا گناہ سمجھتا تھا جس پر سے خیرات کی امید نہ ہو...... وہ عورت پر ظلم کرنا ــــ جس کے دل میں اس کے لئے محبت نہ تھی ــــ ایک ناقابل تلافی جرم سمجھتا تھا۔

اس نے دنیا میں صرف ایک پرستش جائز سمجھی تھی اور وہ اس حسین دیوی نسیمہ کی تھی ــــ "نسیمہ... ایسے رنگین مرقع حسن پر جبر؟ اکراہ؟ اور شوہرانہ اختیارات کا استعمال؟"....... وہ اس خیال سے لرز اٹھتا تھا...

"سعیدہ!" اس نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "نسیمہ نے میری زندگی کو بوجھل کر کے موت کے طوفانی سمندر میں ــــ تنہا۔ فنا کی طرف دھکیل دیا ہے، میری امید کی رسی کاٹ ڈالی ہے... آہ! لیکن مجھے ایک بات پر فخر ہے کہ ــــ میں نے نسیمہ پر ظلم نہیں کیا ــــ اپنے، "مقدس پیار" کے لئے اس کو بےچین نہیں کیا۔ میں نے بہت انتظار کیا، کہ ــــ شاید وہ میری ہو ــــ لیکن آہ! سعیدہ!! نسیمہ...."

اس نے آنکھیں بند کر لیں ــــ موت کا فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا تھا ــــ

سعیدہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ مایوس نگاہوں سے محمود کے چہرہ کو تک رہی تھی ــــ وہ ایک مایوس مجسم کی طرح خاموش بیٹھی ــــ محمود کی بیتابیوں کو دیکھ رہی تھی ــــ وہ اپنی تمام کوششیں محمود کے لئے قربان کر چکی تھی۔

یکدم دروازہ کھلا اور کوئی عورت تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دہاڑ مار کر محمود کی ٹانگوں سے لپٹ گئی ــــ سعیدہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ایک سفید برف کے بت کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی ــــ اس کے آنسو اس کے چہرے کی جھریوں میں مچل رہے تھے۔

اس نے نسیمہ کو پہچان لیا تھا۔ دونوں رو رہی تھیں ــــ آہ! جب رونا بیسود تھا۔ آہ وزاری بیکار تھی، آہ! ــــ جب عشق بے صبر ہو چکا تھا۔ حسن اپنی نافرمانیوں پر شرمندگی سے رو رہا تھا۔

"محمود! پیارے محمود! تمہاری نسیمہ تمہارے قدموں پر پڑی ہے" سعیدہ نے محمود کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کون؟" محمود نے نصف غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

"نسیمہ تمہارے قدموں پر پڑی ہے ــــ حسن عشق کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے۔"

"ناممکن ــــ!"

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، حسن کی شرمندگی کو۔"

محمود نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ نسیمہ واقعی اس کے قدموں پر پڑی سسک سسک کر رو رہی تھی۔

ندامت میں حسن کا احساس الفت تیز ہو جایا کرتا ہے۔ نسیمہ نے اپنے دل میں ایک طوفان محسوس کیا ــــ جس کی شدت اس کے برداشت سے باہر تھی۔ وہ پھر ایک دفعہ اسے زندہ کرنا چاہتی تھی۔

حسن اپنے جادو سے پھر ایک دفعہ عشق کی سرمستیاں بیدار کرنی چاہتا تھا، وہ ایک دفعہ پھر عشق کی جنوں آرائیاں دیکھنا چاہتا تھا، ــــ مگر اب وقت گذر چکا تھا۔ کوشش بے سود تھی ــــ یہ وہ وقت تھا جبکہ عشق کی مایوسیاں حسن پر طاری ہوتی ہیں۔

محمود نے آہستہ سے اپنی نگاہیں اس پر ڈالنے کی کوشش کی ــــ اسے اپنی ٹانگوں پر کچھ بوجھ سا احساس ہوا ــــ اس کے چہرے پر

ایک مجروح مسکراہٹ نمودار ہوئی ——— وہ ایک دم اٹھ بیٹھا ———
جنون اور محبت نے کمزوری پر فتح پالی تھی۔
موت کا فرشتہ انتظار کرنے لگا۔

"جاؤ!" محمود نے جوش دیوانگی میں کہا ——— "جس طرح میں دنیا سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں، میں تمھاری طرف ایک نگاہ بھی ڈالنا جرم سمجھتا ہوں ——— اس لئے نہیں کہ میری نگاہوں میں تمھارے دیکھنے کی ہوس نہیں رہی ——— بلکہ میں جاتے ہوئے تمھیں دنیا میں ——— جس کے لئے تم نے میری مقدس عقیدتوں کو ٹھکرایا ہے ——— تنہا چھوڑنا چاہتا ہوں۔ تاکہ دنیا کے سخت ترین پنجوں میں پھنس کر تمھیں معلوم ہو جائے کہ تمھارا حقیقی دوست اور حبیب ——— محمود اور صرف محمود ہی تھا۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جبکہ اسے ناکامیوں اور مایوسیوں میں ایک سچے غمگسار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اردگرد نگاہ ڈالتا ہے مگر اسے دغاباز روحیں ہمدردی اور دوستی کا جامہ پہنے ہوئے نظر آتی ہیں ——— عشق ——— مکر و فریب کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے ——— اس وقت اس کی آنکھیں کھلتی ہیں، ——— وہ افسوس کرتا ہے مگر بیکار ——— وہ روتا ہے، مگر بیسود ———
وفادار روحیں غایب ہو چکی ہوتی ہیں۔

جس طرح میں تم سے ہمیشہ کیلئے ..... جدا ہو رہا ہوں ———"
وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تمام جسم نے ایک فوری حرکت کی، اور وہ بستر پر گر کر بیہوش ہو گیا۔
چند منٹ بعد ایک ہچکی اس کی مجروح مگر پاکیزہ روح کو لیکر آسمان کی بلندیوں کی طرف مائل پرواز تھی۔
موت کے فرشتے نے اپنا کام کر لیا تھا ———

امین حزیں،

غزل

از:- امین حزیںؔ بہاولپور

یہ رندوں میں آکر شرابوں کا پینا — تمھیں شیخ جی! کیسے آیا قرینا؟
نظر کیوں مری سوئے ساحل اٹھی ہے — کہاں ڈوبنے کو ہے میرا سفینا؟
دعاؤں کی ہستی سمجھ کر چلا ہوں، — کہ دنیا میں مجھکو ہے کچھ روز جینا!
کہاں ان کے جلوؤں میں ہم کھو گئے ہیں، — جہاں ہائے کچھ بھی نہ چھانا نہ بینا!

حزیںؔ زندگی کی وضع داریاں ہیں!
کہ جینا ہے مرنا، تو مرنا ہے جینا!

حقائق!

حضرت طالب باغپتی،

پھر اُن کی نگاہوں میں کیفیتِ صہبا ہے تقویٰ کا خدا حافظ، توبہ مری توبہ ہے

ساقی ہے صُراحی ہے مَیں ہوں لبِ دریا ہے یہ خواب کا عالم ہے یا ہوش کی دُنیا ہے

وہ دل میں سمایا ہے آنکھوں کو یہ دھوکا ہے آنکھوں میں وہ رہتا ہے، دل نے تو یہ سمجھا ہے

بیمارِ محبت کی، اللہ رے مایوسی! اب درد کا بڑھنا ہی اک شکلِ مُداوا ہے

جو تو ہے وہی میں ہوں بس فرق یہ ہے زاہد تو نے جسے سمجھا ہے، میں نے اسے دیکھا ہے

وہ عقل سے بالا ہے، یہ عقل نے کیا سمجھا؟ ہر چیز کے پردے میں وہ جانِ تمنا ہے

گم کردۂ منزل ہے اب کون محبت میں میں نے تجھے ڈھونڈھا ہے، تو نے مجھے پایا ہے

اک درسِ عبادت ہے ساقی کی ہر انگڑائی ہر لغزشِ مستانہ سجدے کا اشارا ہے

طالب کے تعارف پر کیا نازِ تغافل ہے
مُنہ پھیر کے کہتے ہیں۔ "اس کو کہیں دیکھا ہے"

غیر مطبوعہ طالب باغپتی

"دوست"

از۔ نقاش جذبات حضرت ظفر واسطی شاہ آبادی،

سرما کی ایک دلچسپ مگر نہایت خنک شام تھی۔ میں بیٹھک کے برآمدے میں بیٹھا شوکت کی دوستی کے متعلق سوچ رہا تھا اور جتنا زیادہ غور کرتا تھا شوکت اتنا ہی بیوفا معلوم ہوتا تھا۔ سوچتے سوچتے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب شوکت ہی نے وفا نہ کی تو اور کون کریگا۔

شوکت اور صرف شوکت کے لئے میں نے اپنے سب ساتھیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ میں اسی فکر میں تھا کہ شوکت سائیکل پر سوار آ پہونچا۔ اس کی معمولی مزاج پرسی کے بعد میں پھر اسی خیال میں ڈوب گیا۔ اس نے دو ایک ایسے کام کئے تھے کہ میں اس سے کنارہ کشی کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" شوکت نے خلاف معمول سکوت سے تنگ آکر پوچھا۔

"سانپوں کی طرح دوستوں کی بھی بیشمار قسمیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سانپوں کی طرح؟" شوکت نے میرے الفاظ حیرت سے دہرائے "کیا مطلب ہے تمھارا؟ سانپوں کو دوستی سے کیا نسبت؟"

"جس طرح سانپ طرح طرح کے ہوتے ہیں۔" میں اپنا مطلب بیان کرنے لگا۔ "اسی طرح دوست بھی قسم قسم کے پائے جاتے ہیں، نہ کوئی سانپوں کی قسمیں گن سکتا ہے نہ دوستوں کی۔"

"لیکن سانپوں کو دوستوں سے کیا نسبت؟" شوکت نے کہا، "سانپ تو انسان کے دشمن ہوتے ہیں اگر صرف قسموں کا سوال ہے تو کسی اور چیز سے تشبیہ دے سکتے ہو۔"

"دوست بھی ایک طرح کے سانپ ہوتے ہیں بلکہ یہ نقصان پہونچانے میں سانپ سے بھی بازی لئے ہوئے ہیں۔ سانپ تو کبھی کبھار کسی کو کاٹتا ہے اور پھر اکثر بچ بھی جاتے ہیں مگر دوست — دوست سب کو کاٹتا ہے اور اس کے کاٹے ہوئے تمام عمر روتے ہیں، تمام عمر —"

"لیکن تم انھیں دوست نہیں کہہ سکتے — دوست کا لفظ تو صرف باوفا اور سچے ہمدرد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔"

"میں دوست نہیں کہہ سکتا — دنیا انھیں دوست کہتی ہے تم خود انھیں دوست کہتے ہو۔ عابد کون ہے؟ تمھارا دوست — شوکت، کبھی تم نے غور کیا کہ یہ دوستی کے پردے میں تم سے دشمنی کر رہا ہے اور تم اسے دوست سمجھتے ہو۔"

شوکت عابد کی محبت میں اندھا ہے۔ اگر کوئی اس کے سامنے عابد کو برا کہدے تو وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اسی لئے عابد کا نام لیا تھا کیونکہ وہ بحث کو طول دے رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر اس سے کچھ گفتگو نہ کروں۔ وہ عابد کا نام سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا کہنے لگا۔

"ظفر! تم کیا کہہ رہے ہو؟ عابد سا دوست تمھیں عمر بھر نہیں مل سکتا — اور تم جیسے منطقی کو تو قطعی نہیں مل سکتا۔ بن گئے مضمون نگار۔ دوست اور سانپ میں فرق نہیں معلوم۔ دشمن کو اگر سانپ سے نسبت دیتے تو ایک بات تھی۔"

مجھے خیال آیا کہ جب یہ بحث شروع ہی ہو گئی تو شوکت پر اچھی طرح واضح کر دینا چاہئے اور اگر اب بھی میں نے عابد کو برا کہا تو یہ سائیکل اٹھا کر چلا جائیگا۔ اس لئے میں نے کہا۔

"شوکت! ناراض ہونے کی بات نہیں — اور تمھارا بھی کیا قصور سچ بات سب کو بری معلوم ہوتی ہے، خیر عابد کو چھوڑو۔ وہ تمھارا باوفا دوست

ہی سہی لیکن دنیا کے دوست بالکل سانپوں کے مانند ہیں۔"

"تم پھر دوستوں کو سانپوں کے مانند بتلاتے ہو۔" شوکت نے میری بات کاٹ کر کہا ۔۔۔ "سانپ انسان کی جان کے دشمن ہوتے ہیں اور دوست پھر دوست ہوتا ہے۔"

"شوکت! تم ناتجربہ کار ہو ۔۔۔ تمہیں معلوم نہیں کہ دوست کس کس چیز کا دشمن ہوتا ہے؟ سانپ تو صرف انسان کی جان کا دشمن ہے مگر دوست انسان کی ہر ایک چیز کا دشمن ہے۔ مال کا، زر کا، زن کا اولاد کا، سانپ سے ہم بچ تو سکتے ہیں مگر دوستوں سے نہیں بچ سکتے اگر کہیں سانپ نظر آئے اور دیکھنے والے میں اسے مارنے کی ہمت نہ ہو تو دیکھ کر بھاگ ضرور جائیگا۔ مگر دوست سے ہم نہیں بھاگ سکتے۔"

شوکت کچھ بولنا چاہتا تھا مگر میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔

۔۔۔ "دنیا میں جتنے ظلم ہوتے ہیں سب دوستوں کی بدولت، ہر جرم میں کوئی نہ کوئی دوست انسان کے ساتھ دوستی کے پردہ میں دشمنی کرتا نظر آئیگا دور کیوں جائیے، اپنے ہم وطنوں کو ہی دیکھ لیجئے جلیم کو اگر اس کے دوست نہ ابھارتے تو وہ احسان کے خون میں ہاتھ نہ رنگتا؟ ۔۔۔ ہرگز نہیں۔ یہ اس کے دوست ہی تھے جنھوں نے اسے ایسا ذلیل کام کرنے پر آمادہ کیا۔ دوستی مارا گیا۔ جلیم جیل میں چلا گیا اور اس کے دوستوں کا راستہ صاف ہو گیا ۔۔۔ بتائیے کیا کوئی سانپ بھی ایسا نقصان کر سکتا ہے؟

شوکت! دوست سانپ سے زیادہ مسرت رساں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ سانپنی بچے جننے کے بعد ان کو کھا جاتی ہے۔ محض اس خیال سے کہ یہ بڑے ہو کر انسان کا خون نہ کریں مگر ۔۔۔ دوستوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ تمہیں بتاؤ جگن کا قانون نے اور سوسائٹی نے کیا کر لیا۔ اس نے پرکاش کو پارہ کھلا دیا تھا۔ کسی نے جگن کو مشتبہ نگاہوں سے بھی نہ دیکھا خود پرکاش نے مرتے مرتے اس کی وفا کی تعریف کی۔

شوکت! غور سے سنو ' انسان کبھی بغیر مطلب کسی کا دوست نہیں بنتا۔ اگر کسی کو تم سے مطلب ہوگا تو وہ تمہارا دوست بن جائیگا۔ تم سے خوشامد کی باتیں کریگا۔ خود کو بے مطلب بتائیگا اور مطلب نکل جانے کے بعد وہ تمہیں دیکھ کر منہ پھیر کر چلا جائیگا۔ اور اگر تم نے دیدہ و دانستہ اس کا مطلب پورا نہ کیا تو اس کی دوستی عتاب ہونی شروع ہو جائیگی۔"

شوکت چپ چاپ بیٹھا میری نصیحتیں ۔۔۔ تلخ نصیحتیں سنتا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ بولا۔

"مگر شروع سے تم غلطی پر ہو۔ ایسے لوگوں کو "دوست" کہنا لفظ دوست کی توہین ہے۔ ہم ایسے مطلب پرستوں کو ہرگز دوست نہیں کہہ سکتے دوست وہ ہے جسے بے لوث اور سچی محبت ہو اور جتنی مثالیں تم نے دی ہیں ان میں سچی محبت کا شائبہ تک بھی نہیں۔ اور اگر کوئی شخص کسی کو زہر دیدے یا پارہ کھلا دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا بے وفا ہے اور تم زمانہ سے بدظن ہو جاؤ۔ جہاں بے وفا ہیں وہاں باوفا بھی ہیں۔"

"وہ زمانہ گیا اور اس کے ساتھ دوست بھی چلے گئے۔ اب تو وفا کا نام ہی نام رہ گیا ہے ورنہ عالم میں اس کا وجود نہیں۔ لاکھوں میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا جسے بے لوث اور سچی محبت ہو۔ سب اپنے اپنے مطلب کے یار ہیں ۔۔۔" "اچھا تم بتاؤ کہ آج تک تمہیں کوئی دوست ملا ہے؟"

"ڈھونڈھنے والے کو سب کچھ مل جاتا ہے دوست کیا! حقیقت ہی کہا ہے، ڈھونڈھے خدا بھی مل جاتا ہے۔ دوست بننے کا مادہ تھوڑا بہت ہر شخص میں ہوتا ہے مگر دوست نبھانے کا مادہ بہت کم اشخاص میں پایا جاتا ہے"

"خدا تو بیشک مل جاتا ہے مگر دوست نہیں ملتا ۔۔۔ اور اگر بفرض محال کسی کو مل بھی گیا تو میں اسے انسان ہرگز نہ کہونگا۔ وہ انسان ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی رہا بننے نبھانے کا سوال تو یہ ڈھکوسلے ہیں ڈھکوسلے اور کچھ نہیں ۔۔۔ نہ کسی میں دوست بننے کا مادہ نہ بنانے کا۔ خاص کر اس چودھویں صدی میں سب اپنے اپنے مطلب کے ہیں خواہ میں ہوں ۔۔۔ خواہ تم۔"

شوکت کو میری غیر اعتمادی سے رنج پہونچا۔ کہنے لگا۔

"میں تو تمہیں اپنا سچا دوست سمجھتا ہوں۔ تم سمجھو یا نہ سمجھو ۔۔۔ لیکن اگر تم برا نہ مانو تو میں یہ ضرور کہونگا کہ تم ہو بڑے تنگ خیال اور تم جیسے تنگ خیالوں نے ہی "دوست" کو بدنام کر رکھا ہے۔"

"تم خواہ کچھ کہو، لیکن میں تو یہی کہونگا کہ بیوقوف ہے وہ شخص جو کسی کی دوستی پر بھروسہ کرتا ہے اور اس سے وفا کی امید رکھتا ہے۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ اس میں انسان انتقام لینے کے لئے، کینہ نکالنے کے

لئے دوست بن جاتے ہیں اور دوست بن کر زہر دیتے ہیں، قتل کر دیتے ہیں، بیوی کو بھگا لیجاتے ہیں، روپیہ چرا لیتے ہیں، اور لطف یہ ہے کوئی ان پر شبہ تک نہیں کرتا۔ جو کام وہ دشمن رہ کر نہیں کر سکتے دوست بنکر نکال لیتے ہیں۔ بھی کسی کو دوست نہ بنانا چاہئے دوستی ایک فضول چیز ہے ملد شاعری کی طرح بیکار دل کا مشغلہ۔"

"بغیر دوست کے دنیا کے کام چل نہیں سکتے جس کا کوئی دوست نہیں وہ اس بلبل کے مانند ہے جو بے بال و پر ہو اگر سب انسان تمھارے ہمخیال ہو جائیں تو دنیا کا دو دن میں خاتمہ ہو جائے۔"

"اول تو تم نے یہ مثال ہی غلط دی ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی میرے خیال میں بے بال و پر بلبل اور بلبلوں سے آرام میں رہے گا میں ہوں میرا کوئی دوست نہیں، بتاؤ مجھے کیا تکلیف ہے؟ بلکہ جب تک میں نے تمھیں اپنا دوست سمجھا مجھے تفکرات گھیرے رہے اور اب۔" قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہوئی اور ہم دونوں اللہ اکبر کہہ کر مسجد میں چلے گئے نماز پڑھکر واپس ہوئے تو دونوں خاموش تھے کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہے پھر شوکت نے سائیکل اٹھائی اور سلام کرکے چلا گیا اور میں پھر دوستی کے سود و زیاں پر غور کرنے لگا۔ اس کے بعد شوکت کبھی مجھے ملنے نہیں آیا۔

غزل

نہ تھی امید ایسی رازداں سے
نظر آنے لگے وہ بدگماں سے

مری ناکام دنیا اُٹ رہی ہے
اٹھایا جا رہا ہوں آستاں سے

شب فرقت کا قصہ آؤ سُن لو
ستاروں سے فلک سے کہکشاں سے

عجب ہے حُسن ترتیب فسانہ!
بیاں کرتے بجئے چاہے جہاں سے

اب حُسن و عشق کے رنگیں فسانے
بنینگے صرف میری داستاں سے

وہی تم ہو وہی حسرت بھرا دل
ہوا کیا انقلاب آسماں سے

مری رنگینیٔ وحشت تو دیکھو!
بہاریں چُن رہا ہوں میں خزاں سے

جمیل آؤ چلو دیوانے بن لو
تمھیں کیا فائدہ رسم جہاں سے

خان جمیل نعمانی۔ رامپوری

افریقہ کے جادوگر

مولانا شبیر مارہروی

ابھی حال میں نوآبادی کین کے شفاخانے میں ایک بوڑھا ایسی کمزور حالت میں داخل ہوا کہ وہ حرکت بھی بمشکل کر سکتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی اور دوسرے میں پانی کا ایک برتن۔ اس کی ہڈیاں جسم سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور حالت ایسی خطرناک تھی کہ دو ہی دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے متعلق ایک عجیب وغریب داستان ہوئی۔ ایک روز وہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا پانی پی رہا تھا کہ لیبن خاندان کا ایک شخص آیا اور اپنے پاؤں سے پانی گھنگھولنے لگا۔ پانی غلیظ ہو جانے پر بوڑھے نے اسے روکنا چاہا لیبن نے کہا "تمھیں میرے کام میں دخل دینے اور میرے عمل کی تنقیص کرنے کا کیا حق ہے؟" اسی کے ساتھ اس نے بددعا دی کہ آئندہ بجز پانی کے اس کے حلق کے نیچے کوئی چیز نہ اترے گی۔ اس وقت سے بجز پانی کا ایک آدھ گھونٹ پینے کے غذا کا ایک ریزہ بھی اس نے نہ کھایا تھا۔

افریقہ کے جادوگروں اور حکیموں کا جہلا میں جو اثر ہے اس کی یہ ایک معمولی سی مثال تھی۔ موجودہ علوم کی روشنی میں ہم اسے مسمریزم کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال کین کے علاقہ میں روزانہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جادوگر اور حکیم کی بددعا کبھی رائگاں نہیں جاتی۔

افریقہ کے قبیلوں کے لوگ بڑے توہم پرست ہوتے اور ہمیشہ جادو سے خائف رہتے ہیں۔ ہر قبیلہ کا ایک نہ ایک جادوگر اور حکیم ضرور ہوتا ہے ان کے خیال کے مطابق ان میں اتنی طاقتیں نہاں ہوتی ہیں کہ وہ جب چاہیں مینہ برسا دیں، اولاد پیدا کرا دیں، لڑائی میں فتح دلوا دیں اور آئندہ کے حالات بتا دیں۔ حکیم جادو نہیں کرتا لیکن مصیبت زدہ اور بیمار کو دیکھ کر وہ بتا دیتا ہے کہ اس کی بیماری اور مصیبت کا باعث کون سا جادوگر ہے وہ [illegible] زمانہ کا طبیب بھی ہوتا ہے اور دواساز بھی اسے چند عجیب وغریب بوٹیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔

ان لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اولی مویا کی اولاد سے ہیں جو پشتیں گزریں آسمان سے اتر کر نیروبی کے قریب کوہ لونگ پر بیٹھا ہوا پایا گیا تھا۔ وہ اتنے سے چھوٹے قد کا تھا کہ اولاً اسے ایک بچہ سمجھا گیا۔ لیکن اس کی عجیب وغریب طاقتیں جلد ظاہر ہو گئیں۔ بہرحال اس علاقہ کے موجودہ جادوگر بالعموم اسی کی اولاد سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کے توہم پرستوں میں ان کا بے پناہ اثر ہے۔ اگر کوئی جادوگر کسی کو قتل کر ڈالنے تک کا حکم دے تو اس کی تعمیل لازمی ہے ورنہ اس کی بددعا کا خوف دامنگیر رہتا ہے۔

ملک میں کبھی بارش کی قلت اور قحط کا خوف ہو تو ان جادوگروں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ بارش کے لئے وہ مٹی کا ایک برتن، کسی خاص درخت کی جڑ اور کچھ پانی لاتا ہے پھر جڑ کے ٹکڑے برتن میں رکھ کر اوپر سے پانی اور اسے اتنا ہلاتا ہے کہ اس میں جھاگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہر سمت پھینکا جاتا ہے۔ پھر وہ ایک خاص قسم کا سفوف آگ پر ڈالتا ہے جس سے گھٹا ٹوپ دھواں ہو جاتا ہے۔ اس عمل کے وقت تمام حاضرین گاتے ہیں۔ "آؤ! آؤ! مسلسل بارش کے ساتھ آؤ! اویزا! آؤ!" لیزا ان کے یہاں رب الارباب کا نام ہے۔ جادوگر کبھی اس وقت تک یہ عمل نہیں کرتا جب تک اسے مستقبل قریب میں بارش ہونے کا یقین نہ ہو۔ اسی وجہ سے بالعموم اس کا عمل کامیاب ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جادو کی تمام طاقتیں مقدس سانپ کی رہین منت ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر جادوگر کے پاس ایک سانپ اور ایک انسان کی کھوپڑی ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جادوگر مرنے کے بعد سانپ بن جاتے ہیں ان میں سے بعض ارواح خبیثہ سے بھی ساز باز رکھتے ہیں۔ جن کا قد تین فٹ

سے زیادہ نہیں تبایا جاتا۔ پیٹ اور سر بہت بڑے اور پاؤں مڑے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔ یہ خبیث روحیں ہر قسم کے کام کر سکتی ہیں اور سوائے اپنے آقا کے کسی کو نہیں نظر آتیں۔

لیبن خاندان کے علاوہ گیکو خاندان کے جادوگر بھی بہت طاقتور مشہور ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان سے ضرور مدد لی جاتی ہے۔ کوئی شخص گر پڑتا ہے تو جب تک خاندانی جادوگر آکر اسے نہ اٹھائے اس کا اٹھنا محال۔ کوئی غصہ کی حالت میں اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دے تو جب تک جادوگر آکر ایک بکرے کی قربانی اپنے سامنے نہ کروالے بیٹا گھر میں واپس نہیں آسکتا غرض چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں بھی جادوگر کی امداد کے بغیر مفر نہیں۔ کیلے کا پودا ان کے یہاں بہت مقدس مانا جاتا ہے۔ کوئی دانستہ یا نادانستہ کسی کیلے کے پودے کو کوئی نقصان پہونچا دے تو جادوگر کے سامنے قربانی کرنی لازمی ہے۔

عشق و محبت کے معاملات میں بھی جادوگر کی مدد لی جاتی ہے۔ لو فرضاً ایک شخص ایک ایسی لڑکی پر عاشق ہے جسے اس کا بالکل خیال نہیں۔ تو وہ جادوگر کے پاس سے ایک مخصوص درخت کی جڑیں لاکر تمباکو میں ملاتا اور پیتا ہے۔ تمباکو پیتے وقت وہ گاتا جاتا ہے۔ "مجھے تجھ سے کیسی محبت ہے، اے طاقت والے کیا مجھ سے بھی ایسی ہی محبت کی جائیگی؟" اس عمل کے بعد وہ لڑکی اس پر مہربان ہو جاتی ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے لئے ایسا ہی عمل کرتی ہیں۔ ممکن ہے اس میں کچھ حقیقت ہوتی ہو ورنہ گمان غالب تو یہ ہے کہ یہ جادوگر کے اثرات کی کارسازیاں ہوتی ہیں۔

جب کوئی جادوگر آئندہ کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنی چاہتا ہے تو وہ بھینس کے ایک کھوکھلے سینگ میں کچھ کنکریاں ڈال کر ہلاتا ہے پھر انہیں نیچے گرا کر گویا یہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کنکریوں پر کیا لکھا ہے۔ بعض جادوگر شہد کی شراب خوب شکم سیر ہو کر پیتے اور نشہ میں مست ہو کر آئندہ کے متعلق پیشین گوئیاں کرنے لگتے ہیں۔ مسائی اور نادی خاندان کے جادوگروں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان کھوپڑیوں کے ذریعہ سے پیشین گوئی کرتے ہیں جو ہمہ وقت ان کے پاس رہتی ہیں۔

۱۸۹۵ء کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک انگریز جھیل وکٹوریہ نیایزہ کے قرب و جوار میں مقیم تھا۔ رات کے وقت اس کے قلیوں نے شور مچانا شروع کیا۔ ان قلیوں میں کچھ جادوگر بھی تھے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ "بہت دور جنوب میں سفید فام لوگ لڑتے ہوئے نظر آ رہے ہیں"۔ انگریز نے یہ قول مع وقت اور تاریخ کے نوٹ کر لیا اور جب وہ مہذب دنیا میں واپس آیا تو اسے اسی تاریخ اور وقت میں جیمسن کے ڈاکے کے حالات معلوم ہوئے۔

یہ نجم اور جادوگر تعلیم کے بہت مخالف ہیں غالباً اس لئے کہ عام تعلیم سے خود ان کی اہمیت کم ہو جانے کا احتمال ہے۔

شبیر مارہروی

کلامِ اعظم

جناب ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی سابق ایڈیٹر اکبر

یہ میری وفا جذبِ محبت کا اثر ہے — وہ ڈھونڈھنے پھرتے ہیں کہ دیوانہ کدھر ہے

ہے کشتیٔ ہستی مری دریائے فنا میں — امواجِ بقا کو نہیں ساحل کی خبر ہے

پہلی سی نہ وہ الفت، نہ وہ اگلی سی عنایت — قسمت کی طرح مجھ سے پھری تیری نظر ہے

کیا پڑ گئی افتاد گلستاں پہ الٰہی، — ہر شاخ میں پژمردہ جو ہر برگِ شجر ہے

جلنا ہو تو جل جائیں سرِ بزم پتنگے — مہمان کوئی دم کی بس اب شمع سحر ہے

بن بن کے جو بگڑے وہ ہے تقدیر ہماری — بل بل کے جو لڑ جائے تمہاری وہ نظر ہے

میں بیخبرِ دہر ہوں ایسا نہ سمجھنا — عالم سے الگ رہ کے دو عالم کی خبر ہے

انگڑائیاں لیکر اٹھے سب بزمِ طرب سے — کچھ نیند ہے آنکھوں میں تو کچھ مے کا اثر ہے

یہ بیخودیٔ عشق کی تاثیر تو دیکھو! — آغاز میں مجھکو نہیں انجام کا ڈر ہے

بجھتی ہوئی میں شمع ہوں ڈھلتی ہوئی میں دھوپ — انجام زمانے کا مرے پیش نظر ہے

کس نے نگہ شوق سے دیکھا ہے مجھے اعظم — مضطر جو مرا دل ہے تو بیتاب جگر ہے

آخری منازل

مترجمہ ابوسعید صاحب قریشی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

دونوں کی مجموعی عمر کوئی ڈیڑھ سو برس کے قریب تھی۔ لیکن انھیں اپنی الگ عمر کا حساب نہ تھا —— انھوں نے بہت مدت سے یہ حساب لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہاں انھیں اتنا ضرور معلوم تھا کہ ہر سال دونوں کے مجموعی عمر میں دو سال کا اضافہ ہوجایا کرتا ہے۔

انھیں اپنی دہقانی جھونپڑی میں رہتے ہوئے کئی دن، کئی موسم، کئی سال گذر گئے تھے۔ یہ بات ان کے لئے سخت تعجب خیز ہوتی اگر کسی نے ان سے یہ کہدیا ہوتا کہ وہ ابھی تک بیاہے نہیں گئے تھے۔ اپنے ماضی کا صرف ایک دھندلا سا عکس ان کے دماغ میں محفوظ تھا۔ ان کے تعلقات بھائی بہن سے کچھ زیادہ تھے۔ جب گاؤں کے لوگ اس نحیف مگر آپس میں وابستہ جوڑے کو دیکھتے تو یہ کہتے بغیر نہ رہ سکتے کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی مرگیا تو دوسرا بھی اس کے بغیر زندہ نہ رہیگا۔

سرما اس بوڑھے جوڑے کے لئے بہت سخت ثابت ہوا۔ اس تند موسم نے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔ ان کی کمریں زیادہ جھک گئیں۔ گالوں کے گڑھے زیادہ گہرے ہوگئے اور جبڑے بالکل کمزور ہوگئے۔ بوڑھے کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا اور بڑھیا کو چکر آنے شروع ہوگئے —— مئی کے مہینہ میں انھیں یہ محسوس ہوا کہ نہ تو انھیں دھوپ میں پہلے ایسا لطف آتا اور نہ سائے میں۔ بس یہ سمجھئے کہ ان کی زندگی تلخ ہوکر رہ گئی —— صبح سے شام کرنا محال ہوگیا۔

ایک روز جبکہ بوڑھا اپنے جھونپڑے کے سامنے پہلے سے کچھ زیادہ خاموش بیٹھا تھا تو بڑھیا خرگوشوں کے لئے گھاس لانے چلدی۔ باڑ میں سے لگے، ہوئے دروازے کے پاس پہونچتے ہی وہ دم لینے کے لئے ٹھہر گئی —— یہ سفر کی پہلی منزل تھی۔ تھوڑی دیر سستا کر وہ سڑک کے کنارے ہولی۔ ایک کمزور بچے کی طرح بوڑھا اپنی جگہ پر بدستور بیٹھا تھا۔ اس کی کمزور آنکھیں اسے دیکھ نہ سکتی تھیں —— مگر اس کے پاؤں کی چاپ اسے بدستور سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ چشم تخیل سے اسے جاتے ہوئے دیکھ سکے۔

گورنمنٹ صاحبزادیوں کے مکان کے سامنے صدر بازار کے نکڑ پر پہونچتے ہی بڑھیا اپنی آنکھیں کھولے چت سے زمین پر گر پڑی۔ گرتے وقت یا گرنے سے پہلے اس کے منہ سے کسی قسم کی آواز نہ نکلی۔

یہ دیکھ کر ایک راہگیر کھڑا ہوگیا اور ایک چھوٹی لڑکی بھاگتی ہوئی آپہونچی۔ یکے بعد دیگرے بہت سی عورتیں اکٹھی ہوگئیں جو اسے اٹھا کر ایک دکان میں لے گئیں —— دیکھا تو وہ مرچکی تھی۔

لوگ گھروں سے نکل نکل کر دکان اور اس کے آس پاس جمع ہوگئے اسے تین کرسیوں پر لٹا دیا گیا۔ یوں زرد اور پتھرائی ہوئی لوگوں کو وہ ایک ایسی عورت کی تصویر معلوم ہو رہی تھی —— جسے انھوں نے کبھی دیکھا تھا۔

"بوڑھے کو اطلاع دینی چاہئے" کسی نے کہا۔

"نہیں! اسے نہیں ..... اس کی بہو کو کہہ دیا جائے —— ادھر کھڑی ہے نا وہ —— اری مارگریٹ!"

مارگریٹ بدشکل تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے —— اس کا پیشہ کپڑے دھونا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ہاتھوں پر کھولتا ہوا پانی گر گیا تھا جنھیں اب وہ گٹھڑیوں کی طرح لٹکائے ہوئے تھی۔

وہ اپنی ساس کی لاش کو دیکھ کر کانپ اٹھی —— عرصہ ہوا کہ اس کا خاوند مرچکا تھا جسے اب وہ قریب قریب بھلا چکی تھی مگر اب اس کی یاد پھر تازہ

ہوگئی ـــــ اس کے ہونٹ سفید پڑ گئے، اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے
چوڑے چہرے پر پریشان نظر آ رہی تھیں ـــــ اس نے اپنی ناک دوپٹہ
سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"آہ! غریب بڑھیا"

"وہ لوگوں کی طرف مڑی اور کہا ـــــ "بوڑھے کو تم لوگ مت
بتلائیو، میں خود اسے اطلاع دیدوں گی"

مارگریٹ لاش کو اٹھوا کر اپنے گھر لے گئی اور کمرے کو ٹھیک ٹھاک کر کے
وہ بوڑھے کو اطلاع دینے چل پڑی ـــــ بوڑھا اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا انتظار
کر رہا تھا۔

تمام لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

چوبی دروازہ کے بند ہونے کی آواز نے بوڑھے کو چونکا دیا۔

"میں ہوں" مارگریٹ نے کہا۔ بوڑھا پھر بت بن کر بیٹھ گیا۔ "چلو
وکٹر اب اندر چلنا چاہئے"

وہ اٹھا اور اپنے ہاتھ آگے کو بڑھا کر تھوڑا سا جھکا ـــــ اس کی آنکھوں
میں کچھ چمک رہا تھا۔

"کیوں کیا دیکھ رہے ہو؟" مارگریٹ نے دریافت کیا۔

"مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ بالکل کچھ نہیں"

"آہ! مارگریٹ کے منہ سے صرف یہی نکل سکا۔ اس کی روحانی سادگی
اسے ہر طرح کے صدمے برداشت کرنے کیلئے تیار کر دیتی تھی۔ اس نے آرام
سے اس بوڑھے کا بازو پکڑ لیا۔ جو عین اس وقت اپنی بصارت کھو چکا تھا
جب اس کی رفیقۂ حیات نے دم توڑا تھا۔

مارگریٹ اسے سہارا دیتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئی بوڑھے نے
اپنے ہاتھ سے کرسی کو ٹٹولا اور بیٹھ گیا ـــــ اس کا سانس تیزی سے
چل رہا تھا ـــــ مارگریٹ اسے خبر سنانے ہی والی تھی کہ اس نے
ایک آہ بھری اور کہنے لگا۔

"بس اب تو ختم ہو چکی ہیں ـــــ میری آنکھیں"

کئی گھنٹوں تک وہ افسوس کرتا رہا۔ تھوڑے وقفہ کے دوران میں
اس نے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا۔

"بڑھیا کہاں ہے آخر وہ کیا کر رہی ہے؟"

مارگریٹ سمجھ گئی کہ اسے ہوش آ گیا ہے اور وہ اپنی بیوی کا انتظار
کر رہا ہے۔ یہ پوچھ کر وہ پھر اپنی بیماری کا گلہ کرنے لگ گیا۔

بہت سے لوگ آئے۔ بعض مکان کے اندر چلے گئے اور بعض کھڑکی
سے جھانک کر لوٹ گئے۔ مگر بڑھیا کی موت کی خبر پہنچانے کی کوئی بھی جرأت
نہ کر سکا ـــــ جب دن اسے یونہی بغیر اطلاع دیئے گذر گیا تو کسی کو
بھی آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

مارگریٹ تھوڑے تھوڑے عرصہ کیلئے بوڑھے کو بند کر کے باہر چلی جاتی
اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وہ پھر بڑھیا کی لاش کو دیکھنے لگی۔ لاش
تاریکی میں چھپی ہوئی تھی حالانکہ وہاں دو شمعیں روشن تھیں ـــــ
یہاں سے جا کر وہ گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئی۔

"تھکان سے چور ادھر ادھر دوڑتے ہوئے اسے سب چیزوں کا خیال
آ رہا تھا۔ اسی اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مرگ پر کیا ہوگا۔ بدقسمتی سے
اسے اس چیز کا تجربہ حاصل تھا۔

ایک بار وہ پھر بوڑھے وکٹر کے پاس گئی۔ اب رات کے وقت اس
کے غم میں کچھ افاقہ ہو گیا تھا۔ مارگریٹ نے سپرٹ لیمپ جلا کر آتشدان
پر رکھ دیا۔ اور آپ تند ہوا میں کانپتی ہوئی پتی کی طرح لرزاں ـــــ زرد
اور بیجان سی بوڑھے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے بڑھیا کی موت کی خبر
سنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا سر جھک گیا۔ اپنی تمام طاقت جمع کرتے
ہوئے (جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو) اس نے تتلاتے ہوئے کہا ـــــ "وہ
اب نہیں آئیگی! ـــــ وہ نہیں آ سکتی ـــــ وہ ہمیشہ کیلئے جا چکی ہے"

بوڑھے سے اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ سو رہا تھا ـــــ اور
اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ خاموشی سے کمرے کی چیزیں قرینے سے رکھنے میں مشغول ہو گئی۔
یکایک بوڑھا ہلا اور ساتھ ہی اس نے مارگریٹ کو آواز دی ـــــ "ادھر آؤ
ـــــ سنو، بڑھیا آ گئی ہے۔ میں نے اسے ابھی وہاں دیکھا تھا جہاں تم
کھڑی ہو۔ میں سو رہا تھا کہ دفعتہً مجھے معلوم ہوا کہ وہ آ گئی ہے۔ اس نے کمرے
کی تمام چیزوں کو قرینے سے رکھا اور چلی گئی ـــــ سنو! اسے یہ معلوم
نہیں ہونا چاہئے کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ اسے یہ سن کر بہت تکلیف ہو گی
دیکھو جب تک مجھے آرام نہ آ جائے اسے کہیں بھجوا دو ـــــ ہاں ضرور"

کوئی دکوئی طریقہ نکالو ــــــ سُنا میری بچی ؟"۔
وہ اپنی جگہ پر ہلا۔ کرسی چیخ چیخ کر سسکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔
"اسے لے جاؤ ــــــ لے جاؤ ــــــ اسے کہدو کہ وہ تھوڑی دیر کیلئے چلی جائے ــــــ اسے لے جاؤ ــــــ"
"بہت اچھا ڈاکٹر، میں اس کا خیال رکھونگی۔ میں اسے معلوم نہیں ہونے دونگی"۔ مارگریٹ نے قسم کھاتے ہوئے کہا۔
قسم نے بوڑھے پر بہت اثر کیا اور وہ یہ کہتے ہوئے چپ ہو گیا۔ "تم بہت اچھی لڑکی ہو؟"
دوسرے روز مارگریٹ نے بوڑھے کو ایک عجیب و غریب من گھڑت کہانی سنادی کہ بڑھیا کو اس کے رشتہ دار لیگئے ہیں۔" بوڑھا بچوں ایسی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ "لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ یہیں ہے۔ گذشتہ رات جب میں سو رہا تھا وہ پھر آئی تھی۔ میں نے اسے آتے سنا تھا"۔
"ہاں وہ آئی تھی"۔ مارگریٹ نے آہستہ سے کہا۔ اسی طرح دو روز گذر گئے۔ تیسرے دن جب بڑھیا کی تجہیز و تکفین ہو چکی تو ڈاکٹر بوڑھے کو دیکھنے آیا اس نے یہ غیر متوقع رائے دی۔ "بخار تو اب اتر چکا ہے۔ سوزش بھی نہیں رہی۔ کل تک یہ دیکھنے لگ جائیگا۔" وہ گھبرائی ہوئی کمرے کے کونے میں جا چھپی۔ "کل، ہاں ..... کل ....."
اپنی روح کی تاریکیوں میں ایک بار پھر اس نے دُہرایا۔ "کل ..."
کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا لیکن اس وقت واقعی اندھا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ بڑھیا کو نہ دیکھ سکیگا۔ کل مارگریٹ کی ضمیر اسے سرزنش کریگی کہ وہ خاموش کیوں رہی اسی طرح جس طرح اس کی ضمیر نے اسے بوڑھے کو غم کی خبر سنانے پر ملامت کی ہوتی ــــــ جب انجام خراب ہو تو ہمیشہ فردا ہوا کرتا ہے اور پرسکون یا امید افزا دن جس کے ہم کبھی مالک ہوتے ہیں ہمیشہ دوسرے دن کے اختتامی حصے پر واقع ہوتا ہے۔

نظرِ محبّت

دوست! مجھے دنیا کی ہر ایک شے سے تو زیادہ حسین اور پیارا معلوم ہوتا ہے ..... اس وقت جبکہ تو محبت بھری نظروں سے میری طرف تکتا ہے ــــــ،
میرے محبوب! مجھے کائنات عالم کی تمام دلچسپیوں سے بڑھ کر تو دلکش اور دلفریب نظر آتا ہے۔ جس وقت تیرے حسین قہقہے میری سوئی ہوئی آرزوؤں کو جگا دیتے ہیں ــــــ،
میرے عزیز دوست! تیری محبت بھری نگاہیں مجھے اس عالم سے بیخبر بنا دیتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے میں ایسی جگہ جا بستی ہوں جہاں کے گلزاروں میں خزاں کے تند جھونکے نہیں چلتے۔ جہاں خورشید محبت کبھی غروب نہیں ہوتا۔ جہاں محبت کا دریا جاری وساری ہے۔ جہاں کی ہوائیں بوئے گل سے معطر ہوتی ہیں ــــــ ہاں ایسی جگہ جہاں محبت کی فتح ہے ــــــ،
پیارے! جب کبھی تو میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو میری مسرتوں کا ٹھکانا نہیں رہتا ــــــ
میرے دوست تیری محبت بھری نظریں میری روح کی گہرائیوں کو بھی پرنور اور روشن بنا دیتی ہیں ــــــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو آکاش کے دمکتے ہوئے ستاروں سے بھی زیادہ منور ہے۔ تیری بھولی صورت جنت کے مقدس فرشتوں سے بڑھ کر تقدس آمیز ہے ..... اور تیری محبت بھری نگاہیں مجھے جنت کے کوثر و سلسبیل سے زیادہ اچھا بادہ محبت پلاتی ہیں ..... زیادہ سے زیادہ شیریں اور زیادہ سے زیادہ لطیف ــــــ،

شکیلہ اختر،

جذبات تبسّم

جذبِ کامل نے رہنمائی کی، ذرّے نے مہر تک رسائی کی،

کس قدر جذب ہے محبّت میں کھینچ کے آئی جفا خدائی کی

دے گئی ہے خبر سحر رو کر نالۂ شب کی نارسائی کی

سرد ہنگامۂ خیال ہوا، بجھ گئی شمع آشنائی کی

ان کی مشقِ ستم ہے جام بقا طرح ڈالوں میں کیوں لڑائی کی

باتوں باتوں میں یوں بگڑ جانا ہے سزا خوب، لب کشائی کی

حشر میں بے حجاب دیکھیں گے جان قیمت ہے رونمائی کی

درد کہتا رہا میں سنتا رہا، داستاں ان کی کج ادائی کی

شامِ فرقت ہوئی کہ صبح اُمید جس نے کی مجھ سے بیوفائی کی

رازِ حسنِ طلب سمجھ نہ سکا، عشق نے عمر بھر گدائی کی

خندہ زن اس پہ ہے چمن کا چمن
کیا تبسّم نے کچھ بُرائی کی

تبسّم قریشی گجرات

خواب اور افسانہ!

جناب لطیف انور صاحب گورداسپوری

ممتاز اور عزیز ملاقاتی کمرہ میں مصروف گفتگو تھے۔ جب نثار اندر داخل ہوا تو دونوں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

ممتاز — صرف تمہاری کمی تھی۔

عزیز — اب پوری ہو گئی۔

نثار — شکریہ!

ممتاز — لیکن دوست! آج تمہارے چہرہ پر غیر معمولی بشاشت کے آثار نمایاں ہیں۔

عزیز — ہاں! غالباً آج بیگم صاحبہ مہربانی سے پیش آئی ہونگی۔

نثار — تمہارے خیال میں . . . . .

ممتاز — گویا نثار کو یہ نعمت کبھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

عزیز — اور اس غیر معمولی بشاشت کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

نثار — اہاہا۔ جب میں نے اپنی بشاشت کا اصل سبب بتایا تو تم لوگ اسے سن کر یقیناً محظوظ ہوگے۔

ممتاز — ممکن ہے ہمارا قیاس درست ہو۔

عزیز — کہئے ہم اسے نہایت اطمینان سے سنیں گے۔

نثار — ماہرخ — واقعی اس کا چہرہ چاند کے مانند تھا۔

ممتاز حیران ہو کر نثار کا بازو تھام لیتا ہے اور پوچھتا ہے "وہ کون تھی؟"

عزیز — ماہرخ؟ کسی حسینہ کا تم تذکرہ کرنے والے ہو۔ ماہرخ؟ کتنا پیارا نام ہے؟

نثار — اگر قطع کلام کا یہی عالم رہا تو میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گا۔

ممتاز اور عزیز ہم زبان ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔ "نہیں دوست! اب ہم خاموش رہیں گے تم کہے جاؤ۔"

نثار — یہ میں نہیں بتا سکتا کہ میں ماہرخ تک کس طرح پہونچا لیکن اس کے علاوہ مجھے ذرہ ذرہ واقعہ یاد ہے۔

جب ماہرخ نے مجھے دیکھا تو وہ بڑے اشتیاق سے میرے استقبال کیلئے بڑھی مجھے اپنی نشست گاہ میں لے گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ لیکن جب اس نے مجھے افشردہ انگور پیش کیا تو میں بالکل مطمئن ہو گیا۔ اجنبیت دور ہونے لگی۔ یہ راز میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ اس افشردۂ انگور نے میرے تمام خدشات کو کیونکر مٹا دیا اس کے بعد اس نے مجھ سے مندرجہ ذیل سوالات کئے۔

ماہرخ — اب تو جی نہیں گھبراتا ہوگا؟

میں — نہیں جناب! اب مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

ماہرخ — آپکو دوران سفر میں بہت سے مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔

میں — لیکن میں نہیں جانتا کہ میں یہاں کس طرح پہونچا ہوں۔؟

ماہرخ — ہمارے یہاں کوئی حکومت نہیں ہے۔ ہر شخص آزاد ہے جس طرح کسی کا جی چاہے زندگی بسر کرے ہر کوئی خود اپنا ذمہ دار ہوتا ہے اس لئے آمد و رفت کا کوئی مستقل ذریعہ موجود نہیں ہے۔

میں — پھر تو یہاں بہت سی غیر ضروری پریشانیاں ہونگی کیونکہ حکومت کے بغیر زندگی محفوظ نہیں ہو سکتی۔

ماہرخ — (مسکراتی ہے) تمہارا خیال غلط ہے۔ ہم بڑے اطمینان سے زندگی گذارتے ہیں، ہم مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں یہاں مصیبت باہمی عناد سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان کی پیدائش کے اسباب ایسے ہیں جن کا ہم کلی انسداد نہیں کر سکتے۔

میں — مثلاً —؟

ماہرخ — موسم کا تغیر، جنگلی درندے، زہریلے کیڑے وغیرہ

میں — آپکے ملک کا نام کیا ہے؟

ماہرخ — کوئی خاص نام نہیں، ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو نام اسے پسند ہو وہ اپنے ملک کو اس نام سے پکارے۔

میں — مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے میں کھانے کیلئے کچھ طلب کرسکتا ہوں۔

ماہرخ — کیا آپ کے یہاں غلہ کو پیس کر روٹیاں پکاتے ہیں؟

مجھے ماہرخ کے اس سوال پر بے اختیار ہنسی آئی لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں نازک طبع میزبان ناراض نہ ہو جائے۔

میں — نہیں بالکل نہیں، ہمارے یہاں روٹی پکانے کی تکلیف نہیں اٹھائی جاتی۔ وہاں روٹیاں درختوں پر لگتی ہیں۔

ماہرخ — کیا آپ کے ہاں مکانات ہوتے ہیں۔

میں — نہیں، ہم کھلے میدانوں میں رہتے ہیں۔

ماہرخ — افسوس! آپ کے ملک میں آفتاب کی حرارت اور بارش کی خنکی سے محفوظ رہنے کیلئے کوئی انتظام نہیں۔

میں — اظہار افسوس کا شکریہ!

ماہرخ — جنگلی درندے! آہ!! ان کے ہاتھوں اکثر زندگیاں آسانی سے موت کے گھاٹ اترجاتی ہونگی۔

میں — لیکن آپ باوجود مکانات کے اس مصیبت سے محفوظ نہیں ہیں۔

ماہرخ — یہاں بہت کم حادثات ظہور میں آتے ہیں۔

میں — کیا میں دوبارہ کچھ کھانے کیلئے طلب کرسکتا ہوں۔

ماہرخ — کیا تم مردہ کو جلاتے ہو یا دفن کرتے ہو۔

میں — ہم مردہ کو نہ جلاتے ہیں نہ دفن کرتے ہیں۔

ماہرخ — (انگشت بدنداں ہوکر) عجیب معاملہ ہے۔ دریا میں پھینک دیتے ہونگے۔

میں — نہیں،

ماہرخ — اور کیا؟

میں — ہم انہیں کھاتے ہیں مردہ کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔

ماہرخ نے میرا جواب سن کر ایک چیخ ماری ——— میری آنکھ کھل گئی ———،

لطیف انور، گورداسپوری۔

ناامیدی میں امید

جناب محمد اختر صاحب صفوی صفی پور

۳۱ مئی سنہ ۳۵ء کی شب کو جبکہ بربادی کے خوفناک اژدہوں کی پھنکاریں ہر ایک شخص کے جسم کو کپکپا رہی تھیں جس شب کو بربادکن زلزلہ نے شمالی و مغربی ہندوستان کے کئی شہروں کو اینٹ اور پتھر کا ڈھیر بنا دیا تھا محمود اپنے نرم نرم بستر پر پڑا خواب نوشیں کے مزے لوٹ رہا تھا چونکہ محمود بہت ہوشیار سونے کا عادی تھا اس لئے پہلے ہی جھٹکے نے اسے بیدار کر دیا اس کی نظر سب سے پہلے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر پڑی جو اس وقت تین بجا رہی تھی محمود اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اس کو ہلکے ہلکے ہچکولے محسوس ہو رہے تھے گویا زمین کی بجائے وہ سمندر پر ہے اور چھوٹی چھوٹی لہریں اسے ادہر سے اُدہر لیجا رہی ہیں۔ محمود ابھی اپنے حواس ہی مجتمع نہ کرنے پایا تھا کہ اس نے یکایک باہر کی جانب کسی بڑی عمارت کے گرنے کی آواز سنی۔ اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ واقعہ معلوم کرنے کے لئے اپنے بستر سے کود کر کھڑکی کی جانب بھاگا۔ محمود ابھی وہاں تک پہونچ بھی نہ پایا تھا کہ بجلی کی روشنی جس سے شہر کوئٹہ بقعہ نور بنا ہوا تھا یکایک غایب ہو گئی اور تمام شہر کو اندہیرے نے اپنے دامن میں ملفوف کر لیا۔ اب محمود کو محسوس ہوا کہ یہ آفت ناگہانی ایک سخت زلزلہ کی رہین منت ہے۔ اس وقت زلزلے کے جھٹکے جلد جلد اور شدت کے ساتھ آ رہے تھے جنہوں نے ایک خوفناک قسم کی گڑگڑاہٹ میں مل کر ہر شخص کے اوسان خطا کر دیئے محمود نے بعجلت اپنے لباس شب خوابی کے اوپر ایک گون پہنا سرہانے سے پستول، اور قریب کی میز پر سے ٹارچ اٹھا کر اپنے بنگلے سے نکل کر میدان کی طرف بھاگا۔ باہر نکل کر اس کو اس آفت ناگہانی کا کچھ اندازہ ہوا جو کوئٹہ پر نازل ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جو کچھ عرصہ قبل اپنے بستروں پر پڑے غفلت کی نیند سوئے ہوئے تھے اب بدحواسی کے عالم میں ننگے سر ننگے پیر میدانوں میں جمع ہو رہے تھے۔ ہر طرف شور و شیون اور نالہ و بکا کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ محمود جس طرف ٹارچ کی روشنی ڈالتا۔ سوائے گری ہوئی عمارتوں کے اینٹ و پتھر کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ سر بفلک عمارتیں جو کچھ ساعت قبل آسمان سے کھڑی باتیں کر رہی تھیں اس وقت زلزلے کے جھٹکوں کے ساتھ پاش پاش ہو کر گر رہی تھیں۔ اس وقت محمود کا دل خوف و دہشت کی آماجگاہ تھا۔ اور موت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتی دکھائی دیتی تھی۔

محمود ہنوز بحر استغراق سے ساحل ہوش و حواس پر پہونچنے بھی نہ پایا تھا کہ نجمہ کے خیال نے اس کو تڑپا دیا۔ نجمہ و محمود نے ایک ہی ماحول میں اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ گذارا۔ انٹرنس تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ انٹرنس کے بعد محمود نے کالج میں نام لکھایا تو نجمہ نے جو اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد باپ کے پاس رہتی تھی اپنے خانگی امور کی دیکھ بھال شروع کی۔ قدرت کاملہ نے حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی کے بھی وہ وہ جوہر عطا کئے تھے جو علم کی صیقل پر چڑھنے کے بعد چمک اٹھے اور ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ محمود جو بچپن سے نجمہ کا گرویدہ تھا اب اس کا پرستار بن گیا۔ بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد محمود نے حصول ملازمت کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن ناکامیابی اور نامرادی ہر جگہ استقبال کے لئے موجود ملی جن بڑے لوگوں کی ذات سے اب تک اس کی امیدیں وابستہ تھیں انہوں نے بھی صاف جواب دیدیا۔ اب محمود کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ قانون کی ڈگری لینے کے بعد وکالت شروع کر دے۔ محمود کالج کھلنے کے انتظار میں اپنے مکان پر تھا جبکہ ۳۱ مئی سنہ ۳۵ء والے زلزلے نے ہزاروں خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

نجمہ کے باپ کی کوٹھی شہر کے دوسرے کنارے پر قریب تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ "اگر اس وقت وہاں پہونچنا انسانی طاقت میں ہے تو مجھے ضرور پہونچنا چاہیئے۔" محمود نے خود ہی کہا: "لیکن خدانخواستہ اگر نجمہ . . . . " یہ کہتے کہتے اس کی زبان رک گئی۔ دل امید و یاس کا مخزن بن گیا لیکن نجمہ کی محبت نے ایک بار پھر اس کی ہمت مردانہ کو اکسایا۔ محمود جانتا تھا کہ نجمہ کا باپ کراچی گیا ہوا ہے اور اس وقت صرف نجمہ ہی تنہا کوٹھی میں ہے، محمود کا واہمہ عجیب عجیب خیالات اس کے دل میں پیدا کر رہا تھا کہ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے نجمہ انتہائی پریشانی میں محمود کو مدد کیلئے پکار رہی ہے اب غور و فکر اس کے حیطہ امکان سے باہر تھا۔ محمود نجمہ کی کوٹھی کی طرف بھاگا۔ اس وقت چاند اپنے زرد اور معصوم چہرے کے ساتھ بام فلک پر کھڑا اس شہر کی بربادی پر اشک حسرت برسا رہا تھا جو کچھ دیر قبل خوبصورت باغات، عالی شان کوٹھیوں اور حسین تفریحگاہوں کا مخزن تھا۔ محمود چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں نجمہ کی کوٹھی کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں جا بجا اینٹ اور پتھر کے ڈھیروں نے آمد و رفت کو مسدود کر دیا تھا لوگ شب خوابی کے کپڑوں میں ملبوس۔ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں جائے پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ معصوم بچوں کو خون آلود پیشانیوں کے ساتھ اپنے ماؤں کے سینوں سے لپٹا ہوا دیکھ کر محمود کو یارائے ضبط نہ رہا اور اس کے آنسو نکل پڑے۔ کوئی شدت تشنگی سے جاں بلب، کسی کے جسم کا خون دہان زخم سے بہہ بہہ کر اس کو نیم مردہ کر چکا تھا۔ وہ عورتیں جو سوتے وقت لاکھوں کی مالک تھیں۔ جن کے اشارہ چشم پر خادمائیں دوڑتی تھیں جس وقت ان کو فنا اور غارت کے ہچکولوں نے ہوشیار کیا تو فقیر بن کر بیدار ہوئیں۔ نہ اس وقت وہ خادمائیں تھیں اور نہ روپیہ۔ جسم کے کپڑے ان کا کل سرمایہ تھے۔ جن کے دسترخوانوں کے پس خوردہ سے کتنوں کے روزانہ پیٹ بھرتے تھے آج وہ ایک ایک دانہ کے لئے دوسروں کے دست نگر تھے۔ ان کے وارثوں اور سرتاجوں کو ان سے چھین کر گردش زمانہ نے اس دنیا کے ناپیدا کنار سمندر میں بے یار و مددگار ہچکولے کھانے کے لئے ان کو چھوڑ دیا تھا۔ محمود یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن مجبور تھا۔ وفور محبت اور جذبات انسانیت سے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا لیکن لاچار تھا۔ اس وقت قیامت صغریٰ قائم تھی، ہر طرف نفسی نفسی کا شور تھا۔ محمود نے بہت کوشش کی کہ ان مصیبت کے ماروں کو کسی جائے امن تک پہونچا دے لیکن اس ہنگامہ رستخیز میں ان کی سنتا ہی کون تھا۔ وہ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ نجمہ کے خیال نے اس کو پھر چونکا دیا۔ محمود جلدی جلدی نجمہ کی کوٹھی کی طرف کھنڈرات سے گذرتا ملبہ کے ڈھیروں کو پھاندتا چلا جا رہا تھا کہ ایک بڑے مجمع سے اس کا گذر ہوا جو بازار کی تنگ گلیوں میں ہو گیا تھا۔ اس وقت قومیت اور شخصیت کا امتیاز بالکل مفقود ہو گیا تھا۔ برہمن اپنے سرمایہ کی حفاظت کی خاطر بھنگی اور چماروں سے اور چمار و بھنگی برہمنوں سے دست و گریباں تھے۔

"کیا یہ لوگ لوٹ مار کر رہے ہیں؟" محمود نے کہا۔ "ایسا ہونا بھی کیا غیر ممکن ہے؟" پھر خود ہی جواب دیا۔ محمود جانتا تھا کہ اس ملبہ کے نیچے سونے اور چاندی کے ڈھیر ہیں کیونکہ کل تک یہ بہت مالدار بازار سمجھا جاتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ابنائے ملک بنکوں سے کس قدر خائف رہتے ہیں۔ اس وقت محمود کو اپنی وہ دس ہزار کی رقم یاد آئی جو اس نے نجمہ کے باپ کے پاس بطور امانت کے رکھدی تھی۔ محمود کو یقین ہو گیا کہ اس پر آلام اور آفات کا ایک پہاڑ پھٹ پڑا روپیہ ملنے کی اب کوئی امید نہیں اور نجمہ کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ "مجھے روپیہ جانے کی کوئی پرواہ نہیں ہے مگر اے میرے مالک نجمہ مجھے مل جائے۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محمود اسی ادھیڑبن میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک گرے ہوئے مکان میں کچھ لوگ جمع ہیں اور ایک بڑے لوہے کے سیف کو کھولنے میں منہمک ہیں۔ محمود کے پہونچتے پہونچتے سیف کھل گیا اور نوٹوں کے بنڈل کے بنڈل اور طلائی زیورات اس میں سے نکل کر پھیل گئے۔ بھوکے کتوں کی مثل وہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے۔ محمود نے اپنا پستول نکال لیا اور سب کو اپنے ہاتھ اٹھا لینے کا حکم دیدیا۔

مجمع نے محمود کی طرف دیکھا اور جب اس کو سر پر پستول لئے ہوئے پایا تو سب کے حواس غائب ہو گئے۔ صرف ایک شخص نے پیچھے ہٹنے سے انکار کیا اور پاس پڑے ہوئے نوٹوں کے بنڈل پر جھپٹا لیکن قبل اس کے کہ وہ ان کو اپنے قبضہ میں کر سکے پستول کی ایک گولی نے ہمیشہ کے لئے اس کو خاموش کر دیا۔ محمود نے جلدی جلدی نوٹوں اور زیورات سے اپنی کوٹ کی جیبیں بھر لیں۔ "زیورات اگرچہ مرصع ہیں مگر سب بے نئے طرز کے

محمود نے ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "بہرحال میرا کوئی روپیہ کا نقصان نہیں ہوا" محمود نے کہا۔ "اُدھر گیا اِدھر آیا"۔

محمود پھر نجمہ کی طرف بھاگا۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا نجمہ کے ملنے سے اس کو اور زیادہ ناامیدی ہوتی جاتی تھی۔ محمود ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ ایک زخمی بڈھے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر محمود سے امداد کی درخواست کی۔ محمود یہ تو نہ سمجھ سکا کہ وہ کہتا کیا ہے لیکن اس کا مطلب ضرور سمجھ گیا، بڈھے نے ایک ملبہ کی طرف اشارہ کیا اور دونوں نے جلدی جلدی اس کو ہٹانا شروع کیا۔ آخر بدقت دونوں نے ایک عورت کو جو اپنے سینہ سے ایک چار پانچ مہینہ کے بچے کو لپٹائے ہوئے تھی آہستہ آہستہ خاک وخون میں شرابور ملبہ کے نیچے سے نکالا عورت غریب تو ہلکی ہلکی سانسیں لے رہی تھی لیکن بچہ کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ یہ دیکھ کر غریب بڈھے کی بیقراری۔ اف محمود کا دفور غم سے کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔

محمود یہاں سے آنسو پونچھتا پھر دیار محبوب کی طرف بھاگا۔ فرط الم نے اسے مہینوں کا بیمار بنا دیا تھا۔ چہرے سے دحشت برس رہی تھی۔ یاس و حرمان، رنج وغم اور وحشت و پریشانی نے اس کے حواس مختل کر دیئے تھے قدم ڈالتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ مجروحوں کی آہ وزاری کانوں میں بس گئی تھی۔ آفت رسیدوں کی لاشیں قدم قدم پر اس کا راستہ روکتی تھیں موت اور بربادی کا ہر طرف بول بالا تھا۔ آہ وزاری نالہ وشیون سے پریشان ہوکر ہر طرف موت وبربادی سے گھبرا کر محمود ایک ایسے میدان کی طرف بھاگا جہاں نسبتاً مجمع کم معلوم ہوتا تھا۔ محمود چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس ماحول سے دور ہوکر اگر ممکن ہو تو اپنے ہوش وحواس مجتمع کرلے۔ وہ اسی کوشش میں تیز تیز قدم ڈالتا میدان کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اس کا پیر کسی ملائم چیز پر پڑا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک جسم ہے نصف جھاڑی میں پوشیدہ اور نصف باہر۔ محمود نے ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی تو کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ یہ نجمہ تھی، جو خاک وخون میں غلطاں اپنی زندگی سے ناامید بے یار ومددگار یہاں پڑی تھی۔

محمود نے جلدی سے اپنے حواس مجتمع کئے اور نجمہ کو اپنے سہارے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

"نجمہ! میری نجمہ تم یہاں کیسے پہونچیں" محمود نے کہا لیکن ناامیدی کا میں امید نے پیدا ہوکر نجمہ کی آواز کو ایک لمحہ کیلئے فرط انبساط سے گلوگیر کر دیا نجمہ محمود سے لپٹ گئی اور اس کی آغوش میں ایک خوف زدہ بچے کی طرح کانپنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد جب دونوں کے ہوش وحواس مجتمع ہوئے تو انھوں نے ایک دوسرے کی سلامتی پر پہلے تو درگاہ قاضی الحاجات میں سربسجود ہوکر نذرانہ شکر پیش کیا اور پھر دونوں نے اپنی اپنی روداد الم سنائی۔ اسی اثنا میں نجمہ کی نظر ایک طلائی ہار پر پڑی جو نصف کی قریب محمود کے جیب سے باہر لٹک رہا تھا۔ نجمہ نے اسے جیب سے کھینچ لیا اور غور سے دیکھ کر چلا اٹھی "ارے یہ تو میری امی مرحومہ کا ہے محمود یہ تمھیں کہاں ملا"؟

محمود اب بالکل خاموش تھا۔ اس کا خیال فوراً اس لوہے کے سیف کی طرف گیا جس کو لوگ کچھ دیر قبل توڑ کر اس کا سامان نکال رہے تھے اور محمود نے عین اسی وقت پہونچکر ان لوگوں کو پستول سے ڈرا کر کل مال وزر نقد اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اب محمود کو خیال آیا کہ وہ سیف ضرور نجمہ کے باپ کا تھا اور جو روپیہ ملا وہ خود اسی کا تھا جو نجمہ کے باپ کے پاس بطور امانت رکھا ہوا تھا۔ محمود نے نجمہ کے ہاتھوں سے ہار لے لیا اور مسکراتے ہوئے اس کو نجمہ کے گلے میں ڈال دیا ——— یہ اس شب میں محمود کا پہلا تبسم تھا۔

"نجمہ! پیاری مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں اور نہ پرواہ" محمود نے نجمہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "تم مل گئیں، مجھے سب کچھ مل گیا۔ یہ ہار معہ دیگر زیورات کے مجھے راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا جو اب تمھاری نذر ہے۔"

جلد ۲۵ — فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۳۶ء — نمبر ۱۳

(حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا)

ملاحظات!

عالمگیر نے اپنے گذشتہ ادوار زندگی میں ادبیات اردو کی جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں، یہ ایک حقیقت واضح وغیر مستور ہے کہ عالمگیر کا ہر نمبر، پہلے نمبر سے بلحاظ محاسن صوری ومعنوی بڑھ چڑھ کر رہا ہے۔ یوں تو عالمگیر کے ہر نمبر کو علمی و ادبی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھا گیا، مگر اس کے سالناموں اور خاص نمبروں کو دنیائے اردو میں امتیازی حیثیت دی گئی۔ ہم بلا شائبہ مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالمگیر کے سالناموں اور خاص نمبروں نے اردو دنیا میں ایک مستقل و ہتم بالشان اضافہ کیا ہے۔

ادب، قوموں کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اقوام یورپ کے ادب کو دیکھئے، آپ اپنے ادب اور ان کے ادب میں بہت بڑا فرق پائیں گے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ انھوں نے اپنے ادب کو ترقی و وسعت دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور نہ کر رہے ہیں، مگر ہمارے ملک کا باوا آدم ہی نرالا ہے، ادب کی طرف افسوسناک بے توجہی و تغافل برتا جا رہا ہے، حالانکہ ادب قوموں اور ملکوں کے قصر عظمت کے تعمیری عناصر میں، ایک ایسا ناگزیر اہم عنصر ہے جس کے بغیر وہ کھڑا ہی نہیں رہ سکتا، ادب کو فروغ دینے کے واسطے ضروری ہے کہ ہم اپنے رسائل و جرائد کو ذہنی ارتقاء کی بلند سطح پر لائیں، عالمگیر اس فرض کو جس خوبی سے انجام دے رہا ہے - وہ پوشیدہ نہیں، عالمگیر نے قارئین عظام کے ذہنوں کو ایک طرف زندگی کی حرارت سے بھرے ہوئے افکار و ماغیہ سے روشن کیا ہے تو دوسری طرف فن مصوری کی بھی گراں قدر، بیش بہا، جمیل و حسین نمونوں کو بھی سطح وجود پر لانے کی کوشش کی ہے، اس کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے؟ یہ دنیا پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

عالمگیر کے سالنامہ ۱۹۳۶ء کو ہماری توقعات سے بڑھ کر نوازا گیا، جلیل القدر ادبا، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے اور مانگ کا یہ حال تھا کہ اشاعت سے کچھ عرصے بعد سالنامے کی تمام کاپیاں دفتر سے نکل گئیں اور اب دفتر میں صرف چند کاپیاں رہ گئی ہیں اور وہ بھی ہم نے فائل کے واسطے رکھی ہوئی ہیں!

ایک مژدۂ جانفزا

جن حضرات نے عالمگیر کے گذشتہ ہتم بالشان سالنامے اور خاص نمبر دیکھے ہیں، وہ یہ سن کر از حد خوش ہونگے کہ عالمگیر کا خاص نمبر ۳۷ء جہاں عالمگیر کی کتاب حیات میں ایک نہایت ہی اہم باب کا اضافہ کرنے والا ہے وہاں ادبیات اردو کو بھی چار چاند لگا دے۔ ہمارے پیش نظر ایک زبردست لائحہ عمل ہے۔ یہ اہم لائحہ عمل، عالمگیر کو کیا بنا دے گا، اس کے واسطے قارئین عظام کو کچھ عرصے کے لئے انتظار کرنا ہوگا، ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ عالمگیر کا یہ خاص نمبر جس پر ہم اپنی تمام امکانی کوششیں صرف کر رہے ہیں اور جس پر بساط سے بڑھ کر خرچ کر رہے ہیں نہ صرف ۳۷ء کا بلکہ اردو کا بہترین خاص نمبر ہوگا۔ ملک کے چوٹی کے ادباء اپنے نگارشات جمیلہ دفتر میں روانہ کر رہے ہیں۔ کتابت شروع ہو گئی ہے۔ یاد رکھیئے یہ خاص نمبر عالمگیر ظاہری جاذبیت، مقناطیسیت، حسن اہتمام اور مضامین کی جامعیت و تنوع کے لحاظ سے عدیم النظیر ہوگا۔

جو حضرات اس مہتم بالشان خاص نمبر کو مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ آج ہی عالمگیر کا سالانہ چندہ بھیجکر اپنے اسمائے گرامی عالمگیر کے مستقل خریداروں میں درج کرالیں!

اُردو جس دور ابتلا سے گذر رہی ہے وہ اہل قلم حضرات اچھی طرح جانتے ہیں۔ برادران وطن کی عناد آلود کوششیں سطح تعصب سے ابھر ابھر کر اردو پر عرصہ حیات تنگ کر رہی ہیں، اس صورت میں لازم ہے کہ اہل قلم حضرات جو اُردو کے واسطے اپنے سینوں میں درد رکھتے ہیں، برادران وطن کی اس متعصبانہ روشس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائیں، مدافعانہ کوششیں تو ہر حال میں جائز ہیں بلکہ لازمی و ناگزیر، کیا ہم امید رکھیں کہ حامیان اُردو اُردو کی حمایت میں خاص توجہ سے کام لینگے، ہمارے وطنی بھائی ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہیں، یعنی اُردو، مسلمانوں کی زبان ہے، قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے، حالانکہ اگر اس نظریئے کا تجزیہ کیا جائے تو ہم ہندو بھائیوں کو مضحکہ انگیز غلطی میں پائینگے۔ اُردو، ہندو، مسلمانوں کی کوششوں، متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے، پھر اس حالت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، وہ اگر چاہیں تو اسے ترقی دے سکتے ہیں، ہندوؤں کو اس سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے!! کاش برادران وطن اس غلطی کو سمجھیں اور اتحاد کے ایک ایسے ذریعہ کو، جو ہندوستان کی اقوام مختلفہ کو زنجیر محبت میں جکڑ سکتا ہے مٹانے کا افسوسناک اقدام نہ کریں!

عالمگیر کو استحکام دینے کے واسطے جدید انتظامات بروئے کار آرہے ہیں۔ قارئین کرام دیکھیں گے کہ عالمگیر کا معیار بلند سے بلند ہوتا جائیگا۔ آئندہ نمبروں میں ادبی اور محققانہ مقالات زیادہ تعداد میں شایع ہوا کرینگے ہم تحقیقی مضامین حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے بلند پایہ مضمون نگاروں سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ محبان عالمگیر یہ سن کر خوش ہونگے کہ ہمارے ارادوں کو بہت حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے! باب تنقید و تبصرہ کی جانب بھی خاص توجہ کی جارہی ہے!

اب ہم شمارہ حاضرہ کے بعض مضامین پر نظر ڈالتے ہیں۔

بلوری ملکہ (کوکین)

جناب ظفر قریشی صاحب بی۔ اے دہلوی کا یہ مقالہ پر از معلومات مفید اور سبق آموز ہے، کوکین کے ہلاکت انگیز اثرات کو اپنے موثر انداز میں پیش کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس بلوری ملکہ نے خاندان کے خاندان تباہ کر ڈالے ہیں اور کر رہی ہے کاش ہندوستانی، شہد میں لپٹی ہوئی اس زہر ہلاہل سے اجتناب کریں، ہم امید ہے کہ جناب ظفر صاحب آئندہ بھی عالمگیر کو ایسے مفید مقالات عنایت فرمائیں گے، اُردو میں اس قسم کے مضامین بہت کم تعداد میں ہیں۔

ارشد کی روح!

ایک انگریزی افسانہ ہے جسے جناب شفیق الرحمن صاحب نے ہندوستانی معاشرت میں پیش کیا ہے اور نہایت کامیاب طریقے پر،

داستان حیات!

دلچسپ خطوط کا مجموعہ ہے جس میں مرد اور عورت کی فطرت کو بطرز احسن پیش کیا ہے، ہم جناب اختر صاحب صدیقی کے ممنون احسان ہیں،

گناہ معاشرت!

اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ ہمارے معاشرتی گناہ ہمیں کیونکر تباہ کر رہے ہیں!

ہم تمام مضمون نگار حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ بدستور قلمی معاونت سے ادارہ کا ہاتھ بٹاتے رہینگے، (اداریہ)

نمبر خریداری! گذشتہ ماہ (جولائی ۳۶ء) سے عالمگیر کے تمام خریدار حضرات کے نمبر خریداری تبدیل ہوگئے ہیں آپ آئندہ خط و کتابت کے وقت جدید نمبر خریداری (جو اب آپ کے نام کے ساتھ چٹ پر چھپا ہوگا) تحریر کیا کریں، جولائی سے قبل جو نمبر آپ کا تھا اسے لکھنا فضول ہے۔ کیونکہ رجسٹر خریداران از سر نو مرتب کر کے پرانے تمام رجسٹر تلف کر دیئے گئے ہیں، ہر قسم کی خط و کتابت میں نمبر خریداری لکھنا اشد ضروری ہے!

نیاز مند، مینجر عالمگیر لاہور،

ایک جھلک

غازی صلاح الدین بیت المقدس میں

جناب شمس الدین صاحب شیدائی، انصاری تھرامی

۹ر اکتوبر ۱۱۸۷ء کا زمانہ ہے، جمعہ کا مبارک دن ہے۔ بیت المقدس کی فضائے بسیط میں اسلام کا ہلالی پرچم ہوا سے اٹھکھیلیاں کر رہا ہے۔ ذرے ذرے سے کیف و شادمانی کی لہریں پھوٹ رہی ہیں۔ ہر طرف چہل پہل کے ابتہاج آگیں اثرات نمایاں ہیں۔ عساکر اسلام کا ہر سپاہی صہبائے کامرانی سے چور اور نشۂ فتح و ظفر سے مخمور ہو کر پھر رہا ہے۔ وسط شہر کے وسیع سبزہ زار میں دور دور تک رنگ برنگ کے فوجی خیمے نصب ہیں جن کے اوپر احمری جھنڈیاں عجیب انداز سے لہرا رہی ہیں، آج پہلا جمعہ ہے جو فتح بیت المقدس کے بعد مسجد اقصیٰ میں ادا کیا جانے والا ہے۔ تلواروں کے دھنی اور نیزوں کے روح رواں غازیان اسلام فریضہ دوگانہ کی ادائگی کے لیے جلدی جلدی ملبوس فاخرہ سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ ہر طرف سکون و طمانیت کی روح پرور کیفیتیں مستولی ہیں کہ دفعتہً شور اٹھتا ہے کہ سلطان المجاہدین غازی صلاح الدین، نماز جمعہ ادا کرنے اور اپنی زریں کامیابی پر سجدہ شکر بجا لانے کے لئے مسجد اقصیٰ میں تشریف لا رہے ہیں ایک بجلی کی لہر ہے جو تمام عساکر اسلامی میں دوڑ جاتی ہے اور ہر شخص جلد از جلد مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے!

بیت اللہ کا وسیع صحن پرجوش غازیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے لوگ جوق درجوق چلے پڑتے ہیں۔ مجاہدین قطار اندر قطار بیٹھ رہے ہیں سرخ و سفید عرب، خشک فام بدو، کشیدہ قامت ترکی، بانکے ترچھے مصری و شامی جوان اپنے اپنے سرداروں کے ساتھ قطاریں بنا بنا کر جمع ہو رہے ہیں [illegible] کی [illegible] اور جانگسل جانفشانی کے بعد فرزندان توحید کو پھر [illegible] جہاں کا فریضہ امانت اسلام [illegible] سے سانس لینے کا موقع ملا ہے۔ ہر شخص رنگ عقیدت میں ڈوبے ہوئے دل اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نگاہوں سے، ۱ گرد کے در و دیوار کو تک رہا ہے۔ اور اپنے قلب کی ہر حرکت میں رافت و الفت کا ایک بحر بے پایاں موجیں مارتا محسوس کرتا ہے ... تکبیر کی پرجلال آواز اونچے اونچے میناروں سے بلند ہو کر مسجد کے گنبد سے ٹکراتی ہوئی ہر طرف فضا میں منتشر ہو جاتی ہے اور دفعتہً ایک سکوت، ایک مقدس سکوت در و دیوار پر طاری ہو جاتا ہے۔ آلاپو کا جادو بیان خطیب قاضی، جبہ و دستار سے مرصع جریب ٹیکتا ہوا منبر پر چڑھتا ہے اس کے نورانی چہرے کے گرد سفید ڈاڑھی کا جھالر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سے کرن پھوٹ رہی ہے۔ ہزاروں انسانوں کی عقیدت کیش نگاہیں مقدس چہرے پر جم جاتی ہیں۔

سحر بیان خطیب معمولی تلاوت قرآنی کے بعد حاضرین کو مخاطب کرتا ہے:

"غازیان اسلام و فدایان رب کعبہ!!

آج ہم جس قدر بھی خوشیاں منائیں کم ہے۔ خداوند قدوس کے اس الطاف بے پایاں اور عنایت بیکراں کا کس منہ سے شکر کیجئے کہ آج کے دن پھر اس نے اپنے جاں نثار غلاموں کو اس مقدس شہر میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائی، آج پھر ایک بار یہ مقدس در و دیوار تمہاری پرجلال گلبانگ تکبیر سے گونج رہے ہیں۔ کامل ایک سو سال تک دشمنان اسلام کے نجس قدموں سے پامال ہونے کے بعد آج پھر رب کعبہ کے نیاز مند اپنی جبین نیاز میں سجدۂ عقیدت کے ہدایا لئے ہوئے اس چوکھٹ پر حاضر ہوئے ہیں [illegible] ارض مقدس کے چپے چپے کو نقوش عقیدت سے [illegible] یہ [illegible] کی گلی گلی تمہارے [illegible] شیر دل [illegible] اور قیمتی خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ یہ فضائے بسیط جس کا ذرہ ذرہ

دین حنیف کا علمبردار ہے۔ یہ در و دیوار، یہ مساجد و مقابر جن کی بنیادیں حضور رسالتمآب صلعم کی صحبت یافتہ ہستیوں کے ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں پرستاران توحید کے نزدیک اسی طرح مقدس و قابل تعظیم ہیں جس طرح بیت اللہ!! یہ وہ مقدس ارض پاک ہے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قدموں کے نیچے برسوں رہ چکی ہے۔ یہی وہ مقدس خطۂ زمین ہے جہاں ہمارے آقائے نامدار سرور کونین حضور رسالتمآب معراج کی رات کو عرش معلیٰ سے اترے یہ وہ جگہ ہے جو برسوں کلمہ گویان توحید کا قبلہ رہ چکی ہے۔ یہ وہ مقدس خاک ہے جس کے ذرہ ذرہ میں رسولوں اور نبیوں کی امانتیں مخفی ہیں اور یہی وہ شہر ہے جہاں قیامت کے دن تمام انسان اپنے دنیوی اعمال کے حساب و کتاب کے لئے اپنے پروردگار کے روبرو کھڑے کئے جائینگے۔ آج تم جس قدر بھی خوشیاں مناؤ کم ہیں کیونکہ آج پھر اس ارض مقدس کی فضا میں اللہ اکبر کی غلغلہ انداز آواز گونج رہی ہے!

" اسلام کے نام کو زندہ رکھنے والے جانفروش غازیو! توحید کے نام پر سر کٹانے والے بہادر مجاہدو!! تم پر خدا کی رحمت ہو! تم نے اپنی تلواروں کے طوفان بدوش سیلاب سے کفر کے خس و خاشاک کو بہا کر بیت المقدس کو پاک کر دیا۔ تم غازیان بدر کے سرفروشانہ معرکوں کے حامل ہو۔ تمہارے دلوں میں ابوبکر کا استقلال ہے۔ تمہارے بازوؤں میں فاروق اعظم کی طاقت ہے۔ تمہارے جسموں کے اندر خالد کی روح ہے۔ تمہاری شمشیروں میں ذوالفقار کی برق سوز تڑپ ہے! تمہاری سرفروشی نے ابتدائے اسلام کی ان خونریز جنگوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جو قادسیہ، یرموک، اور خیبر کے نام سے موسوم ہیں۔ خداوند قدوس کی بارگاہ میں شہیدان اسلام کے خونی عطیے قبول ہوئے اور اس کے عوض جنت کی ساری شادمانیاں اور ابدی نشاط انگیزیاں انھیں سپرد کر دی گئیں۔ خوشیاں مناؤ کیونکہ تمہارا خدا تم سے خوش ہے۔

(دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر) اے رب العزت! تو اپنے عاجز بندوں کی دعا قبول کر۔ جب تک آسمان ہے اور آسمان پر چاند تارے۔ جب تک دنیا ہے اور دنیا میں انسان یہ ارض مقدس، یہ بیت اللہ، یہ کعبہ دین و ایمان، جس کو تیرے ناچیز بندوں نے اپنا مقدس خون بہا کر حاصل کیا ہے جس کی خاک میں ہمارے اسلاف کی پاک روحیں خوابیدہ ہیں کسی غیر کے نجس قدموں سے ملوث نہ ہو، اے خداوند قدوس! اپنے عاجز غلام کو جس کے جھنڈوں کے نیچے غازیان اسلام کا اجتماع ہے جس کی تلوار نے خرمن کفر کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ جو تیرے دین مبین کی حفاظت میں اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہے یعنی ابوالمظفر، خلیفۃ المسلمین، سلطان المجاہدین، غازی صلاح الدین یوسف بن ایوب کا سایہ ابدالآباد تک ہمارے سروں پر قائم رکھ!

آمین ثم آمین!

قاضی الفضل سلطان غازی صلاح الدین کے معتمد مشیر کا بیان ہے کہ یہ پرجوش اور ولولہ انگیز خطبہ کچھ اس جوش و خروش کے عالم میں ادا کیا گیا تھا کہ وہاں کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا۔

غازیان اسلام بیت المقدس کی زریں فتح سے اپنے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ غازی صلاح الدین کی عقیدت کیشانہ مساعی اس شہر کو پھر ایک بار اس کی پہلی آب و تاب میں لے آئی مقامات مقدسہ پہلے کی طرح پاک و صاف کئے گئے اور پھر وہی رعنائیاں اس کے در و دیوار پر چھا گئیں جو آج سے ایک صدی قبل تھیں۔ لکڑی کا وہ خوبصورت تراشا ہوا ممبر جسے نورالدین نے مسجد اقصیٰ میں نصب کرنے کیلئے بنوایا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے ہاتھوں سے نصب کیا جو آج تک اسی حالت میں موجود ہے اور مسلمانوں کی عظمت دیرینہ کی یاد تازہ کر رہا ہے!

شمس شیدائی شہسرامی!

نپولین پر قاتلانہ حملے

جناب افتخار احمد صاحب ضیا ریوری (دربھنگہ)

نپولین بوناپارٹ کے اخلاق پر مورخین نے جس تفصیل سے نظر ڈالی ہے شاید جدید دنیا کے کسی انسان کی شخصیت اس قدر زیر بحث نہ رہی ہو۔ نپولین نے یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں الٹ دی تھیں، اخلاق کے قانون میں اس کی فاتحانہ اولوالعزمی سب سے بڑا جرم تھی، اور اسی وجہ سے مفتوحہ ملکوں میں اس کی جان کے ہزاروں دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی تمام زندگی میں اس پر صرف دو ہی قاتلانہ حملے ہوئے۔ حملہ آوروں کے جذبات ہمیں سمجھنے چاہئیں۔ ان پر ظلم ہوا تھا، ان کی آزادی چھینی گئی تھی۔ وہ پرجوش دیوانے قوم پرستی میں سب کچھ کر سکتے تھے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ نپولین نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، کیا ایک مجرم کی وجہ سے سیکڑوں بے گناہ قتل کئے گئے؟ کیا خود مجرموں کو اس ہولناک طریقہ پر سزا دی گئی جو عام طور پر آج بھی متمدن دنیا میں رائج ہے؟ تاریخ اس کا اعتراف کرتی ہے کہ اس فراخدل و بلند ہمت انسان نے پوری شرافت سے دونوں قاتلوں کو معاف کر دینا چاہا اگرچہ ان میں سے ایک نے معافی قبول نہیں کی اور موت کو ترجیح دی، یہ دونوں واقعے بے حد دلچسپ اور عبرت انگیز ہیں۔

بویریا میں حملہ

شاہ بویریا (جرمنی) نے آسٹریا کے مقابلے میں نپولین سے مدد طلب کی تھی، نپولین ۲۲ رجولائی کو وہاں داخل ہوا ——— شاہ بویریا اس کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔

اس وقت بویریا کے باشندوں میں اپنے ملک کی سیاسی حالت کے متعلق سخت اختلاف رائے تھا۔ ایک گروہ فرانسیسی اثر پسند کرتا تھا دوسرا آسٹریا کو ترجیح دیتا تھا۔ نپولین کے آنے سے ایک دن پہلے اس شہر کے دو آدمیوں میں تکرار ہو گئی، ان میں ایک فرانس کا طرفدار تھا دوسرا آسٹریا کا۔ آخرالذکر کا نام "لوئی دولفت" تھا، اس کی عمر اٹھائیس برس کی تھی اور فرانس اور نپولین سے سخت نفرت کرتا تھا۔ نفرت کی وجہ بالکل معقول تھی۔ اس کا باپ اور بھائی فرانسیسیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ اور ماں کو جاسوسی کے الزام میں اس قدر تکلیف دی گئی تھی کہ وہ جانبر نہ ہو سکی، اس سے بھی زیادہ اس کی ناراضی کا سبب یہ تھا کہ جس جنگ میں مدد کے لئے نپولین کو بلایا گیا تھا اس کی وجہ سے اس شخص کی شادی ملتوی ہو گئی تھی اسے اپنی منگیتر سے غایت درجہ محبت تھی، وہ کسی طرح بھی شادی میں تاخیر گوارا نہ کر سکتا تھا۔

غرض کہ ان اسباب کی بنا پر شخص مذکور غصہ سے دیوانہ ہو رہا تھا اس نے اپنے ساتھی کو فرانس کی طرفداری کی وجہ سے زدوکوب کیا اور قسم کھائی کہ کل "نپولین کو ضرور قتل کر ڈالوں گا۔"

اس نے کہا "اگر مادر وطن کے اس ظالم دشمن کے قتل کی کسی کو جرأت نہیں تو میں یہ مہم انجام دونگا اور ملک کو اس شریر دشمن سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دونگا۔"

چنانچہ وہ یہ ارادہ لیکر فوراً روانہ ہو گیا۔ اسے نپولین کی آمد کی تاریخ معلوم نہ تھی۔ بازار میں ایک بویرین سپاہی کے گرد بھیڑ لگی تھی۔ یہ ابھی ابھی میدان جنگ سے آیا تھا لوگ لڑائی کی خبریں پوچھ رہے تھے وہ بتا رہا تھا کہ فرانسیسی فوج نے کس طرح آسٹرین فوج کو پسپا کر دیا ہے۔

لوئی دولفت نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ "نپولین ہمارے شہر میں کب داخل ہوگا؟" سپاہی نے تعجب سے سر اٹھا کر کہا "سپہ سالار کی زبانی ہم نے سنا ہے کہ نپولین کل صبح کو شہر میں داخل ہوگا۔ وہ ابھی میدان جنگ کا نقشہ مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے سلام کے لئے بہت بے چین ہو؟"

"ہاں، میں اسے ایک بالکل انوکھے طریقے سے سلام کرونگا!" دولفت نے کہا۔ پھر یہ شخص اپنے مکان پر گیا، بندوق لی اور شارع عام پر ایک خالی

مکان میں چھپ کر بیٹھ گیا، صبح کو بڑی بےچینی سے کھڑکی میں بیٹھا نپولین کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ سورج کی کرنوں کی روشنی میں اسے دور سواروں کی صفیں نظر آئیں۔ سب سے آگے ایک درمیانی قد کا سوار سر پر ممتاز ٹوپی پہنے آ رہا تھا۔ دولف نے سمجھ لیا کہ نپولین یہی ہے۔ بندوق درست کی، لیکن اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ قریب تھا کہ بندوق گر جائے لیکن اس نے اپنے تئیں سنبھالا جب نپولین چند گز کے فاصلہ پر آ گیا، تو فیر کرنا چاہا لیکن عین اسی وقت پیچھے سے ایک ہاتھ بڑھا اور اس زور سے اسے کھینچا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

نپولین کو اس واقعہ کی خبر تک نہ ہوئی، وہ اپنی قیامگاہ میں پہونچا، اور محکمہ جاسوسی کے افسر اعلیٰ کو بلا کر گفتگو کرنے لگا۔

"فرانسیسی فوج کے خلاف کسی سازش کا تو پتہ نہیں چلا؟"

"ہاں حضور والا! تیس سازشوں سے زیادہ کا حال اب تک معلوم ہو چکا ہے"

"سازش کے بانیوں کا بھی کچھ پتہ چلا؟"

"مجھ پر سب سے بڑا فرض شہنشاہ کی حفاظت کا ہے۔ میرے ایک افسر نے ابھی ابھی ایک عاقبت نا اندیش کو گرفتار کیا ہے جو حضور پر ——— گولی چلانے والا تھا۔"

نپولین نے تعجب سے پوچھا "وہ پروشیا کا باشندہ ہے یا آسٹریا کا؟"

"بویرین ہے!" افسر نے جواب دیا۔

نپولین یہ سن کر سخت متحیر ہوا "خوب! میں تو اس بدنصیب ملک کو آسٹریا کی غلامی سے بچانے کے لئے فرانسیسی فوج کا خون بہا رہا ہوں اور اس کا بدلہ مجھے یہ دیا جا رہا ہے۔ 'دھوکے سے قتل!'"

اس نے مجرم کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ موجود تھا نپولین کھڑا تھا۔ مجرم اس کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ اس کے داہنی طرف بویریا کا ولیعہد تھا۔ بائیں جانب جنرل برتھیہ! نپولین نے اپنی آنکھیں مجرم کے چہرے پر جما دیں، ان آنکھوں میں نہیں معلوم کیا طلسمی قوت تھی کہ مجرم تاب نہ لا سکا۔ اور منہ کے بل گر کر چلایا "عفو، عفو!"

نپولین نے نرمی سے پوچھا۔ "وہ اسباب کیا تھے جنھوں نے تجھکو اس جرم پر آمادہ کیا؟"

مجرم نے تمام واقعات صحیح بتا دیئے۔ اس پر نپولین نے کہا "لیکن اس میں میرا قصور کیا ہے؟ اگر دول یورپ مجھے مٹانا چاہتی ہے اور میں اپنی مدافعت کرتا ہوں تو میرا گناہ کیا ہے؟ تمھاری شادی رکنے کا میں نے حکم نہیں دیا نہ میں اس کے التوا کا اصلی سبب ہوں لیکن اگر تم مجھ ہی کو باعث سمجھتے ہو تو میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ آج ہی تمھاری منگیتر سے تمھاری شادی ہو جائے میں اپنی جیب خاص سے سو اشرفیاں اس تقریب میں پیش کرتا ہوں"

پھر وہ جنرل سے مخاطب ہوا "برتھیہ! کل فوج کے ایک دستے کے ساتھ اس شادی میں شریک ہونا اور میری طرف سے دولہا دلہن کے ساتھ جلوس میں چلنا"

پھر نپولین مترجم سے کہنے لگا ——— "اس شخص سے کہدو کہ میں نے معاف کر دیا، میں تمھارے لئے خوشی و خرمی کا متمنی ہوں"

دولف خلاف توقع یہ برتاؤ دیکھ کر مبہوت ہو گیا، گر ولیعہد بویریا نے نپولین سے کہا۔

"آپ کا اخلاق واقعی نہایت قابل عزت ہے!"

نپولین نے سادگی سے جواب دیا۔ "عزیز شاہزادے! میں نے تو بادشاہی کا ایک نہایت معمولی فرض ادا کیا ہے۔ کبھی کبھی 'عفو و کرم' بادشاہوں کا مقدس فرض ہو جاتا ہے!"

(ماخوذ)

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

از ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا روم

تلاش

حضرت علامہ محوی لکھنوی (مدراس)

تاروں بھری رات کی فضا میں،
باغوں کی شمیم دل کشا میں،
اور صبح کی جانفزا ہوا میں،
آنکھیں مری تجھکو ڈھونڈھتی ہیں!!

تاریک ردا میں بادلوں کی،
خاموش فضا میں جنگلوں کی،
دلدوز نوا میں کوئلوں کی،
آنکھیں مری تجھکو ڈھونڈھتی ہیں!!

پھولوں کی لطیف تر ہنسی میں،
کلیوں کے تبسّمِ خفی میں،
شاخوں کی لچک میں نازکی میں،
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں!

جب چاند ہو ضوفشاں جہاں پر،
ہو چاندنی بامِ ہر مکاں ــ پر،
تارے چھٹکے ہوں آسماں ــ پر،
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں!

گلشن کی نسیمِ مشکبو میں،،
صحرا کی ہوائے تند خو میں "
کہسار کی شوخ آبجو میں "
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں!

شادابئ کوہسار میں بھی!!
رنگینئ لالہ زار میں بھی!!
رعنائی ہر بہار میں بھی!!
آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں!

شاداب چمن کی پتیوں میں، برسات کی ننھی بوندیوں میں
بادل کی گرج میں بجلیوں میں، آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

سرسبز تمام وادیوں میں، آزاد خرام ندیوں میں
خودرو شاداب بوٹیوں میں، آنکھیں مری تجھکو ڈھونڈتی ہیں

ہر غنچے میں اور برگ تر میں، ہر پھول میں اور ہر ثمر میں
ہر شاخ میں اور ہر شجر میں، آنکھیں مری تجھکو ڈھونڈتی ہیں

سناٹا ہو جب محیطِ عالم، تاریکئ شب محیطِ عالم
خاموش ہو سب محیطِ عالم، آنکھیں مری تجھکو ڈھونڈتی ہیں

ایک تحیّر زا افسانہ

ارشد کی رُوح

(از راؤ شفیق الرحمٰن خاں کلانوری)

دو سو سال کا ذکر ہے۔ ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ موسم بہار کی ایک چمکیلی صبح کو جبکہ نسیم سحری فضا میں اور بھی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ آگرے سے ایک بگھی دہلی جانیوالی سڑک پر جارہی تھی۔ اس میں تقریباً دس گیارہ مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلی نشست پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔ دونوں کے خدوخال ایک دوسرے سے ایک حد تک ملتے جلتے تھے مگر ایک کا جسم نامناسب اور بے ڈھنگا سا تھا۔ اور چہرہ اداس اور زرد سا۔ دوسرے کا بدن گٹھیلا اور چہرہ بارونق اور شکیل تھا اور کمر سے ایک تلوار بندھی ہوئی تھی۔ گاڑی کو چلتے ہوئے مشکل سے آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا۔ کہ پہلے نے دوسرے سے شرماتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیوں حضرت! آپ کبھی پہلے بھی دہلی تشریف لیگئے ہیں؟"

"دہلی!" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہاں تقریباً چھ سال تک طالب علم رہ چکا ہوں۔ اور وہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں"۔

"آپ کا اسم شریف؟" پہلے سے دریافت کیا۔

"خاکسار کو سلیم کہتے ہیں۔ اور جناب کی تعریف؟"

"بندے کو ارشد کے نام سے پکارتے ہیں!"

"میرے خیال میں آپ دہلی پہلی مرتبہ تشریف لے جارہے ہیں"۔ سلیم نے دریافت کیا۔

"جی ہاں! دہلی کیا میں نے اپنی عمر میں آج تک کوئی سفر ہی نہیں کیا"۔ ارشد نے جواب دیا۔

"خوب! تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ وہاں کس کام کے لئے تشریف لے جارہے ہیں؟" سلیم نے دریافت کیا۔

"جی میں وہاں..... یعنی دہلی..... میں وہاں..... ایک ضروری کام کے لئے جارہا ہوں!" ارشد بولا۔

"گستاخی معاف! میں وہ ضروری کام ہی تو دریافت کرنا چاہتا ہوں"۔ سلیم نے پوچھا۔

"بات در اصل یہ ہے کہ میں اپنی شادی کرنے جارہا ہوں" ارشد بولا۔

"آپ اپنی شادی کرانے جارہے ہیں! واہ واہ!! اور لطف یہ کہ بالکل اکیلے۔ یہ تو انوکھا لطیفہ ہے صاحب!

"مذاق نہ سمجھئے!" ارشد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "قبلہ والد صاحب کو تو اپنی سوداگری کے جھگڑے سے مطلق فرصت نہیں ہے اور میری شادی کے بارے میں سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ فقط نکاح باقی ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی عبا کو ذرا ڈھیلا کیا۔ جس سے اُس کا غیر متناسب جسم سلیم کو دکھائی دیا۔ سلیم ازراہ تمسخر بولا۔ "حضرت! صرف دوکان ہی پر سارا دن بیٹھے رہتے ہو۔ یا کچھ کھیل کود میں بھی....."

"مجھے کھیل کود سے سخت نفرت ہے"۔ ارشد نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں لغویات سمجھتا ہوں۔ اور آپ؟"

"کھیل کود میری جان ہیں"۔ سلیم بولا۔ "میں ورزش کا عاشق ہوں"

"انوکھا عشق ہے قبلہ"۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ آگرے میں کہاں سے تشریف لا رہے ہیں اور دہلی میں کہاں جائیں گے؟" سلیم نے پوچھا۔

"آگرے میں میرے والد میر عبدالجبار صاحب سوداگر ہیں۔ اور دہلی میں میں میر قائم علی کے ہاں جا رہا ہوں۔ وہ بھی سوداگر ہیں۔ اور لال قلعہ کے پاس ہی خانم بازار میں رہتے ہیں۔" ارشد نے جواب دیا۔

"کیوں دوست! تمہیں کچھ وہاں کا پتہ بھی ہے۔ یا ویسے ہی اندھا دھند جا رہے ہو؟" سلیم نے دریافت کیا۔

"ہاں اتنا ہے کہ بڑے دولتمند ہیں۔ اور جہیز بھی کافی ملے گا" ارشد نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"جہیز کو ڈالو جہنم میں اور یہ بتاؤ کہ تمہیں اس کے بارے میں بھی کچھ پتہ ہے؟"

"اس کے۔ کس کے بارے میں؟"

"ارے میاں عجب انسان ہو تم بھی! ارے اپنی منسوبہ کے بارے میں اور کس کے بارے میں؟"

"اوہو! ٹھیک ہے! اب سمجھا۔" ارشد نے ہنستے ہوئے کہا "سنا ہے کہ بڑے زیورات پہنے رہتی ہے۔ اور بڑی خوبصورت اور تندرست ہے!"

"واہ استاد!" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تندرستی اور زیورات کی بھی ایک ہی کہی"۔

"اور آپ کہاں جا رہے ہیں!" ارشد نے سلیم سے دریافت کیا

"ارے یار رہنے بھی دو" سلیم نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "میرا قصہ بہت لمبا ہے سن کر کیا لو گے"

"نہیں نہیں! ہم تو سنیں گے! اور ضرور سنیں گے!!" ارشد بولا

اچھا اگر مجبور کرتے ہو تو سنو" سلیم بولا "بات یہ ہے کہ میرے والد نے میری شادی ایک دولتمند بیوہ سے کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے اور میں اس عورت سے ایسا ڈرتا ہوں جیسے لوگ بھوت سے ڈرتے ہیں۔

اُفوہ! عورت کیا ہے چڑیل ہے۔ جب کبھی دیکھتا ہوں تن سے جان نکل جاتی ہے۔ میں نے بہت انکار کیا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ اب میں نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور دہلی اپنا غم غلط کرنے جا رہا ہوں۔ اس چڑیل سے بناوٹی اظہار محبت کر کے ایک بڑی رقم اینٹھ کر لایا ہوں۔ دہلی کچھ روز ٹھہر کر یا تو لاہور چلا جاؤں گا۔ یا شاہی فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا۔ گھر واپس نہ جاؤں گا"۔

"بڑے ناشکرے ہو تم!" ارشد بولا۔ "اتنی دولت کو ٹھکرا رہے ہیں"

"دولت! لاحول ولاقوۃ!" سلیم نے کہا۔ "دولت کیا اگر مجھے کوئی بہشت بھی اس چڑیل کے ساتھ رہنے کے معاوضے میں دے تو بھی میں دور ہی سے سلام کروں۔ مجھے سکونِ قلب کی تلاش ہے جب زندگی میں وہ بھی حاصل نہ ہو سکا تو دولت بھی فضول ہے"۔

"اور والدین کی فرمانبرداری؟" ارشد نے دریافت کیا۔

"والدین کی فرمانبرداری میں نے بہت کی اور اب بھی کرتا ہوں" سلیم نے جواب دیا۔ "مگر یہ تو معاملہ ہی بے ڈھب ہے شادی ہوتے ہی وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور پھر وہی مثال ہوتی ہے۔ کہ "اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے" اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ ساری زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ایک دو روز کا سودا نہیں عمر بھر کا سودا ہے۔ انسان پیسے کی ٹھلیا مول لیتا ہے تو ٹھوک بجا کر لیتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسے ضروری اور اہم کام کو سارے پہلوؤں سے دیکھ بھال کر انجام نہ دیں۔ سمجھے دوست!"

"ٹھیک ہے" ارشد نے جواب دیا۔ "مگر دیکھو تو اس طرح تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی"

زندگی! زندگی چیز ہی کیا ہے!! سلیم نے لاپروائی سے کہا۔ "زندگی کو میں نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی۔ میں زندگی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ میری نظروں میں زندگی ایک کھیل ہے۔ ایک تماشہ ہے۔ اور صرف چند خوابوں کا مجموعہ ہے۔ زندگی کی قدر اس کی اہمیت وہی جانتا ہے جو بزدل ہو۔ ڈرپوک ہو۔ مگر آزاد طبیعت والے زندگی کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتے"۔

خیر اس جھگڑے کو دفع کرو! ارشد نے تنگ آ کر کہا۔ "اب

یہ بتاؤ کہ گھمی دہلی کیسے وقت پہنچیگی؟" "شام کو پہنچیگی شاید!" سلیم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم دونوں وہاں رات کو اکٹھے کسی سرائے میں ٹھہریں۔ اور اس کے بعد علی الصبح ایک دوسرے سے رخصت ہو جائیں"۔

"بہت بہتر!" ارشد نے جواب دیا۔

اسی طرح سے سلیم اور ارشد شام تک آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔ شام کے وقت جبکہ سورج کی زرد زرد کرنیں دریائے جمنا کی نیلگوں سطح پر رقصاں تھیں۔ گھمی دہلی میں داخل ہوئی۔ لال قلعہ اور جامع مسجد شفق کی گلابی روشنی سے جگمگا رہے تھے یہ دونوں دوست شیخ ابراہیم کی سرائے میں اترے۔ سلیم نے اترتے ہی مالکِ سرائے کو بلا کر کہا۔ "دیکھئے صاحب! آج رات ہم آپ کی سرائے میں ٹھہریں گے۔ آپ ہمارے لئے بہترین کھانے مہیا کریں اور ہمارے ٹھہرنے کے لئے بہترین کمرے درست کرا دیں"۔

"بہت بہتر جناب!" مالک سرائے کا جواب تھا۔

چنانچہ حکم کے بموجب اسی طرح کیا گیا۔ ارشد غریب نے یہ نوابی ٹھاٹ کہاں دیکھے تھے۔ وہ دنگ رہ گیا۔

خیر رات کو سیر کے بعد وہ دستر خوان پر بیٹھے۔ ارشد زیادہ کھا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ سلیم کو آدھی رات ایک ڈراؤنی شکل کے حکیم نے جگایا۔ اور دریافت کیا۔ "کیوں صاحب! ساتھ کے کمرے والے صاحب آپ کے دوست ہیں کیا؟"

"جی نہیں دوست تو نہیں! ہاں واقف ضرور ہیں!!" سلیم نے جواب دیا۔

تو آپ براہ مہربانی اُن کے کمرے میں چلیں"۔ حکیم بولا

"کیوں؟" سلیم نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"وہ شام کو بہت زیادہ کھا گئے ہیں۔ اور انہیں ایک خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ جو کہ ہر ایک لمحے کے بعد زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ وہ صبح تک زندہ نہ رہ سکینگے"

حکیم کا چہرہ زیادہ ڈراؤنا اور سنجیدہ ہوتا گیا۔

سلیم فوراً ارشد کے کمرے میں پہنچا۔ جہاں وہ زور زور سے چیخیں مار رہا تھا۔ اور سلیم کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگا۔ "دوست میرا وقت آن پہنچا۔ اگر کل کچھ برا بھلا کہہ گیا ہوں تو معاف کرنا"

"نہیں نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے! آپ بہت جلد صحتیاب ہو جائیں گے"۔ سلیم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"صحتیاب! صحتیاب ہو چکا"۔ ارشد نے روتے ہوئے کہا "کیوں دوست میرا ایک کام بھی کرو گے؟"

"بسر و چشم!"

"وہاں میر صاحب کے گھر میرا انتظار ہو گا۔ تم علی الصبح ضرور بالضرور جا کر اُن کو اطلاع دے دینا۔ اور ثریا........ اُف وہ........ بھیا سلیم..... سخت درد ہوتا ہے!"

حکیم نے تھوڑی سی دوائی پلائی جسے پی کر ارشد نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوست! افسوس ہے! ہماری دوستی بہت جلد ختم ہو رہی ہے۔ اور تم ایسے دوست پر مجھے فخر ہے — افسوس کہ میں تمہاری....... کچھ.... خدمت..... نہ کر سکا"

تھوڑی دیر میں ارشد نے سلیم کی گود میں جان دیدی۔

سلیم نے باہر نکل کر دیکھا تو پو پھٹ چکی تھی۔ وہ واپس اپنے کمرے میں گیا۔ اس نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور اپنی تلوار ساتھ لے کر ایک گاڑی میں بتائے ہوئے پتے پر چل کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ایک عالی شان محل کے سامنے جا کر رکی۔ سلیم اترا اور اتر کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ یکایک ایک کنیز اندر سے آئی اور سلیم کو دیکھ کر پھر واپس اندر ہی بھاگ گئی تھوڑی سی دیر کے بعد ایک لحیم و شحیم اور ادھیڑ عمر کا آدمی دروازے سے باہر نکلا اور سلیم سے نہایت گرمجوشی سے بغلگیر ہوا۔ یہ میر قاسم علی تھے

"مجھے پورا یقین تھا کہ میرے دوست کا بیٹا اپنے باپ کی طرح وقت کا پابند ہو گا"۔ میر قاسم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر بولے "کیوں بیٹا راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں قبلہ!" سلیم نے حیران ہو کر کہا۔ "بڑے آرام کے ساتھ آیا"۔

"اچھا تو گھر چلو نا"
"مگر قبلہ مجھے تو ایک ضروری کام. . . . ."
"ضروری کام! ہاں ٹھیک ہے۔ گھر چلو نا برخوردار! وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے"۔
"مگر میرا مقصد یہ ہے۔ کہ مجھے . . . . !"
"تمہارا مقصد کرائے سے ہے۔ ناامید! گاڑی والے کو کرایہ دیدو۔ اور ہاں اسے کچھ انعام بھی دیدو۔ بھلا شادیاں روز روز تھوڑا ہی ہوتی ہیں"۔
"مگر قبلہ آپ میری بات تو سنتے ہی نہیں۔ میرا مطلب کچھ اور ہے۔ آپ ناحق . . . ."
"افوہ! اس میں تکلیف کی بات ہی کیا ہے؟ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔ کرایہ ایک معمولی سی چیز ہے برخوردار!"
"مگر حضرت! دیکھئے گا۔ آپ مجھے بولنے کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ . . . ."
"یعنی ناشتہ! ناشتہ گھر کر لینا۔ بھئی چلو نہ۔ کیا کر رہے ہو یہاں!!"

اسی طرح سلیم کی ہر ایک بات کاٹی گئی۔ وہ بے چارہ چُپ چاپ اُن کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں کئی دفعہ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر ہر دفعہ اسے اسی طرح سے چُپ کر دیا گیا۔ اندر جا کر اس نے دیکھا کہ پورا کنبہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے سب کو سلام کیا۔ جس پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے سلیم کو گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ یہ ثریا کی والدہ اور میر صاحب کی بیوی تھیں۔ سلیم سے ہر ایک نے یہی سوال کیا کہ راستے میں اُسے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ مگر اس نے سب کو ایک جواب سے مطمئن کرا دیا کہ وہ بڑے مزے سے آیا۔ اب سلیم کی تواضع شروع ہوئی۔ اور دستور کے مطابق سلیم کے سامنے شربت پان اور چکنی ڈلی وغیرہ پیش کی گئی۔ سلیم کا دل مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ امانت میں خیانت کر رہا ہے۔ وہ اپنے فرض کو بھول رہا ہے۔ مگر ایک آنیوالے سہانے سماں کا خیال ان سب باتوں پر غالب آ جاتا تھا۔ اور دراصل اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ اُسے خیالات کے اظہار کا موقع ہی نہیں دیا گیا تھا۔ کنبے کی غلط فہمی کو پہلے ہی دور کرنا چاہئے تھا۔ اب کوئی موقع نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک حد تک مضحکہ انگیز معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے مستقبل کو قسمت کے ہاتھ میں سونپ دیا اور آرشد کا پارٹ ادا کرنے کی دل میں ٹھان لی ۔

جہاں سب کے لبوں پہ تبسم تھا۔ وہاں ایک ایسا نوجوان بھی تھا جو دانت پیس رہا تھا۔ یہ میر قاسم علی کا بھتیجا تھا۔ جسے انہوں نے بڑے لاڈ سے اپنے بیٹوں کی طرح سے پالا تھا۔ یہ شاہی فوج کا ایک افسر تھا۔ شکل صورت خاصی تھی مگر سلیم کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ اس کا نام محمد ذکی تھا۔ اور صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ یہ آرشد (سلیم) کا رقیب تھا۔ اور اُسے مشتبہ نگاہوں سے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ یکایک وہ اُٹھا اور اندر سے آرشد کی وہ تصویر اُٹھا لایا جو کہ منگنی کے وقت آگرے سے آئی تھی۔ سب کی توجہ تصویر کی طرف مبذول ہو گئی۔

میر صاحب بولے "برخوردار! تم دُبلے بہت معلوم ہوتے ہو!!"

"جی ہاں!" سلیم نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا "میں پچھلے دو مہینوں سے بیمار تھا!"

"بیمار رہے!" سب نے حیرت سے دریافت کیا۔

"جی ہاں! مگر اب بفضلِ خدا بالکل تندرست ہوں" سلیم نے جواب دیا۔

"خیر! لو اب تم بیٹھو" میر صاحب بولے۔ "مجھے آج قلعے میں بادشاہ سلامت نے بلایا ہے۔ ذکی تم ان کے پاس بیٹھو"۔ یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔ اور اب کمرے میں ذکی اور سلیم اکیلے رہ گئے۔ ذکی نے نفرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سلیم سے کہا۔ "جناب! آپ کے اخلاق و عادات تو بالکل آگرے کے گڈریوں ایسے ہیں"۔

"اور جناب! آپ تو!! آپ تو دِلّی کے کنجڑوں ایسے ہیں۔" سلیم نے گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ذکی اس پر کٹ گیا۔ پھر بولا "میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں؟"

"کیا کہا آپ نے؟" سلیم نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا"

"آپ کی سمجھ میں؟" ذکی نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو اچھی طرح سے سمجھا دونگا"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں" سلیم نے بظاہر بزدل بنتے ہوئے کہا۔ "اور یہ آپ نے اپنا ہاتھ کہاں رکھا ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے صاحب! تہذیب کے دائرے میں رہیئے۔ آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"یہی کہ ہم دونوں کو فیصلہ کر لینا چاہئے۔ کہ ہم میں سے زندہ رہنے کے لایق کون ہے۔ آج۔ آج ظہر کے وقت آپ تلوار لے کر پائیں باغ میں تشریف لے آئیں۔ وہاں فیصلہ ہو جائے گا" یہ کہہ کر ذکی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور سلیم بے اختیار مسکرا دیا۔

اسی اثنا میں ایک کنیز کمرے میں داخل ہوئی اور بولی "چلئے صاحب آپ کو میر صاحب کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔ سلیم ساتھ ساتھ ہو لیا کنیز اُسے ایک کمرے میں چھوڑ آئی۔ اور چلتے وقت شرارتاً کہنے لگی۔ "صاحب ذرا سنبھل کر بیٹھئے گا۔ ساتھ والا کمرہ ثریا خانم کا ہے مبادا کہیں ہوش و حواس کھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہشت!" سلیم نے اُسے چُپ کرا دیا۔ کنیز چلی گئی۔ سلیم کے دل میں گدگدی سی اٹھی۔ اس نے کہا۔ کہ جس کے لئے یہ جھگڑا مول لیا ہے۔ اسے ایک نظر سے دیکھ تو لیں۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور ساتھ والے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی درازمیں سے جھانک کر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر ایک جذبۂ بے اختیار سے مجبور ہو کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو گیا ثریا بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ سلیم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی خوبصورت لڑکی اس کی نظروں سے کبھی نہ گذری تھی۔ وہ کچھ دیر تو ٹھٹکا رہا۔ پھر بولا۔ "خانم مجھے امید ہے کہ آپ مجھے چوروں کی طرح سے اپنے کمرے میں داخل ہونے کے لئے معاف فرمائیں گی!"

"جی نہیں!" ثریا نے اپنی نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اس میں معافی کی کیا بات ہے۔ آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں! کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہوئی۔ البتہ ایک شوق نے مجھے بڑا تنگ کئے رکھا۔"

"وہ کیا؟" ثریا نے بھولے پن سے کہا۔

"آپ کو دیکھنے کا شوق"

"معاف کیجئے گا! میں آپ کی بیوی نہیں ہوں۔ صرف منسوبہ ہوں!"

"مگر خانم آپ بڑی بے رحم ہیں" سلیم نے اپنا پارٹ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

"نہ تو میں رحمدل ہوں اور نہ بے رحم! میری حیثیت محض ایک تجارتی سامان کی سی ہے۔ جس کا سودا میرے والد اور تمہارے والد نے آپس میں چکایا ہوا ہے۔ اور بس!" ثریا نے کہا۔

"مگر خانم مجھے آپ سے بے حد اُنس ہے!" سلیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"انس اور آپ کو! جبھی آپ کالے کوسوں سے ایک بلا دیکھی لڑکی سے شادی کرنے آگئے ہیں۔ جبھی آپ نے کسی بدقسمت کی زندگی کو تباہ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف میرے اللہ!" ثریا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ رونے لگی۔

"خانم خدا کی قسم تمہاری پرستش کیا کرونگا۔ میری ادنےٰ زندگی کا لمحہ لمحہ تمہاری خدمت کے لئے وقف ہوگا۔ مجھے اتنی بُری طرح مت ٹھکراؤ۔ اور اس تمناؤں بھرے دل کا خیال کرو جو کہ آگرے سے یہاں تک محض تمہاری اُلفت میں کھینچا ہوا آیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خانم خدا کے لئے غور کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری حالت پر غور کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

سلیم کمال کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اس کی نشیلی اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تھے۔ الفاظ کیا تھے تیر تھے جو ثریا کے دل میں

پیوست ہو گئے۔ وہ متاثر ہو کر بولی۔

"میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ مگر افسوس کہ محبت نہیں کر سکتی میرے دل میں آپ کے متعلق جو خیالات تھے۔ ان سے آپ ہزار درجہ بالاتر ہیں۔ مگر افسوس یہ دل کسی اور کا ہو چکا ہے۔ آپ ذرا دیر میں تشریف لائے۔"

"ذکی!" سلیم نے زور سے کہا۔

"جی ہاں ذکی! ہم آپس میں محبت کرتے ہیں! اس نے میری روح کو دنیا کی پستی سے نکال کر عرش کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ میں اس کی شکر گزار ہوں اور وہ ....!"

"بہت اچھا! خدا حافظ خانم!!" سلیم یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب اس کے سامنے ساری گتھی سلجھی ہوئی رکھی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ اس کی جگہ اگر ارشد ہوتا تو اس غریب کا کیا حشر ہوتا اس کے سلسلۂ خیالات کو ایک کنیز کی آواز نے توڑ دیا۔ "چلئے آپ کو دسترخوان پر بلاتے ہیں!" سلیم اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

سلیم تجربہ کار تھا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی۔ زمانے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کا اسے تجربہ نہ ہو چکا ہو۔ ویسے بھی وہ بڑی بڑی محفلوں میں شریک ہو چکا تھا۔ بیٹھتے ہی اسنے اپنی دلچسپ باتوں اور لطیفوں کا سماں باندھ دیا۔ سلیم میں کمی ہی کیا تھی۔ خوبصورت تھا۔ نوجوان تھا بیش قیمت پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ تہذیب یافتہ تھا۔ سب کے سب اس کے گرویدہ ہو گئے۔ ثریا بھی بہت متاثر ہوئی۔ اور وہ اپنی سخت کلامی پر پشیمان تھی۔ کبھی کبھی سلیم کو کنکھیوں سے دیکھ لیتی تھی مگر ناخوش تھا تو وہ ایک ذکی تھا۔ اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آخر کھانا ختم ہوا۔ اور وہ سلیم پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔

سلیم نے بھی باہر جانا چاہا۔ مگر میر صاحب نے اسے شطرنج کیلئے بٹھا لیا۔ اور بازی شروع ہوئی۔ جو پورے دو گھنٹوں میں ختم ہوئی سلیم نے کہا۔ قبلہ! میں ذرا باغ تک ہو آؤں"

"بخوشی!" میر صاحب نے جواب دیا۔ "اگر کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں"

"جی نہیں! مجھے اکیلے سیر کرنے کی عادت ہے" سلیم نے کہا۔

"بہت اچھا جاؤ" میر صاحب بولے۔ "مگر ذرا جلدی آنا۔ کیونکہ نکاح کے لئے سب تیاریاں ہو چکی ہیں" سلیم پائیں باغ میں پہنچا وہاں ذکی کو منتظر پایا۔ وہ دیکھتے ہی بولا۔ "دوست! بہت دیر لگا دی۔ اپنی منسوبہ کے پاس بیٹھے تھے کیا؟"

"خاموش! بدبخت!! پرائی چیز پر نگاہ ڈالتے تجھے شرم نہ آئی۔ ایک معصوم لڑکی کو اپنی بیہودہ باتوں سے بہکا ہی دیا نا؟" سلیم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"اوہ! اتنا غصہ!! اتنا گھمنڈ آخر کس پر؟" ذکی نے طنزاً جواب دیا۔ "کیسی پرائی چیز محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہے۔ اچھا خود خیال کرو کہ کھلا ہوا دسترخوان دیکھ کر بھوکے کا ایمان کس طرح سلامت رہ سکتا ہے۔ خیر! جلدی کرو تلوار نکالو۔ آؤ ہم فیصلہ کر لیں کہ ثریا کس کی ہے؟"

"ثریا! ثریا کی طرف میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ چاہنا تو درکنار رہا" سلیم نے جواب دیا۔

"چھوٹے ہوئے شکار پر ہاتھ ڈالنا میں انتہائی درجے کی حماقت سمجھتا ہوں"۔

"خیر! سمجھتے ہو گے!" ذکی نے کہا۔ "مگر اس وقت تو تم لڑائی سے بچنے کے لئے بہانے تلاش کر رہے ہو"۔

"بہانے! کیا کہا بہانے تلاش کر رہا ہوں؟" سلیم نے پارٹ خوش ادائیگی سے ادا کرتے ہوئے کہا۔ "تجھے ایک ناتجربہ کار سوداگر زادے پر تلوار اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کاش تیرا پالا کسی سپاہی زادے سے پڑا ہوتا"۔

"مگر تمہیں لڑنے کے لئے مجبور ہی کون کرتا ہے" ذکی نے کہا "اگر چاہو تو لڑائی سے بچ سکتے ہو۔ چپ چاپ عزت سے واپس آگرے چلے جاؤ۔ بس! میں تمہاری جان بخشی کردونگا!!"

اب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ سلیم سپاہی زادہ تھا ہر چند کہ وہ نقلی گفتگو کرتا رہا مگر ایسے طعنے سن کر اس سے رہا نہ گیا وہ کڑک کر بولا۔

"جان بخشی اور تو کرے گا؟ میں تجھ سے ابتک کھیل رہا تھا اچھا لے اب تجھے اصلیت بتا ہی دوں۔ تلوار نکال لے..... خبردار.........لے سنبھال......!"

لڑائی شروع ہو گئی۔ ذکی سلیم کو ناتجربہ کار سمجھتا تھا۔ مگر اب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ بُرا پھنسا ہے۔ اور اس کی زندگی کا انحصار صرف سلیم کے رحم پر موقوف ہے سلیم استادی سے کام لے رہا تھا۔ پہلے تو وہ ذکی کے وار روکتا رہا اور جب اُسے اچھی طرح سے تھکا چکا تو پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہوا۔ اور تلوار کے چرکوں کے ساتھ ساتھ الفاظ کے چرکے بھی لگاتا جاتا تھا۔

"اجی قبلہ اسے سنبھالئے...... اوہ آپ ہانپ کیوں رہے ہیں......اوہو آپ خون پونچھ رہے ہیں....... ثریا کا رومال لادوں کیا........ ہاہاہاہا......خدا کے لئے میری جان بخشی کر دینا......... اجی سپاہی صاحب قبلہ..... اور لو یہ فیصلہ ہے.........!

جھن سے ذکی کی تلوار سلیم کے قدموں میں آپڑی ۔ ذکی کا رنگ زرد پڑ گیا۔ سلیم نے تلوار اٹھاتے ہوئے ذکی کو فرشی سلام کیا۔ یکایک اُس کی نظر سامنے کی کھڑکی پر پڑی ......اس میں سے کوئی جھانک رہا تھا ...... یہ ثریا تھی!۔

"لیجئے قبلہ!" سلیم نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذکی سے کہا۔ "وہ رہیں آپ کی معشوقہ! جنہیں آپ ایسے بہادر اور دلیر چاہنے والوں پر ناز ہے"

"م......م.....میر.....ی.... ت.....تلوار..... و...... و...... وا.......پس دے دو"

ذکی نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"تلوار واپس دیدوں!" سلیم نے کہا۔ "مجھے تمہاری جوانی پر اور خاص کر ثریا پر ترس آتا ہے۔ کیونکہ اگر میں نے تمہیں تلوار واپس دیدی تو اس کا نتیجہ تمہارا خون ہوگا سمجھے!" پھر چلتے ہوئے بولا۔ "اچھا دیکھنا یار ہمیں اپنی شادی پر بھولنا مت۔ خدا حافظ!" یہ کہا اور فوراً مکان کی جانب چل دیا۔ راستے میں اُسے فوارے کے پاس ثریا ملی۔ جس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ سلیم کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ اور بولی "خدا کے لئے بتائیے کہ آپ نے ذکی کا کیا کیا؟" "میں نے اسے تمہاری خاطر چھوڑ دیا ہے۔ اور لو یہ اس کی تلوار ہے سے تم شادی کے موقع پر بطور تحفے کے پیش کرنا" سلیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مگر..... مگر..... آپ بڑے مہربان ہیں..... میں آپ سے اپنی گستاخی کی معافی چاہتی ہوں....... مجھے آپ سے محبت ہے...... میں شادی پر رضامند ہوں...!" ثریا نے سلیم کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"مگر خاتون معاف کیجئے! افسوس کہ آپ نے محبت کے لئے دیر میں درخواست کی۔ اور وہ طبیعت کی جولانی اور شگفتگی تو آپ کے پہلے ہی سنگدلانہ جواب سے مردہ ہو چکی ہے۔ اور وہ دل ہی بدل گیا ہے۔ جو آپ کی محبت کا جواب دے سکے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں آپ کے راستے میں کبھی حائل نہ ہوتا" سلیم نے نہایت سنجیدگی جوابدیا

"مگر سنئے تو سہی! آپ میرے دل کو توڑ رہے ہیں" ثریا نے روتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھ سے صبح بڑی سخت غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کردو میں تمہاری قدر وقیمت اب سمجھی ہوں"

"نہیں نہیں! مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ میں تمہیں پسند بھی کرتا ہوں۔ مگر افسوس کہ محبت نہیں کر سکتا" سلیم نے اپنے خوبصورت چہرے کو زیادہ سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔ "اچھا محترمہ خاتون خدا حافظ!" یہ کہکر سلیم تیر کی طرح سے مکان کی طرف چلا۔ وہاں اُسے میر صاحب منتظر ملے۔ وہ دیکھتے ہی بولے "برخوردار اتنی دیر کہاں لگا آئے۔ جلدی کرو۔ سب لوگ تمہارے منتظر ہیں"۔

"مگر، مگر میں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے ایک جگہ ضروری کام ہے اور اسی وقت وہاں پہنچنا ہے!" سلیم نے کہا۔

"ضروری کام ہے! اس سے ضروری کام کیا ہو سکتا ہے؟" میر صاحب نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کیسی بہکی بہکی باتیں

کر رہے ہو بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"قبلہ! مجھے اپنے جنازے میں شریک ہونا ہے۔ جو کہ تھوڑی دیر میں، شیخ ابراہیم کی سرائے سے قبرستان لے جایا جائے گا۔" سلیم نے کہا۔

"اپنے جنازے میں......؟ کیا کر رہے ہو برخوردار؟" میر صاحب نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں اپنے جنازے میں! یعنی ارشد کے جنازے میں!! خاص اپنے جنازے میں!!! اچھا خدا حافظ" یہ کہتے ہوئے سلیم فوراً مکان سے نکل کر۔ دہلی کی گلیوں میں غائب ہوگیا۔

اس خبر نے سارے گھر میں کہرام مچا دیا۔ ثریا اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ میر صاحب صحن میں کھڑے تھے اور سارا کنبہ انہیں گھیرے ہوئے کھڑا تھا۔ سب کے سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ یکایک ثریا کی والدہ بولیں "میرے خیال میں تو........!"

"کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے"۔ میر صاحب کڑک کر بولے۔ "کیا تمہارے خیال میں.......؟"

"میرے خیال میں آپ اسی وقت شیخ ابراہیم کی سرائے میں جائیں اور وہاں سے مفصل پتہ لیں"

میر صاحب فوراً سرائے میں پہنچے جہاں جا کر انہیں مالکِ سرائے کے بیان سے تصدیق ہوگئی۔ مالک سرائے بولا۔

"جی ہاں میر صاحب! ارشد نامی ایک بدقسمت نوجوان رات کو یہاں ٹھیرا مگر ایک خطرناک بیماری سے اس کا انتقال ہوگیا وہ کل آگرہ سے آیا تھا۔ اور تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ دفن کیا گیا ہے"۔

میر صاحب حیرت زدہ ہو کر گھر پہنچے۔ اور یہ ڈراؤنی خبر سب کو سنائی۔ جس کو سنتے ہی سارا گھر خوفزدہ ہوگیا کہ ایک رُوح ان کے ساتھ سارا دن رہی۔ ان کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور میر صاحب نے اس کے ساتھ شطرنج بھی کھیلا۔ چونکہ نکاح پر بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس لئے اس حیرت انگیز واقعہ کی اطلاع دہلی کے کوچے کوچے میں پھیل گئی۔ اور اس کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے من گھڑت قصے بنا لئے مگر اصلیت کسی کو معلوم نہ ہوئی۔ اور نہ ہی ثریا اور ذکی کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔ شاید ذکی ثریا کو بہانے تراش کر اپنے ڈھب پر لے آیا ہو۔ کہ اس کا مقابلہ کسی انسان سے نہیں بلکہ ایک روح سے ہوا تھا۔ جس میں اس کی شکست یقینی تھی۔ یا شاید میر صاحب نے ارشد کی موت پہ خود ہی ثریا کی شادی ذکی سے کر دی ہو۔

مگر سلیم؟——— ! اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں!!

(پلاٹ ماخوذ)

شفیق الرحمن خاں
کلانوری

التماسِ تمنّا

(از مولانا ذکریؔ بھوپالی)

حُسن کی شوخیاں بڑھائے جا | دل کی رگ رگ کو دل بنائے جا
داستانِ وفا سنائے جا | برہمی حُسن کی بڑھائے جا
وجد میں آرہی ہیں اُمیدیں | نغمۂ سازِ دل سُنائے جا
غنچے گلشن میں ناشگفتہ ہیں | صبحِ اُمید مُسکرائے جا
میکدہ کھینچ دے جو آنکھوں میں | اسی ساغر سے مے پلائے جا
دیکھ پھر کائناتِ عالم کو | اور کچھ دیر مُسکرائے جا
کچھ توقع ہے اس کے آنے کی | شمعِ ہستی کی لَو بڑھائے جا
دیکھ لے وہ بھی عشق کا حاصل | ہر تمنا کو دل بنائے جا
آرزوئے کرم ارے توبہ | غم کی دُنیا الگ بنائے جا
دل کی ہستی مری نظر میں ہے | مُسکرا اور مُسکرائے جا

حُسن کا راز راز رہنے دے
اس سے ذکریؔ نظر بچائے جا

بلوّری ملکہ (کوکین!)

یورپ اور امریکہ کے تمدّن کی تباہ کاریاں

از جناب ظفر قریشی ۔ بی۔ اے (دہلوی)

یورپ اور امریکہ کے تمدن کی تباہ کاریوں کا جو سیلاب ہندوستان میں آیا ہے اس میں سب سے زیادہ خوفناک اور مہیب کوکین نوشی ہے۔

کوکین ایک ایسی عام چیز ہے جسے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ کوکین ایک سفید دوائی ہوتی ہے جو عمل جرّاحی کے وقت اعضا کو سُن کرنے کے لئے ڈاکٹر استعمال کیا کرتے ہیں کوکین کا دوسرا مصرف یہ پیدا ہوا ہے کہ اسے شراب۔ افیون۔ چرس گانجا وغیرہ کی طرح بطور منشی چیز کے استعمال کیا جائے۔ گو کوکین میں نشہ تو نہیں ہوتا۔ لیکن ایک "اعضا شکن سرور" ضرور ہوتا ہے۔

کوکین اور ہندوستان

ہندوستان میں کوکین ہر جگہ ناجائز طور پر فروخت ہوتی ہے۔ پان میں رکھ کر اسے کھایا جاتا ہے پان میں چھالیا بہت موٹی کھائی جاتی ہے۔ تاکہ پان منہ میں بہت زیادہ دیر تک قائم رہے۔ اور گھلتا رہے۔ تاکہ کوکین نوش کی زبان سُن رہے۔ اور لذت محسوس ہوتی رہے۔ پان کے ساتھ کوکین کھانیوالوں کو چونا بہت زیادہ کھانا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کوکین اپنا فعل پوری قوت کے ساتھ نہیں کرتی۔ کوکین کے اجزا محرک ہوتے ہیں اور چونے کا کھار اس کے ساتھ مل کر زیادہ تحریک اور حس پیدا کردیتا ہے

چونا زیادہ کھانے کی وجہ سے کوکین نوشوں کی زبان کے پھٹ پھٹ کر ٹکڑے اڑجاتے ہیں۔ تالو۔ کلّے اور جبڑے بالکل پھٹ جاتے ہیں۔ نمک اور مرچ بہت تیزی کے ساتھ لگتی ہے۔ اس لئے سالن یا تیز چیزیں نہیں کھاسکتے۔ دودھ یا پھلوں پر گذارا کرنا پڑتا ہے لیکن بھوک چونکہ کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے کوکین نوش کو غذا کی طرف سے ایک نوع کا اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔

ہندوستان میں لاکھوں روپے کی کوکین فروخت ہوتی ہے ہسپتالوں اور مطبوں میں کوکین معین مقدار سے زیادہ استعمال نہیں ہوتی۔ لاکھوں روپے کی خفیہ کوکین ناجائز طریقہ پر ہندوستان میں لائی جاتی ہے۔ اور قطعی ناجائز طریقوں سے اسے فروخت اور حاصل کیا جاتا ہے۔ کوکین ہندوستان میں دوا کے طور پر استعمال ہونے کے لئے ایک ہسپتال میں استعمال کی گئی۔ لیکن بعد میں اسے کھانے کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ اب یہ وبا ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں پھیل چکی ہے۔

کلکتہ میں کوکین کی ناجائز درآمد چینی کرتے ہیں۔ لاکھوں روپے کی کوکین اِدھر سے اُدھر کردیتے ہیں۔ ان کی کارستانیاں اور چالاکیاں مشہور ہیں۔ اس لئے باوجود سخت احتیاطی تدابیر کے اس ناجائز درآمد کو قابل قدر طور پر روکا نہیں جاسکتا۔ کلکتہ کے علاوہ بمبئی۔ کراچی میں بھی یہ درآمد ہوتی ہے۔ دہلی۔ لاہور لکھنؤ۔ پشاور۔ آگرہ۔ کانپور۔ بنارس وغیرہ شہروں میں کوکین فروشی اور کوکین نوشی کا بہت زور ہے۔ دہلی میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے بیسیوں خوشحال گھرانے اس "بلوری ملکہ" پر تصدق ہوگئے۔ کوکین نے دہلی کے گھرانے کے گھرانے تباہ کردئے ہیں اکی بڑی جگر خراش تفصیلات ہیں جن کا تصور کرکے روح لرز جاتی ہے۔ یہی حال تقریبًا تمام ہندوستان کے ان شہروں کا ہے۔ جہاں یورپ کی اس شہزادی یا ملکہ نے اپنے سحر سے بربادی اور تباہی پھیلا رکھی ہے۔

بلوری ملکہ

کوکین جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ایک سفید دوا ہوتی ہے۔ جو ایک درخت کا ست ہوتا ہے۔ اسے ڈاکٹر بلینز ایک فرانسیسی معالج امراض کوکین نے اس منحوس شے کا نام "بلوری ملکہ" رکھا تھا اور یہ نام یورپ اور امریکہ بھر میں مشہور رہے۔ چنانچہ اس کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی اسے "شہزادی" کا لقب دیا ہے۔ دہلی کے چاوڑی بازار۔ موتی دالاں وغیرہ بازاروں میں "شہزادی کا پان" کوکین کے پان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات کھلے بندوں ملجاتا ہے۔ ایک روپیہ فی پان کے حساب سے بیچتے ہیں۔ اس سے زیادہ قیمتی بھی ہوتے ہیں۔ دہلی کے ایک بزرگ جنکی جائداد ابھی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ سو۔ سوا سو روپے روزانہ کے "شہزادی پان" کھا جاتے ہیں!

کوکین کی نقل

کوکین کی نقل تیار ہو چکی ہے۔ یورپ میں، جرمن نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی چنانچہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے پر آشوب زمانہ میں اس نے مصنوعی کوکین بہت تیار کی۔ اب یہ کوکین ہر جگہ بننے لگی۔ اصل میں اور نقل میں بہت ہی کم فرق ہوتا ہے۔ ابتدائی کھانے والے تمیز نہیں کر سکتے۔ ہندوستان میں بھی مصنوعی کوکین چل پڑی ہے چنانچہ اصل کے دام لے کر نقلی کوکین بیچنے والے ہر بازار اور کوچہ میں مارے مارے پھرتے ہیں؛

یورپ اور کوکین

یورپ اور امریکہ میں کوکین کھانے کا رواج خوفناک طریقہ پر جاری ہے ہندوستانی یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ کوکین نوشی کی لت ہندوستان میں یونہی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن یہ خیال قطعی غلط ہے سب سے زیادہ کوکین کھانے والے یورپ اور امریکہ کے لوگ ہیں۔ بالخصوص عورتیں۔ یورپ کا کوئی ملک نہیں ہے جہاں خفیہ طور پر کوکین درآمد نہ کی جاتی ہو۔ اور خفیہ طریقہ پر کھائی نجاتی ہو۔ یورپ میں اس کی تباہ کاریاں بہت بڑھ رہی ہیں۔ ہر قوم اور ملک پریشان ہے کہ کس طرح اس لعنت کو دور کیا جائے۔

یہ رسم غلامی سے بھی زیادہ برباد کن ہے۔ یورپ میں صرف انگلستان ہی ایسا ملک ہے جہاں کوکین نوشی کی وبا نہیں پھیلی ہے ورنہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں بلوری ملکہ کی شعاع سحر انداز پہنچ چکی ہے۔ امریکہ جہاں سے یہ چیز آتی ہے وہاں بھی یہی حال ہے

جنگ عظیم اور کوکین

جنگ عظیم نے کوکین نوشی میں سب سے زیادہ کام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوکین ہسپتالوں اور جنگی زخمیوں کے کیمپوں میں استعمال ہوتی تھی۔ مریضوں نے تندرست ہو کر بھی اس کا استعمال جاری کر دیا جب امن قائم ہو گیا تو تمام یورپ اور امریکہ میں کوکین نوش افراط کے ساتھ نظر آنے لگے۔

ایک فوجی ڈاکٹر لکھتا ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں جب چاروں طرف توپوں کی گرج۔ مرنے والوں کی آہ و بکا۔ زخمیوں کی چیخ و پکار ہنگامہ اور دہشت و خوف کے ماحول میں ہسپتالوں کے ڈاکٹر پریشان ہو جاتے تھے۔ تو سکون حاصل کرنے کے لئے کوکین کھا لیا کرتے۔

کوکین جب ڈاکٹروں نے کھانی شروع کر دی تو مریضوں کو بھی اس کی رغبت ہو گئی۔ جب کوکین کی طلب بہت زیادہ بڑھ گئی تو مصنوعی کوکین بننے لگی اور اس کی یورش عام ہو گئی۔ یہ ڈاکٹر لکھتا ہے کہ امریکن قوم سفید اقوام میں سب سے زیادہ کوکین فروش ہے۔ اس کے بعد جرمنی۔ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ۔ سپین۔ ہندوستان۔ چین وغیرہ کا درجہ آتا ہے؛

کوکین کی قیمت

کوکین غالباً سب سے زیادہ قیمتی دوا ہے کوکین فروشی سے جو دولت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ کوکین کی قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دیا سلائی کے بکس میں ۷۵۰۰ ہزار روپے کی کوکین لیجائی جا سکتی ہے!! ایک پونڈ کوکین کی قیمت عموماً دو سو روپے ہے۔ لیکن جب یہ فروخت کی جاتی ہے تو انفرادی طور پر ایک پونڈ کی قیمت ۴۰ ہزار سے ۵۰ ہزار روپے تک جا پہنچتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس چیز سے دولت اسقدر خطیر تعداد

میں حاصل ہو سکتی ہے ایسی چیز کی تجارت کیوں نہ ترقی کرے

کوکین کی قیمت اس قدر زیادہ کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے درآمد کرنے میں لوگ جسقدر خطرہ اور خدشہ برداشت کرتے اور حیرت انگیز طریقوں سے اس کی ناجائز ترسیل کے اختیار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قیمت کا بڑھ جانا تعجب انگیز ہیں۔ چونکہ ناجائز طور پر خرید و فروخت اس کی ممنوع ہے۔ اس لئے اسے بیچنے کے لئے معمولی تجارت یا مصنوعات کے مقابلہ پر بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیکڑوں لوگوں کے ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی یہ چیز اصل خریدار تک پہنچتی ہے۔ اس لئے ہر ایک کارکن اپنے خطرہ کے مطابق اس کی قیمت کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اور کوکین

کوکین کو بیچنے۔ بنانے۔ کھانے اور ناجائز طور پر کسی ملک میں داخل کرنے کیلئے یورپ اور امریکہ میں نہایت ہی سخت قانون ہیں۔ ہر بندرگاہ سرحد سمندری علاقوں اور چپے چپے پر کوکین کی ناجائز درآمد کا مقابلہ کرنے اور اسے روکنے کے لئے محکمے۔ سراغرساں اور بڑے بڑے منتظم مقرر و متعین ہیں۔ لیکن اس لعنت کو دور نہیں کیا جا سکتا وجہ یہ ہے کہ کوکین بیچنے اور اس کی ترسیل کے ایسے نادر طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ کہ سراغرسانی کا فن ہار مان جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جس شہر میں کوکین جاتی ہے وہاں کے بڑے بڑے لوگ۔ ارکان بلدیہ مشہور مصنف۔ تجارت پیشہ لوگ۔ افسر۔ وکیل۔ ڈاکٹر وغیرہ وغیرہ اس تجارت یا اس کے کاروبار میں کسی نہ کسی طرح متعلق ہوتے ہیں۔ پولس ان سب کو کسطرح گرفتار کر سکتی ہے۔ جہازراں کمپنیوں کے کارندے۔ کپتان اور غواص بندرگاہوں کے قلی۔ افسر اور کارکن نہایت خطیر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر اس تجارت کو روکے تو کون روکے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ کوکین فروشی یا کوکین کی ناجائز درآمد کو روکنے کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں وہ خود اس کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی خاطر سے وہ کوکین درآمد کرتے ہیں۔ باقیماندہ کوکین اپنے ملک کے دیگر "اہل ذائقہ" کے لئے بھیجدیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی کوئی سلطنت اپنی پوری سراغرسانی اور پولیس کی قوت کے اس کا انسداد نہیں کر سکی۔ پھر ہندوستان بیچارا تو کس گنتی میں ہے۔

یورپ میں کوکین نوشی کے طریقے

یورپ میں کوکین زیادہ تر عورتیں کھاتی ہیں۔ مرد بھی کھاتے ہیں بعض لوگ خاموشی اور تنہائی میں بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں بعض طبائع کیفے ہوٹل اور کھانیکے کمروں میں بیٹھکر اسے کھانا۔ ہنگامہ اور گرمی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں کھانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ زبان پر مل لیا جاتا ہے۔ اس کا لوشن سوڈے شراب وغیرہ میں حل کرکے پینا بھی عام ہے۔ ایک طریقہ انجکشن کا ہے۔ جو یورپ میں عام نہیں ہے۔ امریکہ میں عام ہے۔ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں ہے۔

کوکین کا جنون اور علاج

کوکین کھانے کی عادت بالآخر انسان کو نہ صرف مالی حیثیت سے بالکل تباہ کر دیتی ہے۔ بلکہ صحت بھی قطعی تباہ ہو جاتی ہے۔ انسان آخرکار پاگل سا ہو جاتا ہے۔ یورپ میں کوکین زیادہ لوگوں کے علاج کے لئے صحت گاہیں اور ہسپتال قائم کر دیئے گئے ہیں جہاں کوکین زدہ لوگوں کا علاج مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ بگڑے ہوئے نظام جسمانی اور تباہ شدہ اعصاب کو درست کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انسانی عقل جو کچھ کر سکتی ہے کرتی ہے۔ ان صحتگاہوں کے ڈاکٹر یا معالج عام طبیبوں کی طرح نہیں ہوتے۔ "کوکینیات" کے ماہر ہوتے ہیں اور بعض اوقات "خود کوکین زدہ" ہوتے ہیں جو بعد میں اس کے تباہ کن اثرات سے متنبہ ہو کر جلد راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ اور پھر طبی تحقیقات کرکے اس کے معالج بن جاتے ہیں۔ کوکین زدہ لوگوں کے علاج میں بھی بڑا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

ایک ڈاکٹر نے کوکین کے اثرات اور اس کی تباہ کن کیفیت ایک شخص سے بیان کی ہے جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی و افادہ نہ ہوگا۔

نظام جسمانی پر کوکین کے تباہ کن اثرات

پاگل خانے میں پہنچنے سے پہلے ایک کوکین خور کو

تجربہ کار آدمی فوراً پہچان لے گا۔ کیونکہ نہایت نمایاں علامتیں ہوتی ہیں زرد چہرہ - ہوائیاں اڑی ہوئیں - ہونٹ خشک اور پتلے زبان اینٹھی اور سوکھی ہوئی ۔ جسم لاغر و ضعیف - آنکھیں بے رونق اور ڈراؤنی - اندرونی اضطراب کی پوری کیفیات اور نظام جسمانی کے اضمحلال کی جملہ علامتیں جسم پر نظر آتی ہیں - مزاج چڑچڑا انتہائی پسند خوفزدہ اور خراب ہوجاتا ہے -

کوکین خور کا دماغ خراب ہونے لگتا ہے - پہلے غیر محسوس ہوتا ہے پھر اثر ظاہر ہونے لگتا ہے - معمولی سی آواز کوکین خور کو ایک گرج سنائی دیتی ہے - ایک معمولی آواز جس پر کوئی آدمی توجہ نہیں کرتا - کوکین خور اس پر چونک پڑتا ہے - وہ معمولی حرکت سے دھڑ دھڑ چلنے لگتا ہے - دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں - زبان خشک ہوجاتی ہے - اگر کوئی مسکن چیز آپ پی بھی لیں تو کوئی اثر نہیں ہوسکتا آپ دعا کرتے ہیں کہ خدا کے لئے طبیعت پرسکون اور مسکن ہوجائے مگر ایسا نہیں ہوگا - طبیعت ہراساں و پراگندہ ہی رہے گی - آپ کو اپنی آواز بھی سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے - کجا دوسرے کی آواز کا سننا - اگر آپ بولیں گے بھی تو نہایت آہستہ آہستہ سرگوشی کرنیکے انداز میں گویا آپ کسی چیز سے خائف ہیں - اس کے بعد وہم اور خوفناک تصورات کا دور آتا ہے - آپ کی زندگی یہاں پہنچکر رنج ہوجاتی ہے - آپ کو خیالی اور وہمی تصورات اور بھیانک تصویریں پریشان کرتی ہیں - دماغ دھوکے دیتا ہے - دنیا کی ہر چیز سراب نظر آتی ہے - آپ کو ہر جگہ پولیس اور سراغرساں نظر آتا ہے - عورتیں جو اس لعنت کی سب سے زیادہ شکار ہوتی ہیں بری طرح پریشان ہوتی ہیں - سڑک کے کھمبے - درخت اور درانتقہ آدمی انہیں عفریت معلوم ہوتے ہیں -

کوکین خور کے لئے اس حالت میں پہنچکر نیند بھی ناممکن ہوجاتی ہے وجہ یہ ہے کہ جسم میں خشکی ہوجانے اور طاقت نہ قائم رہنے کی وجہ سے نیند اڑ جاتی ہے - دماغ خراب ہونے لگتا ہے - بھوک بھی غائب ہوجاتی ہے - جو رفتہ رفتہ انسان کو پاگل بناتی رہتی ہے - اگر ایک منٹ کیلئے آپ کی آنکھ لگ بھی گئی تو فوراً کھل جاتی ہے دفعتاً آپ ایک خیالی عفریت سے ڈر کر چونک پڑتے ہیں - آپ کو چاروں طرف رنگ برنگ کی بجلی کی بتیاں دن کو جلتی ہوئی نظر آتی ہیں - دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو سرخ و سبز زرد رنگ میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھتے ہیں - آپ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں - اور گذشتہ واقعات پر اظہار تاسف کرتے ہوئے سوچتے ہیں - کہ انسانی جسم کیا ہوگیا ہے ؟ خدا کا ہیکل کس طرح منہدم ہوگیا ہے ؟؟"

"اب آپ کا حافظہ فنا ہوچکا ہے - قوت ارادی برباد ہوجاتی ہے بغیر کوکین کی لسوار لئے آپ کا ذہن متوازن نہیں رہتا اگر وقت پر کوکین نہ ملے تو پھر آپ ایک جرائم پیشہ انسان بن جاتے ہیں - اور کوکین حاصل کرنے کے لئے جرائم کی مشق اسی زمانہ سے شروع کرتے ہیں بعض مریض اس سے زیادہ افسوسناک دماغی جہنم میں تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں - مثلاً بعض لوگ سڑک عبور کرتے ہوئے یہ سمجھیں گے کہ لاکھوں میل کا سفر طے کرلیا ہے - ایک مکان انہیں ہاتھی کے برابر معلوم ہوگا - دیوار پر لگی ہوئی تصویر یکایک آپ کو مثلث معلوم ہونے لگے گی - نیلگوں آنکھیں سرخ یا زرد معلوم ہونگیں - عورتوں کو ہر جگہ چوہے پھرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں - ایک فیشن ایبل لیڈی کو ہر وقت اپنی گردن - فراک - اور ٹوپی پر ایک بے وجود چوہا پھرتا ہوا نظر آئیگا - وہ اسے گھڑی گھڑی جھاڑتی رہیگی مگر تصور کا چوہا برابر آنکھوں کے سامنے رہے گا - عورت کی حالت ناگفتہ بہ ہوگی - ناک پر آپ کو مکھی بیٹھی ہوئی نظر آئے گی - آپ اسے ہمیشہ اڑانے کی کوشش کریں گے مگر وہ جانے کا نام نہ لے گی - دروازہ پر دستک اور اجنبی لوگوں کی آوازیں گھڑی گھڑی سنائی دینگیں - حالانکہ حقیقت میں وہ آپ کے دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہیں - آپ کمرہ میں مجنونانہ جوش کے ساتھ مٹھیاں بھینچے ہوئے پھرتے نظر آئیں گے اور آپ گھبرا کر نکل کھڑے ہوں گے چل پڑیں گے شہر سے دور ——— میلوں کی مسافت ایک پراسرار دھن میں طے کر جائیں گے اور پلٹنے کا نام نہ لیں گے - غرض حالت بری ہوگی ——— آخر ! !"

غزل

(از جناب فضا جالندھری)

تاثیرِ سوزِ دل سے ہوئی بیقرارِ شمع
پروانے جل رہے ہیں تو ہے اشکبارِ شمع

مہمان ایک شب کا ہوں میں بھی تری طرح
اس دہر میں ہے ہستیٔ ناپائدارِ شمع

کیا جانے کس کی یاد میں اِس کا یہ حال ہے
سوزِ دروں کو کیوں نہ کرے آشکارِ شمع

پروانوں کو تو شام ہی سے تو جلا چکی
اب کون بزم میں ہو ترا غمگسارِ شمع

کون آج بزمِ ناز میں جلوہ نما ہوا؟
گرد اُس کے گھومتی ہے جو پروانہ وارِ شمع

کس شعلہ رو کی یاد میں از شام تا سحر
تر کر رہی ہے دامنِ دل اشکبارِ شمع

جب خود نہ اپنے سوزِ دروں کو چھپا سکی
پھر کس الم نصیب کی ہو رازدارِ شمع

رونق فزائے بزم رہی شب سے تا سحر
لائی تھی صرف زندگیٔ مستعارِ شمع

تاثیرِ عشق کا یہ نتیجہ ہے اے فضاؔ!
پروانوں کے فراق میں ہے سوگوارِ شمع

(فضا جالندھری)

"داستانِ حیات"

(از جناب ثمر صدیقی ردولوی)

"داستانِ حیات" چند خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ایک "اسیرِ محبت" ہستی کی طرف سے ایک دوست کو لکھے گئے۔ سرحقہ بذاتِ خود مکمل ہے تاہم یہ بتادینا بھی ناگزیر ہے کہ ان خطوں کے ضمن میں ایسی داستانِ محبت تحریر کی گئی ہے جس سے لکھنے والے کی عالی دماغی اور بلند خیالی کے ساتھ ہی اس کی حساس دلی کی بھی جھلک نمایاں ہے۔ وہ ایک عورت کی محبت میں بری طرح اسیر ہے۔ غمِ روزگار کی جفاؤں نے اسے خود فریبی کی زنجیروں میں ایسا گرفتار کر دیا ہے کہ وہ مسرت کے لمحوں کو بھی سکون میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ صنفِ نازک کے طبقہ سے بیزار نظر آتا ہے۔ مگر اس میں اتنی ہمت و جرأت نہیں کہ ایک لفظ بھی اس کے خلاف اپنے منہ سے نکال سکے ؟

(ثمر صدیقی ردولوی)

(۱)

جمالی! مجھے ایسے لوگوں کی حالت پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ جو اپنی منفعت کے لئے سارے جہان کا خون کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ خود غرضی انسان کے احساسات کو بھی مردہ کر دیتی ہے۔ ذرا غور کرو وہ درو دیوار، جو کبھی میرے لئے عشرت و سکون کا باعث تھے۔ اور جہاں کی نشاط آفرینیاں میرے پژمردہ دل کے لئے راحت و مسرت کا پیغام لاتی تھیں۔ آہ جمالی! جہاں پہلی بار میں شاہزادی سے ملا تھا۔ اب مسمار کر دیئے گئے ہیں۔ ایک دھندلی سی تصویر اُن ـــــ "درو دیوار" کی اب بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہے ـــــ بھائی ظلم ہے یا نہیں؟ زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انتہائی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ لیکن دنیا کے نامبارک ہاتھ اُن کو تہ و بالا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ جمالی! آج کل میں سکون و طمانیت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ شہزادی ایک طویل مدت کے لئے یہاں آگئی ہے اگرچہ اس کی قربت میرے خوابیدہ جذبات کو برانگیختہ کر دیتی ہے لیکن اس میں بھی سکون کا کافی شائبہ موجود ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے اچھا برتاؤ کرتی ہے جیسا کہ ایک خوش خلق میزبان اپنے مہمان سے کرتا ہے ـــــ سُنا؟ تعجب کیوں کرنے لگے؟ بھلا جس کے لئے میں نے دنیا تج دی۔ جو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے کیا ـــــ "اس" سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ـــــ "وہ" مجھ سے دو باتیں کر لے؟ پھر بھی میں اپنی زندگی میں ایک ناقابلِ بیان خلا محسوس کرتا ہوں جمالی! تم سمجھ گئے ہوگے کہ یہ خلا اسی وقت پُر ہو سکتا ہے۔ جب شہزادی کی ـــــ "آغوشِ محبت" میرے لئے ہمیشہ کے واسطے وقف ہو جائے؟

سنا تم نے؟ وہ اب ایک ایسا زہر ہلاہل تیار کر رہی ہے جو عنقریب میرے اور خود اس کے لئے موت کا پیغام ثابت ہونیوالا ہے میں خود حیران ہوں کہ یا الٰہی! میرا کیا انجام ہوگا۔ مجھے اپنے دل پر اب اتنا بھی اختیار باقی نہیں رہا کہ اُس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکوں؟ ہے ـــــ اسی کا نام بے بسی ہے ــ ـــــ ؟؟؟

(۲)

آج شاہزادی ریشمی سرخ ساری میں ملبوس میری قیامگاہ کے قریب سے گزری۔ میں نے دیکھا اُس کے ہونٹوں پر ایک لطیف تبسم نمایاں ہے ـــــ میں نے ایک سچے عقیدتمند زائر کی طرح اُس کی خوبصورت رتھ کے چاروں طرف طواف کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک جاں نثار پروانہ شمع کے گرد طواف کیا کرتا ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ میں کب تک اپنے عقیدتمند دل کو پہلو میں لئے اس کے نقش

قدم کو بوسہ دیتا رہا ——— اُس کی رتھ میرے قریب سے گزر گئی جمالی! یہ سنکر تمہیں تعجب ضرور ہوگا۔ کہ شاہزادی کے ہاتھوں میں وہی رومال تھا جو کسی زمانہ میں مجھ سے بہ اصرار لیا گیا تھا ———
وہ چادر بھی ابتک میرے حرزِ جان ہے جو ایک جلوس کے موقع پر شاہزادی نے اوڑھ رکھی تھی ——— دنیا میں جھوٹے سکّوں کی جو قدر و منزلت ہے وہ خلوص و محبت کے آبگینوں کی نہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ میرے عزیز دوست! مجھے شہزادی کی اس مذموم روش سے بہت اذیت ہوتی ہے۔ وہ ظاہری آن بان کو باطنی خلوص پر ترجیح دیتی ہے۔ اور بہت جلد زر و تموّل سے متاثر ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں میرے پاس کچھ نہیں اور اگر سچ پوچھو تو میرے پاس کیا نہیں؟ سب سے بڑا خزانہ اس کی محبت ہے۔ اور اس کی محبت کے سوا مجھے دنیا میں کچھ چاہئے بھی نہیں۔ پیارے دوست! میں عنقریب یہاں سے رخصت ہونیوالا ہوں۔ شاہزادی کی روش میں آئے دن تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ہر وقت اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ بہت سی باتیں میرے مزاج کے خلاف شروع ہو گئی ہیں۔ جن سے متاثر ہونے کے بعد میں اپنی عزتِ نفس کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ابھی کل کا واقعہ ہے۔ شاہزادی سے ایک نوجوان ملنے آیا۔ گھنٹوں وہ اس سے کسی مسئلہ اقتصادیات پر بیٹھی گفتگو کرتی رہی۔ میں خاموش بیٹھا اُس کی صورت دیکھتا رہا۔ جمالی! کیا شاہزادی کا فرض نہیں تھا کہ وہ مجھے بھی اس شخص سے متعارف کراتی؟ ——— اس کے معنی تو یہی ہیں کہ اُس نے مجھے ذلیل سمجھا؟؟ ——— ؞

——— (۳) ———

میری تو دلی خواہش تھی کہ شاہزادی کو ایک پل کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے نہ اوجھل ہونے دیتا۔ لیکن قدرت کے خلاف کوئی کام کرنے کی اپنے میں جرأت نہیں پاتا۔ آج شاہزادی کچھ دیر کے لئے گھر سے باہر چلی گئی تھی۔ مختصر لمحے جس کرب و بےچینی کے عالم میں گزرے ہیں ——— جمالی اس کی کیفیت نہ پوچھو ———
میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ شاہزادی نے کھڑکی سے جھانکا۔ سلام کے لئے ہاتھ اٹھائے لیکن ——— نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید رعبِ حسن مانع رہا ہو۔ مجھے اپنی اس حماقت نما جرأت پر اس وقت تک قلق ہے۔ عزیز دوست! میرا ارادہ ہے کہ میں کچھ دنوں کے لئے تمہارے پاس چلا آؤں ——— شاید اس وقت میری یہ بےچینیاں صبر و سکون میں تبدیل ہو جائیں ——— مگر نہیں جمالی! میں تم کو بھی اپنے ضمیر کیطرح دھوکا دے رہا ہوں ——— میں ایک لمحہ کے لئے بھی شاہزادی سے علیحدہ نہیں ہو سکتا؞

——— (۴) ———

آج شاہزادی جب میرے سامنے آئی ——— ندامت اور شرمساری کی وجہ سے میری زبان سے ایک لفظ بھی معذرت کا نہ نکل سکا۔ اس کے تیور کچھ بدلے ہوئے تھے۔ غور و فکر کی علامتیں اُس کے خوبصورت چہرے سے مترشح تھیں۔ کل میں نے شاہزادی کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ یہ غم آفریں فروگذاشت میرا سینہ ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ آہ ——— جمالی! بعض اوقات میں یہ سوچ کر حیران ہو جاتا ہوں کہ میں اور شاہزادی سے محبت؟ ——— اُس کے حصول کی آرزو؟ ——— میری ساری امیدیں مجروح ہو جاتی ہیں۔ اور ——— لاتعداد آرزوئیں ایک خوفناک خواب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ——— اللہ میرا کیا حشر ہوگا ——— جمالی! جس کے لئے میں نے اپنی زندگی برباد کر دی۔ کیا وہ میری کبھی نہیں ہو سکتی؟ ——— ؟؟

——— (۵) ———

سنا تم نے؟ مرجھائے ہوئے پھول گلے کا ہار نہیں ہوتے!
جمالی! وہ زمانہ یاد کرو جب میں دنیا میں شاہزادی کے لئے ہر کام کر سکتا تھا۔ دنیا میرے نقشِ قدم پر چلتی تھی ——— نوازش کی جب بارشیں ہوتی تھیں۔ اس وقت میرا وجود بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا ——— لیکن اب میرا وجود ——— وجودِ باطل کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانہ تعیش پسند واقع ہوا ہے۔ غم کا ساتھی دنیا میں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ جمالی! میرے چاہنے والے مجھ سے اب کنارہ کرتے جا رہے ہیں۔ وہ موقع کے

۔ ہانس رہتے ہیں کہ میری ذرا سی غفلت ہو اور وہ اپنی جو فروشی کا ثبوت آن واحد میں پیش کردیں۔ میری خفیف ترین فروگذاشت ان کے نزدیک گناہ عظیم کے مترادف ہوتی ہے۔

مجھے اپنی زندگی کا ہر پہلو اب تاریک نظر آرہا ہے۔ وقت سے پہلے غم کا اظہار آئین محبت میں ممنوع ہے لیکن جمالی! ——— پانی اب سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میری زندگی ایک طوفانی زندگی بن چکی ہے جس کا دارومدار محض یادو باراں کی فراوانی پر منحصر ہے۔ اس کے بعد میری زندگی ——— سکون کی زندگی ہوگی؟

(۶)

جمالی! جب میں اپنی زندگی کے اس انقلاب آفریں پہلو پر غور کرتا ہوں۔ جس نے مجھے اس حالت پر پہونچا دیا ہے۔ یقین مانو مجھے خود تعجب ہوتا ہے! ——— یا خدا! کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ اس ابتدا کی انتہا کب ہوگی؟ ——— مستقبل کی اُمیدوں پر حال کی زندگی تلخ کرلینا دانشمندی کے خلاف ہے۔ یہ جانتا ہوں ——— میرے عزیز دوست! لیکن احساسات کے سیلاب کو کیا کروں جو مجھے حال کی وادیوں سے علیحدہ کر کے ——— مستقبل کے دلفریب اور بے پایاں سمندر کی طرف بہائے لئے جارہا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ایک تنکا ——— پانی کی رو پر انجام سے بے خبر موجوں کے رحم وکرم پر بہتا چلا جارہا ہو ——— شاید اس زندگی کا انجام موت کے پردے میں پوشیدہ ہو؟

(۷)

میں کیا ہوں۔ ہوا کے تیز کا ایک بے ثبات جھونکا؟ پھر جمالی! ——— کیوں نہ طمانیت کی زندگی گزاروں جبکہ شاہزادی مجھ پر انتہا سے زیادہ مہربان ہے۔ وہ مجھ سے اچھا سلوک کرتی ہے۔ اُس کے لبوں کا خفیف سا تبسم میرے خوابیدہ جذبات کو آن واحد میں بیدار کردیتا ہے۔ میں نے لاکھ بار چاہا کہ جھونپڑی کے گہوارے میں رہ کر محلوں کے خواب نہ دیکھوں۔ لیکن دل سے انسان مجبور ہو جاتا ہے ——— اور اگر سچ پوچھو تو مجھے اپنے دل پر ناز بھی ہے

وہ اس لئے کہ ——— میرا دل محکوم ہے میرے دماغ کا! جو دماغ دل پر حکومت کرتے ہیں وہ انسان انتہا سے زیادہ ضبط کے خوگر ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے جو دل ——— دماغ پر حکومت کرنیکے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک بھرے ہوئے پیمانہ کی طرح چھلک اٹھتے ہیں ——— سمجھے جمالی! یہ عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ میں انتہائی مصائب اور روحی تکالیف برداشت کرسکتا ہوں۔ لیکن یہ کبھی نہیں گوارہ کرسکتا کہ اپنی قلبی کیفیات کو منظر عام پر لاکر کسی کی رسوائی کا باعث بنوں؟ مجھے دنیا میں کچھ نہ چاہئے۔ تمام لذتیں میں اپنی ختم شدہ طویل زندگی میں حاصل کرچکا ہوں۔ اب ہر وقت شاہزادی کی خوشنودی مجھے مدنظر ہے!!؟

(۸)

جمالی! ——— خط ملا۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ تم عنقریب میرے پاس آنے والے ہو۔ یہ خط میں تم کو سفر کی حالت میں لکھ رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ سال گذشتہ شاہزادی نے مجھے ایک تصویر دی تھی۔ جس میں چند سہیلیوں کے درمیان وہ ایک ادائے تمکنت کے ساتھ کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ گویا ——— "ستاروں" نے "چاند" کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ اب تقاضا ہے کہ میں وہ تصویر شاہزادی کو واپس کردوں۔ پیارے جمالی! جب اس کی تصویر میرے صفحہ دل پر نقش ہے۔ تو مجھے ان کاغذی نقوش کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ واپس کردوں ——— مجھے دیکھنا ہے کہ وہ تصویر واپس لینے کے بعد میرے ——— "دل" سے بھی ——— اپنی تصویر علیحدہ کرسکتی ہے؟ جمالی! میں نے ایک انتہائی خوفناک خواب دیکھا ہے۔ جس سے طبیعت سخت پریشان ہے ——— دعا کرو تعبیر میرے حق میں خوشگوار ثابت ہو!

(۹)

آج کل طبیعت بے چین سی ہو رہی ہے۔ کچھ نہ پوچھو۔ راتیں غم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ دل سے نشاط انگیں تصور رخصت ہو چکا ہے ولولہ انگیز خواہشوں کی جگہ یاس چھائی ہوئی ہے۔ اُف جمالی! میری روح کانپ رہی ہے۔ شاہزادی کے مرمریں جسم کی حرارت کا

احساس مجھے پھونکے جارہا ہے۔ میں اس کے بغیر اس دنیا کی فضا میں
سانس نہیں لے سکتا۔ اندوہگیں خیالات دماغ سے کسی وقت دور
نہیں ہوتے۔ اے کاش میں اپنی پوری قوت صرف کرنے کے بعد
شاہزادی کو حاصل کر سکتا!

تم نے بھی انکساری کی حد کر دی ——— بس بس مجھ سے اتنی
غیریت نہ برتا کرو۔ خدانخواستہ تم کس بات میں کسی سے کم ہو۔ یہی نا
کہ دولت کے نشے میں نہیں ڈوبے ہو جو ——— ثانی در کو بھی
کھو بیٹھو؟ ——— کیا جھوٹے موتیوں کی چمک سچے موتی کی توقیر کھو سکتی
ہے۔ نہیں؟ ہرگز نہیں؟ پھر بلا وجہ انکسار کیسا؟

میرے اس خواب کی تعبیر ظاہر ہو گئی۔ اسی مہینے شاہزادی کی
شادی ہونیوالی ہے۔ دماغ ابھی سے بیکار ہو رہا ہے۔ حواس جواب
دے رہے ہیں۔ عجب مایوس کن کشمکش میں مبتلا ہوں ——— یا اللہ
اس کے بعد میرا کیا حال ہوگا۔ اس مبارک تقریب پر شادیانے بجیں گے
ہر شخص مسرت کی دیوی سے ہم آغوش ہوگا اور ——— میں ایک کونہ میں
پڑا اپنی بدقسمتی پر خون کے آنسو بہاؤں گا!! ———

(۱۰)

تم بار بار میرے زخموں کو کریدتے ہو۔ مجھے شاہزادی سے کیوں
محبت ہے آہ ——— جمالی! یہ نہ پوچھو! میری آنکھوں سے اس کی خوبیاں
دیکھو! میرے دل سے سوال کرو کہ وہ کیوں اس کی پرستش کرتا ہے۔ لیکن
میری زبان صرف اک آہ ——— دلفگار آہ کے سوا ایک لفظ بھی نہیں
کہہ سکتی ——— بہت کچھ سوچتا ہوں! سمجھتا ہوں لیکن لاتعداد امیدوں کے
روشن پہلو کو تاریک نہیں بنا سکتا۔ اس کی طویل جدائی اب میرے
لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔

میرے عزیز دوست! اس شعلۂ بے پناہ کو کیونکر چھپاؤں ———
وہ انتہا سے زیادہ ظاہر پرست بن گئی ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنا مستقبل
تاریک نظر آرہا ہے ——— جمالی! مجھے صرف اتنا بتادو کہ وہ کسی ———
زمانہ میں میری ہو گی ——— یا میری آخری سانس بھی اسی آرزو میں فنا
ہو جائے گی؟؟ ———

(۱۱)

جمالی! میرا ہر نفس اب مجھ سے گریزاں ہے۔ رقابت بھی محبت
ہی کا ایک جذبہ ہے جو میری رگ رگ میں نیش زنی کر رہا ہے۔ خدا
کیلئے مجھے تم ترک محبت پر مجبور نہ کرو۔ یہ تمہارے الفاظ میرے لئے
کوئی معنی نہیں رکھتے۔ نہ میں نے اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی
کوشش کی اور نہ میں اس کو فراموش کرنے کی سعی کر سکتا ہوں۔
میں دنیا کی ساری چیزیں اپنے سے علیحدہ کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ کبھی
نہیں گوارا کر سکتا کہ شاہزادی کی محبت میرے دل سے علیحدہ ہو
میرے حریم دل پر شاہزادی کے سوا کسی دوسرے کا قبضہ نہیں
ہو سکتا ——— میرے سینے کی آگ ہر لمحہ ——— ہر ساعت ———
شعلہ ریز ہوتی جارہی ہے ——— مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میرے
خرمن حیات کو ہمیشہ کے لئے نہ خاکستر کر دے!

میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر اپنی حالت کا صحیح اظہار
تم پر نہیں کر سکتا۔ اے کاش مجھے چند ساعتیں شاہزادی کی قربت
میں بسر کرنے کی مل جاتیں اور میں انہیں اپنی زندگی کے عوض خرید سکتا
اف جمالی! ان ملنے کی بندشیں میری فطرت کو پیسے ڈالتی ہیں۔ اور بعض
اوقات تو مجھے خطرات کا پھندا اپنا گلا گھونٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔
یہ سب کچھ ہے مگر دوست! میرے سکون کی متلاشی روح ———
اضطراب کی لہروں میں بھی سکون سا محسوس کرتی ہے۔ شاید مستقبل کا
کوئی سنہرا لمحہ مجھے سرشاری کے گہوارے میں بیخود بنا کر دنیا سے بے خبر
کر دے؟؟

(۱۲)

خود فریبی کی آخر کوئی انتہا بھی ہے۔ ہم روز بروز آگے
بڑھتے جارہے ہیں۔ مگر منزل کا پتہ نہیں۔ بتاؤ آخر محبت کی سرحد
کہاں ہے۔ یہ ستم نہیں تو اور کیا ہے کہ شاہزادی کی موجودگی میں بھی
زمانہ مجھے اطمینان کی صورت نہ دیکھنے دے؟ ——— تم بالکل سچ
کہتے ہو۔ واقعی میری فطرت کا خمیر "عشق و محبت" کی جنوں انگیزیوں سے
ترتیب پایا ہے۔ ہاں مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں محبت اور
صرف محبت کا بھوکا ہوں اور وہ ——— بھی شاہزادی کی! میں اپنی

المناک زندگی کی تصویر تمہاری نظروں کے سامنے کیونکر پیش کروں؟ ——— میری قید بڑی سنگین ہے - اور میرا جرم؟ اس سے بھی زیادہ سخت؟ ——— "جرم محبت" کے قیدیوں کی سزا جسمانی نہیں ہوتی ان کا تعلق روح سے ہوتا ہے - پھر بتاؤ جمالی! ——— میں اپنی روح کی اذیتوں کو تم پر کیسے ظاہر کروں ؟؟؟ ——— ؟

(۱۳)

پیارے جمالی! اگر سچ پوچھو تو میں اب مرنا بھی نہیں چاہتا خدا کی قسم یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے - میں اپنا وجود اب ضروری سمجھنے لگا ہوں - نہ جانے شہزادی نے کون سا سحر کر دیا ہے - اب اگر جینا چاہتا ہوں تو اس کے لئے ——— جمالی تم نے میری فطرت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا - کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم بھی مجھے عوام کی نظروں سے دیکھنے لگے - تمہارے نزدیک ظاہری آسائش قلبی کوفت کو دور کر سکتی ہے - کیسی باتیں کرتے ہو جمالی! دنیا میں رہ کر قلبی سکون حاصل کرنا ہوا کو مٹھی میں بند کرنا ہے - میرے تفکرات میرے دم کے ساتھ ہیں - اب یہ تلخیاں جزو حیات بن گئی ہیں - جن کا مٹانا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے - سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس نے آلام کی فضا میں آنکھ کھولی ہو وہ کیونکر ——— مسرت کے لئے تیار ہو سکتا ہے ——— میرے پیارے تم میری محبت کے معترف ضرور ہو مگر پھر بھی یہ نہیں جانتے کہ میں شاہزادی سے کتنی محبت کرتا ہوں ؟

(۱۴)

آہ! میرا احساس دل اکثر میرے لئے سخت گراں ثابت ہوتا ہے - میں خوب جانتا ہوں کہ وہ دونوں کے دونوں ——— محبت کے لطیف جذبے سے محض ناآشنا ہیں - ایک شوق کی فراوانی میں مبتلا! دوسرا تمول کی زنجیروں میں گرفتار!! ——— حسن کی دلفریبی کو میری نظروں سے دیکھو! دلبستگی مجھے سوائے شاہزادی کی قربت کے کسی شئے سے نہیں ہو سکتی! ——— دل کی دنیا تاریک ہے ——— "ہلال محبت" پر مجبوری کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں، غم و یاس کی دھواں دھار بارش ہو رہی ہے - جمالی! میں عنقریب یہاں سے باہر جانے والا ہوں - اور کچھ دنوں تک ادھر کا رخ بھی نہ کروں گا - اس لئے کہ ہوا کئی دن سے میرے خلاف چل رہی ہے ——— میرا یہاں سے چلا جانا ہی میرے حق میں اچھا ہے ؟ ؟ ———

(۱۵)

جمالی! ——— تمہارا خط ملا - موسم کی نشاط آفرینیاں اور ——— تمہاری زبان قلم سے ؟ کچھ نہ پوچھو ——— قلبی بے چینیوں کا اظہار ناممکن ہے ! ——— جذبات کی فراوانی رگ رگ میں ہیجان مچائے دیتی ہے - دل مچلا جا رہا ہے - آرزوؤں کی وسعت - ——— تمناؤں کا طوفان مجھے دریائے تفکر میں ڈبوئے دیتا ہے ——— کاش زمانہ مجھے اتنی مہلت دیتا اور یہ فردوسی مناظر مجھے شاہزادی کی آغوش تک پہونچا دیتے - ماسوا کا غم ہر نفس پر چھایا ہوا ہے - اُف یہ احساس زندگی کے قیمتی اور زریں لمحات کو تلخ بنائے دیتا ہے - یہ جاں سوز خلش میری صحت کو برباد کر رہی ہے؟ قدرت نے دنیا بھر کی ناکامیاں میرے حصے میں دے دی ہیں - افسوس یہ طویل جدائی کے دن کس طرح ختم ہوں گے ؟ ——— نگاہ یاس سے ہر سو نگراں ہے لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو مجھے - "قفس آلام" سے آزاد کرا سکے ؟ میری قیام گاہ کے قریب ایک خوبصورت آبشار ہے ——— جہاں شام کو میں روز تفریح کرنے جاتا ہوں لڑکپن کی وہ معصوم یادگار جھیل جس میں کبھی ——— "ہم اور تم" غوطے لگا کر سکون حاصل کیا کرتے تھے ؟ بے اختیار یاد آ جاتی ہے ؟ ——— جمالی یہ ٹھنڈی ہوا کی موجیں رات بھر میرے دل کو ڈسا کرتی ہیں - اے کاش یہ ہوا کی روانی ہی مجھے شاہزادی کے قدموں تک پہونچا دیتی ؟!!

(۱۶)

آج صبح کو میں شاہزادی کے دربار میں پہونچ گیا - شان رحمت کے قربان! ہم ایسے گنہگاروں کی التجائیں بھی ٹھکرائیں نہیں جاتیں - شاہزادی مجھے دیکھتے ہی حیرت میں آ گئی ——— میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک تبسم آمیز چمک نمایاں ہے

وہ گھنٹوں مجھ سے میٹھی گفتگو کرتی رہی۔ میں نے اپنی سیاحت کے دلچسپ واقعات سنائے۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ بیٹھی سنتی رہی! —— جمالی! اس کو مسرور دیکھ کر میں کنول کے پھول کی طرح کھل اٹھا محبت کے خوابیدہ جذبے چونک اٹھے! —— بخدا میری تسلی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ "شاہزادی" مجھ سے دلی خلوص سے ملتی ہے۔

اپنی مجبوریوں کا مجھے خود احساس ہے۔ مگر اضطرار آگیں طبیعت کو کیا کروں۔ جو مجھے ابتک دھوکہ دے رہی ہے۔ جمالی۔ مجھ میں اب اتنا ضبط و تحمل کہاں جو انجام پر نظر کر سکوں؟ گو زمانے نے پیہم سبق دیئے۔ لیکن عہد ماضی کے واقعات ابتک بھولے نہیں؟ شاہزادی کی محبت میری عقل کی روشنی چھین چکی ہے۔ دل کی تمنائیں مجھے نابینا بنا کر —— "دنیائے محبت" میں بھٹکنے کا حکم صادر کر چکی ہیں اب مجھے اتنا ہوش کہاں جو نشیب و فراز دیکھ کر چلوں؟ —— شہزادی مجھ پر انتہا سے زیادہ مہربان ہے۔ آج اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے ایک شاداب آڑو کا تحفہ پیش کیا۔ لیکن خود فریبی کا برا ہو —— قسمت کی تاریکیاں اسی طرح دماغ میں خلش آفریں خیال پیدا کر رہی ہیں —— کاش اس ظاہری خلوص کے تحفہ میں باطنی خلوص بھی پوشیدہ ہو!!؟ ——

〈۱۷〉

جمالی! جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ہر چیز پر یاس و افسردگی کی خوفناک تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر وہی گھر ہے اور میری جنوں انگیزیاں! —— یہ زندگی ہے یا عالم برزخ —— کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک دھندلا سا تصور عہد رفتہ کا ہر وقت پیش نظر رہتا ہے۔ ذرا غور کرو وہ شخص اپنے سینے میں خار غم کی خلش کیسے محسوس کر سکتا ہے۔ جس کے تلوؤں میں کبھی ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو —— عیش و عشرت کے گہوارے میں میٹھی نیند سونیوالے دوسروں کی شب بیداری کا حال نہیں جان سکتے —— پھر جمالی! میری تلون مزاجی عبث اور شکوہ فضول۔ ایسے ہی وقت روح یاس و ناکامی کی بندشوں کو محسوس کر کے پھڑپھڑانے لگتی ہے —— تم نے موسم برشگال کی کیف سامانیوں کا ذکر کیا ہے —— میرے دوست؟ اب نہ موسم برشگال کی آمد کا احساس ہے۔ نہ ان کیف سامانیوں کی خبر، جو کبھی دنیائے محبت کے ہر ذرے میں بیخودی کے بے پناہ جذبے پیدا کر دیتی تھی۔ آہ اب تو ایسی ہولناک بستی میں گھر ہوں کہ یہاں —— یاس و ناامیدی —— غم و اندوہ کی بھیانک صورتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا —— جمالی! ان حزاں رسیدہ لمحوں میں بھی شہزادی کا تصور میرا شریک حال ہے۔ میری متالم ہستی پر وہ چھائی ہوئی ہے —— اُف میں انتہائی گنہگار ہوں۔ ضمیر کی خلش بار بار اکثر میری حالت دگرگوں کر دیتی ہے —— اے کاش میں —— اپنے گناہوں کی سزا —— خود بن سکتا! ——

〈۱۸〉

دل کی تاریک وادیوں میں ابتک قندیل آرزو روشن ہے —— سنا تم نے جمالی! باب الفردوس پر کھڑا ہوں۔ مگر اندر جانے کی اجازت نہیں؟ —— مجبوری کی دشوار گزار راہیں —— راہِ شوق میں پہاڑ کی طرح حائل ہیں۔ وفور اضطراب سے رگوں میں خون ٹکرا کر پانی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ قید و بند کی ہولناک گور میں تڑپ رہا ہوں۔ اطمینان و آزادی کی سانس لینے کی اجازت نہیں؟ مجھے یہاں ہر چیز میسر ہے تاہم جتنے راحت و سکون کتنے ہیں۔ اس کا میرے لئے فقدان ہے!

یہاں کا موسم انتہائی خراب ہے۔ دن بھر خوفناک ہوائیں چلتی ہیں۔ ساری دوپہر جہنمی شعلوں کے حصار میں گزرتی ہے۔ یہ تپش آفریں لمحے اور بھی زندگی کو خاکستر بنا رہے ہیں ——

جمالی کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے عزت و توقیر نہ چاہئے۔ عظمت و دولت کی خواہش نہیں۔ میں تو صرف محبت کا بھوکا ہوں۔ تم دل کی باتیں خوب سمجھ لیتے ہو۔ واقعی میں نے اسی اظہار کے لئے شاہزادی کو خط بھیجدیا تھا کہ اس نے بھی کبھی مجھ سے محبت کی ہے؟

تم نہ جانے کس دھن میں بار بار مجھے خوش رہنے کی تلقین کرتے ہو۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ اگر میں خوش بھی رہوں تو کیا۔ شاہزادی کی طویل مفارقت ہی میرے لئے کیا کم ہلاکت آفریں ہے؟ —— جمالی! اس کے بغیر صبح و شام کی گردش میرے لئے زہر کی

ہولناک تاریکیوں سے بدتر ہے۔ تم میری مجبوریوں کو دور نہیں کر سکتے؟
آخر میری زندگی میں رسمی عنصر کیوں تلاش کر رہے ہو؟ مجھے اب
اس کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں اگر کسی شئے کی حاجت ہے۔ تو وہ
—— شاہزادی اور صرف —— "شاہزادی" کی محبت تھے۔

۱۹

میں شاہزادی سے ملنے کے لئے کتنا بے چین ہوں۔ تم خوب
جانتے ہو۔ لیکن مجبوریوں کی بھاری آہنی زنجیریں میرا قدم نہیں
اٹھنے دیتیں؟ زندگی کا ہر نفس اسی کوشش میں سرگرداں ہے کہ میں
پھر کسی طرح اس کے مبارک قدموں تک پہنچ جاؤں۔ کیا جمالی!
میں اس قید بے زنجیر سے رہائی نہیں حاصل کر سکتا؟ ——
کیا دنیا یہ بھی نہیں گوارا کر سکتی کہ میں دور ہی سے اس کو دیکھ لوں؟؟
—— جمالی! اب یہ آرزو نہیں کہ شاہزادی بھی مجھے دیکھے ——
میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ خواہ خود حشر تک اس کو نظر نہ آؤں۔
اس زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ ہر صبح اب میرے لئے ہلاکت
آفریں صبح ثابت ہو رہی ہے۔ بعض اوقات میں خود حیران ہو جاتا ہوں
کہ شاہزادی کو آخر یہ انداز کس نے سکھائے —— "تعمیر تمنا" شاکر
—— نوازش کے لباس میں جلوہ گر ہونا اسی کا کام ہے۔ بھائی
مجھ میں اتنی روحانیت کہاں کہ اسے دیکھوں، اور جبین نیاز نہ
جھک سکے؟ کاش میں محبت کے بلند مراتب پر پہنچ سکتا ——
گو میری محبت ہنوز تشنہ ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے فخر ہے کہ میں اس کا
دل سے پرستار ہوں۔ کاش مجھے جذبات پر قابو حاصل ہوتا اور
میں صحیح معنوں میں شاہزادی کا پجاری بنجاتا؟؟

۲۰

جمالی! مدتوں سے مجھے جس چشمۂ محبت کی جستجو تھی ——
جس کے حصول کے لئے میں نالاں و پریشان تھا۔ وہ اب جا کر مجھے
مل گیا ہے! —— یعنی حقیقی مسرتوں کی دنیا اب میرے قدموں کے
نیچے ہے۔ یہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ میں دولت کا خواہاں نہیں۔ مجھے
ظاہری عزت و وقار نہ چاہئے۔ میرے نزدیک شہرت و عظمت
کوئی چیز نہیں —— یہ ساری آسائشیں جن پر دنیا مٹی جا رہی ہے

—— جمالی! محبت کے بغیر ہم خاک سے بدتر ہیں۔ خوش ہو جاؤ جمالی!
میں تمہیں بھی اپنی خوشیوں میں برابر کا مستحق بنانا چاہتا ہوں ——
میری روح محبت کی متلاشی تھی۔ میں بھکاری بنکر اس کے در پہ
ایک مدت سے آسرا لگائے بیٹھا تھا آہ —— جمالی! کیسی خوش
نصیب ساعت تھی کہ تاروں کی ضیاباریوں میں "شاہزادی" میری
آغوش میں آگئی —— میں نے اس کی دلفریب آنکھوں کی چمک
میں اپنا مقصد حیات پا لیا —— کچھ نہ پوچھو! مجھ میں اتنی قوت
نہیں جو اپنی روحانی مسرتوں کا اظہار کر سکوں؟
جمالی۔ وقعت و عظمت دوسری چیز ہے اور ——
"محبت" اور شئے! —— میں نے آج شاہزادی سے کہدیا کہ تمہاری
محبت آہ —— "شدید محبت" میری رگ رگ میں موجزن ہے۔
مجھے محبت کے دریا میں تمہیں نے ڈبویا ہے۔ اب ساحل تک بھی
ساتھ دینا —— وہ سن کر خاموش ہو گئی! —— جمالی!
اگر دونوں دلوں میں ایک ہی جذبہ ہے اور روحانی اتصال حاصل ہے
تو ساری قوتیں خود بخود شل ہو کر رہ جائیں گی؟ مگر بھائی میں اسے
ناجائز طریقے سے حاصل کرنا بھی نہیں چاہتا!!

۲۱

جمالی! اب تو زندگی اور موت کی بازی لگی ہے۔ دیکھنا ہے کہ
جیت کس کے ہاتھ رہتی ہے؟ میں ہمیشہ شاہزادی سے حقیقت کا اظہار
کرتا ہوں۔ لیکن یہ میری قسمت کہ وہ سمجھتی ہے کہ میں اسے بناتا ہوں
اے کاش وہ میری نگاہ بن کر اپنے کو دیکھتی! ذرا غور کرو میرے لئے
جان دینے کا مقام ہے یا نہیں؟ اب تو ہر سانس پیام بیخودی دیتی
نظر آرہی ہے۔ انسان بغیر محبت کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کا
اصل مفہوم پرستش ہے۔ خواہ وہ کسی کی کی جائے۔ جذبہ ایک ہے
پرستارانہ انداز جداگانہ ہیں۔ پھر میں اپنے کو اس خلش لطیف سے
کیونکر بچا سکوں گا؟
محبت کی دو سالہ زندگی میں نہ جانے کتنی بار خزاں اور
بہار آئی اور چلی گئی؟ لیکن اس کی محبت کی تصویر جو میرے صفحۂ
دل پر نقش ہو چکی تھی۔ کبھی دھندلی نہ ہوئی؟ —— جمالی!

جان کر انجان بننا تم پر زیب نہیں دیتا۔ بھلا اب سوچنے اور سمجھنے کی قوت کس میں باقی رہ گئی ہے؟ دل کی اگر پوچھتے ہو تو یہ ہے ——— ایک بار میں پھر ——— "شہزادی" کی آتشِ محبت میں مدہوش ہو کر دنیا و مافیہا سے اسی طرح بے خبر ہو جانا چاہتا ہوں ——— جس طرح ۸ جون کی سکون آفریں رات میں اس نے مجھے جامِ سرشاری پلا کر آپے سے باہر کر دیا تھا! ———

(۲۲)

خط ملا۔ لیکن وہی غیریت میں ڈوبی ہوئی تحریر۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر تمہارے دل سے یہ خلش آفریں کھٹک مٹاؤں؟ اگر میری فروگذاشت کا کفارہ میری جان ہو سکتی ہے تو تم شوق سے بار بار میرے دل پر احسان احسان کی ٹھیس لگا کر مجھے ہلاک کر سکتے ہو۔ میری طرف سے ہمیشہ تمہارے دل میں ——— "جذبۂ غیریت" رہا۔ بس وہی پھر عود کر آیا ہے۔ جس سے تم خود قلبی انتشار میں مبتلا ہو اور مجھے بھی شرمندگی اور ندامت کے بحرِ عمیق میں غوطہ زن کر دیا ہے۔ بلا وجہ قلبی ہنگامہ آرائیاں نہ ہونی چاہئیں۔ میں اور تمہیں شرمندہ کروں۔ خدا اس دن کے لئے مجھے زندہ نہ رکھے۔ تم مجھ سے زیادہ زود رنج معلوم ہوتے ہو ——— میں اور تمہارے ضمیر کو دھوکا دوں۔ ——— بس حد ہو گئی! زیادہ سنا نہیں جاتا۔ جب تم کو میرے الفاظ میں طنز اور اشتباہ نظر آتا ہے تو پھر میری ہر سعی بیکار اور ——— میرا ادعائے دوستی فضول ہے۔ اگر تم مجھے اپنا سمجھتے تو کبھی یہ نوبت ہی نہ آتی ——— ہاں ہاں اس کے اظہار کی ضرورت نہیں! خوب معلوم ہے کہ ——— تم کسی کے نہیں! لیکن یہ خیال کہ تمہارا بھی کوئی نہیں ——— تمہارا التباسِ فطرت ہے! جسے غیر سمجھو وہ غیر ہے۔ ورنہ محبت کی نگاہیں بیگانہ روی کی تاریکیاں مٹا دیتی ہیں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو لیکن یہ بار بار اظہارِ تشکر کیسا؟ ——— خدا کے لئے بس ہو چکا ——— جانے دو۔ تم جیسا عالی دماغ انسان محض شبہ کی بنا پر محبت کے آبگینہ کو یوں شکست کر دے۔ حیرت ہے۔ تعجب ہے۔ سوسائٹی کے اثرات تم نے بھی قبول کر لئے۔ برا منہ ماننا وہاں سب کے سب ایک ہی رنگ کے

میں۔ قسمت دیکھو جس سرمایہ پر مجھے فخر تھا وہ خود مجھ سے اپنا دامن کھینچتا نظر آ رہا ہے۔ دیکھنا ہے ابھی قسمت کیا کچھ دکھاتی ہے۔ آج کل تو موسم اس قابل نہ تھا کہ قلبی ہنگامہ آرائیاں ہوتیں۔ مگر تم نے میری ساری کیف سامانیاں چھین لیں ——— خیر اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو ——— میں زندگی بھر دن رونے کو تیار ہوں؟!

(۲۳)

جمالی! کیوں زخم خوردہ دل کو چھیڑتے ہو۔ مجھے دل کی آگ میں جل بجھنے دو۔ سچ ضرور کڑوا ہوتا ہے۔ لیکن جو خود کڑوا ہو۔ اس پر دوسری تلخی کا اثر کم ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ شاہزادی کو میری وجہ سے بدنامی کی تلخی چکھنا پڑی ——— جس کی سزا اگر دیکھو تو قدرت مجھے دے چکی! خود اپنے ہاتھوں محبت کے کنوئیں میں ڈوبا ہوں۔ تو اب تہ تک بھی تنہا جاؤنگا۔ مجھے کسی رہبری کی ضرورت نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ واقعی میں تمہیں اسقدر بلند فطرت انسان نہیں سمجھتا تھا ——— خدا کے لئے مجھے معاف کرو! میری کمزوریوں کو نہ دیکھو؟ تمہارے سارے الفاظ سنہرے اور قیمتی ہیں۔ کاش اس سے پہلے میں نے تمہارے جذبات کا اندازہ کر لیا ہوتا ——— جمالی! بدگمانی انسان کو بالکل اندھا کر دیتی ہے ——— مجھے اپنی کمزوریوں کا بخوبی احساس ہے۔ پیہم ناکامیوں نے مجھ سے عقل و ہوش چھین لئے ہیں تاہم میں شاہزادی کی شدید محبت میں گرفتار ہوں!!

(۲۴)

میں تمہاری رائے سے کبھی متفق نہیں ہو سکتا۔ کیا دوسرونکی پر مسرت زندگی میرے لئے وجہ سکون بن سکتی ہے؟ ہرگز نہیں؟ میرے لئے مسرت عنقا ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو مسرت وہ شے ہے جس کو نہ دولت خرید سکتی ہے نہ بادشاہت۔
کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر مسرت کی تلاش ہے تو جھونپڑوں کی خاک چھانو! ——— جمالی! اگر عمیق نظروں سے دیکھو تو حقیقت بھی یہی ہے۔ ایک تھکے ہوئے مزدور کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھو اور ——— ایک امیر پرغرور کی صورت پر نظر ڈالو۔ انصاف سے کہو۔ کون مسرور ہے

۔۔۔۔۔۔۔ مسرت کا راز اصل میں محبت کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے یہ میرا قول ہی نہیں بلکہ تجربہ ہے۔ جسقدر محبت کی گہرائیوں میں کھوتے جاؤ گے۔ مسرت تم سے قریب ہوتی جائے گی! ۔۔۔۔۔۔۔ میں خود اپنے کو دھوکا دے رہا ہوں جمالی! سچی محبت تو مجھے اسی وقت حاصل ہو گئی۔ جس وقت ۔۔۔۔۔۔۔ شاہزادی نے میرے خلوص محبت کا اپنے دل سے اعتراف کیا!! ۔۔۔۔۔۔۔ !!!

۔۔۔!!! ۔۔۔۔ !!! ۔۔۔۔۔۔ !!! ۔۔۔۔۔۔ !!! ۔۔۔۔۔

(۲۵)

جمالی! مجھے کل شاہزادی کے ہمراہ ایک طویل سفر کرنا ہے ابھی سے خوش ہوں۔ اُس کی دلنواز قربت کا احساس میرے جذبات میں ایک غیر فانی اہتزاز پیدا کر رہا ہے۔ ایسے وقت جو مسرت میرے قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ تم بخوبی کر سکتے ہو۔ خدا جانے اُس کی ہستی میرے لئے کیوں سرمایۂ نشاط بنتی جا رہی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ تم یقین نہ کرو گے جمالی! میرے سیاہ خانۂ غم میں امید کی کرنیں پھر اپنا نور پھیلا رہی ہیں۔ عجب ہیجان آفریں ابتلا میں گرفتار ہوں۔ اس کی طبیعت کا جوش و خروش ہوائے تند کے غیر مستقل جھونکوں کی طرح ہے ۔۔۔۔۔۔ کہ آیا اور نکل گیا! ۔۔۔۔۔۔ تبدیلی نفس کی حالت بالکل بہتے ہوئے دریا کے مانند ہے جس کو کسی حالت قرار نہیں۔ پھر بتاؤ جمالی اُس کی فریب آگیں باتوں کو یقین سے کیسے تعبیر کروں؟ کبھی اس کی نوازشات مجھے جنت کے کیف پرور تخیلات میں گم کر دیتی ہیں۔ اور ۔۔۔۔۔۔ کبھی اس کی فطرت کا تغیر آفریں رویہ مجھے دوزخ کی آگ میں جلنے کے لئے مجبور کرتا ہے؟

۔۔۔۔۔۔ تمہارے نزدیک محبت میں رقابت کا عنصر ہونا بھی ناگزیر ہے۔ میرے عزیز دوست یہ خیال کاش تم میرے فلسفہ محبت کو مد نظر رکھتے ہوئے ظاہر کرتے تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا ۔۔۔۔۔۔ میں جس سے محبت کرتا ہوں اپنے دل کی تمام مجبوریوں سے مجبور ہو کر! پھر اگر اُس ہستی کو بھی کسی دوسرے کے ساتھ محبت ہے تو اس میں رقابت کی کیا ضرورت؟ انصاف سے اگر دیکھو تو وہ بھی مجبور ہے ۔۔۔۔۔۔ اور اگر سچ پوچھو تو ۔۔۔۔۔۔ میں جس ہستی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ جس کی میرے دل میں سب سے زیادہ عزت و توقیر ہے۔ بھلا وہ ہستی میرے سوا کسی دوسرے سے محبت کر سکتی ہے نہیں! ہرگز نہیں! بے بنیاد شک و اشتباہ میں پڑ کر اپنی موجودہ خوشگوار زندگی کو تلخ بنانا دانشمندی کے خلاف ہے ۔۔۔۔۔۔ تم کہو گے محبت کی رمز شناسیوں میں گم ہو کر انسان دانشمند کہاں رہ جاتا ہے؟! بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں سے بھی بے خبر کر دیتا ہے جو وقت وہ کسی مخرب اخلاق عمل کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ اُس کا ضمیر اُسکے بدترین اعمال پر ملامت کرتا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔

جمالی! میں کل یہاں سے روانہ ہو جاؤنگا ۔۔۔۔۔۔ دعا کرو! اثنائے راہ میں مجھے شاہزادی کی تلون مزاجی سے دوچار نہ ہونا پڑے؟

(۲۶)

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہوا میرے اس مبارک سفر پر الوداعی نغمے الاپ رہی تھی۔ جس وقت شاہزادی نے گاڑی کے اندر قدم رکھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ کیا میں کبھی شاہزادی کی قربت اس آزادی کے ساتھ حاصل نہ کر سکونگا۔ جو اس وقت مجھے میسر ہے۔ دنیا میں رہ کر روحی مسرت حاصل کرنا جمالی! ہر انسان کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ روحی مسرت کے معنی کہیں تم دنیاوی دولت نہ سمجھ لینا۔ یہ مسرت جھوٹے سکوں سے نہیں خریدی جاتی۔ اس کے حاصل کرنے میں جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔

ہاں سنو! میں تمہیں ایک انتہائی افسوسناک واقعہ سناتا ہوں غالباً تمہیں سنکر ذرا بھی استعجاب نہ ہو اس لئے کہ تم شروع سے میری مجذوبیت کے قائل ہو۔ مگر میرے لئے یہ واقعہ ایک اہمیت ضرور رکھتا ہے ۔۔۔۔۔۔ گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ متحرک تھی۔ ہوا کے غیر دلچسپ جھونکے میری نظارہ بازی میں مخل تھے۔ شاہزادی سے ملا ہوا میرا کمپارٹمنٹ تھا۔ بہت دیر تک میں اس کے حسن و جمال کی کیف باریوں میں کھویا رہا۔ مجھے خبر نہیں کہ درمیان میں کتنے اسٹیشن آئے اور نکل گئے ۔۔۔۔۔۔ دفعتاً شاہزادی نے اپنا خوبصورت و نازک ہاتھ میری

طرف بڑھاتے ہوئے ایک ریشمی رومال مجھے پیش کیا! جس کی مست کن خوشبو نے گرد و پیش کی مذموم فضا کو معطر کر دیا۔ جمالی! میری مسرت کا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ شاہزادی کے اس خلوص و محبت سے مجھے کتنی خوشی حاصل ہوئی ہوگی؟ میں نے رومال اپنی جیب میں رکھ لیا۔ آج مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کی ساری دولت اس کے مقابلہ میں ایک حقیر شے ہے۔ وہ چیز جو خلوص و محبت سے حاصل کی جائے اس دولت سے کہیں زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ جس کے حصول کے لئے دنیا والے اپنا ضمیر فروخت کر ڈالتے ہیں —— مجھے تعجب تھا کہ شاہزادی نے آج یہ تحفہ مجھے کیوں دیا —— لیکن جمالی یہ میری خود فریبی کا تاریک پہلو تھا! وہ راستہ بھر مجھ سے نہایت سنجیدہ گفتگو کرتی رہی۔ جس وقت میں اسٹیشن پر اترا میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ رومال میری جیب سے غائب تھا۔ اُف جمالی میری روح نے جو اذیت محسوس کی۔ بخدا اگر مجھے کسی جرم کی پاداش میں پھانسی کا حکم دیا جاتا تو مجھے یہ تکلیف نہ ہوتی جو شاہزادی کے بیش قیمت عطیہ کے ضائع ہو جانے سے ہوئی؟ —— جمالی! اے کاش تمہیں میری شدید محبت کا احساس ہوتا کہ میں —— شاہزادی سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ ——

(۲۷)

اس وقت ساری دنیا —— مجھے اپنے خلاف نظر آ رہی ہے۔ قسمت کی طرح شاہزادی بھی مجھ سے برگشتہ ہو گئی ہے۔ بعض اوقات تو میں اپنا سر دھن لیتا ہوں۔ مجھے اپنی قسمت پر ایسے ہی وقت افسوس ہوتا ہے۔ دنیا اگر ظاہری خلوص کو پسند کرتی ہے۔ تو اے میرے مالک! مجھے کیوں نہ ایسا دل دیا۔ جس سے میں بھی دنیا والوں کو اپنے دامِ خیال میں محبوس کر سکتا —— جمالی میں جس قدر شاہزادی سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے اتنا ہی دور ہوتی جا رہی ہے۔ مسرت کی لہریں دماغ میں بالکل اُن موسم برشگال کے بادلوں کی طرح اٹھتی ہیں۔ جو تھوڑی دیر کے لئے —— اٹھے، برسے؟ اور نکل گئے: کیا میں نہیں چاہتا کہ اس بار سے نجات حاصل کر سکوں جس کا میں اہل نہیں۔ مگر پیارے! دل کچھ اس طرح اُس کی محبت میں اسیر ہو چکا ہے کہ میری ساری کوششیں بے سود اور میری ہر سعی بیکار نظر آتی ہے اور —— میں کسی طرح اپنے کو دامِ محبت سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ محبت کی تباہ کاریاں —— اُف جمالی! کچھ نہ پوچھو! کتنی شدید ہوتی ہیں۔ اے کاش تم نے بھی —— کبھی کسی سے "محبت" کی ہوتی —— تو اس جاں سوز جذبے سے واقف ہوتے!! ——

(۲۸)

جمالی! تمہیں خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کون سی ایسی روحانی اذیت تھی جو میں نے یہاں نہیں اٹھائی؟ بہت کچھ جھیل چکا ہوں۔ اب تنہائی ہے اور خاموشی —— ابھی خاموشی جہاں اپنی صدا بھی کانوں میں نہیں آتی۔ کل سے میں نے اپنی داستانِ حیات کی ورق گردانی شروع کر دی ہے۔ صنفِ نازک کی فطرت کا عمیق نظروں سے مطالعہ کر چکا ہوں۔ ان کے سنہرے جال میں پھنس کر انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی تم اُن کے قریب نہ جانا۔ میں جتنا عورت کی ذات سے ڈرتا ہوں —— دنیا میں کسی دوسری شے سے نہیں ڈرتا میری زندگی کا ذرہ ذرہ ان کی فریب کاریوں کا شکوہ سنج ہے —— میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنے کو ان کی قربت سے دور ہی رکھنے کی کوشش کرونگا مگر جمالی! —— آگ جب جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو اس میں دوسری آگ کی گرمی شعلے نہیں پیدا کرتی۔ —— پھر میری یہ احتیاط میرے لئے کیسے —— "سکون و منفعت" کا باعث بن سکتی ہے؟؟

....

(ثمر صدیقی ردولوی)

غزل

(مصورِ قلم ماسٹر باسط بسوانی)

ہر نظر داستان ہے گویا
آنکھ اپنی زبان ہے گویا

بے نشاں کا نشان ہے گویا
لامکاں بھی مکان ہے گویا

گلفشاں یوں ہیں حضرتِ ناصح
آپ ہی کے زبان ہے گویا

جور کرتا ہے اس ادا سے حسن
عشق کا امتحان ہے گویا

پردۂ قوس میں سرِ افلاک
کوئی ابرو کمان ہے گویا

سامنے میرے دل کیا پامال
صبر کا امتحان ہے گویا

خونِ ناحق نہیں سرِ دامن
ظلم کی داستان ہے گویا

کوئے قاتل کی سرزمیں کیا ہے
ظلم کا آسمان ہے گویا

جاں ستانئ تیشۂ فرہاد
اس کے قصہ کی جان ہے گویا

دل دکھاتا ہے اور ہنستا ہے
آج وہ مہربان ہے گویا

کیا ہے باسط غزل سرائی میں
دردِ دل کا بیان ہے گویا

ڈراما :-

گناہِ معاشرت

(ایک معاشرتی المیہ)

(از جناب میرزا ادیب - بی - اے)

افراد ڈراما

شیخ احمد اسمعیل - ایک بہت بڑے تاجر - تہذیب قدیم کے عاشق

سلطانہ ...... شیخ احمد اسمعیل کی بیوی - خاوند کے نقش قدم پر چلنے والی

غیاث ..... شیخ احمد اسمعیل کا نوجوان بیٹا!

نازو .... ایک مفلس و قلاش خاندان کی لڑکی!

صفدر } غیاث کے ماموں، شیخ احمد اسمعیل کے ہمنوا!!
جعفر }

رضا ...... شیخ احمد اسمعیل کا دوست -

ان کے علاوہ خادمہ - غیاث کی بیوی - دو بدمعاش - دو سپاہی - بوڑھا آدمی - مسافر وغیرہ

جائے وقوع ...... وسطِ ہندوستان کا ایک شہر -

پہلا ایکٹ ـــــــ منظر اول

منظر :- وسط ہندوستان کے ایک شہر کا بارونق - وسیع و کشادہ بازار - سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا - اور اس کی ضعیف و مضمحل کرنیں اونچے اونچے مکانوں کی پیشانیوں پر الوداعی بوسہ ثبت کر کے جلدی جلدی رخصت ہو رہی ہیں - بازار کی تجارتی سرگرمیاں اپنے پورے شباب پر ہیں - مکانات اور دکانیں رنگ برنگ کے برقی قمقموں کی مختلف اللون روشنی میں جنت نگاہ بنی ہوئی ہیں ٹانگوں اور موٹروں کے شور - خوانچہ والوں کی مسلسل صداؤں اور فقیروں کی لگاتار التجاؤں سے فضا میں ایک ہنگامہ برپا ہے - بازار کے آخری سرے پر یہاں کے ملک التجار شیخ احمد اسمعیل کی بلند - عالیشان اور فراخ بلڈنگ اسمعیل منزل - کھڑی ہے - اسمعیل منزل کی دوسری منزل میں ڈرائنگ روم ہے - اور ڈرائنگ روم کا طرزِ آرائش صاحب خانہ کی تہذیبِ قدیم کی محبت پر دال ہے! کمرے کے فرش پر ایک اعلی دری بچھی ہے - دروازے کے دائیں جانب ایک پرانی الماری رکھی ہے جو فرسودہ و بوسیدہ رجسٹروں سے بھری ہے - پاس ہی ایک چھوٹی میز ہے - جس کے اوپر چند کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئی ہیں دیواروں پر قطعات اور مقامات مقدسہ کے فوٹو لٹک رہے ہیں - سامنے کی دیوار کے ساتھ دو تکئے لگے ہیں اور ان کے آگے کشمیری قالین بچھا ہے - شیخ احمد اسمعیل ایک تکئے سے سہارا لگائے بیٹھے ہیں - حقہ کی نلی منہ میں ہے اور لمبے لمبے کش لگا رہے ہیں - ان کے دائیں طرف صفدر اور جعفر بیٹھے ہیں اور بائیں جانب رضا - شیخ احمد اسمعیل ایک تجارت پیشہ اپنے فن میں ماہر - مذہب کی سختی سے پابند تہذیب جدید سے متنفر انسان ہیں - صحت نہایت اچھی - سر، مونچھ اور داڑھی کے بالوں کی سیاہی پوڈر کی رہین منت - جعفر اور صفدر اپنے اخلاق و عادات میں شیخ احمد اسمعیل سے مماثلت قریبہ رکھتے ہیں - آزاد خیالی ان کے

پاس تک نہیں پھٹکی۔ شیخ احمد اسمٰعیل کے چہرے سے اثرات تفکر ظاہر ہیں۔ خادمہ آتی ہے۔ اور حقہ کی چلم اٹھا کر لے جانا چاہتی ہے۔ شیخ احمد اسمٰعیل اس کی طرف دیکھتے ہیں وہ مودبانہ کھڑی ہو جاتی ہے)

احمد اسمٰعیل۔ اتنی دیر میں کیوں آئی؟ اور یہ شور کیسا ہے؟

خادمہ۔ چھوٹے شیخ صاحب آئے ہیں حضور!

احمد اسمٰعیل۔ غیاث آ گیا۔ اکیلا؟ (اس کا لہجہ استفہامیہ اس کے قلبی اندیشے کو ظاہر کر رہا ہے)

خادمہ۔ وہ اکیلے تو نہیں ان کے ساتھ ایک برقعہ پوش عورت بھی ہے۔

احمد اسمٰعیل۔ برقعہ پوش عورت؟

(شیخ احمد اسمٰعیل غم و غصہ سے بھری ہوئی نگاہوں سے خادمہ کو دیکھتے ہیں۔ وہ دو تین لمحے ٹھہر کر چلی جاتی ہے۔ صفدر۔ جعفر اور رضا کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ گویا ان کا اندیشہ پورا ہو گیا ہے)

صفدر۔ بلند اقبال صاحبزادے کی یہ کار روائی میں نے پہلے ہی کنایۃً شیخ صاحب پر ظاہر کر دی تھی!

جعفر۔ اُسے اس بات کا خیال نہ آیا کہ اس فعل سے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی!

صفدر۔ خیال آتا تو کرتا ہی کیوں؟

جعفر۔ افسوس اتنی عزت والا باپ کس طرح لوگوں کو منہ دکھا سکے گا؟

رضا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس بے حیا لڑکی کو جھڑک بلکہ مار پیٹ کر گھر سے نکال دیجئے اور لڑکے سے کہہ دیجئے کہ آئندہ خبردار اس کمبخت کا نام تک نہ لے!

(خادمہ چلم بھر کر لاتی ہے)

احمد اسمٰعیل۔ (خادمہ سے) کہاں ہے وہ خبیث؟

خادمہ۔ باورچی خانے میں۔ بی بی جی کے پاس! (آگے بڑھ کر شیخ احمد اسمٰعیل کے کان میں آہستہ سے کچھ کہتی ہے)

رضا۔ اچھا شیخ صاحب! اب میں جانے کی اجازت چاہتا ہوں کل صبح کے وقت آؤنگا۔ اور غیاث کو خود سمجھاؤں گا۔ مطمئن رہئے!

احمد اسمٰعیل۔ آپ جا رہے ہیں؟ بہتر۔ صبح ضرور تشریف لایئے

صفدر۔ (رضا سے مخاطب ہو کر) رضا صاحب! دیکھئے یہ خاندان کی عزت کا معاملہ ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے!

رضا۔ لاحول ولا۔ آپ مجھے اتنا بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ بات دوسروں سے کہہ دونگا؟

صفدر۔ احتیاط لازمی ہے۔

احمد اسمٰعیل۔ ناہنجار نے مجھے کہیں کا نہ رکھا!

(رضا آہ بھرتا ہے اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل جاتا ہے ایک منٹ خاموشی طاری رہتی ہے۔ سلطانہ آتی ہے اور اور اپنے خاوند کی دائیں طرف بیٹھ جاتی ہے)

سلطانہ۔ آپ تو اس طرح بیٹھے ہیں گویا گھر میں کسی کی موت ہو گئی ہے!

احمد اسمٰعیل۔ تو کیا تم سمجھتی ہو یہ واقعہ موت سے کم ہے؟ خدا کی قسم میرا بیٹا مر جاتا پھر بھی مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ جتنا اب ہوا ہے جانتی ہو تمہارا لال کس کو گھر پر لایا ہے؟

سلطانہ۔ یہ تو میں نہیں جانتی مگر لڑکی نیک معلوم ہوتی ہے۔ بے حد خوبصورت اور شرمیلی ہے۔ جب تک میں اس کے پاس کھڑی رہی۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں۔ بہت ادب آداب والی نظر آتی ہے۔ غیاث نے سخت غلطی کی جو اسے لے آیا۔ ہمیں کیوں نہ کہا۔ اب بھی کیا بگڑا ہے؟

احمد اسمٰعیل۔ (صفدر سے مخاطب ہو کر) سُن لیا تم نے! یہ ہے تمہاری بہن کا حال؟ خاندان بھر کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور اسے کچھ خبر ہی نہیں!

سلطانہ۔ یہ میں نے کب کہا کہ غیاث نے اچھا کیا ہے۔ اس نے سخت غلطی کی ہے۔ آپ بلا کر اسے ڈانٹیں۔

احمد اسمٰعیل - میں تو اس کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتا - کاش وہ پیدا ہوتے ہی مرجاتا -

سلطانہ - غیاث کے ابا! آپ اتنے سخت الفاظ کیوں زبان سے نکالتے ہیں؟ غیاث نے بے حد نادانی کی - میں بھی اسے لعنت ملامت کرکے آئی ہوں - بیچارا رو رہا ہے -

صفدر - آپا! آپ جانتی ہیں وہ لڑکی کون ہے؟

سلطانہ - میں کیا جانوں بھائی!

صفدر - آپ کا فرزند ارجمند جس لڑکی کو لایا ہے - وہ ایک غریب اور مفلس خاندان سے ہے - باپ اس کا مرچکا ہے - ماں بمشکل سوکھی روٹیوں سے اپنا اور بیٹی کا پیٹ بھرتی ہے کیا ایسی لڑکی ہمارے خاندان میں آسکتی ہے؟

سلطانہ - تم کیا کہہ رہے ہو؟

احمد اسمٰعیل - اسنے جو کہا سو کہا - اب اسے بلاؤ اور میں اسے کچھ کہنا چاہتا ہوں -

سلطانہ - غیاث کے ابا! صبر سے کام لیں - غیاث بیمار ہے بیٹا ہے

احمد اسمٰعیل - تھا مگر اب نہیں --- غیاث میرا بیٹا نہیں مار آستیں ہے!

سلطانہ - آج آپ کو کیا ہوگیا ہے؟

صفدر - آپا! آپ اسے لائیے -

(سلطانہ - سر جھکائے جاتی ہے اور ایک دومنٹ کے بعد غیاث کو لاتی ہے - غیاث کا سر فرطِ ندامت سے جھکا ہوا ہے)

جعفر - غیاث! نہیں اور تمہارے باپ کو تم سے ایسی امید نہیں تھی -

(غیاث چپ رہتا ہے)

احمد اسمٰعیل - بدبخت! بولتا کیوں نہیں - زبان کٹ گئی ہے؟

غیاث - کیا بولوں اباجان؟

صفدر - آخر یہ تم نے کیا کیا؟ اپنے والد کی عزت کا خیال نہ آیا؟!

احمد اسمٰعیل - مجھ سے تو تم نے کلکتہ جانے کی اجازت لی تھی - اور ---

غیاث - اباجان! مجھ سے سخت غلطی ہوئی - میں شرمندہ ہوں خدا کے لئے معاف کردیجئے -

احمد اسمٰعیل - مجھے تباہ و برباد کرکے اب معافی مانگ رہے ہو - شرم تو نہیں آتی! -

غیاث - میں شرم سے پانی پانی ہوں اباجان!

احمد اسمٰعیل - مجھے کیا معلوم تھا کہ تو مارِ آستیں ثابت ہوگا - ورنہ پیدا ہوتے ہی تیری گردن مروڑ ڈالتا -

غیاث - اب بھی آپ کو مجھے ہر سزا دینے کا اختیار ہے!

احمد اسمٰعیل - میں تجھے کوئی سزا دینا نہیں چاہتا - بس میرے گھر سے نکل جاؤ - اور آئندہ مرتے دم تک مجھے شکل نہ دکھانا!

سلطانہ - بیٹا! تو نے کتنی بری غلطی کی - ایک غریب و قلاش خاندان کی لڑکی یہاں کیونکر آسکتی ہے؟ ہم تو جیتے جی ہی مرجائیں گے -

احمد اسمٰعیل - تو نے اس کارروائی سے میرے دل میں ناسور ڈالدیے ہیں - اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو اس لڑکی سے کہدو - یہاں سے چلی جا - اور آئندہ اس کا نام تک اپنی زبان پر نہ لا - میرا پہلا اور آخری فیصلہ یہی ہے -

صفدر - باپ آخر باپ ہے - غیاث تمہیں تو ایسے رحمدل شفیق باپ کے پاؤں چومنے چاہئیں -

سلطانہ - میں اپنے بیٹے کے لئے شہر کے کسی اعلےٰ اور دولتمند خاندان سے دولھن لاؤنگی بیٹا! باپ نے جو حکم دیا ہے اس کی فوراً تعمیل کرو -

غیاث - اباجان! مجھے معاف کیجئے - میں ایسا نہیں کرسکتا ایسا نہیں کرسکوں گا - میں اسے - اس کے گھر سے بیوی بناکر لایا ہوں - میں اس سے یہ سلوک کیسے کروں؟ اس کا اور اس کی بوڑھی ماں کا کیا حال ہوگا؟

احمد اسمٰعیل - تو جا دور ہوجا - خدا تجھے غارت کرے -

(آہستہ آہستہ اٹھ کر کمرے میں چلے جاتے ہیں - صفدر اور جعفر بھی ان کے ساتھ چلے جاتے ہیں - سلطانہ غیاث کا

بازو پکڑ کر اسے پاس بٹھاتی ہے)

منظر دوم

منظر۔ (ڈرائنگ روم کا بغلی کمرہ۔ دروازے کی دائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی سنگِ مرمر کی میز کے اوپر طشت میں چائے کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں بچی بچی چائے ہے۔ میز کے عین سامنے کھڑکی ہے جس پر ریشمیں پردہ پڑا ہے۔ چھت سے تین بڑے بڑے بلوری فانوس۔ جن کے گرد موتیوں کی جھالریں پڑی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لٹک رہے ہیں۔ کمرے کی بائیں دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا ہے۔ پلنگ کی پائینتی کے پاس سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے۔ دروازہ اس وقت بند ہے۔ ناز و ایک ہژدہ سالہ خوبصورت لڑکی خاموش مغموما نہ انداز میں دروازے کے پاس دیوار کا سہارا لگائے کھڑی ہے۔ اس کے چہرے کے سوگوارانہ اثرات اس کے حسن وجاذبیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یکایک فرطِ غم سے مجبور ہو کر وہ خود کو پلنگ پر گرا دیتی ہے اور چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسکیاں بھر کر رونے لگتی ہے۔ دوسرے دروازے سے غیاث جھوکا متفکرانہ انداز میں آتا ہے۔ جونہی اس کی نظر ناز و پر پڑتی ہے۔ وہ متحیرانہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ناز و چہرے سے ہاتھ اٹھاتی ہے۔ اس کے سیاہ ریشمیں بال۔ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر لہرا رہے ہیں اور ہاتھ بھی قطراتِ اشک سے پرنم ہیں۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں غیاث کی نظریں شرمندہ۔ محجوب اور مضطرب ہیں۔ اور ناز و کی مایوس۔ افسردہ اور رحم طلب۔ غیاث ناز و کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے)

غیاث۔ ناز و! تم اس کمرے میں کب سے ہو؟ اور رو کیوں رہی ہو؟؟

(ناز و مایوسانہ اس کی طرف دیکھتی ہے)

ناز و! بولتی کیوں نہیں؟؟

ناز و۔ کیا بولوں؟

غیاث۔ تم رو کیوں رہی ہو؟

ناز و۔ اور کیا کروں۔ ایک بیکس عورت رونے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے؟

غیاث۔ صاف صاف کہو ناز و!

ناز و۔ مجھے خادمہ یہاں لائی تھی۔ اور میں نے تمہارے والدِ بزرگوار اور دوسرے لوگوں کی تمام گفتگو سن لی ہے۔

غیاث۔ تم نے سب کچھ سن لیا ہے؟

ناز و۔ ہاں۔ سب کچھ۔ میری وجہ سے تم پر کتنی بڑی مصیبت ٹوٹ رہی ہے!

غیاث۔ ان باتوں کو چھوڑ دو۔ سوچنا یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟

ناز و۔ کیا کیا جائے۔ ؟ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ (دو تین لمحوں کے بعد) ہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے بھلا دو۔

غیاث۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا ناز و! تمہیں چھوڑ کر۔ تمہیں بھلا کر میں زندہ نہیں رہ سکتا!

ناز و۔ غیاث! سوچو!! ایک جھونپڑی میں رہنے والی غریب مفلس لڑکی تمہارے محل میں کیونکر آ سکتی ہے؟ میرے ساتھ رہنے سے تم پر تمہارے محل کے دروازے بند کر دئے جائیں گے!

غیاث۔ محل کے دروازے بند کر دئے جائیں گے؟ بیشک۔ مگر خدا اپنی دنیا کے دروازے تو مجھ پر بند نہیں کرے گا۔ تمہارے ساتھ ایک جھونپڑی بھی میرے لئے محل ثابت ہو گی!؟

ناز و۔ غیاث! تم یہ دل سے کہہ رہے ہو۔ میں نے سنا ہے مرد محبت کے معاملے میں دھوکا دیتے ہیں!

غیاث۔ دیتے ہوں گے۔ مگر میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔

(شیخ احمد اسمٰعیل۔ صفدر اور سلطانہ کے ساتھ آتے ہیں
ناز و خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی ہے)

سلطانہ۔ غیاث! میں تمہارے باپ کو پھر لاتی ہوں۔ آہ تم ہمیں کتنی تکلیف دے رہے ہو۔ (ناز و کو دیکھ کر) لڑکی تو یہاں سے تھوڑی دیر کے لئے چلی جا (خادمہ ناز و کو لے کر کمرے سے نکل جاتی ہے) اولاد والدین کو اتنا ہی ستایا کرتی ہے؟

غیاث۔ میں نے تو کسی کو بھی نہیں ستایا! اماں جان!

احمد اسمٰعیل۔ کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔ تو وہ بھی پوری کر دو۔

سلطانہ۔ بیٹا! ہم تمہارے والدین ہیں۔ ہمیں ہر حالت میں تمہاری بہتری مقصود ہے۔ دیکھو تو! اگر ایک مفلس و قلاش خاندان کی لڑکی ہمارے خاندان میں آگئی تو ہمیں لوگ طعنے دے دے کر مار ڈالیں گے۔ تمہارے والد خدا کے فضل سے شہر میں بڑی عزت کے مالک ہیں۔ تمہاری اس حرکت سے لوگوں میں ان کی کیا عزت رہ جائے گی؟

غیاث۔ غریب لڑکی کو گھر میں لانے سے عزت میں کیا فرق آسکتا ہے؟ کیا اس کا غریب ہونا دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے؟

صفدر۔ لڑکے! تم ابھی ان چیزوں کو نہیں جانتے۔ ہمیں دنیا میں رہ کر دنیا کے اصولوں پر عمل کرنا ہے۔ دنیاداری یہی ہے۔

غیاث۔ ماموں! مجھے معاف کرو۔ میں دنیاداری کے لئے خود کو اور ایک غریب لڑکی کو تباہ نہیں کر سکتا۔

احمد اسمٰعیل۔ تم ناز و کو نہیں چھوڑ سکتے۔ تو تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے والدین اور یہ گھر چھوڑنا ہو گا۔

سلطانہ۔ (احمد اسمٰعیل سے) آپ نرمی کے ساتھ گفتگو کریں۔ میں ہی اپنے بیٹے کو سمجھاتی ہوں (غیاث کے سر پر ہاتھ پھیر کر) میرے بیٹے! تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔ باپ کی آنکھوں کا نور ہو اور میرے دل کا سرور ہو۔ دیکھو نا! تمہیں ذرا سی بھی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم بیتاب ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب تمہاری طبیعت۔ بنصیب دشمناں خراب تھی۔ تو جانتے ہی ہو۔ تمہارے باپ کی کیا حالت تھی؟ رات دن تمہارے لئے بےچین رہتے تھے!

غیاث۔ مگر اماں جان! آج مجھے تباہ کرنے کے لئے بےچین کیوں ہیں؟ ناز و! میری بیوی ہے۔ میں اس سے نکاح کر چکا ہوں۔ اس کی بوڑھی ماں۔ اپنی اکلوتی لڑکی مجھے سونپ چکی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ دوں تو وہ کدھر جائے گی اور میں بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اماں! مجھ پر رحم کرو!

صفدر۔ سنو غیاث! جوان آدمی بعض اوقات ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے جو اس کی تمام زندگی کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس وقت والدین کا کہنا نہ مانو گے تو تم بھی ایسی ہی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ سوچو۔ سمجھو۔ پھر ایسا موقعہ ہاتھ نہیں آئے گا۔

سلطانہ۔ تم اپنے والدین کو تباہ کرنا چاہتے ہو؟

غیاث۔ میں کیا کروں۔ کاش میں ایک لکڑہارے کے گھر پیدا ہوتا! (رونے لگتا ہے)

احمد اسمٰعیل۔ (نرم لہجے میں) بیٹا! میں تمہارا باپ ہوں۔ اگر تم اپنے باپ اور اپنے خاندان کی عزت کو بٹہ لگوانا نہیں چاہتے اگر تم دنیا کو ہم پر ہنسنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتے تو اس لڑکی کو فوراً چھوڑ دو۔ میں آج ہی اپنی تمام جائداد تمہارے نام لکھے دیتا ہوں۔ سمجھ گئے!

صفدر۔ غیاث! تم اتنے سنگدل ہو گئے ہو کہ والدین کی پیہم التجاؤں کو ٹھکرا رہے ہو۔ ایک طرف عزت ہے۔ دولت ہے۔ والدین کی محبت ہے۔ اور دوسری طرف غریبی ہے طعنے ہیں۔ اور ذلت ہے۔ بتاؤ ان میں سے کون سی راہ پسند کرو گے؟

سلطانہ۔ کیا سوچ رہے ہو بیٹا! باپ سے معافی مانگو!

(غیاث خاموش رہتا ہے)

صفدر۔ (احمد اسمٰعیل سے) شیخ صاحب! آپ اسے معاف کر دیں آخر یہ آپ کا بیٹا ہے۔

احمد اسمٰعیل۔ (غیاث کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر) میں بیحد خوش

ہوں - کہ آخر تم سمجھ گئے - میں آج ہی تمام جائداد تمہارے
نام لکھدونگا - یہ سب مکانات اور کوٹھیاں تمہاری
ہیں - میں ابھی اس ذلیل لڑکی کو نکال دونگا - اس
کمبخت نے میرے بچے کو برباد کرنا چاہا تھا -

(غصے میں دروازے سے نکل جاتے ہیں - غیاث
ان کے پیچھے جانا چاہتا ہے مگر سلطانہ اس کا بازو تھام
لیتی ہے)

سلطانہ - غیاث! کیا کر رہے ہو؟ تم نے تو ہمیں کبھی بھی نہیں ستایا!
آج کیوں بدل گئے ہو میرے بیٹا!

صفدر - تم ایک خوفناک و مہیب غار میں جا رہے تھے - خدا کا
شکر کرو - تمہارے باپ نے تمہیں بچا لیا -

غیاث - میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا -

سلطانہ - بیٹا! آج تمہاری پھوپھی آنیوالی ہیں - تمہیں اسٹیشن پر جاکر
انہیں لانا ہے - اب کپڑے پہنو - آؤ میرے ساتھ میرے
لال! ـــــ

(سلطانہ غیاث کا بازو پکڑ کر دروازے سے نکل جاتی ہے
صفدر بھی مسکراتا ہوا ان کے ساتھ ہے)

منظر سوم

منظر :- (اسمٰعیل منزل میں مسرت کے قہقہے گونج رہے ہیں -
مہمان شاداں و فرحاں نیچے سے اوپر - اوپر سے نیچے چڑھ
اتر رہے ہیں - شیخ احمد اسمٰعیل اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی
ابتدائی رسوم میں انتہائی دلچسپی کا ثبوت دے رہے ہیں
مکان کے پائیں باغ میں غیاث - بلور کا ایک مدور ٹکڑا
دائیں ہاتھ میں پکڑے - ایک روش پر ٹہل رہا ہے -
دسمبر کا آفتاب آسمان پر جلوہ گر ہے - غیاث کے عقب
میں باغ کا دروازہ ہے - نازو ایک شیر خوار بچے کو
گود میں اٹھائے - لرزتی - کانپتی - ادھر ادھر دیکھتی -
آہستہ آہستہ آتی ہے - غیاث پاؤں کی آہٹ سنکر - مڑ کر
اسے دیکھتا ہے - اس کی نگاہیں نازو کے چہرے پر پڑ کر
بچے کے چہرے پر خود بخود جھک جاتی ہیں)

غیاث - نازو! تم کیسے آئیں؟

نازو - یہ میں خود بھی نہیں جانتی!

غیاث - پھر بھی!

نازو - تمہارے چرنوں میں رہنے کے لئے تمہاری پوجا کرنے کے
واسطے - محبت کی ماری ہوئی عورت اس کے سوا اور
کیا چاہتی ہے؟

غیاث - نازو! (وقفہ) کاش میں تمہاری آرزو پوری کر سکتا
تمہاری کیا - میری اپنی بھی آرزو ہے کہ ہم ایک دوسرے
سے کبھی جدا نہ ہوں - لیکن -

نازو - (متعجبانہ) لیکن ـــ؟ میں نہیں سمجھی؟

غیاث - میں جانتا ہوں اس بات سے تمہارے دل کو چوٹ
لگے گی - مگر کیا کیا جائے؟

نازو - آج تم معموں میں کیوں باتیں کر رہے ہو - تم نہیں
جانتے میں اس وقت کس مصیبت میں ہوں - تمہیں
حاصل کرنے کے لئے میں تمام دنیا کو ٹھکرا چکی ہوں - ہمارے
تمام رشتہ دار ہم سے سخت ناراض ہیں - وہ مجھ پر طرح طرح
کے خوفناک الزام لگاتے ہیں - اماں بیمار ہیں - اسے
تمہارے والدین کی روش سے سخت صدمہ پہنچا ہے -
غیاث! تم کہاں اس دن بدل گئے تھے - تمہارے والد نے
مجھے بالوں سے پکڑ کر اور ہنٹر مار مار کر گھر سے نکال دیا
اس وقت تم کہاں تھے؟ مگر مجھے کوئی رنج نہ ہوا کیونکہ
میں سمجھتی تھی کہ میرا غیاث تو میرا ہی رہے گا!

غیاث - اف میرے اللہ!

نازو - ان باتوں سے تمہیں صدمہ پہنچتا ہے تو میں خاموش رہتی
ہوں -

غیاث - میں مجبور ہوں نازو! مجھے دنیا نے مجبور کر دیا ہے!

نازو - کس بات پر؟

غیاث - اس بات پر کہ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں بسر کر سکتا

نازو۔ ظالم نہ ہو غیاث۔ دیکھو میرے کان مجھے دھوکا دینے لگے ہیں۔

غیاث۔ تمہارے کان تمہیں دھوکا نہیں دے رہے۔ جو کچھ تم نے سنا ہے۔ میں نے ہی کہا ہے! نازو! میں نے تم سے محبت کی۔ شدت کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔ ہماری سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ اکٹھے رہیں۔ مگر سوسائٹی کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ تم بے حد مفلس اور میں دولتمند باپ کا بیٹا ہوں۔ یہ فرق کسی صورت سے بھی دور نہیں ہو سکتا اس لئے ہم کسی صورت میں بھی نہیں مل سکتے۔

نازو۔ تو کیا ابتک تم مجھے دھوکا ہی دیتے رہے؟ سوسائٹی کا قانون تم کو اس بات پر مجبور کر سکتا ہے۔ کہ تم ایک غریب لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتے۔ مگر یہ قانون تمہیں ایک غریب لڑکی کو نہایت شرمناک دھوکا دے کر تباہ کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے؟ محبت کا فریب دے کر تم نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔ غریبی اور امیری کا فرق اس وقت کہاں تھا۔ جب تم نے ہمیشہ محبت اور نباہ کرنے کا وعدہ کرکے مجھ سے نکاح کیا تھا؟ کیا میری ماں نے اس وقت یہ نہیں کہا تھا کہ تم بہت امیر آدمی کے بیٹے ہو اور میری بچی بیحد مفلس ہے مگر تم نے ایک نہ سنی۔ بار بار مجھے محبت کا دھوکا دیا۔

غیاث۔ جی بھر کر بددعائیں دو۔ شاید اس سے تمہارے دل کو تسلی ہو۔

نازو۔ تسلی میرے دل کو؟ تمہیں یہ الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی؟؟

غیاث۔ نازو! تم مجبور رہو۔ میں نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔

نازو! (ملتجیانہ لہجے میں) غیاث! تم وہی محبت کرنے والے پہلے غیاث کیوں نہیں رہے! سوچو میری حالت کیا ہو؟ میں دنیا کی نگاہوں میں مجرم ہوں۔ اور جرم کی سب سے بڑی نشانی (بچے کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہے۔ کون جانتا کہ تم نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ میری ماں بیمار ہے۔ وہ مر رہی ہے۔ میری زندگی کا یہ سہارا ابھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ اگر تم بھی مجھ سے چھن گئے تو میں کدھر جاؤں گی۔ سوچو تمہاری دعوت میں کس مصیبت میں ہوں۔ تمہاری دی ہوئی دنیا مجھے اور میری ماں کو طعنے دے دے کر ہلاک کر رہی ہے۔ اور تم بھی مجھے چھوڑ رہے ہو۔ میں تمہارے گھر میں ایک خادمہ بن کر رہونگی۔ بولو غیاث! بولو۔ دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔

(سر جھکانے لگتی ہے۔ غیاث اس کے شانوں کو پکڑ لیتا ہے۔ اور وہ پھر سیدھی ہو جاتی ہے)

غیاث۔ نازو! میں تم سے برابر محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ مگر ہماری معاشرت کے قانون نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ میں اب کیا کر سکتا ہوں؟

نازو! تم سب کچھ کر سکتے ہو!

غیاث۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری ہستی سوسائٹی کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی سی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ گھر میں آتنی چہل پہل ہے۔ معلوم ہے یہ کیوں؟

نازو۔ نہیں میں نہیں جانتی۔ اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔

غیاث۔ تم جاننا نہیں چاہتیں۔ مگر تمہیں جاننا ہوگا۔ آج شام کو میں شہر کے ایک بہت بڑے تاجر کی لڑکی کا شوہر بن جاؤنگا۔

نازو۔ شوہر بن جاؤ گے ——— تم ——— تم؟؟

غیاث۔ ہاں نازو! میرے والدین اور سوسائٹی یہی چاہتی ہے

نازو۔ سمجھ گئی۔ میں جاتی ہوں۔ مکار مرد! لو اپنے بچے کو لے لو میرے ساتھ یہ کیوں ٹھوکریں کھاتا پھرے؟

غیاث۔ میں اسے لے کر کیا کروں؟ تمہیں رکھو۔

نازو۔ اتنے ظالم۔ سنگدل۔ سفاک!!!

(چلی جاتی ہے۔ غیاث بھی آہستہ آہستہ باغ سے نکلتا ہے)

منظر چہارم

منظر۔ (شہر سے باہر ایک وسیع میدان۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی ایک مسلسل قطار جا رہی ہے۔ شام کی ظلمت آہستہ آہستہ فضا میں پھیل رہی ہے۔ نازو۔ اپنے بیمار بچے کو گود میں اٹھائے ہانپتی کانپتی۔ لرزتی۔ ڈگمگاتی آتی ہے۔ اور ایک ٹیلے کے پاس ٹھہر جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے خوف و دہشت کے آثار مترشح ہیں۔ پیشانی پسینے میں شرابور ہے۔ لباس پھٹا ہوا ہے۔ آنکھوں سے مظلومیت ٹپک رہی ہے۔ وہ بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے اور پھر یہ محسوس کر کے کہ بخار پوری شدت کے ساتھ ہے مایوسانہ اٹھا لیتی ہے)

نازو۔ (خود بخود) دنیا کتنی ظالم بن گئی ہے۔ شہر میں لوگ طعنوں سے ہلاک کئے دیتے ہیں اور یہاں ظالم بدمعاش پیچھا نہیں چھوڑتے۔ خدایا رحم کر (بچے سے) دودھ پیو گے میرے لال!

بچہ۔ (کمزور آواز میں) مم..... مم

نازو۔ مم (متجسسانہ ادھر ادھر دیکھتی ہے) یہاں پانی کہاں (ایک طرف چلنے لگتی ہے۔ اور خود بخود کہتی جاتی ہے) غیاث بھی بدل گیا۔ ماں بھی دنیا سے چل بسی۔ اب زندگی کا کون سا سہارا باقی رہ گیا ہے۔ غیاث کیوں بدل گیا؟؟ مجھے اس کی کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی! ہاں وہ مرد ہے۔ مرد کا دل بہت جلد بدل جاتا ہے۔ اس نے مجھے محبت کا کس طرح یقین دلایا تھا۔ اور یقین دلا کر کس طرح تباہ کر دیا۔ آخر کیا کروں؟ موت؟؟ مگر یہ ننھی جان! (دور سے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ وہ ڈر کر ٹھہر جاتی ہے۔ دو شخص جن کی آنکھوں سے بدمعاشی ٹپک رہی ہے۔ سامنے آتے ہیں)

ایک آدمی۔ کہاں کہاں بھاگی پھر رہی تھیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے عاجز آگئے!

دوسرا آدمی۔ ہم بھی تمہارے پیچھے ہیں۔ کہاں جاؤ گی آخر؟

نازو۔ تم لوگ مجھ بے کس عورت کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ تم سے خدا کے نام پر التجا کرتی ہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں بہت دکھی ہوں!

پہلا آدمی۔ بہت دکھی (قہقہہ لگا کر) واقعی بہت دکھی لیکن ہم تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتے۔

نازو۔ (مڑ کر جاتے ہوئے) تم سب مرد ظالم ہو!

دوسرا آدمی۔ (پہلے آدمی سے) کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ تیتری تو اس طرح اڑ جائے گی!

(دونوں آدمی اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ نازو بھاگتی ہے۔ بچہ کمزور آواز میں چیختا ہے۔ نازو ایک بڑے پتھر سے ٹھوکر کھاتی ہے۔ بچہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر ایک پتھر پر جا گرتا ہے۔ ایک ہلکی سی چیخ کی آواز آتی ہے اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ بدمعاش بھاگ جاتے ہیں۔ دو سپاہی اس کی طرف آتے ہیں۔ نازو خون میں شرابور بچے کی نعش کو اٹھاتی ہے اور اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے)

نازو۔ میرے بچے۔ اف۔ خون۔ لہو۔ بے جان!!!

(آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی ہے۔ سپاہی اس کا بازو پکڑ لیتے ہیں)

ایک سپاہی۔ چلو ہمارے ساتھ!

(نازو متحیرانہ کبھی انہیں اور کبھی بچے کو دیکھتی ہے)

دوسرا سپاہی۔ سنتی نہیں (تم نے اس بچے کو مار ڈالا ہے!

(دونوں سپاہی اسے لے چلتے ہیں۔ اس کے لمبے لمبے بال بچے کے خون آلود جسم پر بکھرے ہیں۔ لبوں پر مہر خاموشی ہے)

دوسرا ایکٹ

منظر اول

منظر۔ (متذکرہ بالا واقعات کو گزرے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ نازو۔ پانچ سال کے اختتام پر پاگل سمجھ کر

جیل خانے سے آزاد کر دی گئی ہے۔ اور اب وہ عالم جنون میں شہر کے کوچہ و بازار میں پھر رہی ہے۔ غیاث چھ ماہ سے بیمار ہے۔ اس وقت وہ اپنے مکان کے نچلے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ سرہانے کی طرف ایک بلند میز پر دوائیوں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پلنگ کے دائیں طرف سلطانہ کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر غیاث کی بیوی بیٹھی ہوئی ہے۔ غیاث کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا ہے۔ آنکھیں دھنس گئی ہیں اور ان کے گرد حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ گھڑی دن کے بارہ بجاتی ہے۔ سلطانہ غیاث کے چہرے کو دیکھ کر دواؤں کی طرف دیکھتی ہے)

سلطانہ۔ دوائی پینے کا وقت ہو گیا بیٹا! اس تکئے کے سہارے بیٹھ جاؤ نا!

(اٹھ کر میز کے پاس جاتی ہے)

غیاث۔ دواؤں سے کیا ہوگا؟ میری دلی خلش برابر بڑھ رہی ہے کوئی سینے میں نشتر چبھو رہا ہے!

سلطانہ۔ گھبراؤ مت۔ غیاث! آخر ان ہی کو تکلیف پہنچتی ہے دو تین دن تک تندرست ہو جاؤ گے!

غیاث۔ نہیں اماں! میں کبھی بھی تندرست نہیں ہو سکتا۔ میرے دل کو وہ زہر آلود نشتر سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہے۔

سلطانہ۔ وہ کون؟ تم کیوں وہمی ہوتے جاتے ہو؟

غیاث۔ ناز و کو تم نہیں جانتیں اماں!

سلطانہ۔ ناز و؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے میرے لال! وہ کبھی کی مر کھپ گئی ہے۔

غیاث۔ وہ مر کھپ گئی! مگر یہ کس کے خون سے بھرے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ کس کے بالوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں یہ کس کی آتشیں نگاہیں میرے دل کو جلا کر کباب کر رہی ہیں۔ میرے کانوں میں یہ کس کی جگر خراش صدائیں گونج رہی ہیں؟؟ یہ ناز و نہیں تو کون ہے اماں؟ ظلم —— میں نے اس پر وہ ظلم کیا ہے کہ کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ ایک محبت کرنیوالی بیکس عورت کو سوسائٹی کی نگاہوں میں عزت و وقار حاصل کرنے کے واسطے تباہ کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟ سوسائٹی۔ سنگدل۔ ظالم۔ ستمگر سوسائٹی۔ لیکن میں نے ظالم سوسائٹی کے ملعون قانون کی کیوں پابندی کی؟ ناز و میری تھی۔ سوسائٹی کو کیا حق تھا کہ وہ مجھ سے میری ناز و کو چھین لے۔ دولت اور خاندانی فخر کو زندہ رکھنے کے لئے میں نے اس بیکس عورت کو چھوڑ دیا۔ اُف (سینے پر ہاتھ رکھتا ہے)

سلطانہ۔ بیٹا، غیاث! خدا کے لئے چپ رہو۔ تم بیمار ہو۔ اس طرح تمہاری تکلیف بڑھ جائے گی۔

غیاث۔ بڑھ جائے۔ یہانتک کہ میری زندگی ختم ہو جائے میں میری یہ سرزنش میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے ارد گرد جہنم کی آگ دہک رہی ہے۔ ناز و مر گئی۔ کسی گاڑی سے ٹکرا کر۔ کسی موٹر کے نیچے آ کر اس کا ننھا بچہ بھی اس کے سینے سے چمٹا ہوگا۔ ان دونوں جانوں کے خون کا ذمہ دار میں ہوں۔ والد نے اسے ہنٹر مار مار کر اسی گھر سے نکال دیا۔ اور میں بےحس و حرکت کھڑا رہا۔ ننھے سے بچے کو لے کر وہ ایک بار پھر رحم کی بھیک مانگنے آئی۔ میرے خاندان و دولت کے ملعون غرور نے اس کی ہر ایک التجا کو ٹھکرا دیا۔ اس کی درد انگیز صدائیں میرے دل میں اثر پیدا نہ کر سکیں۔ اور پھر —— وہ کہاں گئی؟ مایوس ہو کر اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہو گی۔ اور میں جس نے اسے برباد کیا۔ زندہ ہوں۔

سلطانہ۔ (غیاث کی گردن کے گرد مادرانہ شفقت سے ہاتھ ڈال کر) بس اب خاموش رہو بیٹا! (گلاس میں دوائی ڈال کر غیاث کے منہ کے قریب لاتی ہے) پی لو غیاث! تمہیں میری قسم ہے جو انکار کرو۔

غیاث۔ چند دن ـــــ شاید چند دن یہ خلش برداشت کروں گا
پھر ـــــ موت!
(سر اٹھا کر دوائی پی لیتا ہے)
سلطانہ۔ پھر خوفناک باتیں!
غیاث۔ اماں! تم نہیں جانتیں میرے دل میں کیا ہو رہا ہے؟
(سلطانہ خالی گلاس غیاث کی بیوی کی جانب بڑھاتی ہے۔ وہ اٹھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ گلاس کو الماری پر رکھ دیتی ہے۔)
سلطانہ۔ لو اب سو رہو۔
غیاث۔ مجھے اب ایک ہی بار نیند آئے گی اماں! اف سینے میں سخت درد ہو رہا ہے۔
سلطانہ۔ میں تمہارے سینے پر روئی گرم کر کے رکھتی ہوں۔ آرام آجائے گا۔
غیاث۔ نہیں اماں! جانے دو۔ مجھے جتنی تکلیف پہنچے کم ہے۔
(اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں)
سلطانہ۔ خدا جانے تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے غیاث! (اس کے آنسو پونچھتی ہے۔ غیاث کی آنکھوں سے برابر آنسو نکل رہے ہیں۔ سینے میں سخت ہیجان برپا ہے)

منظر دوم

منظر۔ (اسمٰعیل منزل کے سامنے۔ بازار کے آخری سرے پر ایک وسیع چوک۔ شام کا وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے۔ سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے خوفناک آواز پیدا کر کے چل رہے ہیں۔ چوک میں کوئی کوئی آدمی تیزی سے چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پاگل نازو۔ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس ایک طرف چل رہی بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر وہ خود بخود کچھ کہنے لگتی ہے اس کے پاس سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جس نے ہاتھ میں لالٹین پکڑی ہے۔ گزرنے لگتا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتی ہے اور ہاتھ اٹھا کر اسے روکتی ہے۔ بوڑھا آدمی ٹھہر جاتا ہے)

نازو۔ اے جانے والے ٹھہر! ذرا ٹھہر۔
بوڑھا۔ کیا ہے نازو!
نازو۔ نازو؟ کون ہے نازو؟؟ یہ لفظ میں نے کئی بار سنا ہے۔
بوڑھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟
نازو۔ تمہیں بتاؤ۔ میں تو بھول چکی ہوں۔
بوڑھا۔ آہ! دیوانی عورت!
نازو۔ ہاں ہاں یاد آ گیا۔ میرا نام دیوانی عورت! (قہقہہ لگاتی ہے) کتنا اچھا نام ہے۔ تم بھی یہ نام رکھ لو۔ بولو رکھتے ہو؟
بوڑھا۔ میں جاتا ہوں آسمان پر بادل آئے ہوئے ہیں بجلی بھی چمک رہی ہے۔ بارش ہو گی۔
نازو۔ خون کی بارش ہو گی۔ آسمان پھٹ جائے گا۔ اور اس میں آگ اور خون برسے گا۔ لوگوں کی خون آلود نعشیں آگ کے شعلوں پر جلیں گی۔ ہر طرف خون ہو گا ہر طرف آگ ہو گی۔ (آسمان پر نظر ڈال کر) وہ بادل کا ٹکڑا کیوں اس ننھے سے ستارے کی طرف جا رہا ہے۔ شاید محبت سے بیتاب ہو کر جا رہا ہے۔ مگر (گھبرا کر) ستارے سے کہو۔ بادل پر بھروسہ نہ کرے۔ محبت کرنے والا دھوکا دیا کرتا ہے۔
بوڑھا۔ اُف! (لالٹین کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے)
نازو۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ لالٹین (اپنے بازو اور ہاتھوں پر نظر ڈال کر) میری گود میں بھی ایک چراغ تھا۔ وہ کہاں گیا؟ شاید لوگوں نے چھین لیا!
(ایک مسافر ان کے پاس آ کر ٹھہر جاتا ہے)
مسافر۔ (بوڑھے سے) میں راستہ بھول گیا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ یہ راستہ کدھر کو جائے گا؟

ناز و۔ تم راستہ بھول گئے ہو؟ ہر ایک شخص راستہ بھولا ہوا ہے
درخت آپس میں ٹکرائیں گے۔ ان کے پتے، ٹہنیاں
اور شاخیں تر بتر ہو کر زمین پر گر پڑیں گی (آسمان کی طرف
دیکھ کر) وہ دیکھو بادل کا ٹکڑا ستارے کو چھوڑ کر
آگے بڑھ گیا ہے۔

بوڑھا۔ پاگل ہے۔ بیچاری۔

مسافر۔ خدا رحم کرے۔

ناز و۔ (مسافر سے) جب تمہارے پاس چراغ ہو تو اسے چھپا کر
رکھو۔ لوگ چراغوں کو چھین لیا کرتے ہیں۔ جنگل کے
درندے خون سے بھری ہوئی نعشوں کو اپنے بڑے بڑے
تیز دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھائیں گے جب انسانوں کی
نعشیں ختم ہو جائیں گی۔ تو وہ ایک دوسرے کو کھانا
شروع کر دیں گے۔ تمہاری لالٹین بجھ جائے گی۔ بوڑھے
آدمی! تم اسے چھپا کر کیوں نہیں رکھتے؟

مسافر۔ یہ بیچاری کب سے پاگل ہے؟

بوڑھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔

ناز و۔ دنیا دھوکا ہے۔ ہر ایک شخص دوسرے کو دھوکا دیتا ہے
اس غریب عورت کو بھی دھوکا دیا گیا۔ بادشاہ کے
لڑکے نے اس سے شادی کر لی۔ یہ بات بادشاہ کو سخت
ناگوار گزری۔ شاہزادہ بھی بے وفا ہو گیا۔ غریب عورت کو
محل سے نکال دیا ـــــ اس بازار کی دوسری طرف
ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک الّو ہے
وہ غریب عورت اب کہاں گئی۔ جنگل کے درندے
اس کی طرف بھاگے۔ اور وہ کنوئیں میں گر پڑی۔ الّو
اس کا ماتم کرتا رہتا ہے۔

بوڑھا۔ بیچاری، بے کس عورت۔

ناز و۔ (رو کر) مجھے کوئی بلا رہا ہے۔ میں کسی سے ملنا چاہتی
ہوں۔ مگر کس سے۔ چراغ بجھ گیا جس نے وہ چراغ دیا تھا
وہ بھی مر گیا۔ دنیا بدل گئی۔ میں میں نہ رہی۔ وہ، وہ نہ رہا۔

بوڑھا۔ وہ کون نازو؟

نازو۔ وہ ۔ بادل جس نے ستارے کو دھوکا دیا ہے۔

(مسافر اور بوڑھا ایک طرف چلے جاتے ہیں)

آخر کار دھوکا ہی دیا (اپنی دائیں طرف دیکھ کر) دونوں
چلے گئے۔ انہیں جانا ہی چاہئے تھا۔ (بارش ہونے لگتی ہے)
خون برسنے لگا۔ ابھی جنگل سے درندے آئیں گے۔ اپنے
شکار کے لئے چیخیں گے دھاڑیں گے! مجھے بھی کھا جائیں گے
آہ ـــــ میرا کلیجہ تو وہ پہلے ہی کھا چکے ہیں (آہستہ
آہستہ چل کر اسمٰعیل منزل کے پاس جا کر ٹھہر جاتی ہے)
یہ مکان مجھے کیوں کھینچ رہا ہے۔ میں یہاں کبھی آئی تھی۔
(ہاتھوں سے بالوں کو کھینچ کر) میں اندر جاتی ہوں۔
لوگ مار کر باہر نکال دیں گے۔ کیا پروا۔ وہ ایسا ہی
کرتے ہیں۔

(دروازے میں داخل ہو جاتی ہے)

منظر سوم

منظر۔ (غیاث پلنگ پر لیٹا ہے۔ جسم بالکل کمزور اور نحیف ہو چکا
ہے۔ سلطانہ اور اس کی بیوی مایوسانہ اسے دیکھ رہی ہیں)

سلطانہ تیرے باپ کو تار دیا ہے وہ آتے ہی ہوں گے۔

غیاث۔ اب وقت ہو چکا۔ ان کا انتظار کرنے کے لئے میرے
پاس فرصت نہیں۔

سلطانہ۔ بیٹا! تم ایسی باتیں کر کے میرے دل پر چرکے لگا رہے ہو

غیاث۔ اماں! اماں! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ
ہے۔ اسے لاؤ۔ میں مرنے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتا ہوں
لاؤ اماں، نازو کو لاؤ۔ چند سانس باقی رہ گئے ہیں۔

سلطانہ۔ (اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر) میرے غیاث! میرے
لخت جگر!!

غیاث۔ میری یہ حسرت ـــــ بھی ـــــ پوری نہ ہوئی۔
نازو ـــــ نازو۔

(نازو اندر داخل ہوتی ہے۔ غیاث اسے دیکھتا ہے)

وہ آگئی- نازو!

(نازو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی ہے- گویا کوئی بھولی ہوئی چیز اسے یاد آ رہی ہے)

نازو- ایک دم چونک کر) غیاث - غیاث!

(نہایت تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی ہے- غیاث سر اٹھاتا ہے- مگر سر گر پڑتا ہے - اور جسم مردہ ہو جاتا ہے- نازو آگے بڑھ کر گر پڑتی ہے- نازو کا سر اس کے پلنگ کے پائے کے ساتھ زور سے ٹکراتا ہے- چند لمحوں میں اس کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے- رات کی تاریکی میں نالہ و شیون کی صدائیں اٹھنے لگتی ہیں- بارش زور سے برس رہی ہے- بادل گرج رہا ہے- بجلی چمک رہی ہے)

کہاں جا رہے ہو؟

مرے دل کی برباد دنیا بسا کر
خیالوں میں بس کر نظر میں سما کر
مجھے تم سراپا تمنا بنا کر
امنگوں بھرے جی کو ترسا رہے ہو
کہاں جا رہے ہو! کہاں جا رہے ہو

سرورِ مسرت سے معمور راتیں!
جوانی کے نشہ میں مخمور راتیں!
یہ رنگین دلکش یہ پرنور راتیں!
مجھے ایسی راتوں میں تڑپا رہے ہو
کہاں جا رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو

سکوتِ مجسم بنا کر رہو گے؟
تحیر کا عالم دکھا کر رہو گے؟
جلا کر رہو گے؟ مٹا کر رہو گے؟
محبت کی دنیا کو ٹھکرا رہے ہو
کہاں جا رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو

یہ لازم تھا تم کو محبت بڑھاتے
تغافل نہ کرتے وفا آزماتے
نگاہوں سے تسکین کے گل کھلاتے
مگر تم تو بے طرح کترا رہے ہو
کہاں جا رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟

عبدالسلام اختر ہوشیارپوری

تخمیس بر غزلِ غالب

عشق میں گریۂ خوں ہیں نہ رہا میرے بعد   درد والے ہیں طلبگارِ دوا میرے بعد
طالبِ جور وجفا کون ہوا میرے بعد   "حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد"

مایۂ نازِ محبت جو ہو، وہ دل نہ رہا   ہو جو لذت کشِ آلام وہ کامل نہ رہا
دھوم عشاق میں جس کی ہو وہ بسمل نہ رہا   "منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد"

بارِ الفت کا اٹھانے سے کہاں اُٹھتا ہے   اشک ہوتے ہیں رواں، درد جہاں اُٹھتا ہے
ضبط ہوتا ہے کہاں شورِ فغاں اُٹھتا ہے   "شمع بجھتی ہے تو اس میں دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد"

شکر ہے بعد مرے قدر ہوئی ہے میری   چہرہ اُترا ہوا ہے۔ زلفِ سیہ ہے بکھری
اب حسیں آنکھوں میں سرمہ ہے نہ لب پر مسّی   "خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد"

امتحاں گاہِ محبت میں کوئی کب ٹھہرا   نہ ملا مجھ سا کوئی ناز اٹھانے والا
یہ حسیں بھول گئے جور و جفا کو ایسا   "درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے کرم حالِ زبوں کے لئے آغوشِ وداع   وصل ہے دردِ دروں کے لئے آغوشِ وداع
عقل ہے سحر و فسوں کے لئے آغوشِ وداع   "ہے جنوں- اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد"

تم نے دیکھا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق   "صرف بندہ ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
اب تو عنقا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق   "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

رنج کرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی   آہیں بھرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہتے ڈرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی   "غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد"

تم سے کہتا تھا رسا جان نہ کھونا غالب   کسی بے درد پہ عاشق نہیں ہونا غالب
اب یہ کیوں کہتے ہو- ممکن نہیں سونا غالب   آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد"

(سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی)

چک والی

(از جناب ریاض الدین احمد)

مئی کا مہینہ تھا۔ میں امتحان سے فارغ ہو کر ماموں جان کے ہاں ایبٹ آباد چلا گیا۔ ماموں جان کپڑے کے سوداگر تھے۔ اور شہر سے باہر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ ایبٹ آباد چھوٹا سا شہر ہے۔ ایک ہی دن میں تمام شہر کی جی بھر کے سیر کر لی۔ اور پھر دن بھر گھر پر رہنے لگا۔ ماموں جان سویرے ہی سے کام پر چلے جاتے اور میں دن بھر کبھی کوئی کتاب دیکھ لیتا۔ کبھی ممانی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا۔ اور کبھی ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتا۔

بچے شام کو سیر کرنے جاتے تھے اور ہر روز واپس آ کر چک والی کی باتیں سنایا کرتے۔ کوئی کہتا آج اس نے ہمیں گانا سنایا۔ اور میں بھی ان کی باتوں کو دلچسپی سے سنا کرتا۔

ایک دن بچوں نے مجھ سے کہا۔ "بھائی جان! چلئے ہم آپ کو چک والی دکھائیں۔" اس دن میں گھر بیٹھے بیٹھے ذرا اکتا گیا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ ہو لیا۔

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی چک بنا رہی تھی اور سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھی۔ بچوں نے پہنچتے ہی شور مچا دیا "چک والی! آج بھائی جان بھی ہمارے ساتھ آئے ہیں"۔

میں قریب پہنچا۔ نوعمر لڑکی کچھ شرما کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بچوں سے کہا۔ "اچھا یہ ہیں چک والی؟" اور پھر بے پروائی سے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "تم ہی انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہو؟" اس نے کہا۔ "جی ہاں بچے آ کر کھیلتے رہتے ہیں۔ میں انہیں کہانیاں سناتی ہوں اور ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی جاتی ہوں۔ اکیلی ہوتی ہوں۔ ان کے آنے سے تھوڑی دیر کے لئے دل بہل جاتا ہے۔"

"ہوں! اچھا بچو! تم یہیں کھیلو۔ میں آدھ گھنٹے تک واپس آؤں گا۔ پھر ساتھ چلیں گے" دس قدم جا کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں اور کام میں مشغول ہو گئی۔

میں آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈوں میں سے گزرتا ہوا جا رہا تھا۔ اور چک والی کے متعلق غور کر رہا تھا۔ وہ پہاڑی ہرگز نہیں۔ لب و لہجہ سے یو۔ پی یا پنجاب کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا لباس بھی اس علاقے کا نہیں --- شلوار اور قمیص۔ لیکن وہ اکیلی یہاں کیا کرتی ہے؟ عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی گھر میں کام کیوں نہیں کرتی؟ اس کے ماں باپ بھائی بہن کہاں ہیں؟ کہتی ہے اکیلی ہوتی ہوں۔ بچوں کے آنے سے جی بہل جاتا ہے لیکن یہ اکیلی کیوں ہے؟

میں کچھ دیر ادھر ادھر پھرتا رہا اور یہی سوچتا رہا۔ پھر بچوں کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

دوسرے روز پھر میں اس عجیب و غریب لڑکی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بچوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کے ساتھ دو چار باتیں کیں اور واپس آ گیا۔ اس کے بعد تو میرا معمول ہو گیا کہ ہر شام کو بچوں کے ساتھ چک والی کے پاس جاتا اور باتیں کرتا رہتا۔ بچے اپنے کھیل میں مشغول رہتے چند دنوں میں مجھے اس کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ سہارنپور کی رہنے والی تھی۔ اور خوشحال گھر میں پیدا ہوئی تھی لیکن دو سال ہوئے اس کے ماں باپ دونوں ہیضہ کا شکار ہو گئے۔ اور زمانے کی گردش نے اسے بے رحم چچی کے دروازے پر لا پھینکا۔ اس کے چچا چکوں کی تجارت کرتے تھے۔ اور ایک چک روزانہ اس سے بھی بنوانے تھے۔ صبح کو وہ گھر پر کام کرتی اور

شام کو ایک چک لیکر یہاں درخت کے نیچے آبیٹھتی تھی - وہ خوش مزاج تھی - خوش شکل تھی - رنگ گورا نہ تھا - لیکن ایسا جیسے ملیح کہیں - ناک نقشہ تیکھا نہ تھا - لیکن اس چھوٹے سے گول چہرے میں ایک عجیب جاذبیت تھی - اس کی صورت میں ایک خاص نمکینی تھی - جو بلا کی کشش رکھتی تھی - مجھے معلوم ہوا اس نے چھ سات کتابیں اردو کی بھی پڑھی ہیں - اس نے اپنی داستانِ غم کچھ ایسے انداز میں بیان کی اور اس طرح چپکے چپکے روئی کہ ایک دو آنسو میری آنکھوں سے بھی ٹپک پڑے ۔

دو ہفتے گزر گئے - اور ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے - میں چک والی کے پاس بیٹھ کر کمرہ میں اس کا ہاتھ بٹاتا وہ مجھے چک بنانا سکھاتی - اور جب مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو قہقہے مار کر ہنستی - میں شام ہونے سے پہلے ہی اس درخت کے نیچے پہنچ جاتا - وہ کھڑی ہو کر آداب کہتی اور پھر ہم دونوں بیٹھ کر چک بنانے میں مشغول ہو جاتے ۔

دن گزرتے گئے اور ہماری بے تکلفی بڑھ کر کشش سے بدل گئی - تمام دن بڑی مشکل سے گذرتا - بار بار میں اپنی گھڑی دیکھتا کہ کب پانچ بجیں اور میں گھر سے نکلوں - چک والی بھی کہتی کہ آپ اتنی دیر میں کیوں آتے ہیں جلدی آیا کیجئے - لیکن مجھے سانی جان کا خیال تھا کہ اگر اتنی جلدی گھر سے نکلوں گا تو وہ ضرور پوچھیں گی کہ دھوپ میں کہاں جا رہے ہو ۔

ایک روز جی میں آئی کہ آج جلدی چلیں - چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب سو گئے تو میں چپکے سے نکل کھڑا ہوا - درخت کے نیچے پہنچا - ابھی چک والی نہیں آئی تھی -

ویسے تو ہندوستان کی دوپہر اوائل بہار میں خوشگوار ہوتی ہے - لیکن ایبٹ آباد کی دوپہر جبکہ میں درخت کے نیچے بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا - نہایت حسین تھی - دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ کی گرمی میں ہلکی ہلکی ہوا کی خنکی مل کر فضا کو نہایت خوشگوار بنا رہی تھی - درختوں پر پرندوں کی دلکش سریلی آوازیں ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ ملکر ایک پُرکیف و پُردرد نغمہ الاپ رہی تھیں - میرے دل کی عجیب کیفیت تھی - ایک پوشیدہ احساس ایک ہلکا سا جذبہ ایک ناقابلِ بیان خواہش ایک نامعلوم امنگ میرے دل میں موجزن تھی - میں اس درخت کے تنے سے بیٹھ لگائے کھڑا تھا - اس کے پتے ہل رہے تھے - آس پاس کی حسین طلسمی دنیا کو بہوت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا - ایک جادو تھا جو مجھے سلا رہا تھا - وہ "آتی ہو گی" میں آہستہ سے درخت کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا - میں نے گھڑی دیکھی - پونے تین بجے تھے "وہ تین بجے آتی ہے" میں نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی - وہ نظر نہ آئی - قریب سے ایک بھونرا شور مچاتا ہوا گزر گیا - ایک اور گزرا - ایک اور - سامنے بڑے درخت پر پرندے شور کر رہے تھے - دور گائیں گھاس چر رہی تھیں - ساری دنیا خوش تھی مگر اس خوشی میں متانت تھی - سنجیدگی تھی - میرے سینے میں ایک غبار اٹھا - اور میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی سر تنے سے لگا کر ٹوپی کو آنکھوں پر رکھ لیا - اور اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا -

کان پر سرسراہٹ محسوس ہوئی - میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے غنودگی کی حالت میں ہاتھ سے مکھی کو اڑا دیا - وہ پھر آبیٹھی - میں نے پھر اڑا دیا - وہ پھر میرے کان پر چلنے لگی - میں نے زور سے اپنے کان کے قریب سے ہاتھ گھمایا - میرا ہاتھ کسی چیز کو لگا - چھن سے آواز آئی - میں نے اٹھ کر دیکھا - چک والی نسیمہ اپنی کلائی پکڑے ہوئے منہ بنائے بیٹھی تھی - اس کی ایک چوڑی ٹوٹ گئی تھی - بظاہر وہ ناراض معلوم ہوتی تھی - لیکن اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی - اور چھوٹی سی پیاری ناک پر شرارت کھیل رہی تھی ۔

اوہو - میں نے کہا - "میں سمجھا تھا مکھی ہے" میں اپنی مسکراہٹ نہ دبا سکا - بلکہ ہنس دیا -

"آپ کو شرم نہیں آتی ؟ ایک تو مارتے ہیں اور پھر اوپر سے ہنستے ہیں" - اس نے جھوٹا غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا -

میں چونک پڑا "آپ کو شرم نہیں آتی ؟" کتنا بیباک فقرہ تھا

لیکن مجھے برا نہیں لگا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم نے کبھی بن کر نے مجھے کیوں ستایا؟ میں سو رہا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ سے یہاں سونے کو کس نے کہا تھا؟ انتظار کرنا تھا تو جاگ کر کرتے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

میں پھر چونک پڑا۔ "انتظار!" ہاں اس نے سچ کہا تھا۔ ۔ درحقیقت میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا۔ لیکن کیا چبھتا ہوا فقرہ تھا۔ مجھے مزا آیا۔

لیکن پھر فوراً اپنی خودداری کا خیال آیا۔ میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا "انتظار کس کا کرنا تھا؟ یونہی ذرا سیر کو جی چاہا۔ یہاں آ گیا مجھے کیا خبر تھی کہ تم اتنی جلدی آ جاتی ہو"

وہ ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔ کہنے لگی۔ "اچھا اب مجھے کام بھی کرنے دو گے۔ یا یہیں میری جگہ پر بیٹھے رہو گے۔"

دوسرے روز مجھ سے نہ رہا گیا۔ پھر اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ لیکن آج میں نے دور سے دیکھا۔ چک والی مجھ سے پہلے آ چکی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ وہ بھی میرا انتظار کرتی ہے۔ اس نے کہا۔ "آداب! آج آپ بہت دیر میں آئے ہیں۔"

"نہیں تو! کل ہی کا وقت ہے" میں نے کہا۔

"میں تو آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں"۔

"کس کا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ شرما گئی۔ سر جھکا کر کہنے لگی۔ "اچھا تو بیٹھئے کام کریں"

ہم بہت دیر بیٹھے ایک چک بناتے رہے۔ کام کے دوران میں اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھو جاتا۔ اور کبھی اس کی انگلیاں میری انگلیوں میں پھنس کر رہ جاتیں۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتی۔ غرض اسی طرح کبھی اتفاقاً اور کبھی جان بوجھ کر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے اور کام دلچسپ ہو جاتا۔

وہ ہمیشہ سفید اور اجلے کپڑے پہنتی تھی۔ اور چند دن سے تو میں نے کبھی میلے کپڑے اس کے جسم پر نہ دیکھے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ اس کے بال بہت اچھی طرح گندھے ہوتے تھے۔ چہرہ کا رنگ بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ سرخ و سفید ہو گیا تھا۔ دوسرے وہ ایک سفید روح معلوم ہوتی تھی۔

ایک روز میں نے اس سے کہا۔ "نسیمہ! میں ایک ہفتہ تک چلا جاؤں گا"

"کہاں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"جہاں سے آیا تھا" میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں! سچ کہیئے" اس نے گڑگڑا کر کہا۔

"سچ کہتا ہوں"

"کیا سچ مچ آپ چلے جائیں گے؟" اف! اس کی آواز میں سوز تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔

"کیا کروں نسیمہ! جی تو نہیں چاہتا۔ لیکن کالج کھلنے والا ہے اور مجھے وہاں پہنچنا ہے"

اس نے گویا چڑ کر آہستہ سے کہا۔ "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ آپ چلے جائیں گے۔" اس کی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی۔

میں چپ ہو رہا۔ ہم کام کرتے رہے۔ وہ چپ تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا۔ وہ سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔ مغرب کے وقت رخصت ہوتے وقت میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں میں اپنی سیاہ غمگین آنکھیں ڈال دیں۔ پھر فوراً اٹھی اور سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ میں گم سم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں غم کا بوجھ دل پر اٹھائے گھر واپس آیا۔

اب میں روز دوپہر کو جانے لگا۔ کبھی وہ پہلے آ جاتی کبھی میں۔ ایک روز باتوں باتوں میں چک والی نے مجھ سے کہا۔ "میں غریب ہوں اور آپ بڑے آدمی۔ کاش آپ بھی میری طرح غریب ہوتے"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوتا؟ اور ویسے بھی اول تو میں بڑا آدمی ہوں نہیں۔ اور اگر ہوں بھی تو تمہارے ساتھ تو بالکل برابر کی حیثیت سے ملتا ہوں۔ تم مجھے چھیڑتی ہو۔ برابھلا

کہتی ہو۔ کبھی بن کر کان پر چلتی ہو۔ لیکن مجھے تمہاری یہ سب باتیں اچھی لگتی ہیں۔ تم ناراض ہو جاتی ہو تو میں مناتا ہوں۔ اور ہر بات میں برابر کا سا برتاؤ کرتا ہوں۔ اس پر بھی تمہیں بڑے چھوٹے کا خیال آتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "پھر بھی اگر آپ میں اور مجھ میں یہ فرق نہ ہوتا تو۔ . . ." وہ رک گئی۔ اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔ جن سے وہ اپنے موہوم مطلب کا اظہار کر سکتی۔

میں نے پوچھا۔ "تو کیا ہوتا؟"

"آپ بڑے بیوقوف ہیں"۔ اس نے کہا۔

یہ چبھتا ہوا فقرہ مجھے اچھا لگا۔ میں نے مذاق کے طور پر کہا۔ "اور تم عقلمند ہو؟"

"آپ کو تو فقط مذاق کرنا آتا ہے اور بس" اس کی پیاری پیاری نظروں سے ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نہیں" میں نے کہا۔ "تمہیں میں ساری عمر نہیں بھول سکتا"۔ میرے سینے میں سوز کا غبار اٹھا اور میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ "نہیں نسیمہ! میں تمہیں کبھی نہ بھولوں گا"۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی کالی غمگین آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اور سر جھکا کر انہیں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آخر میں نے بھی پوچھا۔

"نسیمہ! کیا تم بھی مجھے یاد کرو گی؟" میرے اس سوال کے جواب میں اس نے سر اوپر اٹھایا اور اپنی غمگین و پرنم سیاہ آنکھوں سے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ اف! وہ نظر میں کبھی نہ بھولوں گا۔ اب جب مجھے اس نظر کا خیال آتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن عین اس وقت اس کی جاذب دل آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے۔ اس کے تمتماتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"تم رو رہی ہو" میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک خاموش سیلاب جاری ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور بچوں کی طرح ہاتھ پھیر پھیر کر چپ کرانے لگا۔ "نسیمہ! رو نہیں۔ اتنی سی بات پر روتی ہو! تم بڑی ہو کر بیانی ہو۔ نہیں رونا نہیں چاہئے۔ دیکھو دنیا میں کسی چیز کو قیام نہیں۔ سب کچھ بدلتا رہتا ہے۔ مجھے بھی جانا ہے۔ خدا کی قسم۔ نسیمہ! میں تمہارے پاس سے جانا نہیں چاہتا۔ لیکن میرے بس کی بات نہیں۔ میں کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ اپنا منہ میری آغوش میں چھپائے رو رہی تھی۔ میں جھکا۔ میرا سر اس کے سر کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میری گود میں پڑے پڑے میری طرف دیکھا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اسی لمحہ وہ گویا نیند سے چونک اٹھی۔ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ چک کو لپیٹا۔ سامان اٹھایا۔ اور میری طرف ایک آخری جھلکتی ہوئی نظر ڈال کر چل دی۔ میں ایک سکتے کے عالم میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ فوراً میں بیدار ہوا میں نے آواز دی۔ "نسیمہ کہاں جاتی ہو؟" وہ جاتے جاتے ٹھٹکی۔ مڑ کر دیکھا اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلنے لگی۔ میں نے پھر آواز دی۔ "نسیمہ! نسیمہ! خدا کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ"۔ لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ تیز قدم اٹھا کر چلنے لگی۔ میں بھاگ کر اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن خدا جانے کیوں میری ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور میں درخت کے تنے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے روز میں پھر اسی وقت گیا۔ لیکن وہ نہ آئی تھی۔ میں درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ آج مجھ کو معلوم ہوا کہ انتظار کے لمحے کتنے طویل ہوتے ہیں اور ملاقات کی گھڑیاں کتنی مختصر۔ ادھر ایبٹ آباد کی دوپہر کا پرسکون طلسم ادھر میرے دل میں ہیجان و اضطراب۔ مجھے آس پاس کی سنہری دنیا کی مسرت پر رشک آ رہا تھا۔ کائنات مطمئن معلوم ہوتی تھی لیکن میں بیچین تھا۔ سڑک پر دور دور تک نظر دوڑائی۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہوئے اور ہر دفعہ یہ کہکر دل کو تسلی دی کہ بس اب آتی ہو گی۔ لیکن وہ نہ آئی۔

اگلے روز پھر میں گیا۔ اور دور ہی سے اس سفید روح کو درخت کے نیچے کھڑا دیکھا۔ میں نے قدم تیز کیا۔ لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا

اور مڑ کر بھاگی۔ درختوں کے جھنڈوں میں سے ہوتی ہوئی خدا جانے کہاں چلی گئی۔ میں بھاگا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے تک وہ غائب ہو چکی تھی۔ دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ نظر نہ آئی۔ مگر میری نظر درخت کے تنے پر پڑی جس پر ایک کاغذ کیل سے لگا ہوا تھا۔ وہ ایک خط تھا میں نے دیوانہ وار اسے نوچ لیا اور پڑھنے لگا۔

میرے دل کے مالک!

آپ نے مجھے دھوکا دیا۔ اب میں کبھی آپ سے نہیں مل سکتی میں نے جب پہلے دن آپ کو دیکھا تو مجھے آپ سے انس سا ہو گیا۔ خدا معلوم مجھے کیوں آپ اتنے اچھے لگنے لگے۔ جب آپ سیر کرنے چلے گئے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد آپ نے روز آنا شروع کر دیا اور چند دنوں کے بعد آپ بھی میرے ساتھ بڑی محبت سے ملنے لگے۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھ غریب کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا۔ میں آپ کا یہ سلوک کبھی نہ بھولوں گی میرا خیال تھا۔ کہ آپ ایبٹ آباد سے کہیں نہ جائیں گے۔ اور ہماری ملاقاتیں اور باتیں ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ کاش آپ مجھے اس وقت بتا دیتے۔ کہ آپ چلے جائیں گے۔ تو میں عقل سے کام لیتی لیکن آپ نے مجھے غلط فہمی میں رکھا اور ہمیشہ کہتے رہے کہ میں یہیں ہوں۔ دن گزرتے گئے اور میرے دل میں آپ کی محبت بڑھتی گئی۔ آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں آپ کی پیار کی باتوں کو سچ سمجھتی تھی۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ لیکن میں کم عقل تھی آپ کی نظروں سے محبت ٹپکتی تھی۔ آپ کی باتوں سے محبت کی بو آتی تھی۔ لیکن میں کم عقل تھی۔ آپ کی نظروں کے دھوکے میں آ گئی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ ایک روز میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں آ گیا تو آپ نے اس طرح دبایا کہ میری رگ رگ میں آپکی محبت سرایت کر گئی کاش مجھے جب بھی معلوم ہو جاتا کہ آپ فقط دل لگی کر رہے ہیں۔ اور میرے دل کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں آپ سے زیادہ نہ ملتی اور اگر ملتی تو ایک غیر کی طرح۔ اور شروع ہی سے اپنے اوپر جبر کر کے آپ کی محبت کو دل سے نکال دیتی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ ایک روز آپ میرا انتظار کرتے کرتے درخت کے نیچے سو گئے۔ میں نے آ کر آپ کو چھیڑا تو آپ نے میری چوڑی توڑ دی۔ میں جھوٹ موٹ ناراض ہو گئی۔ تو آپ نے مجھے منایا۔ اس دن میں بہت خوش تھی۔ اور آپ بھی بہت خوش تھے۔ ... ان دنوں کو کس طرح بھولے ہیں ... لیکن مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ باتیں وہ ... فقط ایک خوش وقتی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو ہونا تھا ہو لیا۔ میں آپ سے شکوہ نہیں کرتی۔ کیونکہ آپ بھی مجبور ہیں۔ کالج میں پڑھتے ہیں۔ اور ابھی آپ کو اور پڑھنا ہے۔ خدا کرے آپ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور آپ اپنی تمنا اور مراد حاصل کر لیں۔ میں ہمیشہ آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی کہ خدا ہمیشہ آپ کی نگہبانی کرے اور اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ مجھے یقین ہے میرا خدا میری دعا ضرور سنے گا۔ میں آپ کو تمام عمر کبھی نہیں بھلا سکتی۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ آپ مجھے بھول جائیں گے۔ آپ کے ہاں شہروں میں دل لگی کا سب سامان موجود ہوتا ہے آپ کو اور بہت سی لڑکیاں دل بہلانے کے لئے مل جائیں گی بھلا میں غریب کیسے یاد رہ سکتی ہوں۔!

اب میں آپ سے کبھی نہیں مل سکتی۔ آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔ میں نے بے شرم ہو کر سب کچھ آپ کو لکھ دیا ہے۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ آپ سے چھپا کر کیا کروں گی۔ مجھے آپ سے پاک محبت ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گی آپکو یاد کرتی رہوں گی۔ لیکن آپ سے مل کر میں آپ کی پڑھائی اور ترقی میں حائل ہونا نہیں چاہتی۔ آپ مجھ سے ملنے کا خیال نہ کیجئے۔ آپ کی بدنامی ہوگی۔ ممکن ہے دنیا کو معلوم ہو جائے اور آپ کے نام پر بٹہ لگ جائے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ میرا خیال دل سے نکال دیجئے اور اطمینان سے پڑھائی میں مشغول ہو جائیے۔ آپ کو دنیا میں اور بہت سے کام کرنے ہیں۔ ان کی تیاری کیجئے۔ اور مجھ بدنصیب کو میرے حال پر رہنے دیجئے

آپ کی غم نصیب نسیمہ

میں نے یہ خط پڑھا تو سر چکرانے لگا - آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا - اور میں بے بس ہو کر وہیں بیٹھ گیا - معلوم نہیں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا اور کیا کرتا رہا - بس اتنا یاد ہے کہ مغرب کے وقت میں اپنے چھوٹے ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ گھر واپس آیا *

اس کے بعد میں تین چار روز ایبٹ آباد میں رہا - روز دوپہر کو اس درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا - لیکن وہ نہ آتی - کاش وہ آجاتی - لیکن اگر وہ آجاتی تو میں اس سے کیا کہتا یہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں - کبھی دور سے کوئی سفید کپڑوں والا کسان گزرتا - تو میری آس بندھ جاتی - دل بلیوں اچھلنے لگتا - لیکن پھر وہی یاس وہی غم - کئی بار خیال کرتا کہ نسیمہ کا خیال چھوڑ دوں - پڑھائی میں حرج ہوگا - مگر دل نہ مانتا اور ہر دوپہر کشاں کشاں نسیمہ سے ملنے کی آرزو میں اس درخت کے نیچے لا بٹھاتا *

اس کے بعد میں جلد ہی لاہور واپس آگیا - لیکن مجھے نسیمہ کے خیال نے اکثر بے چین رکھا اور وہ چک والی مجھے ہمیشہ یاد آتی رہی آج اس بات کو تین برس گزر گئے ہیں اور اب بھی بہار کے موسم میں مجھے وہ اکثر یاد آتی ہے - اور میں غمگین ہو جاتا ہوں دل میں کچھ ایسی ہوک اٹھتی ہے کہ کسی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا - جب موسم خزاں میں کسی اداس شام کو ایک بے برگ و بار درخت کے نیچے کھڑے ہوئے دل میں ایک میٹھا سا درد اور اداسی محسوس ہوتی ہے - تو مجھے ایبٹ آباد کی رنگین دوپہر ایک سہانے خواب کی طرح یاد آجاتی ہے

اس دفعہ پھر ایبٹ آباد جانے کا ارادہ ہے - خدا معلوم نسیمہ کہاں ہے؟ اور کیا کرتی ہے؟ ممکن ہے اس کی شادی ہوگئی ہو اور وہ کہیں باہر چلی گئی ہو - لیکن میں اس بڑے درخت کے نیچے جایا کروں گا - جہاں میں چک والی سے ملا تھا ہر روز وہاں جاؤں گا اور درخت کے نیچے اسی جگہ بیٹھ کر اس طلسمی دوپہر کا لطف اٹھاؤں گا - وہاں ہوا ہلکی ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ پتوں میں سے گزرتی ہوئی چلے گی - سامنے بڑے درخت پر پرند شور مچائیں گے - دور گائیں گھاس چرتی ہوں گی - بھونرے بھنبھناتے ہوئے میرے پاس سے گزر جائیں گے کبھی کسی کسان کے گانے کی آواز دور سے آئے گی - فضا میں غم کی جھلک ہوگی - اور میرے دل میں یاد رفتہ ایک سرور پیدا کرے گی - اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس بڑے درخت کے نیچے ایک سفید روح سر جھکائے بیٹھی اپنے نازک ہاتھوں سے چکیں بنا رہی ہو *

ریاض الدین احمد

انگوٹھی

مترجمہ حضرت صہبائی بی۔ اے (آنرز)

[ہیمسن ناروے کا مشہور زمانہ ادیب ایک گڈریے کا لڑکا تھا جس نے باقاعدہ تعلیم پایا تو درکنار بچپن میں کبھی یہ خیال بھی نہ کیا تھا کہ ایک دن وہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی کی دنیا میں ۔۔ آفتاب بن کر چمکیگا۔ وہ مویشی چراتا اور فطرت کی سحر کاری سے مسحور ہوکر حسین مناظر میں حسین خواب دیکھا کرتا۔ یہی خواب اس کی کتابوں میں جواہر ریزے بن کر چمکے ہے"

ہیمسن ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا اور گھر پر اپنے پیشہ کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت تعلیم پاکر اپنے نصب العین کی بلندی اور رفعت کے خیال میں محو رہنے لگا۔ اتفاق سے اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جانے کا موقع مل گیا۔ لیکن وہاں کی مصروف زندگی میں ناکام رہ کر وہ پھر ناروے واپس آگیا۔ آسکو (دارالحکومت) میں چند ماہ بھوک اور فقر و فاقہ کی زندگی نے اس کے نظریہ حیات کو بے انتہا بلند کردیا اور یہی آلام مصائب اس کے عدیم النظیر شاہکار "بھوک" کو ۱۸۹۰ء میں منظر عام پر لانے کا باعث ہوئے۔ "بھوک" جیسے بلند پایہ ناول نے ہیمسن کو ادبیات ۔۔ میں نہ صرف روشناس کرایا بلکہ یکلخت اس کی شہرت و عظمت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ اس کے افسانوں ناولوں اور ڈراموں میں مرکزی کریکٹر ایک ایسا نوجوان ہوتا ہے جو منظم سوسائٹی کا مخالف بلکہ اس کا ایک فرد ہی نہیں ہوتا۔ یہی ہیرو پھر اس کے دو مشہور ناول "خانہ بدوش" اور "آخری مسرت" میں نمودار ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بجائے خود ایک ایکٹر ہونے کے زندگی میں صرف دنیا اور سوسائٹی کے نا منصفانہ اعمال کا ایک تماشہ بین ہے!

"زمین کی پیداوار" ۱۹۱۷ء میں شایع ہوئی اور اس میں دنیائے قدیم کا ایک فرد جو تمام انسانوں سے مساوات اور امن دوستی کا متوقع ہے اور خود بھی انھیں صفات کا حامل ہے پھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس کتاب چونکہ بزمانہ جنگ شایع ہوئی تھی اور امن و آشتی کی ایک روح اور سچا پیغام تھی اس لئے عامۃ الناس اور خواص میں وہ ایک عجیب جوش اور احساس امن پیدا کرنے میں ڈائنامیٹ ثابت ہوئی۔ اکثر ممالک نے جو جنگ میں شریک تھے "زمین کی پیداوار" کا داخلہ اپنے حدود میں ممنوع قرار دیدیا لیکن ۱۹۱۸ء میں جب ہر قوم صلح اور امن کی حامل اور حامی نظر آرہی تھی ہیمسن کی کتاب اپنی اصلی قدر و قیمت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور مصنف "نوبل پرائز" کا مستحق قرار دیا گیا!

ہیمسن کی شہرت کا زیادہ تر دار ناول نویسی اور افسانہ نگاری پر ہے لیکن اس نے بعض مرتبہ کامیاب تمثیل بھی لکھی ہے اور حدود شاعری میں بھی داخل ہونا چاہا ہے جس میں اس کی کامیابی چنداں قابل ذکر نہیں۔ مترجم]

ایک مرتبہ کسی دعوت کے موقع پر میں ایک خاتون سے ملا جو دیوانہ وار محبت میں گرفتار تھی اور اس کی آنکھوں میں باری باری سے ایک ہلکی نیلی اور چمکدار روشنی پیدا ہوتی تھی۔ یہ خاتون اپنے جذبات کو چھپانے میں بالکل ناکام تھی ۔۔ وہ کس سے محبت کررہی تھی؟ اس نوجوان سے جو سامنے کھڑکی

والے مکان میں رہتا تھا اور میزبان کا لڑکا تھا۔ ایک ایسا تنومند نوجوان۔ جس کی آواز میں شیر کی سی گرج تھی اور جو ہمیشہ ایک لباس میں ملبوس رہتا تھا۔

اسی رات کو جب ہم لوگ مکان جا رہے تھے۔ میں نے خاتون سے سلسلۂ گفتگو چھیڑتے ہوئے کہا کیونکہ میری اس سے بہت گہری ملاقات تھی

"کیسا حیرت انگیز موسم ہے؟ کیا تم نے یہ شام کافی دلچسپی سے نہیں گذاری؟"

اور یہ خیال کرکے کہ اس کی بھی یہی خواہش ہے میں نے پہلے منگنی کی انگشتری اپنی انگلی سے اتار لی۔ "کیا تم جانتی ہو؟" میں نے اس سے کہا "یہ انگوٹھی جو تم نے مجھے دی تھی اب بہت چھوٹی اور بہت تنگ ہو گئی ہے۔ میری انگلی میں نہیں آتی۔ کیا تم یہ خیال کرتی ہو کہ تم اس کو میری انگلی کیلئے ٹھیک کرا سکو گی؟"

اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا۔۔۔ "لاؤ! انگوٹھی مجھے دیدو میں اسے جلد درست کرانے کی کوشش کرونگی!"

اور میں نے انگوٹھی اسے دیدی۔

ایک مہینے کے بعد میں پھر اس خاتون سے ملا۔ میں اس سے انگوٹھی کی بابت پوچھنا چاہتا ہی تھا کہ کسی دوسرے خیال سے رک گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے اس کو تھوڑا سا موقع اور ملنا چاہئے ایک ماہ کی مدت بہت کم ہے!

خاتون ۔۔۔۔ سڑک کی سطح پر نظر جمائے رہی۔

"اوہ! ہاں!" اس نے کہا۔ "انگوٹھی! انگوٹھی بدشگونی کی علامت تھی، مجھے خوف ہے مگر اظہار کرنا ہی پڑتا ہے کہ میں اسے کہیں بھول گئی۔ وہ میرے پاس سے گم ہو گئی۔"

وہ میرے جواب کا انتظار کرتی رہی۔

"کیا تم مجھ سے خفا ہو؟" ۔۔۔ اس نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں!" میں نے جواب دیا۔

اور اُف! وہ کتنی پرسکون اور مسرور نظر آئی جب اس نے یہ معلوم کر لیا کہ میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔

پورا ایک سال گذر گیا۔ میں پھر ایک مرتبہ اپنے دوستوں میں اور پرانی جگہ پر واپس گیا اور جب ایک دن شام کو ایک بہت ہی مانوس راستہ پر چل رہا تھا تو میں نے خاتون کو اپنی طرف آتے دیکھا اس کی آنکھوں میں باری باری سے ایک ہلکی نیلی اور چمکدار روشنی پیدا ہو رہی تھی لیکن اس کا چہرہ زرد اور اداس ہو اتھا۔ ابھی وہ دور ہی تھی کہ اس نے مجھے سے پکار کر کہا۔

"یہ ہے تمہاری انگوٹھی ——— تمہاری منگنی کی انگوٹھی! ———

میں نے اسے ڈھونڈ لیا اور میرے پیارے میں نے اس کا حلقہ بھی بڑھا دیا اب کبھی تمہاری انگلی میں تنگ نہ ہوگی!"

محبت میں ناکام خاتون اور اُس کے مصیبت زدہ چہرے پر میں نے نگاہ ڈالی ——— اور پھر میں نے انگوٹھی کو دیکھا!

"افسوس!" میں نے معمول سے بہت زیادہ جھک کر کہا۔ "یہ انگوٹھی واقعی بدشگونی کی علامت ہے ——— اور اب یہ میری انگلی سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے!"

صہبائی۔ بی۔ اے (آنرز)

"آمدِ خورشید"

حضرت آزاد انصاری ،

غضب کی روشنی فطرت نے دی مہرِ درخشاں کو
کیا اک آن میں جس نے منور بزمِ امکاں کو

ہوئے ہیں جلوۂ خورشید سے ہر بام و در روشن
نہ چھوڑا اس نے تشنہ وادی و کوہ و بیاباں کو

کیا مزدور کو بیدار فرشِ خاک سے اس نے
جگایا ہل چلانے کیلئے درماندہ دہقاں کو

پڑے ہیں خوشنما شبنم کے موتی سبزہ و گل پر
نسیمِ صبح نے جنت بنا ڈالا گلستاں کو

وفورِ عیش سے ہر غنچہ و گل مستِ رنگینی
طرب اندوز جس نے کر دیا مرغِ خوش الحاں کو

ہوائے تازہ نے کیسی بہارِ تازہ بخشی ہے
پیامِ زندگی دیکر ہر اک قلبِ پریشاں کو

اُدھر مہرِ منور پردۂ تاریک سے نکلا
اِدھر پہونچی ضیا ، ہر ذرۂ خاکِ بیاباں کو

اُدھر روشن ہوا خورشید کی تنویر سے عالم
اِدھر جنبش ہوئی یکلخت تارِ بربطِ جاں کو

ادھر گلشن میں لی شاخِ شجر نے اُٹھکے انگڑائی
ادھر اک تازگی حاصل ہوئی قلبِ پریشاں کو

دُھلایا قطرۂ شبنم نے مُنہ ہر ایک غنچے کا
حیاتِ تازہ بخشی نوجوانانِ گلستاں کو

منادر سے صدائیں آئیں ناقوسِ برہمن کی
موذن کر چکا بیدار ہر مردِ مسلماں کو

خدائے پاک کے آگے کسی کا سر خمیدہ ہے
بچشمِ تر کوئی دھوتا ہے اپنے داغِ عصیاں کو

خدا کے روبرو آزاد تو بھی سرنگوں ہو جا
چھپائیگا کہاں تک یونہی اپنے دردِ پنہاں کو

میں اک ناکامِ الفت ہوں مری تائید کر یارب !
مجھے بھی ہمکنارِ جلوۂ خورشید کر یارب !

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۵

فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء

نمبر ۱۴

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۷ء اپنی فقید المثال خصوصیات کی بنا پر عدیم النظیر ہوگا!

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا

مُلاحظات!

ملاحظات ضرور ملاحظہ فرمائیے

اشاعت گزشتہ میں ہم نے اُردو کے موقت الشیوع رسائل وجرائد کے خاص نمبروں کے ادبی وفنی معیار کو بالتفصیل زیر بحث لاتے ہوئے عالمگیر کے پچھلے خاص نمبروں اور سالناموں کے متعلق ایک حقیقت غیر مستورہ وواضحہ کا اظہار کرکے دسمبر میں شایع ہونے والے مہتم بالشان خاص نمبر کے باب میں چند اشارات کئے تھے۔ دعویٰ کی وقعت وصداقت صرف اسی وقت دنیا پہ ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ مدعی کا ہر لفظ، ہر ایک فقرہ، ہر ایک اعلان عملی جامہ پہن لے۔ وہ دعویٰ جو عمل سے یکسر محروم ہو، دنیائے صداقت میں ذرہ بھر وقعت حاصل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا، اور رکھے بھی کیونکر؟ دنیا عمل چاہتی ہے، زبانی گفتگو نہیں، آپ اس معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہمارے پچھلے دعاوی وعزائم پر پھیلتی ہوئی نظر ڈالیں اور پھر ہمارے خاص نمبروں کو اپنی نظروں کے سامنے لائیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ اپنے خاص نمبروں کے باب میں ہمارا ہر ایک اعلان عمل کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دعاوی صداقت سے محروم نہیں سمجھے جاتے، اور ہر ایک شخص جس نے کبھی ہمارے کسی دعوی کو پڑھا ہے۔ قوت احساس کی پوری شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارا دعویٰ الفاظ کی رنگین وفریب کار دنیا سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور صرف عمل کی دنیا کو محیط ہے! ہم دو تین اشاعتوں سے بہانگ دہل اس چیز کا اعلان کر رہے ہیں کہ دسمبر میں شایع ہونے والا عالمگیر کا خاص نمبر دنیائے اردو کو چار چاند لگا دیگا۔ اور اپنے ہمعصروں کے سامنے خاص نمبر کا ایک خاص معیار پیش کریگا۔ آپ نے جب ہمارے پچھلے دعوی کو صداقت سے معمور پایا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس زیر ترتیب خاص نمبر ۱۹۳۷ء کے بارے میں ہمارے ہر ایک اعلان کو "اعلان صداقت" نہ سمجھا جائے۔ دنیا کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے کن کن دشوار تجربات، ہمت فرسا مراحل، ہمت شکن منازل کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہ چیز وہی شخص جان سکتا ہے جس نے دوسروں کے اعتماد کے حصول کیلئے امکانی کوششوں سے کام لے کر اس مرحلے کی تمام تلخیوں کو بخندہ پیشانی برداشت کیا ہو۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ عالمگیر کے قارئین کرام ہم پر کلی اعتماد رکھتے ہیں اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آج تک زندگی کی منزلیں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کر لی ہیں۔ ہم نے محبان عالمگیر کے ساتھ جو وعدہ کیا اسے پورا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کارپردازان عالمگیر، قارئین عالمگیر کے ساتھ اسی وقت وعدہ کرتے ہیں اور وہی وعدہ کرتے ہیں جسے وہ اپنے وقت مقررہ پر بطرز احسن پورا کر سکیں۔ ہم نے یہ بھی کبھی نہیں کیا کہ اعلان کر دیا کہ رسالہ جہازی سائز پر شایع ہوگا اور شایع ہو وہ معمولی سائز پر۔ یا یہ وعدہ کیا ہو کہ اس خاص نمبر میں اتنی باصرہ نواز سہ رنگی تصاویر شریک اشاعت ہونگی اور تصویریں مقررہ تعداد سے کم دیں۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ رسالہ کے صوری ومعنوی محاسن، ہمارے وعدوں اور دعووں سے بڑھ کر ظاہر ہوتے ہیں۔

ہم پھر اعلان کرتے ہیں کہ عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۷ء جس پہ ہماری تمام کوششیں مرکوز ہیں اُردو کی تمام خاص نمبروں اور سالناموں سے یقیناً بڑھ چڑھ کر شایع ہوگا!۔

ہمارے سامنے رسالے کو معیار کی انتہائی سطح پر پہنچانے کے واسطے ایک ایسی زبردست سکیم ایک ایسا مہتم بالشان لائحہ عمل ہے جس پر عمل کر کے ہم اپنی توقعات سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہونگے۔ یہ سکیم جہاں تک آپ کے علم کا تعلق ہے بالکل پردۂ اخفا میں ہے اور اسے پردۂ اخفا ہی میں رہنا چاہیئے کیونکہ ہم اس کا روشن ترین پہلو، جسے دنیا کی تمام زبانیں علمی پہلو کہتی ہیں، خاص نمبر کی صورت میں پیش کرینگے۔ آپ حسب معمول ہم پر اعتماد کیجیے اور ہمارے دعووں کو صداقت پر مبنی سمجھیے۔

ہمارا کام اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہے۔ آیئے ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ بغیر تعاون کے دنیا کا کوئی کام پوری کامیابی کے ساتھ پورا نہیں ہوا ہے۔ آپ اپنا کام کریں، ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ ہمارے اعلانات پر اعتماد کرنے کے ساتھ ہی عالمگیر کے محترم قارئین پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے حلقۂ احباب و اثر میں تا بحد امکان اپنے عالمگیر کی توسیع، اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں۔ عالمگیر کی یہ جائز مدد آپ کی اس پیاری اُردو زبان کی مدد کے مترادف ہے، جس کی تخریب کے لئے معاندین ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُردو کی اس آہنی دیوار کو چاٹ لینا کسی یاجوج و ماجوج کے بس کی بات نہیں۔

مضمون نگار حضرات سے گذارش

یہ ایک مسلّم امر ہے کہ جب رسالہ انتظار مضامین کی تلخیوں کو برداشت کر کے کتابت کے منازل طے کر چکتا ہے تو ہمارے محترم مضمون نگار ہاتھ میں قلم اٹھاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُردو کے عام رسالے وقت پر تو نکلتے نہیں اس لئے ایک دو ماہ پیشتر روانہ کرنے سے کیا فائدہ؟ مگر چونکہ عالمگیر پر بہت کم ایسے مواقع آئے ہوں کہ وہ بدیر نکلا ہو اس لئے مضمون نگار حضرات اس کی تاریخ اشاعت سے "بدگمان" نہیں ہیں۔ خاص نمبر کی کتابت کو شروع ہوئے ابھی چند دن گزرے ہیں مگر ہندوستان کی ہر سمت سے برابر مضامین دفتر میں موصول ہو رہے ہیں۔ اس جگہ ہمیں اپنے دیگر محترم مضمون نگاروں کی خدمت میں یہ گزارش کرنا ہے کہ وہ بھی نظر التفات سے کام لیں۔ اگر وہ مضامین جلد از جلد بھیج دینگے تو کارپردازان رسالہ کو خاص نمبر کی ترتیب و تدوین کے باب میں ان مشکلات و تکالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔ جو مضامین بدیر پہونچنے سے ایک ہجوم کی صورت میں نازل ہو جاتی ہیں، ہمیں امید واثق ہے کہ معزز و محترم مضمون نگار حضرات ہماری گذارش پر توجہ فرمائیں گے اور جلد اپنے گرانقدر مضامین بغرض اشاعت روانہ فرمائیں گے!

عالمگیر کی پالیسی

عالمگیر کو پڑھنے والے حضرات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہم نے کبھی اپنے کسی ہمعصر کے خلاف نہیں لکھا، اور نہ کبھی کوئی ایسا مضمون شایع کیا ہے، جس میں کسی رسالے یا کسی رسالے کے کسی مضمون نگار کے خلاف ایسی تنقید جو تخریبی پہلو لئے ہوئے ہو شایع کی ہو۔ اول تو ہم نے اپنے ہمعصروں کے خلاف کسی حالت میں بھی قلم اٹھانا پسند نہیں کیا اور جب کبھی کچھ لکھنے کی نوبت بھی آئی ہے تو صرف یہ چیز مدنظر رکھ کر کہ یہ مدافعانہ پہلو ہے اور مدافعانہ پہلو اختیار کرنا دنیائے اخلاقیات میں جائز ہے۔ مختصر یہ کہ ہم اپنے ہمعصروں کے خلاف لکھنا، معاصرانہ فرض سے بعید سمجھتے ہیں۔ ہماری یہ پالیسی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کے باوجود اکثر ہمارے مضمون نگار دفتر میں بغرض اشاعت ایسے مضامین روانہ فرماتے ہیں جن پر تخریبی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ہم ایسے مضامین کو ہرگز شایع کرنے کے واسطے تیار نہیں ہیں۔ ہم پھر اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہیں کہ عالمگیر میں تخریبی اور محض ذاتی عناد پر مبنی تنقیدیں کسی حالت میں بھی شایع نہیں ہو سکیں۔ اس لئے مضمون نگار ایسی تنقیدیں دفتر میں نہ بھیجا کریں کیونکہ ہم انہیں شایع نہ کرنے پر مجبور ہیں۔ یقین ہے ہمارے بعض مضمون نگاروں کی روش تبدیل ہو جائیگی۔

کوئی صاحب اس سے یہ نہ سمجھیں کہ ہم ادب کے ایک نہایت ضروری شعبے یعنی تنقید نگاری کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تنقید کو نہایت ہی ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ادب کا ایک نہایت ضروری اور اہم شعبہ مفقود ہو جاتا ہے۔ مگر وہ تنقید جو محض ذاتی عناد پر مبنی ہو کسی حالت میں بھی تنقید کہلانے کی حقدار نہیں ہے۔ ایسی تنقید سے ادب کو فائدہ پہونچنے کی بجائے نقصان پہونچتا ہے!

شمارۂ حاضرہ

میں تمام مضامین افادی حیثیت سے بہت کامیاب ہیں۔ ہمیں اس حقیقت صحیحہ کے اعلان میں تامل نہیں کہ عالمگیر کے مضامین حقیقی معنوں میں حیات آموز ہوتے ہیں۔

اس شمارہ میں حکیم قاآنی پر جو بلند پایہ مقالہ ہے وہ قارئین سے ضرور داد تحسین حاصل کریگا۔ اُردو میں ایسے بہت کم مضامین لکھے گئے ہیں جن میں دوسری زبانوں کے علما و مشاہیر ادب کی ذہنی کاوشوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہو حالانکہ اس چیز کی اشد ضرورت ہے۔ ہم صاحب مضمون

کے ممنون احسان ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آیندہ بھی اس قسم کے بلند پایہ مضامین عالمگیر کو مرحمت فرمائینگے۔ آپ بیتی چند خطوط کا مجموعہ ہے جو عورت کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی بہت کامیاب نفسیاتی تحلیل ہے جناب تمر ردولوی کا پہلا مضمون جو گست کے عالمگیر میں شایع ہو چکا ہے بہت مقبول ہوا ہے (Psychoanalysis) نفسیاتی تحلیل ایک نہایت دشوار اور مشکل منزل ہے اور ہر ایک مضمون نگار سے طے کرنے کی اپنے اندر صلاحیت نہیں رکھتا جناب تمر صاحب کو ہم ایسے بلند پایہ مضمون پر قابل مبارکباد سمجھتے ہیں

عالمگیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا حصہ نظم ہمیشہ بہت بلند رہا ہے ملک کے جلیل القدر شعرا ہمو عالمگیر کو نوازتے ہیں شمارہ حاضرہ ہی کو دیکھئے کن کن قابل فخر شعراء کا کلام درج ہے۔ ہم تمام شعرا کے ممنون احسان ہیں۔

شمارہ آئندہ (نومبر کے پرچہ) میں ہم خاص نمبر میں شایع ہونے والے چند مضامین کے عنوانات اور تصاویر کے نام درج کریں گے

(ادارہ)

علمی و ادبی جواہرات کا گراں بہا خزانہ!

عالمگیر کا

"خاص نمبر" سنہ ۱۹۳۷ء

گرانقدر مضامین، دلگداز افسانوں۔ باصرہ نواز تصویروں اور کیف بار نظموں کا بلند پایہ مجموعہ

سپہر علم و ادب کا یہ درخشاں ماہ تاباں افق صحافت پر دسمبر کے پہلے ہفتہ میں طلوع ہو کر شیدایان اردو علم ادب کے لئے سرور دل و خنکی چشم کا باعث ہوگا

سالانہ خریداروں کو حسب معمول بالکل مفت ملے گا!

عالمگیر بارہ تیرہ سال سے اردو علم و ادب کی مستقل و مسلسل خدمات انجام دے رہا ہے اور اپنے ناظرین کی خدمت میں دو بلند پایہ و ضخیم خاص نمبر (دسمبر، جون) مفت پیش کرتا ہے۔ اس کی خریداری قبول کرنا یقیناً آپ کا علمی و ادبی فرض ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ اس خوشگوار فرض کو جلد از جلد محسوس فرمائینگے

سالانہ چندہ صرف چار روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک ۔ نیاز مند منیجر "عالمگیر" لاہور

دیوارِ چین

جناب حکیم محمد ابراہیم صاحب۔ بھوپال اسٹیٹ

کچھ مدت گزری کہ ایک مضمون دیوارِ چین کے متعلق میں نے معزز رسالہ عالمگیر میں دیکھا تھا۔ لیکن اس مضمون میں تاریخی غلطیوں کے علاوہ دیوارِ ختا جس وجہ سے تمام عجائبات عالم پر فوقیت رکھتی ہے اور جس کی نظیر اگر دنیا میں ہو سکتی ہے تو صرف نہر خطا ہے اس پر صاحب مضمون نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ اس لئے میں اجمالاً دیوار و بانیٔ دیوار کے حالات پر روشنی ڈالتا ہوں۔

فغفور چینگ وائی سے پہلے خانوادے ملک ختا کے حکمران گزر چکے ہیں۔ چنانچہ ختائی مورخین کے نزدیک فغفوروں کا پہلا خانوادہ سانؔ ہوامؔ اور پہلا فغفور فوہی کے لقب سے ملقب تھا۔ اس خاندان میں ہزارہا سال حکمرانی رہی اور بہت سے فغفور گزر رہے۔ منجملہ آخری فغفور یاؤ تھا۔ جس کی تعریف ختائیوں میں یہاں تک ہے کہ جب کسی فغفور کی مدح میں ختائی شاعر مبالغہ کرتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے کہ تو مثل یاؤ کے ہے۔

یاؤ نے شنؔ نامی ایک گمنام شخص کو اس کی نیک طینتی کے باعث اپنا ولیعہد کیا۔ شن کے بعد حکومت ھیا کے گھرانے میں منتقل ہوئی اور پہلا فغفور یوء ہوا۔ یوء کے بعد اس کا لڑکا ٹی کی حضرت عیسٰی سے دو ہزار ایک سو ستانوے سال ما قبل مسند نشین ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۷ سال مسیح سے پہلے دولت خانوادہ ھیا۔ شانگ کے گھرانہ میں منتقل ہوئی۔ شانگ خاندان کے بعد سلطنت ختا خانوادہ چوؔ میں منتقل ہوئی۔ اسی خاندان میں لینگ وانگ تیئیسواں بادشاہ تھا اور اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں سید الحکماء ختا حکیم کنگ فوزی پانچ سو سال قبل مسیح پیدا ہوا۔

خاندان چوؔ کے زوال کے بعد چوسی انگ نے تخت ختا حاصل کیا چی وانگ ٹی بانیٔ دیوار ختا اسی چوسی انگ کا پرپوتا تھا جو حضرت مسیح سے دو سو پچاس سال پہلے سلطنت چین پر حکمران تھا۔ لیکن ختائی مورخین لکھتے ہیں کہ یہ اپنے باپ کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔

ممکن ہے کہ ختائیوں نے یہ فقرہ اس نفرت کے باعث وضع کیا ہو جو اس عہد کے علماء و حکماء کو فغفور کے ساتھ تھی اور جس کی وجہ سے علمائے ختا ہمیشہ اس فغفور پر ہزارہا لعنتیں بھیجتے تھے۔ حالانکہ اس بات پر مورخین متفق ہیں کہ اگرچہ بعض حرکات جو اس فغفور سے حالت غیض و غضب میں واقع ہوئیں خلاف عدل و رحم تھیں۔ تاہم یہ فغفور بڑے مرتبہ کا شخص تھا۔ دیوار ختا کے علاوہ اس نے چھ سو میل کی ایک سڑک تیر کے مانند سیدھی بنوائی۔ دونوں طرف درختان ثمر و سایہ دار لگائے گئے۔ آٹھ لاکھ مزدور اس کے سینتیس سالہ دور حکومت میں ہمیشہ ساخت مکانات و اصلاح دار السلطنت میں مصروف بکار رہے اور سوائے ارادہ زینت ملک و راحت رعایا و پرورش غربا کے دوسرا مقصد اس کے مدنظر نہ تھا اس لئے کہ خود مطلق عیش پسند و آرام طلب نہ تھا۔ نہ غذا و لباس میں کوئی تکلف تھا نہ ان بری خواہشوں میں مبتلا تھا جسے عوام عیش و عشرت سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ سخت جفاکش و بہادر و مدبر تھا اس درجہ کہ شاید ہی دو تین فغفور اس شخصیت و رتبہ کے ختا میں گزرے ہوں۔

علماء ختا کی عام ناراضی کا باعث یہ ہوا کہ حکیم کنگ فوزی نے سلطنت ختا کے لئے جو دستور العمل مرتب کیا تھا۔ تمام فغفورا اور رعیت ان دستوروں پر عمل پیرا تھی۔ ان قواعد میں ایک تو تعظیم و تکریم والدین پر بہت زور دیا گیا تھا۔ دوسرے حکیم موصوف نے غیر ملکیوں سے میل جول رکھنے اور ان کو ملک میں آنے دینے اور خرید و فروخت کا معاملہ کرنے کی سختی سے بندش کی تھی ان کے علاوہ اور بھی تنگ نظری کے احکام تھے۔

فغفور جینگ وانگ کی ماں بدچلن تھی اور ایک شخص سے جو خواجہ سرا کے بھیس میں تھا ملوث پائی گئی۔ اس لئے فغفور نے اپنی ماں کو انتہائی ذلت کے ساتھ حرم سرا سے نکلوا دیا۔ چونکہ حکیم کے احکام ابھی تازہ تھے تمام رعیت کو یہ سلوک ناگوار گزرا اور ایک دو علمائے خاص نے فغفور کو ملامت کی جس پر فغفور نے انھیں قتل کرا دیا۔ اس کے علاوہ فغفور چونکہ تنگ خیال نہ تھا بلکہ آزاد طبع و دور اندیش تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ مملکت ختا کا جدید اصول پر بند و بست کرے اور جو باتیں تنگ نظری کی ہیں ان سے سلطنت کو پاک کرے۔ چنانچہ اس نے ایک قابل و فاضل غیر ملکی شخص کو وزیر اعظم بنایا۔ غیر ملکی تاجروں کے امتناع کو محض بیجا اور موجب نقصان رعیت سمجھ کر بندرگاہوں کو تجارت کے لئے کھول دیا۔ چنانچہ اس کے عہد میں بنگالہ اور جزائر بحر شرق سے بڑے پیمانہ پر تجارت شروع ہو گئی۔ غرضکہ ابتدا میں بخلاف احکام حکیم کنگ فوزی جب کوئی حکم جاری ہوتا تو علما و حکما ختا شور مچا دیتے کہ فلاں بات یاؤ اور شن کے خلاف ہے۔ اور فلاں حکم کنگ فوزی دیوکے دستور آ کی توہین کرتا ہے۔ القصہ علما و حکما نے اس درجہ شور مچایا کہ ناچار بہت سے علما و حکما کو فغفور نے زندہ زمین میں گڑوا دیا۔ جس کی وجہ سے فغفور کا رعب و ہراس دلوں پر چھا گیا اور پھر کسی کو دم مارنے کی جرات نہ ہوئی۔ مگر یہ سیاست علما ختا کو ایسی بری معلوم ہوئی کہ چی وانگ ٹی اور شیطان میں انھوں نے کوئی فرق نہیں کیا اور ولد الزنا قرار دینے کے علاوہ ابلیس مجسم کا لقب دیا لیکن بنظر انصاف سے دیکھا جائے تو شور و غوغا فغفور کے تمرد اور خلاف رائے حکما قدیم کے کرنے سے علما نے شروع کیا تھا اگر زیادہ رہنے پاتا تو بادشاہ کو تخت خالی کرنا پڑتا یا اصلاح سے باز رہنا پڑتا۔ پس ایک امر میں خود اس کا ذاتی نقصان تھا اور دوسرے میں ملک و رعیت کا۔ اسی لئے اس نے ایسی سخت سزا دی کہ سب پر ہیبت چھا گئی۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ چی وانگ ٹی قتل ہوا البتہ یہ صحیح ہے کہ اپنی شجاعت کے باوصف موت سے لرزاں و ترساں تھا۔ عرصہ تک اکسیر بقا کی تلاش میں رہا لیکن جب مایوسی ہوئی اور اسی عرصہ میں ایک مقرب خاص نے فغفور کو پارہ سنگ دکھا کر کہا کہ چند معتبر لوگوں نے اسے آسمان سے گرتے دیکھا ہے اس بات کے سنتے ہی فغفور کے دل میں یہ وہم سما گیا کہ میرے مرنے کا وقت قریب ہے اور اس خیال سے اس کی طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ پھر کسی نے اُسے ہنستے نہیں دیکھا۔ اور اسی فکر و غم میں گھل گھل کر چند روز میں دو سو دس سال قبل مسیح مر گیا۔ [1]

دیوار ختا بنانے کی یہ وجہ ہوئی کہ اہالی ختا جب تاتار کی بار بار یورش سے عاجز آ گئے اور کوئی تدبیر یورش روکنے کی بن نہ پڑی تو فغفور نے ۲۱۴ سال قبل مسیح میں دیوار بنانی شروع کی۔ مملکت چین کی نصف آبادی مصروف کار رہی اور عرصہ قلیل یعنی پانچ سال میں یہ حیرت انگیز و عظیم الشان دیوار مع اپنے لاتعداد برج کے مکمل ہو گئی۔ دیوار مذکور کی حالت یہ ہے کہ پہاڑ، دریا، جھیل، سمندر کوئی شے بھی مانع تکمیل نہیں ہوئی تقریباً آٹھ سو کوس یعنی کچھ کم ۱۶۰۰ میل جو موانع سامنے آئے سب کو دفع کرتی ہوئی منزل مقصود تک پہونچ گئی۔ کئی مقامات پر ایک ایک میل بلند پہاڑوں کی چوٹی سے گزری ہے، بعض جگہ بڑے بڑے دریاؤں، جھیلوں پر پل باندھ کر ان پر سے گزر گئی ہے سب سے تعجب خیز یہ ہے کہ سمندر کے درمیان سے اس طرح نکالی گئی ہے کہ ہزاروں جہاز پتھروں سے بھر کر غرق کر دیئے گئے اور اس پر بنیاد قائم کی گئی آٹھ سو کوس طویل اور تیس گز بلند اور اس قدر چوڑی کہ چھ سوار پہلو بہ پہلو گھوڑے دوڑا کر گزر سکتے ہیں یہ دیوار ہے۔

سو سو گز کے فاصلے پر دو منزلہ اور پانچ پانچ سو گز کے فاصلہ پر سہ منزلہ برج اس دیوار میں بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ دولت تاتار یعنی خاندان مانچو جب تک مملکت چین کا مالک نہیں ہوا تھا ہزاروں توپیں ان برجوں پر چڑھی رہتی تھیں اور دس لاکھ فوج تقسیم تھی۔ دیوار کی ساخت میں جو حکمت و قدرت و استقلال معماران ختا سے ظاہر ہوا ہے فی الواقع حیرت انگیز ہے چنانچہ بڑے بڑے پتھر ایک میل کے بلند و سیدھے پہاڑوں پر جہاں چڑھنے کا کوئی سہارا نظر نہیں آتا اور کراروں کی بلندی و کٹاؤ ایسا ہے کہ انسان کا چڑھنا قطعی ناممکن ہے چڑھائے گئے ہیں۔ سمندر میں جہاں اگرچہ گہرائی کم لیکن جوش و خروش بہت زیادہ ہے وہاں ایسی مضبوط بنیاد ڈالی گئی ہے کہ دو ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزرنے پر بھی بنیادوں کو جنبش تک نہیں ہوئی ختا کے سمندر میں سالانہ دس بیس مرتبہ اس زور و شور سے طوفان اٹھتا ہے کہ ایک انگریز ناخدا اور بڑے تجربہ کار کا بیان ہے کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ ایک

---

[1] صفحہ ۶۳ باب پنجم دفتر اول جلد ۲ تاریخ مصنفہ جیمز کارکرن مطبوعہ ۱۸۵۲ء مطبع پادری طامس صاحب کلکتہ۔

جہاز پر دس ہزار قرنائیں ونقارے دفعتہً بجائے جائیں تو اس جہاز کے پتوار پر بجز طوفان کے شور وغل کے قرناؤں اور نقاروں کی آواز کو کوئی نہیں سن سکتا!

دیوار مذکور کی عظمت کا کسی قدر اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ایک انگریز سیاح نے جو علم ریاضی کا ماہر اور اہندسس تھا حساب لگا کر یہ تخمینہ بیان کیا کہ دیوار ختا کے فقط برجوں ہی میں اس قدر اسباب تعمیر صرف ہوا ہے کہ تمام انگلستان کی ہر طرح کی عمارتوں پر جو کچھ خرچ ہوا ہے شاید اس کے مقابلے میں بہت کم نکلے گا۔ پس غور فرمائیے کہ جس قدر دولت کثیر اس دیوار پر صرف ہوئی ہوگی اس کا کیا ٹھکانہ ہے! [۱]

[۱] صفحہ ۴۰۰ باب ۱۴ فقرہ ۲ جلد اول مطبوعہ ۱۸۴۸ء مطبع منذکرہ حاشیہ نمبرا

حکیم محمد ابراہیم، بھوپال

تین خواب!

بچپن

میری پیاری اماں! مجھے اولیں پیار کر لو!
صبح کی رنگین شفق میں میرے نظام کی
تکمیل ہو رہی ہے
میں اپنے ننھے سینہ میں دنیا کا راز لیکر آیا ہوں
جس کی آتش سے میرا دل سلگ رہا ہے! —
جس کی شدت سے میں چلا رہا ہوں! —
جس کی رنگینی میں میری امیدیں نہاں ہیں!
میری پیاری اماں! مجھے اولیں پیار کر لو!
میں دنیا کو لطیف اور پاکیزہ سمجھ کر آیا ہوں!
میں زندگی کو وسیع اور رنگین سمجھ چکا ہوں! —
میں ہر انسان کو دوست سمجھ رہا ہوں —!
میری اماں! مجھے اولیں پیار کر لو —
میں اپنے مہمانوں کے لئے
خوشی کا
چراغ ہوں!

جوانی

میری پیاری اماں! مجھے آخری پیار کر لو!
دوپہر کی کڑکڑاتی دھوپ میں میرے نظام
کی تکمیل ہو رہی ہے
میں زندگی کی لامتناہی جنگ میں جا
رہا ہوں
میرے نغموں میں ابدی مستی ہے!
میرے افسانوں میں آتش موجزن ہے!
میری پیاری اماں! مجھے آخری پیار کر لو،
میری آنکھوں سے نیند غایب ہو رہی ہے
میرے لئے زندگی "حسن و عشق" کا ایک طویل
افسانہ ہے
ظالم کیوپڈ کا تیر میرے سینے میں لگ چکا ہے
میری اماں! مجھے آخری پیار کر لو —!
میں اپنے مہمانوں کیلئے متاع محبت
جمع کرنے جا رہا ہوں!

بڑھاپا

رات کی تاریکیوں میں میرے نظام کی تکمیل ہو چکی ہے
میری آنکھوں سے رنگین نظارے ختم ہو چکے ہیں
رو رہا ہوں — زندگی تباہ کن پریشانی ہے
میری روح میں جوش نہیں... میرے افسانوں
میں آتش نہیں!
موت کے پردار فرشتے کی رتھ کی
آواز
میرے کانوں میں آ رہی ہے!
وہ میری طرف آ رہا ہے!
میرے ہاتھوں پر سکتہ ہے!
میرے نغمے ختم ہو چکے ہیں میرے ضعیف
ہاتھوں میں ٹوٹی ہوئی ستار ہے جس میں ٹوٹے ہوئے
نغمے تڑپ رہے ہیں۔
آ — موت کے پردار فرشتے میں
تمہارا منتظر ہوں!

امین حزیں

[illegible]

تخیلاتِ عالیہ!

معلی القاب عالیجناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر دام اقبالہ پائیگاہ

بتوں نے چاہنے والوں کو خوار ہی رکھا
خراب و خستہ و زار و نزار ہی رکھا

تمام عمر رہے ہم اسیرِ دامِ بلا
خیالِ کاکلِ پیچاں نے زار ہی رکھا

وفا کیا نہ کبھی تم نے وعدۂ فردا
ہمیشہ محوِ غمِ انتظار ہی رکھا

ملا کئے وہ رقیبوں سے صاف دل ہوکر
مگر ہماری طرف سے غبار ہی رکھا

تصوّرِ نگہِ مستِ یار کے صدقے
سُرور میں صفتِ بادہ خوار ہی رکھا

گراں تھی دل پہ جو تکلیف دستِ وحشت کی
تو ہم نے جامۂ ہستی اُتار ہی رکھا

خوشی کے دن نہ دکھائے کبھی مقدّر نے
ہمیشہ صرفِ غمِ روزگار ہی رکھا

نہ تو نے چین سے رہنے دیا کبھی اے دل
تمام عمر مجھے بیقرار ہی رکھا

مٹی بہار نہ گلہائے داغ کی دم بھر
جنوں نے سینہ مرا لالہ زار ہی رکھا

خیالِ نرگسِ مخمور میں ترے قرباں
نہ مست ہی نہ مجھے ہوشیار ہی رکھا

معیںؔ بڑھا کے گھٹانے کی خو نہیں اپنی
دیا عروج جسے، باوقار ہی رکھا

مجتہد الشعرا حکیم قاآنی اور اُس کے ممدوحین

سنہ ۱۸۰۷ء تا سنہ ۱۸۵۳ء

از مولانا صہبائی بی۔ اے (آنرز)

ایران کے مشہور زمانہ ادیب اور شاعر حکیم قاآنی کا اصل نام مرزا حبیب اللہ تھا۔ قاآنی کے متعلق بالاتفاق یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ عہد جدیہ کے فارسی شعرا میں اس کا درجہ افضلیت رکھتا ہے۔ قاآنی مرزا عبدالحسین متخلص بہ گلشن کا لڑکا تھا۔ سنہ ۱۸۰۷ء یا سنہ ۱۸۰۸ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ سات سال کی عمر تک تو وہ شیراز ہی میں ابتدائی تعلیم پاتا رہا لیکن آٹھویں سال مشہد چلا گیا اور السنہ قدیم و مختلف علوم کی تحصیل میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس کی شہرت بحیثیت ایک نوخیز شاعر کے دور و نزدیک تک پہونچ گئی۔ فن شاعری میں اس کی حیرت انگیز مہارت اور اس کے کلام کی نفاست نے مرزا حسن علی شجاع الدولہ یا شجاع السلطنتہ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ قاآنی کچھ دنو اپنے سرپرست کے دربار میں رہا جو اس کے فیض صحبت سے مستفیض ہوتا رہا، اور کچھ عرصے کے بعد اسے اپنے باپ فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں بھیجدیا۔ اس بادشاہ نے جو علم و فضل اور شاعری کا دلدادہ تھا قاآنی کی بڑی عزت و عظمت کی اور نہ صرف بیش بہا انعامات اور خلعتہائے فاخرہ سے اس کو نوازا بلکہ مجتہد الشعرا کے لقب سے بھی سرفراز کیا۔

اسی کے بعد ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد حکومت میں اس کو ملک الشعرا کا خطاب مرزا علی قلی کی کوششوں سے حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ اس وقت دربار ایران کے شعرا کا ممتاز ترین خطاب تھا۔ مرزا علی قلی اس زمانہ میں سلطنت کا وزیر اعظم اور کل سیاہ و سفید کا مختار تھا۔ خود بھی ایک فاضل تھا اور شعر و شاعری سے کمال شغف رکھتا تھا۔ اس کی سرپرستی نے قاآنی کا حوصلہ بہت بلند کردیا اور آج دنیا کے سامنے قاآنی کی شاعری فارسی شاعری کی روح رواں سمجھی جاتی ہے۔

قاآنی نے شعر و سخن کی مشق کے ساتھ ساتھ علوم السنہ کا مطالعہ بھی نہ چھوڑا چنانچہ وہ نہ صرف شاعری کی تمام اصناف پر کمال قدرت رکھتا تھا بلکہ ایک متبحر زباندان بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان اور جرمن زبان میں پورا پورا ملکہ رکھتا تھا۔ اور اس کے طرز ادا اور خیالات سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کہیں کہیں فکر مغرب سے استفادہ کیا ہے۔ فارسی شاعری میں اس کا انداز نہ صرف الفاظ اور حسن تخیل پر ہی دلالت کرتا ہے بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ زبان پر اسے پوری پوری قدرت حاصل تھی۔ جو اس کے معاصرین میں سے کسی کو حاصل نہ ہوسکی۔

افسوس ہے کہ عمر نے مشرق کے اس بلند پایہ مفکر اور شاعر کے ساتھ وفا نہ کی اور صرف ۴۷ سال کی عمر میں یہ سنہ ۱۲۷۰ھ مطابق سنہ ۱۸۵۳ء میں وہ اس مادی قید و بند سے آزاد ہوگیا۔

قاآنی کی تصانیف

قاآنی نے ایک دیوان کے علاوہ نثر میں بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور "کتاب بار" اور "پریشان حکیم قاآنی" ہیں۔ آخر الذکر کتاب نثر میں گلستان سعدی کے طرز میں لکھی گئی ہے جس میں تقریباً ۱۱۴ حکایات پند و نصائح اور اقوال موجود ہیں۔ اس کتاب میں خود نوشتہ سوانح کی جھلک بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ کلیات قاآنی میں تقریباً سات ہزار ہیں۔ ان میں قصاید، قطعات، غزلیات، ترکیبات اور چند مثنویاں بھی شامل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاآنی کی مہارت فن خصوصیت کے ساتھ قصائد میں دیکھی گئی ہے اور یہی اس کی دوامی شہرت کا سبب ہوئے ہیں۔

طرز کلام

قصیدوں میں قاآنی نے گوناگوں علمیت اور ہر قسم کی قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ بعض بعض قصیدوں میں تو دو دو سو اشعار

سے بھی زیادہ ہیں، عرفی کے بعد قاآنی کے سوا کسی فارسی شاعر کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہوا کہ نئی نئی ترکیبات اور شاعرانہ اصطلاحات کی اختراع کرے۔ چنانچہ قاآنی کی شاعری کے بعض بعض شارحین نے ان اصطلاحات کی ایک فہرست تیار کی ہے جس کو دیکھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بغیر اس سے استصواب کئے قاآنی کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔

ایک قصیدہ گو کی حیثیت سے قاآنی کا مرتبہ کسی طرح انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی، عنصری اور فرخی سے کم نہیں ہو سکتا۔ تخیل کی رفعت اور بحر و قوافی کے استعمال میں جدت اس کا امتیازی حصہ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ قاآنی نے انتہائی کوشش اور سعی بلیغ سے فارسی کی صحیح شاعری اور زبان کی سلاست و نفاست کو زندہ کر دیا ہے اور اس اعتبار سے اسے فردوسی اور نظامی گنجوی کا قائم مقام کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ طرز ادا میں بھی قاآنی خود اپنی نظیر ہے۔ زبان جو وہ استعمال کرتا ہے روانی میں آب رواں سے کم نہیں کہی جا سکتی اور بیان اس کا خاص حصہ ہے، غرض یہ کہ سلاست، صفائی، نفاست الفاظ اور شیرینی زبان، طرز ادا کی خوبی، قوت بیان اور بحر کا ترنم یہ سب ایسی خصوصیات ہیں کہ سننے والوں اور پڑھنے والوں پر فوری اثر ہوتا ہے۔ اور ایک بیخودی و کیف سا طاری ہو جاتا ہے۔

قاآنی نے جہاں شعر کی ان خصوصیات کو فن کے اعتبار سے برقرار رکھا، وہیں زبان کی خصوصیات کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مناظر قدرت، موسم بہار کی رنگینیاں، خزاں کی تباہ کاریاں، دن اور رات کا سماں، موسموں کی تبدیلیاں اونٹ، گھوڑے، عمارات، رسوم اور تیوہار، نوروز اور عید کے جزئیات اور تفصیلات کے اظہار میں وہ فارسی شعرا کی طرح ایک ندرت پیدا کر دینے میں ید طولیٰ رکھتا ہے اور کسی طرح فرخی، منوچہری اور حکیم سنائی سے کمتر شمار نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً فرخی کا رنگ قدیم شعرا میں سب سے اس کے اشعار و قصائد میں کافی نمایاں ہے۔

السنہ مشرق پر عبور

قاآنی اپنی شاعری کے دوران میں فارسی، عربی اور ترکی کا کافی مظاہرہ کرتا ہے جس سے اس کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اسے فرانسیسی اور جرمن کے علاوہ ان مشرقی زبانوں پر بھی انتہائی عبور تھا۔ ایک فارسی کے شاعر کے لئے ندرت تخیل اس زمانہ میں جتنی ضروری چیز ہو سکتی تھی، قاآنی نے اپنی شاعری میں اس کا خاتمہ کر دیا اور اس کی شاعری اور تخیل اور جدت کی رنگینیوں سے مالامال تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ قاآنی ہجو کا بھی مالک تھا۔ اس کے کلام میں اکثر تلخی زبان، دھمکیاں اور سخت الفاظ کی جھلک موجود ہے۔ خصوصاً جس جگہ وہ اپنے مقصد میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکا ہے، اس نے ہجو کا بے محابا استعمال کیا ہے اور متعدد فارسی شعراء کی طرح جس میں انوری کا درجہ اول ہے اس نے ہجو کو ذریعہ کامیابی بنایا ہے۔

قاآنی نے قصائد کو چند در چند بحور اور زمینوں میں استعمال کیا ہے، اور اس اعتبار سے اس کو خاقانی کا ایک قریبی پیرو سمجھنا چاہئے، جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا، قاآنی جدت خیال کا حد سے زیادہ شائق تھا۔ رفعت تخیل کی یہ فراوانی اس میں مطالعہ فطرت اور خصوصاً فرانسیسی شاعری کے استفادہ سے پیدا ہوئی تھی یہی امتیاز انگریز شاعروں میں لارڈ ٹینی سن کو بھی حاصل تھا اور قاآنی کی شاعری کا اس سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

قاآنی نے شاہی دربار داری کے نقشے حسین اور بہت ہی رنگین الفاظ میں کھینچے ہیں، اسی کے ساتھ معاشرتی حالت، اپنے زمانے کے رسم و رواج اور اپنے ملک کی حالت بھی بتائی ہے۔ دوسرے قصیدہ گو شعراء کے مانند اپنے مربی اور ممدوح کی صفت و ثنا میں قاآنی نے اپنے پیشرو اور متقدمین سے ذرا ہٹ کر ایک جدید طریقہ اختیار کیا ہے یعنی قصیدہ کے آغاز میں عموماً تشبیب کو نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن چند قصیدے جن میں اس نے حسب دستور پہلے تشبیب لکھی ہے، ان میں حصہ تشبیب کو تغزل کی ایک عمدہ مثال اور نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ قاآنی اکثر خود ستائی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے ؎

چون من پس از وصال نیابی کس
صد بار گر بکاوی تو ایران را

پروفیسر براؤن کی رائے

مشہور مستشرق پروفیسر براؤن کی رائے قاآنی کے متعلق بہت مستند سمجھی گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"قاآنی فارسی شعراء میں سب سے زیادہ خوشگو ہے اور زبان پر کامل عبور رکھتا ہے، لیکن اس کی شاعری میں بلند نصب العین اور اعلیٰ اصول موجود نہیں ہیں۔ نہ صرف وہ بڑے اور صاحب اقتدار لوگوں اور ہستیوں کی خوشامد میں حد سے زیادہ گذر گیا ہے بلکہ ضرورت اور نفع مطلب کیلئے وہ نہایت قابل اعتراض ہجو

اور رکیک الفاظ کے استعمال سے بھی نہیں چوکتا، چنانچہ اپنے متعدد قصائد میں اس نے حاجی مرزا آقاسی، وزیر اعظم ایران کی صفات جلیلہ کا اظہار بڑی ہی شد و مد سے کیا ہے۔ لیکن ایک قصیدہ میں جو اس کے جانشین کی شان میں لکھا گیا ہے وہ لکھتا ہے ؎

بجائے ظالم شقی نشستہ عادل تقی
کہ مومنان متقی کنند افتخار ہا

ہجو گوئی کی مثال ذیل کے اشعار میں عمدہ نظر آتی ہے ؎

خنداں خنداں دو دیدہ پیشش من آمد — دوخت دو لب بر لبم کہ بوسہ زن ہا
الحق بشرم آدم بدیں لب شکر — بوسہ زدن بر لبے چو لالۂ حمرا
گفتمش اے ترک ترک ایں سخناں کجا — بس کن از یں غمزہ و رمز و عشوہ و ایما

یہ ممکن ہے کہ اس نوعیت کا تخیل قاآنی نے فرانسیسی شاعری سے استعارہ کیا ہو ——!

عہد قاچاریہ کے بیشمار شعراء کی طرح قاآنی بھی قصیدہ گوئی کا حاکم تھا لیکن اس نے مسمط اور ترکیب بند میں بھی کمال فن کا اظہار کیا ہے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ بحروں کے استعمال میں قاآنی ایک موجد کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ مندرجہ ذیل بحر قاآنی سے پہلے غالباً ایک دو متقدمین کے سوا کسی نے استعمال نہیں کی ؎

مارک راحت رند و مژدہ گو — شوخ و دلبر او خوب و خوشتریں

مرزا تقی خاں اور ام الملک ملکہ کی شان میں قاآنی کے بعض قصائد عمر بھر فارسی زبان اور ادبیات سے خارج نہ کئے جاسکینگے، قاآنی کی یہ خصوصیت بھی قابل اظہار ہے کہ وہ پیشرو شعرا کی طرح تخیل کی گہرائیوں میں الجھکر ابہام کی حد تک کبھی نہیں پہونچتا، وہ اس کو ترجیح دیتا ہے کہ اپنی تلمیحات کا منبع، مانوس رسوم اور عام مشاہدات کو بنائے۔ نوروز فارسی شعراء کے لئے اظہار قابلیت میں سب سے بڑا موضوع رہا ہے۔ قاآنی جب نوروز کا نقشہ کسی قصیدہ کی تشبیب میں کھینچتا ہے تو اس کی تشبیہات ہمیشہ عام زندگی اور رسوم سے ماخوذ ہوتی ہیں مثلاً

عید شد ساقی بیا در گردش آور جام را — پشت پا زن دور چرخ و گردش ایام را
سین ساغر بس بود اے ترک مارا روز عید — گو نباشد ہفت سین رندان دُر آشام را

ایران میں یہ پرانا رواج ہے کہ "نوروز" کے دن سات ایسی چیزیں جمع کر کے بطور تحفہ دی جاتی ہیں جو حرف "س" سے شروع ہوں اور عموماً ان میں یہ سات چیزیں ہوتی ہیں۔ ۱۔ سنبل ۲۔ سیب ۳۔ سوسن ۴۔ سیم ۵۔ سرکہ ۶۔ سیر ۷۔ سپند، ہفت سین کا حوالہ انھیں مندرجہ چیزوں سے مراد ہے۔

قاآنی کے ممدوحین۔

۱۔ حضرت علی موسیٰ الرضا علیہ السلام

فرقہ شیعہ کے آٹھویں امام تھے۔ ان کا مزار مشہد میں ہے۔ اور ہر سال ہندوستان، افغانستان اور ایران کے ہزاروں زائرین وہاں جاتے ہیں، جس کے بعد انھیں مشہدی کا لقب مل جاتا ہے۔ اور یہ لقب شیعوں میں ایک خصوصی امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ حاجی اسد اللہ خاں

یہ ایک ترکمان سردار تھا اور قبیلہ قاچار سے تعلق رکھتا تھا۔ ناصر الدین شاہ کے عہد حکومت میں اس کو کافی رسوخ حاصل تھا۔

۳۔ فتح علی شاہ قاچار

فتح علی شاہ قاچار تخت ایران پر ۱۷۹۶ء میں آغا محمد خاں کے بعد سریر آرائے حکومت ہوا اُس کو ادبیات سے کافی ذوق تھا۔ خود بھی شعر کہتا تھا اور اچھا کہہ لیتا تھا۔ شعراء و ادبا کی صحبت سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ اور ہر نوع ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس بادشاہ نے تخت ایران پر تقریباً چالیس سال حکومت کی اور ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔ یہ اسی بادشاہ کا عہد حکومت تھا جس میں سر جان مالکم اپنی عظیم الشان سفارت لیکر ۱۸۰۰ء میں حسب الحکم لارڈ ولزلی ایران پہونچا تھا۔

۴۔ عباس مرزا

یہ فتح علی شاہ قاچار کا لڑکا تھا۔ ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۳ء میں باپ سے ایک سال پہلے چل بسا۔ فتح علی شاہ کے ولیعہد کی حیثیت سے اس کو آذر بائیجان کی حکومت سپرد کی گئی تھی۔ روس و ایران اور ایران و ترکی کی سرحد پر بھی حفاظت کیلئے اسی شہزادہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں زار کی دست درازیوں سے ایران کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ لیکن ایران میں اس کی موت ایک عظیم قومی صدمہ کے مترادف سمجھی گئی تھی۔

۵۔ حسن علی مرزا

یہ بھی فتح علی شاہ کا بیٹا تھا، جس کو شیراز کی گورنری دی گئی تھی۔

۶۔ ناصرالدین شاہ

ناصرالدین شاہ، فتح علی شاہ کا سب سے بڑا پوتا اور محمد خاں فتح علی شاہ کے بڑے بیٹے کا لڑکا تھا۔ ناصرالدین شاہ تخت ایران پر ۱۸۴۸ء میں اپنے باپ کی وفات پر بیٹھا، اس وقت اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی، جب یہ ولیعہد تھا، تو حسب دستور آذر بائیجان کا گورنر تھا۔ اپنے طویل عہد حکومت میں اس نے دو بار یورپ کا سفر کیا اور خزانہ ایران پر اتنا بار پڑا کہ ملک بالکل مفلس ہوگیا۔ یہ ایک مطلق العنان اور مغربی معاشرت کا دلدادہ اور عیش و عشرت کا بندہ، بادشاہ تھا خصوصاً فرانسیسی ادبیات اور فیشن اس کی نظر میں بے انتہا مقبول ہوئے تھے۔ اور اسی کے عہد حکومت میں سینکڑوں کتابیں فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں، وہ ایک عمدہ شاعر بھی تھا اور بادقات فرصت اس کا مشغلہ "شعر و شراب اور عورت" کے سوا کچھ نہ تھا۔ بابی تحریک ایران کے اندر اسی کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔ چھرے کی بندوق سے اس پر ایک مرتبہ فائر بھی ہوا، اور یہی چیز بابیوں پر مظالم اور تشدد کے آغاز کا باعث ہوئی جس سے تحریک بابیان کو اور تقویت ملتی گئی، یہاں تک کہ ناصرالدین شاہ عبدالعزیز کے مزار کی زیارت سے واپس ہوتے ہوئے ایک ایرانی بابی کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ قاآنی نے بھی اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں وفات پائی،

۷۔ مرزا تقی خاں،

امیر نظام مرزا تقی خاں ناصرالدین شاہ کی تخت نشینی کے کچھ دن بعد ہی وزیر مقرر ہوا۔ امیر نظام کی پیدائش ایک معمولی گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ ایک باورچی تھا جو تھوڑے دن کے بعد قائم مقام محمد شاہ کے وزیر اول کا خانگی منتظم مقرر ہوگیا۔ اس کا لڑکا تقی خاں سپہ سالار ایران کی ملازمت میں داخل ہوگیا اور اس کے بعد خسرو مرزا کا ایلچی بن کر خود سپہ سالار کے لباس میں سینٹ پیٹرز برگ (لینن گراڈ) زار کے دربار میں پہونچا۔ وہاں خدمت خاطر خواہ انجام دینے کے صلہ میں اس کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ آذربائیجان میں وہ فوجی وزیر مقرر کر دیا گیا۔

مرزا تقی کا سب سے بلند اور آخری عہدہ ولیعہد سلطنت کا وزیر اعظم مقرر ہونا تھا، اس نے اپنے معاصرین کے رشک و حسد سے بچنے کیلئے "صدر اعظم" کے خطاب کو جو آذربائیجان کی حکومت کا سب سے بڑا خطاب تھا، قبول کرنے سے انکار کر دیا اور "امیر نظم" کا لقب اختیار کیا۔ اپنے بلند اخلاق اور روشن ضمیری کی بدولت، ایران میں اس امیر کو ایک لازوال شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔

اس نے نظم حکومت کی اکثر خرابیاں اپنی فطری صلاحیت اور لیاقت سے دور کیں۔ صوبہ داریوں اور دیگر ملازمتوں کی فروخت کا طریقہ بالکل مسدود کر دیا اسی طرح پنشن کی بڑی بڑی رقوم جو نااہل اشخاص کو دی جاتی تھیں ایک لخت موقوف کر دیں، فوج کی تکلیفات اور افسروں کی چیرہ دستیوں کا جیسا سدباب اس مدبر نے کیا وہ عہد قاچار کا سب سے بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا رہیگا۔ ان تمام اصلاحات اور تبدیلیوں کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ملک کے وزیر نظم حکومت میں سے نااہل افراد کا ایک بڑا گروہ اس کا جانی دشمن ہوگیا۔ انھیں میں ام الملک ملکہ ایران بھی تھی۔ جس کا اخلاقی اثر ملک پر اب تک کافی موجود تھا۔ ناصرالدین شاہ پہلے تو اس کا کافی معتقد اور مداح رہا، یہاں تک کہ اپنی بہن سے اس کا عقد کر دیا لیکن ۱۸۵۱ء میں اس کے مرتبہ و عزت کو زوال آگیا۔ اس کو مقید کر لیا گیا اور دوسرے ہی سال قتل کر دیا گیا۔

۸۔ منوچہر خاں معتمدالدولہ

یہ شاہ محمد شاہ قاچار کا بڑا چہیتا اور یار غار تھا۔ جس کے عہد حکومت میں اسے شیراز کی صوبہ داری پر مامور کیا گیا تھا۔ شہزادہ فریدون مرزا کی سازش سے اس کا ستارہ عروج بھی زوال پذیر ہوگیا۔ اور فریدوں مرزا اس کی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

۹۔ حاجی مرزا عکسی،

حاجی مرزا عکسی بھی محمد شاہ کا وزیر اعظم تھا۔ قائم مقام کے بعد اسے یہ درجہ حاصل ہوا تھا جسے بادشاہ نے اپنے مواجہ میں پھانسی دلوا کر ختم کرا دیا تھا۔ وہ جرجان کا باشندہ تھا۔ اپنے حجاز کے سفروں میں اس درجہ استعداد بہم پہونچائی تھی، کہ تبریز واپسی پر اسے عباس مرزا کے لڑکوں کی معلمی کیلئے منتخب کر لیا گیا۔ مرزا عکسی کو نجوم، رمل اور علم ہندسہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ چنانچہ فتح علی شاہ، قاچار کے عہد حکومت ہی میں اس نے پیشین گوئی کی تھی، کہ محمد شاہ ایک دن سلطنت ایران کا صدر ہوگا۔ لیکن اپنے اس تبحر علمی کے باوجود وہ ایک لائق مدبر اور وکیل سلطنت بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ وہ ہمیشہ ہمسایہ حکومتوں کے مقاصد اور تحریکات کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا اور کبھی کسی صلحنامے اور معاہدے کی تکمیل پر آمادہ نہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علم سیاست اور پولیٹکل اکانومی سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ چنانچہ اکثر ایسے معاہدے جو خود دولت ایران کے حق میں بدرجہ غایت مفید ثابت ہوتے۔ اس کوتہ اندیش اور تنگ نظر مدبر کی

کی وجہ سے معرضِ وجود میں نہ آسکے۔

مرزا عکسی کا ایک ناعاقبت اندیشانہ قدم یہ تھا کہ افغانستان کو فتح کرنے کیلئے ایک فوج اس کے حکم سے روانہ کی گئی اور پوری فوج کو صرف ایک سرحدی قلعہ کا محاصرہ کرنے کے بعد واپس بلا لیا گیا۔ اس کے عہد حکومت میں کچھ توجہ ریشم کے کیڑوں اور شہتوت کی پیداوار کے لئے کی گئی، اور یقیناً ریشم کی صنعت کا ایران میں اس کے زمانہ سے ہی ایک قومی صنعت کی شکل میں آغاز ہوا۔ اس نے دریائے "کرج" کا راستہ بھی موڑ کر طہران سے گذارا تاکہ شہر میں آب رسانی کی آسانی ہوسکے۔

ناصر الدین شاہ کے تخت نشین ہونے پر مرزا عکسی کے دشمنوں کو موقع ملا اور درباریوں کے ایک بڑے اور با اثر گروپ نے کھلم کھلا اس کی برخواستگی کا مطالبہ کیا۔ ۱۸۴۹ء میں بالآخر بادشاہ نے مرزا عکسی سے قلمدان وزارت لیکر مرزا تقی خاں کے حوالہ کیا اور مرزا عکسی کو مقید کرنا چاہا لیکن مرزا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا، بقیہ حصہ عمر مزار عبد العزیز پر پناہ گزیں رہا۔ اور اسی جگہ اس نے وفات پائی۔ ——— !

"موت اور انسان"

رابرٹ براؤننگ کی مشہور آفاق نظم "پراسپس" کا ترجمہ

از:۔ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی،

آہ! .... کیا میں موت سے ڈروں؟ کیا میں یک بہادر انسان کی طرح اس کا مقابلہ نہ کروں؟ جبکہ موت ...... اپنی بھیانک صورت .... دکھلا کر مجھے ڈرا رہی ہے؟ آہ! ..... اب میری روح آخری ہچکی کے لئے بیچین ہے ... میری پیشانی پر پے در پے موت کا پسینہ آرہا ہے .... میرا بدن برف کی مانند ٹھنڈا ہو رہا ہے، موت ..... آہ ظالم موت ..... میرے سر پر منڈلا رہی ہے، کیا اس وقت میں ایک بہادر انسان ہوتے ہوئے اپنی بزدلی اور کم ہمتی کا ثبوت دوں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں!

اب میں اپنی زندگی کی مسافت طے کرچکا ہوں، اور اپنی زندگی کے مقاصد کو حاصل کرچکا ہوں تاہم مجھ کو آخری دم تک بہادری سے لڑنا چاہئے تاکہ میں اس بڑے انعام کو بھی حاصل کروں، جو خداوند عالم اس دنیا کے بعد ہر بہادر کو عطا کرے گا — او خدا ...... او خدا!.. میری تمام زندگی ایک نامور اور بہادر سپاہی کی طرح گذری ہے میں جانتا ہوں کہ میں اس آخری اور سب سے زیادہ مشکل جنگ (یعنی موت) میں بھی بہادری سے فتح حاصل کروں، میں ایک بزدل، کم ہمت انسان کی جیسی موت مرنے سے نفرت کرتا ہوں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے بزرگوں کی طرح بہادری سے موت کی تمام تکالیف کو برداشت کرکے اس دنیا سے سرخرو جاؤں۔

ایک بہادر جب موت کی تمام تکالیف کا بہادری سے مقابلہ کرتا ہے تو آخر میں وہ مصائب اور تکالیف ایک خوشنما باغ بن جاتی ہیں جہاں اس کو ہر طرف خوشی اپنے زریں لباس میں ٹہلتی نظر آتی ہے ..... میرے چاروں طرف ایک ہُو کا عالم ہے، میرے کانوں میں شیطان کی آوازیں آرہی ہیں .... لیکن رفتہ رفتہ یہ تمام آوازیں غائب ہوکر کسی خوشنما چیز میں تبدیل ہوجائنگی اور میں ایک غیر فانی چین اور آرام کی زندگی بسر کرونگا، اس وقت بہادری .... میری پیاری .. ... میرے دل کی ٹمٹماتی ہوئی شمع میں جنت میں تجھ کو اپنے آغوش میں لونگا۔ اے خدا .... اے خدا ..... آئندہ کا تو نگہبان ہے!

درسِ نصیحت

مولانا محمود اسرائیلی،

دستِ فرہاد بنا تیشۂ بُرّاں کے لئے ہستیٔ قیس ہوئی وقفِ بیاباں کے لئے

ہے دلِ بلبلِ بیتاب فغاں سے مخصوص لذّتِ سوز ہے پروانۂ رقصاں کے لئے

چشمۂ کوہ کی ہر موج گہر بار میں ہے اک ترنّم کی صدا مُرغِ خوش الحاں کے لئے

منزلِ دہر میں، جو نقشِ قدم ملتا ہے مشعلِ راہ ہے وہ بے سروساماں کے لئے

کوئی مشکل نہیں دنیا میں، جو آساں نہ ہو عزم بالجزم مگر شرط ہے انساں کے لئے

جذبۂ شوقِ شہادت میں کبھی آہ تو کھینچ کام شمشیر کا دیگی یہ رگِ جاں کے لئے

خستہ حالی پہ کبھی اپنی تُو آنسو تو بہا کہ نہیں تارِ رفو چاک گریباں کے لئے

تیرے میدانِ شجاعت میں قدم کانپتے ہیں ننگ ہے ننگ یہ خوددار مسلماں کے لئے

مکتبِ عشق میں جا درس براہیمی لے اک نیا کعبہ بنا قوتِ ایماں کے لئے

رشکِ گلزار بنا اس دلِ صد چاک کو تو کہ یہ درکار ہے گلدستۂ عرفاں کے لئے

منتِ مہرِ درخشاں ہے اسے موجبِ ننگ اک شرر کافی ہو جس سوختہ ساماں کے لئے

آتشِ شوق سے کر بزم چراغاں غافل
دربدر پھرتا ہے کیوں شمع فروزاں کیلئے

آپ بیتی!

جناب ثمر صاحب صدیقی، ردولوی،

"آپ بیتی"، "داستانِ حیات"[1] کا دوسرا رخ ہے۔ اُن خطوط میں "عورت" کی فطرت پر ایک مرد کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی تھی، اور زیرِ نظر خطوط میں ایک گرفتارِ محبت ــــ "شادی شدہ" عورت کے خیالات قلمبند کئے گئے ہیں جو مرد کی جانب سے "صنفِ نازک" کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی روح محبت کی کاوشوں میں بُری طرح اسیر ہے۔ وہ ایک خوددار مرد کی محبت حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری کائنات لٹانے کو ہر وقت آمادہ و مستعد نظر آتی ہے۔ اُس کا "مرکزِ نظر" کسی دوسری ہستی کی کافرادؤں میں مسحور ہے، جس کا خود بھی اس کو علم و احساس ہے لیکن وہ جذبۂ رقابت سے مجبور ہو کر بھی "اباحت والہانہ" کے لئے تیار نہیں ہوتی، کبھی مایوس ہو کر سرافگندگی کا اظہار کرتی ہے، کبھی لطیف ترین تلخ رویہ اختیار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے، اس کا "مرکزِ محبت" "غمِ روزگار" کی زنجیروں میں گرفتار ہے، وہ ہمت و استقلال کی تلقین کرتی ہے، تسکین دیتی ہے۔ محبوب کی کلفتوں پر خون کے آنسو بہاتی ہے، پُرفریب زمانہ کا رونا روتی ہے مگر ایک انوکھی شان کے ساتھ! محبت میں یاس کے قدم نہیں ڈگمگاتے، غرضیکہ "آپ بیتی" پڑھنے کے بعد آپ ایک ایسی فضا میں پرواز کرنا شروع کردینگے جہاں کی ہر چیز آپ کو "آپ بیتی" نظر آئیگی! ــــــــــ ثمر صدیقی،

(۱)

نظر فریاد کرتی ہے، نگاہیں تھرتھراتی ہیں
محبت ہے وہ افسانہ جسے آنکھیں سناتی ہیں

روح نواز اختر! ــــ نامۂ جانفزا کی دلکشی نے مسحور کر لیا۔ اُف یہ سحر آفرینی تمہیں کس نے سکھائی؟ ــــ جذبات کو دلفریب الفاظ کا جامہ پہنا کر "قوتِ گویائی" عطا کرنا بس تمہارا کام ہے، کاش یہ تحریر تمہارے دل کا پرتو ثابت ہوتی، سکون کی باعظمت منزل کا اگر مجھے پتہ معلوم ہوتا تو آج کیوں دنیا میرے لئے "خارزار" بن جاتی۔ اتنا معلوم ہے کہ دولت و ثروت، حکومت و سلطنت اقتدار و شوکت، تفکرات کے "فولادی قلعے" سے نجات نہیں دلا سکتے! ممکن ہے، کہ دنیا میری ہمخیال نہ ہو، لیکن مجھے تو جو راحت فاقہ میں ملی خوانِ نعمت میں وہ لذت نہ حاصل ہوئی۔ بس ایک ذی فہم اور حساس دل کے واسطے یہی کافی ہے ــــ کہ وہ دنیا کو رنج و مصیبت کی مستقل جگہ سمجھ لے! ــــ

اف، میں ان انگاروں کو جس پر بدنما راکھ کی تہ چڑھا دی گئی ہے! خوب جانتی ہوں ــــ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتے ہیں، دریا اور سمندر خشک ہوسکتے ہیں، آفتاب و ماہتاب ٹوٹ کر زمین پر گر سکتے ہیں، لیکن ــــ "ناآشنائے مسرت" خوشی تو درکنار سکون کی سرحد سے بھی واقف نہیں ہوسکتے، سفینۂ حیات ہے، اور اضطراب کی ذخار موجیں، جن کی لذتیں زندگی میں تو فنا سے ہم آغوش نہیں ہوسکتیں، میری جان! تم جیسے باہوش انسان کے لئے یہ خیال کتنا گندہ، اور زہریلا ہے، موت کا آتشیں جام خود پی لینا بزدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرو۔ صبر کی تند ہوائیں کبھی تو غم کے بادلوں کو منتشر کردینگی، خوب جانتی ہوں ــــ تفکرات کی فراوانی جیسی روح فرسا ہوتی ہے لیکن مردانہ استقلال اس پہاڑ کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے، تم اپنے کو گھلائے ڈالتے ہو، یہ قدرت کا ستم نہیں تو پھر کیا ہے؟ کہ تمہاری شوخ طبیعت پر خشک مزاجی فتح یاب ہوجائے! ــــ یہ میری بدنصیبی کے کرشمے ہیں، جو میری ــــ "قندیلِ مسرت" بھی جھلملانے لگی، ورنہ جب "قوتِ بصارت" سلب ہوجاتی ہے

[1] زیادہ تر خطوط ادبیجنل ہیں [2] عالمگیر ماہ اگست ۱۹۳۶ء

تو ـــــ چاند کی نورپاشی بھی بے حقیقت ہوجاتی ہے، یاس کے مسموم جھونکے آرزوؤں کے لہلہاتے باغ کو خاکستر کردیتے ہیں ـــــ اس وقت برسات ـــــ پھولوں کا مینہ برسا رہی ہے، فضا مسرتوں سے لبریز ہے، پہاڑ کے سینہ سے شگوفہ و گل پھوٹ نکلے ہیں! یہی موسم جو کبھی سرخوشی و نشاط کے جام پلاتا تھا ـــــ آج کس قدر پھیکا اور بے کیف ہے ـــــ اف شالامار کے مخملی فرش پر ملاقاتیں یاد ہیں، زمانہ کس قدر جلد رنگ بدلتا ہے۔ گو دلوں میں محبت کے چشمے موجود ہیں لیکن تمناؤں میں سیلاب نہیں آتا، فراق کی بھیانک صورت سامنے کھڑی ہے اور موسم کی خوشگواری میں زہر سرایت کررہی ہے ـــــ خدا کی قسم ہر رات خواہ کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو، میرے لئے جاذبیت کا باعث نہیں ہوتی۔ ہاں، تنہائی کے خار بُری طرح دل میں کھٹکتے ہیں، کون کمبخت شب بھر سوتا ہے۔ تخیلات کی وادیوں میں بھٹکتی پھرتی ہوں، لیکن تمھارے تبسم کی گلچینی نصیب نہیں ہوتی، تمھارا ماحول تو اس قابل نہ تھا کہ آلام کی بارش ـــــ بہار جوانی کو تباہ کردے، لیکن ؎

تقدیر جو دکھائے سو ناچار دیکھنا ؟

تم نے ساون کی کیف باریوں کا ذکر کرکے مجھے وہ زمانہ یاد دلادیا جب ہم لوگ مرزاپور کے فردوسی گاؤں چندن پور میں مقیم تھے، بنگلہ کے اندر سرسبز وادی کے آغوش میں ایک خوبصورت چھوٹا سا تالاب تھا۔ جس کے کنارے جامن کے درخت میں جھولا پڑتا اور یہی چیز ؎

بملاتلے ڈولہ رکھدے مسافر ـــ آئی ساون کی بہار،
میں اپنے محل بن جھولا جھلت تھی ـــ سیاں نے بھیجے کہار

چھوٹے داروغہ کا لڑکا اقبال پورے تان اور سُر کے ساتھ گاتا۔ اسے قدرت نے دلکش آواز دے رکھی تھی، گیارہ بارہ سال کی عمر! معصوم صورت سے نورانی جلوے پھوٹ نکلتے ـــــ بھولی بھالی صورت! نغموں کا دیوتا معلوم ہوتا، میں پہروں، اس کے نغموں کی دلکشی میں کھوئی رہتی۔ اب یاد ماضی ایک فسانہ ہے جس کے بیان کرنے میں بھی سرور نہیں حاصل ہوتا ؎

زمین دل کو غم نے پیس ڈالا آسماں ہوکر

آج کل، دل غم کے حصار میں تڑپ رہا ہے۔ شب کی تاریکیوں میں مینڈک اور جھینگروں کی لے کے ساتھ موت کی لوری سنائی دیتی ہے، توبہ و استغفار کی صدائیں کانوں میں آتی ہیں، لیکن میں تو ابھی مرنا نہیں چاہتی،

میری آخری آرزو ہے کہ ایک بار اپنی زندگی میں تمھارے یاقوتی لبوں سے مسرت کے پھول جھڑتے دیکھ لوں! ـــــ پھر ابدی نیند کی آغوش بسالوں تاکہ میری روح تمھاری مسرت کا احساس کرکے سکون حاصل کرسکے۔

دل گرفتہ ـــــ تمھاری نرگس

ـــــ (۲) ـــــ

پھر بارگاہ عشق میں پہونچا ہوں سر بکف
زخموں سے پاش پاش کلیجہ لئے ہوئے

مجھ سے کبیدہ خاطر اختر! ـــــ ہمیشہ خوش رہو۔ خط ملا، یہ افسردگی اور معافی کیسی؟ تمھاری تحریر سے مجھے اپنی بے باکی کا احساس ہوا، اور میں نے سخت ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف کیا۔ خدا کے لئے بتاؤ، میرے کس جملہ سے تمھیں بدظنی کہ شکوک کا خیال پیدا ہوا؟ تم خود ذرا ٹھنڈے دل سے اپنی تحریر پر نظر ڈالو، دیکھو واعظانہ بو آتی ہے یا نہیں؟ پھر اگر اس کا دل پر اثر ہوا تو کیا بیجا ہے۔ تم کیا جانو کہ تمھاری تحریر کے چند جملوں نے مجھے کتنا شرمندہ کیا۔ اور مجھے خود اپنی ہستی کس قدر ذلیل نظر آئی، اف وہی ہستی جو اپنے شوہر کی التجاؤں کا جواب ہلکے تبسم سے بھی نہ دے سکے۔ تمھارے سامنے نسوانی حیا کو چاک کرکے پیکر التجا بن جائے! ستم ہے یا نہیں! ـــــ اُف، میری تحریر سے جو معنی تم چاہو اخذ کرو، واللہ میں نے ندامت کی گہرائیوں میں غرق ہوکر وہ خط تم کو لکھا تھا۔ تمھیں قسم ہے محبت رفتہ، کی میری اس فروگذاشت کو معاف کردو، میں اور وفاداری کا ثبوت دینے کی سعی! مجھ میں اتنی قدرت نہیں، خطوط واپس کرنے کی فہمائش نہیں ہے بلکہ انھیں خاکستر کرنے کی تاکید، وہ بھی مصلحتاً؟ تم مجھے قابل جواب سمجھو یا نہیں، لیکن ان انگلیوں میں جب تک دم ہے اور تم تک پہونچنے کا ذریعہ ہاتھ آتا ہے قلم صفحہ قرطاس پر دل کا نقشہ اتارتا رہے گا۔ اب تم اسے دیکھو یا دیکھنے سے قبل چاک کرڈالو، تم بہت جلد کتاب محبت پر مہر لگانے لگتے ہو ذرا دیکھو تو ابھی کتنے ورق آرزوئے نقش پر خونبار ہیں، آج کل ـــــ "ماہ محبت" کے قریب عقربیہ کا وجود مجھے ڈرائے دیتا ہے۔

تمھاری طالب عفو، نرگس،

ـــــ (۳) ـــــ

اسی جگہ ہوئی منزل جہاں پہ ٹوٹی آس
ٹھکانے ڈالتی ہیں گردشیں زمانے کی،

نرگس نواز اختر! خوش رہو خط ملا، میں تم سے نہ کبھی برگشتہ ہوئی اور نہ ہوں، جو کچھ بھی لکھا صرف اس اظہار کے لئے کہ میں تمہاری دلبستگی سے واقف نہیں؟ ورنہ یہ تو خود مجھے معلوم ہے کہ ——— میری تحریر مہمل لغو اور مضحکہ خیز ہوتی ہے، ——— ہاں میری روش تمہارے لئے باعث اذیت کیوں ہوتی جبکہ تمھیں میری قلبی تکلیفوں کا خیال و احساس تک نہیں؟ خیر ہٹاؤ اب میں کبھی اپنے ——— "قلبی کوفت" کا مظاہرہ تم پر نہ کرونگی۔ میں اپنے سابقہ کے سارے الفاظ تم سے واپس مانگتی ہوں۔ مجھے خود افسوس ہے کہ میں صفائی کا ثبوت تمھیں نہ دے سکی، لیکن یہ محسن کشی ہوتی اگر میں تم سے کہتی کہ میری رسائی تو حشر تک تمھارے آستانہ تک نہ ہوتی اور میں نہ جانے کب تک غلط فہمی کے عمیق سمندر میں غوطے کھایا کرتی۔ مخبر نے گو رگ رگ میں زہر سرایت کر دیا ——— آرزوؤں کا طلسم توڑ دیا ——— تمناؤں کی کشتی دریا برد کر دی ——— مگر اچھا کیا! نا فہم دل کا غرور تو ٹوٹا؟ ——— ہاں اب اس موضوع کو تو آپ ہی کرنا بہتر ہے۔ میری ناکامیوں کا رونا تمھاری سمجھ میں کیوں آنے لگا، تم کیا جانو شکست دل کی صدا کیسی ہوتی ہے؟ اب اتنی قوت کہاں کہ اپنے فلسفہ شادکامی کی تشریح کر سکوں ——— پھر اب تم سمجھ ہی کر کیا کروگے؟ تمھاری عالی دماغی اور بلند نفسی کا سکہ ایسا نہیں جو دل پر نہ بیٹھے۔ تم روشن ضمیر ہو مگر خود پرست نہیں، اسی لئے تمھیں اپنے صفات کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ واللہ یہ میرا حسن ظن نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ محبت تو قیر کا جذبہ پیدا نہیں کرتی۔ یہ ذاتی جوہر ہیں جنھیں دشمن بھی ماننے پر مجبور ہوتے ہیں ——— خدا کی قسم، یہ مبالغہ ہے نہ خوشامد' احساس گناہ بھی روشن ضمیری کی دلیل ہے۔ میں تمھیں فریبی سمجھتی ہوں، نہ دروغ گو ——— کیوں اپنے قلم کو بیکار ایسے لفظوں سے گندہ کرتے ہو احتیاط پسند ضرور ہو۔ اپنے راز کی کلیوں کو چٹکنے نہیں دیتے، یہی عالی ظرفی کی دلیل ہے۔ تم نے اپنی عزت کے موتی میرے دامن میں بھر دیئے ہیں ——— کمند فریب سے نکال کر مجھے صرف حیات نو نہیں بخشی بلکہ اپنے اخلاق کی بلندیوں سے آگاہ کر دیا۔ میرے جسم کا ذرہ ذرہ ممنونیت کے بلے سے دبا ہوا ہے۔ تمھارے یہ الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کہ "خواہشات کو زندگی میں مردہ کر دینا آسان کام نہیں"؛ ——— تم نے افسانہ نگاری کیوں چھوڑ دی۔ بخدا میں کبھی اس سے خوش نہیں ہو سکتی کہ تم دنیائے ادب سے منہ موڑ لو۔ میرا تو صرف یہ مقصد تھا کہ ایک کمزور ہستی کی خامیوں کو نہ اچھالو۔ موضوع سخن بدل دو، تمھارا قلم ہر مرکز پر پھول برسا سکتا ہے ——— "دروپدی" جیسا شاہکار افسانہ بھی تو تمھارے ہی نگارش طبع کا، لاثانی فسانہ ہے، ——— "انیس تنہائی" بھی کس قدر دلچسپ رومان ہے کہ پڑھنے سے روح غیر فانی مسرت محسوس کرتی ہے، تمھیں قسم ہے کہ ہرگز ہرگز فسانہ نگاری نہ چھوڑو۔ ہاں کسی کی دل آزاری کا باعث بھی نہ بنو ایسے افسانے لکھو جو ملک و قوم کو نفع بخش سکیں، اب کیا لکھوں، زندہ ہوں مگر قسمت کی تاریکیوں میں دست اجل بھی ڈھونڈھے سے نہیں ملتا ؎

آ موت آ کہ رونا بھی آتا نہیں مجھے ‏ ‏ گھبرا گئے ہیں اہل جہاں کی ہنسی سے ہم

برباد محبت نرگس،

۴

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

جان آرزو! ——— کشتہ غم کا سلام لو! خط پڑھا۔ تمھاری افسردگی کے احساس نے دل میں غم آگیں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اف مجھ بدنصیب کے باعث تمھیں تفکرات سے دوچار ہونا پڑا۔ کاش میں نے اپنے قلب کو ان شعلوں کی نذر کر دیا ہوتا اور تم تک آنچ نہ پہونچائی ہوتی، میری دماغی کمزوریاں اکثر خود میری اذیت کا باعث ہوتی ہیں۔ میرے اختر میں اور تم سے ناراض؟ محبت کے لطیف جذبہ کے علاوہ تمھاری قدر و قیمت کوئی میرے شکستہ دل سے پوچھے۔ یہ اور بات ہے کہ نسوانی دل میں یہ آرزو چٹکیاں لے کہ تم میرے اور صرف میرے "مرکز نظر" بنے رہو؟ ورنہ محبت تو تمھاری مسرت کی خواہشمند ہے۔ واقعات، خواہشات کے پابند نہیں ہوتے، مجھ جیسی گرفتار علائق ہستی کیلئے یہی کافی تھا کہ عہد گذشتہ کی تصویر کلیجے سے لگائے بیٹھی ہوں بلند خیال اختر! میں ہر درد سے واقف ہو چکی ہوں برسوں محبت کی آگ میں جلتی رہی لیکن تم کو فراموش نہ کر سکی۔ تمھارا خیال ہمیشہ رفیق حیات بنا رہا واقعات نے سمجھا دیا تھا کہ تم میرے کبھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ ہوش کب آیا جب میرے پاؤں میں...... فرائض کی زنجیریں پڑ چکی تھیں محبت کی ناکامی پر اکثر جی چاہا کہ شمع حیات گل کر دوں۔ مگر تمھارے ..... خیال کی خوشبو میرے لئے بقائے حیات کا باعث ٹھہری۔ میں نے خوش رہنے کی کوشش کی۔ لیکن کبھی مسرت کی شعاعیں مایوس دل تک نہ پہونچ سکیں

محبت کی مجبوریاں کوئی نا آشنائے درد کیا جانے۔ یہ دل صدق کے ساتھ تمہاری پرستش کرتا ہے ـــــ آہ، سب کچھ یاد ہے، وہ سرور آفریں لمحے اب رہبر حیات بن گئے ہیں۔ ایام رفتہ کی خوش عنوانیاں مجھ سے پوچھو کتنی لذت آفریں تھیں تم نے چونکا کر مجھ سے کہدیا ہے کہ میں اس قابل نہیں ـــــ کہ تم مجھے نظر التفات سے دیکھو، وہ حماقت آمیز زمانہ گذر گیا۔ اب اتنا ہوش ہے کہ اپنی خامیوں کو ضمیر کے آئینہ میں دیکھ سکوں، پھر بھی نہ جانے کیوں یہ تمنا خلش آفریں بن کر دماغ میں سما گئی ہے کہ "تمہاری" نظر توجہ کی آرزومند ہوں، گو اس معراج پر نہیں پہونچ سکتی لیکن میری مسرتوں کا راز تمہاری مسحور کن آنکھوں میں مضمر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ دوسری ہستی بھی تمہاری پجارن ہو۔ لیکن ـــــ اختر! اتنا سمجھ لو، یہ دل تم پر مر مٹنے والا جذبہ رکھتا ہے۔ آہ تم میری محبت کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتے کہ میں تمھیں کتنا پیار کرتی ہوں، میں اور تم سے ہمیشہ کے لئے علیٰحدہ ہو جاؤں ممکن نہیں ـــــ فنا کا جام پی کر بھی میری روح شاید تم پر قربان ہونے کو عالم بالا سے آئے۔ ہاں، میں قسام ازل سے مقابلہ نہیں کر سکتی مجھے محبت کا چراغ دیکر فراق کے تاریک غار میں ڈھکیل دیا گیا ہے، جہاں میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں اور باد سموم کے جھونکے ـــــ شمع محبت بجھانے پر تلے ہوئے ہیں، یہ مانتی ہوں کہ تم مجھ سے نہیں ملتے، نو شگفتہ، مہکتے ہوئے پھول، تمہارے مشام جان کو معطر کرنے کو موجود ہیں تو ایک ـــــ "مرجھائی ہوئی کلی" کی تمھیں کیا پروا ہو سکتی ہے؟ تم نے میری محبت کا اعتراف کیا، اگر سچ پوچھو تو یہی مسرت میرے لئے کافی ہے، ورنہ ـــــ ذرا سی سعی پر ـــــ" وہ "ہمیشہ کے لئے تمہاری امیدوں کو سرسبز بنا سکتی ہے؟ میرا کون رازدار ہے، میں نہیں بتا سکتی۔ مجھے تمہاری محبت کی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اس مذموم اور اخلاق سوز رویہ سے تمھیں تکلیف ہوگی لیکن ـــــ میں مجبور ہوں۔ میں نے جو سنا تھا تمھیں لکھدیا۔ کیا تم ـــــ" اُن "کے گلدان کے لئے شاداب پھولوں کے گلدستے نہیں فراہم کرتے؟ کیا وہ دن رات کا بیشتر حصہ تمہارے قریب نہیں گزارتی اکثر میں نے سوچا کہ تمھیں ـــــ "سرخ گلاب" کے گلدستے بنا کر بھیجوں لیکن کمبخت ـــــ رشک نے اجازت نہ دی۔ میں اتنی بلند حوصلہ اور عالی ظرف کہاں کہ اپنے عزیز ترین محبوب کو کسی دوسرے کے "فانوس دل" میں جلوہ گر دیکھوں اور خاموش رہوں، ـــــ اُف! رقابت کی آگ مجھے جلائے ڈالتی ہے خدا کی قسم اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا، آج کل جنونی کیفیت طاری ہے رات بھر نیند نہیں آتی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے کو کیونکر سنبھالوں۔ عنان صبر ہاتھوں سے چھوٹی جاتی ہے۔ میں رشک کے جانسوز شعلوں کو ضبط کے پردے میں چھپانا چاہتی ہوں مگر ان پر قابو نہیں حاصل کر پاتی؟ ایثار کی منزل پر قدم رکھنا چاہتی ہوں لیکن دل کی قوت مجھے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کاش میں حسن عقیدت کی راہ میں اپنی جان قربان کر سکتی، تم کیا جانو مجھ پر کیا گزرتی ہے؟ تم مجھ سے بدظن ہوتے جا رہے ہو۔ میں تمھیں خدا نہ کرے دروغگو سمجھوں، تمہاری جو عزت میرے دل میں ہے اُسے "رشک" کے شعلے خاکستر نہیں کر سکتے، میں تمہاری ہوں اور تا حشر تمہاری رہونگی۔ خواہ ـــــ تم کسی کے ہو جاؤ۔ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں جو شباب کے جھونکوں کی طرح فنا نہیں ہو سکتی۔ حقیقی محبت کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ جسمانی لذات کی خواہشیں ہمیشہ روح کیلئے مار آستین ثابت ہوتی ہیں۔ اب یہ رام کہانی کب تک سنوگے؟ تمہاری نازک مزاجی مجھے خاموشی کا حکم دیتی ہے ـــــ

رخصت! سوگوار تمنا۔ نرگس،

(۵)

خودکشی بھی بن نہ آئی پھر دوا پینا پڑی
ہائے یہ تلخی کہاں تھی زہر بے تاثیر میں

وسیع النظر اختر! ـــــ زندہ باد، تمہارا معنویت سے لبریز خط ملا مُنہ سے بے اختیار تمہاری حقیقت شناسی کی داد نکل گئی، صفائی دلوں میں اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کدورت کا پردہ چاک نہ ہو، مجھ میں شرافت کا جوہر کہاں! فرائض کا احساس اگر مجھے ہوتا تو آج دوسروں کے لئے وبال جان نہ بنتی، مجھے اپنی خامکاریوں کا خود صحیح اندازہ ہے۔ میں نے ان غریب کے لئے آج تک کچھ نہیں کیا۔ شوہر پرستی کا جذبہ اگر میرے خمیر میں ہوتا تو آج یہ روسیاہی کیوں نصیب ہوتی۔ اول تو اختلاف طبائع کے باعث کبھی نہ بنی، دوسرے اب کیا بنے گی جبکہ میری ـــ سیاہ کاریاں فضائے حیات کو ہمیشہ کے لئے تاریک بنا چکیں، خدا کے لئے مجھے زیادہ بحر ندامت میں نہ غرق کرو۔ مجھے اپنے رکیک جذبات کی فراوانی کا بخوبی احساس ہے۔ تم ہو کہ بار بار شانہ ہلائے جا رہے ہو، پھر بھی میری نفسی ہیجو دی مجھے ہوش میں آنے نہیں دیتی۔ تمہاری نکتہ رس نگاہ میں میری جو تصویر ہے، مجھ سے پوشیدہ نہیں ـــــ تمہاری میٹھی میٹھی چٹکیوں نے دل پر خاص اثر کیا۔ میں جانتی ہوں، میری ظاہری صورت سے

میرے اعزہ، نیز میرے والدین غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں، واللہ آج تک انھیں میری رکیک فطرت کا احساس تک نہیں ہوا، وہ ان افواہوں کو صرف بغض و عداوت سمجھے ہوئے ہیں، اور اسی باعث بیچاروں نے مجھ پر کوئی سختی نہیں کی۔ خدا کی قسم میں اس بات سے مطلقاً خوش نہیں کہ لوگ دھوکا کھاتے ہیں، گو روح معصیت کی تاریکی میں ڈوبی ہے مگر بخدا ضمیر کی روشنی میں اپنی ساری لغزشوں کو دیکھ رہی ہوں ــــ مجھے معلوم ہے کہ "زنا نفس" خواہ جس قدر بھی "خیانت حیات" کے لئے ضروری ہو لیکن باعث شر ضرور ہوتی ہے وہ دل جو گنہگار ہے کبھی تنہائی میں بھی گنہگار ہستی کے لئے موجب سکون نہیں بنتا خیالات فاسد کبھی انسان کو چین سے سونے نہیں دیتے، اگر تنگ نظری کا چشمہ اتار کر پھینک دیا جائے تو ہر انسان خواہ وہ کیسا ہی ــــ رکیک فطرت، خود غرض کیوں نہ ہو، ذلت کی گہرائیوں کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ تمھارے تجربات ایک حد تک درست ہیں، تمھاری معلومات کو غلط کہنے کی جرأت کوئی حق بین نہیں کر سکتا۔ میں نے بھی تم لوگوں کی کتاب زندگی کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ مگر قلم میں اتنی طاقت نہیں جو تمھاری صنف کے خلاف زہر اگلوں، صرف اس لئے کہ بہت سی معزز ہستیاں تمھاری صنف میں ایسی موجود ہیں جن کا اعزاز دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ مرد کی محبت تاڑ کی چھاؤں ہے۔ وہ نہ کبھی باوفا تھا اور نہ آج ہے۔ ہزاروں عورتیں مرد کے ساتھ جل مریں، مگر آج تک کوئی مرد ستی ہونا تو کجا وفا کو وفا بھی نہ کہہ سکا۔ ہمیشہ تریا چرتر کا مذموم خطاب عورت کے لئے رہا۔ تم لوگ بادشاہ ہو، ہم لوگ تمھاری رعیت، جو جو ستم نہ کرو کم ہیں دل جلا کر اس کی لپٹوں سے کھیلنا مرد کا قدیم شیوہ ہے، اگر انصاف پسند ہو تو . . . . میں دیکھ لو تم کو بہت سی ایسی ہستیاں ملینگی جو صنف نازک کو تباہ و برباد کر کے بھی نہیں شرماتیں، ــــ میں بیحد شرمندہ ہوں، نہ جانے تمھیں پاکر کہاں پہونچ جاتی ہوں کہ ساری شرم و غیرت خاک میں مل جاتی ہے۔ خواہ وہ تخیلی ہو یا حقیقی اتنا بھی سوجھتا کہ تمھاری نگاہیں ملامت کے تیر برسا رہی ہیں ؎

تم جو آتے ہو سامنے! تو کوئی اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے

بخدا میں جب اپنے باطن پر نظر ڈالتی ہوں تو خود کو مجسمہ فریب نظر آتی ہوں۔ سیہ بختی دیکھو سب کچھ جانتی ہوں، ہر بات کا علم ہے جنت کی خوشگواری کا بھی خیال ہے اور جہنم کے شعلوں کا بھی احساس؟ مگر نہ جانے کون سی ایسی قوت میرے فردِ عمل پر حائل ہے کہ میں بصارت پاکر بھی نابینا بنی ہوئی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کرو۔ نیکی و بدی کا امتیاز سرشت آدم میں داخل ہے۔ پھر میں کیونکر اس امتیاز کو مٹا سکتی ہوں، مجھ میں ملکوتی صفات نہیں، مجھے دہکتے ہوئے انگاروں پر برف کی نقاب ڈالنا نہیں آتا، اب تو جیسی ہوں ــــ ہوں، گو کہ لغزشوں کا مجسمہ ہوں ــــ لیکن تمھارے خیال سے خالی نہیں ــــ بس بس! فضائے دل کو مکدر نہ کرو۔ ان خطوط کی نقل میرے پاس موجود ہے ضرورت ہوگی تو بھیجدونگی۔ تمھارا افسانہ خوب ہے، عزت و ثروت پر مرنے والے ــــ محبت کی پروا نہیں کرتے۔ بہت سے انسان دولت و امارت کی ظاہر پرستیوں کو باعث سکون جانتے ہیں۔ ہاں تمھارے افتتاحیہ نوٹ کے اس جملے نے طبیعت پراگندہ کر دی کہ "حسن و وفا کا مجسمہ عورت نہیں ہوتی"۔ یہ ماننے کو تیار ہوں، لیکن اب تخلیق عالم کا باعث بھی نہیں رہی۔ چلو چھٹی ہوئی ہم لوگوں کے لئے اب یہ بار باعث اذیت ہے ــــ کچھ دنوں کے لئے تم لوگ ــــ تخلیق عالم کا باعث بن کر تو دیکھو، اس لئے کہ مادری فرائض کا بار اب ــــ صنف نازک سے اٹھائے نہیں اٹھتا! ــــ خدا حافظ،

بدبخت، نرگس،

(۶)

رکھ رکھ کے دل نے آنکھ میں تصویر یار کو
قیدی بنا دیا نگہ انتظار کو

مظہر محبت اختر! ــــ شاد رہو، کچھ خبر ہے کہ دل پر کیا گزرتی ہے؟ سنا؟ میں صاحب فراش تھی، اللہ اتنے بیدرد ہو، بیخبری کی حد کر دی، خواب میں بھی مزاج پرسی کو نہ آئے، تم سے زیادہ تو تمھارا خیال ــــ رفیق نکلا، کیا کہوں کیسی ہوں، غشی کا ایک دورہ مہینوں کی قوت سلب کر لیتا ہے، نقاہت کی تنگ آغوش مجھے سانس بھی لینے نہیں دیتی، ابھی تک طبیعت بحال نہیں ہوئی ہے۔ ہاں زندہ ہوں لیکن تنفس کے خار ــــ "چادر حیات" کو چھلنی کئے دیتے ہیں، ہر لمحہ صبر شکن ہے، اُف، تم میری روحانی اذیتوں کو نہیں جان سکتے، ایک ہفتہ سے تمھاری خیریت بھی نہیں معلوم ہوئی، ہاں اتنا جانتی ہوں قدرت نے تمھاری دلبستگی کی دنیا سنوار دی ہے، خدا کرے ہمیشہ خوش رہو۔ پرسوں حضرت رعد نے تو اس قدر برہمی سے جھڑکا تھا کہ بیمار کا دل بھی لرز گیا ہوگا۔ میں بداعمالی کی تاریکیوں میں بھٹک کر کئی بار کانپی اور تمھاری

صحت وسلامتی کی دعا کرتی رہی۔ غم دوری کی وحشت اثر گرفت نے دامن استقلال چاک کر دیا۔ بتاؤ ان قطرہ ہائے اشک کو کیونکر تمہارے قدموں پر بکھیروں۔؟ بولو، فراق کے دہکتے ہوئے انگاروں پر کب تک سجدہ ریز رہوں۔ بس اب ان شعلوں کو حکم دو کہ مجھے خاکستر کر دیں۔ بیمار محبت کی عیادت دل کی جانسوز لپٹیں کب تک کر سکیں گی۔ رات کی ساکت فضا میں اضطراب کی روح دوڑانے والے دلنواز اختر! اب میری روح کو آسمان کی بلندیوں میں گم کرنے کی سعی کرو، فراوانی غم نے حسیات کے پھولوں کو مسل ڈالا ہے۔ دل کے گھاؤ اب اندمال کے قابل نہیں رہے۔ خدا کی قسم اب دل زندگی سے بیزار ہو چکا ہے۔ ہائے تمہاری یہ خاموشی اور لب بندی جان لیوا ہے یا نہیں؟ ——

فرقت نصیب، نرگس،

——(۷)——

اپنی حالت کا کچھ احساس نہیں ہے مجھکو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

نرگس نواز! —— تسلیم و نیاز، مختصر نامہ ملا۔ میں اچھی ہوں کوئی بات قابل انتشار نہیں ہے۔ مطمئن رہو۔ یہ پریشانی اور اضمحلال کب تک؟ خاموش سلگ سلگ کر اپنی صحت کا خون کئے دیتے ہو۔ خدا کے لئے اس بیکاری کا فیصلہ کرو۔ یہ ممکن نہیں کہ انسانی کوششیں بارآور نہ ہوں، تقدیر کو عصا بنا کر تفکرات کی صحرا نوردی دوراندیشی نہیں کہلاتی۔ قدرت نے انسان کو ہمدردی کا مادہ عطا کیا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اگر یہ لطیف جذبہ آج نیست و نابود ہو جائے تو انسان کیا تمام موجودات عالم میں ایک ایسا تصادم واقع ہو کہ چند لمحوں میں اس کرۂ ارض کا بھی پتہ نہ لگے —— پھر یہ بیجا غیریت کیسی؟ زمانہ کی تنگ نظری کا مجھے کافی احساس ہے مگر تم اپنے لبوں میں جنبش تو پیدا کرو۔ جب سوچ سوچ کر میرا جی گھبراتا ہے تو تمہارا کیا حال ہوتا ہوگا؟ یہ آٹھ پہر کی کوفت اچھی نہیں۔ سر زانوئے تفکر سے اٹھاؤ۔ تدبیر بھی کوئی چیز ہے خدا کے لئے کروٹ بدلو۔ زندگی سے عاجزی اچھی نہیں۔ پودے محض کمھلانے کیلئے پیدا نہیں ہوتے۔ رب العزت کی رحمت سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے اس نے ایک راستہ آسودگی کا بھی بتایا ہے۔ اسے صرف وہی پائیگا جو ڈھونڈھنے کی زحمت گوارہ کریگا۔ مجھ سے کتب بینی تین ماہ ہوئے چھوٹ گئی، اب "داستان حیات" کے مطالعہ سے فرصت نہیں ملتی، ہمیشہ کی عادت، رات کو بغیر پڑھے نیند نہیں آتی روزانہ "حقیقت" آتا ہے۔ اسی کو بس گیارہ بجے تک الٹ پلٹ کر دیکھتی رہتی ہوں قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ ساری دنیا سے جی سیر ہو چکا، اب کسی طرف طبیعت متوجہ نہیں ہوتی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں کہاں ہوں؟ زندگی بے کیف ہے کام کرنے بیٹھوں تو عدیم الفرصتی دامن نہ چھوڑے، لیکن میں ہوں کہ سارا سارا دن چارپائی ہی پر گزار دیتی ہوں۔ وہ بھی کمرے کے ایک گوشے میں خبر نہیں گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اس بے خبری کا جو اثر متعلقین پر پڑے گا! ظاہر ہے؟ گھر سے برابر خطوط آ رہے ہیں کہ جولائی کا مہینہ کشمیر میں گزارو۔ خود بھی اپنے کو کمزور پاتی ہوں، لیکن خودداری اس کی اجازت نہیں دیتی جو ان پر اظہار کر سکوں ہر خط وہ کھول کر پڑھ لیتے ہیں۔ انھیں جب خود خیال نہیں تو پھر میں کیوں۔ —— بات بھی کھوؤں التجا کر کے؟ —— رخصت خدا حافظ! ——

تمہاری دل شکستہ، نرگس

——(۸)——

نہ پوچھ میری میں وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا،

آرام جان اختر! خوش رہو، تحریر جانفزا ملی، مجھے تمہاری قلبی اذیتوں کا خاصہ احساس ہے۔ واللہ تفکرات کے جال میں دل بری طرح اسیر ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے ایسے قیمتی الفاظ لاؤں جو تمہاری تسکین کا باعث ہوں اے کاش میں صحیح معنوں میں تمہاری شریک درد بن سکتی، اف مجھ میں اتنی قدرت نہیں جو اپنے عزیز ترین محبوب کو افکار کے پنجہ سے نجات دلا سکوں۔ پھر یہ زندگی کس کام کی؟ آہ میں صرف تمہارے لئے زندہ رہنے کی آرزومند ہوں لیکن جب تمہاری ہمدردی کا ثبوت نہیں دے سکتی تو پھر —— پیارے یہ زندگی ایک روگ ہے، مجھے اور تمہاری ذہنی کلفتوں کا اندازہ نہو، کیا کروں اور کیسے اپنے دل کی کیفیت دکھاؤں۔ دنیا مجھے مطمئن اور مسرور سمجھتی ہے، کسی کو کیا خبر کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے! دل میں لاکھوں زہریلے خار پیوست ہیں، —— پیارے! تمہیں کیونکر سمجھاؤں؟ تلقین صبر بےسود، سچ ہے جس پہ گزری ہو وہ ہی جانے۔ خدا کے لئے ایسے مایوس کن الفاظ لکھ کر میری مشتاق آنکھوں کو خونبار نہ بنایا کرو۔ میں انتہائی وہمی اور شکی انسان ہوں! میری جان اگر مصیبتوں کا مقابلہ استقلال سے کروگے تو خود بخود رحمت کی شعاعیں تمہیں اپنے آغوش میں لے لینگی، اگر میرا تمہارا ساتھ ہوتا تو شاید میں تمہارا دکھ درد مٹا سکتی

اب تو میرا عدم و وجود تمھارے لئے یکساں ہے۔ اپنی حالت کیا لکھوں؟ ایک رات اگر نیند نہ آئے تو طبیعت کتنی کسلمند رہتی ہے۔ اس سے پوچھو جو ہفتوں سے بے خوابی کے آغوش میں تڑپتا ہو۔ ساری ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے کسی کروٹ چین نہیں ملتا۔ زندگی اجیرن ہے، موت کی چاپ رت بھر سنائی دیتی ہے۔ توہمات کا صفحہ ہے اور میں اسیر غم ــــ زمانے اس تصور سے کب رہائی ہوگی! ۔ ۔ ۔

تمھاری مضطرب، نرگس،

ــــ (۹) ــــ

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

میرے اختر! ــــ باری تعالےٰ تمھیں مسرور رکھے۔ تمھارا نوشتہ حیات افزا ملا۔ جواب دیر سے دے رہی ہوں ــــ معاف کرنا، کیا کہوں کچھ ایسے جھگڑوں میں مبتلا تھی کہ اب تک دماغ کو یکسوئی نہ حاصل ہوئی۔ تمھیں میرا خط نہ پاکر حیرت ہوئی ہوگی، اور شاید تم نے انتشار کی صورت اختیار کرلی ہو اُف، پیارے یہ کیا؟ میری ناکامیوں کے خاروں سے تم کیوں اپنے ضمیر کو مجروح کرتے ہو، آہ، میری ایسی قسمت کہاں؟ جو تمھاری شریک درد بن سکوں؟ ہائے، اس کعبۂ محبت میں سوا لفظوں کے اور کیا ہے جو تم پر نچھاور کروں۔ تفکرات کا لشکر امیدوں پر نرغہ کئے ہے۔ گو تمھارا تصور میری پشت پناہی پر آمادہ ہے مگر پھر بھی کاوشوں کے چنگل سے رہائی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ آلام کے ہچکولے میری غرقابی پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے لئے تو اب یہ وسیع دنیا ایک ــــ قطرہ زہر بن کر رہ گئی ہے ــــ اے کاش صعوبات کی خوفناک لہریں مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے دامن میں چھپالیں! تم کیا جانو کہ تمھاری جدائی اس ستم رسیدہ ہستی کیلئے کتنی ہلاکت آفرین ہے۔ تمھاری پریشانیوں کا احساس ــ "مارسیاہ" بن کر سینہ سے لپٹا کلیجہ کا خون چوس رہا ہے۔ سعی و کوشش سے اگر مصائب پر قابو حاصل ہوجاتا تو پھر مصیبت ــــ مصیبت نہ رہتی؟ تمھارا نظریہ محبت کیا ہے، ذرا غور کرو، ممکن ہے کہ جسم کے کسی حصہ میں پھانس چبھے اور آنکھیں اس کی تلاش میں سرگرداں نہ ہوں، دل کو درد نہ محسوس ہو، ادعائے دوستی تو یہ نہیں کہ تم مجھ سے اپنی کلفتوں کو پوشیدہ رکھو، مانا کہ قوت درماں نہیں رکھتی ــ ناکامیوں کے بادل تک میرے دست شل نہیں پہونچ سکتے جو آلام کا گریبان چاک کردوں مگر ــــ پیارے تاثیر درد سے تڑپ تو سکتی ہوں، ہائے کیا تمھیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے دل پر تمھارے دل کا پرتو پڑے؟ میرے غیور اختر! بتاؤ میں کیونکر تمھارے گوشۂ دل سے یگانگیت کی شمع بجھاؤں۔ جانتے ہو کہ جب دو مختلف ہستیاں رشتۂ محبت میں منسلک ہوجاتی ہیں تو جب تک ایک دوسرے کو شریک درد نہ بنائے لطف زیست حاصل نہیں ہوتا۔ ابھی کچھ دن ہوئے تم نے ایک خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ "جس میں روحانیت نہ ہو وہ انسان نہیں" تمھارا جملہ [illegible] قیمتی ہے کاش کہ تم انھیں پھولوں سے اپنے دل کو بسالیتے۔ غریبی اور پریشانی کو حقیر نہ سمجھو، یہ دل و دماغ پر جلا کرنے والی کسوٹی ہے ــــ ذرا میری آنکھوں سے دیکھو اقبالمندی کی روشنی تمھاری ــــ بلند پیشانی سے ابلی پڑتی ہے۔ قدرت کی رحمتوں کی بارش یقیناً تم پر ہوگی۔ میری ہر سانس، اسی فکر میں سرگرداں ہے۔ کیا کروں اور کیونکر تمھیں دامن طمانیت میں پوشیدہ کروں۔ کیا میرا غمزدہ دل کبھی خوشی کی ٹھنڈک نہ محسوس کرسکے گا ــ کیا یہ پھول جو مجھے جان سے زیادہ ہیں مسرت کی خوشبو سے مشام جان کو معطر نہ کرینگے یاس کا دھواں دم گھونٹے دیتا ہے کچھ بس نہیں چلتا، کیونکر فضائے محبت کو خوشگوار بناؤں، سیلاب کی تباہ کاریاں علاحدہ جی دہلائے دیتی ہیں، کچھ لکھنؤ کا حال، جانتے ہو تو لکھو۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے، طبیعت بیحد بدمزہ ہے تحریر کی بے ربطی کو نظرانداز کردینا۔ میرا جی آج کل بہت نڈھال ہے، تم بہت یاد آتے ہو ــ خدا حافظ! ــــ

میرا رہے جائے لیکن زندگی سے دل تاثیر سے خفا مرے نالے ہوئے تو ہیں

مضطرب الحال، نرگس،

ــــ (۱۰) ــــ

اب کی بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی
اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی

آسمان محبت کے تابندہ اختر! ــــ خدا تمھیں صبر و ضبط کی توفیق عطا کرے! آمین! خط ملا، ضمیر کی آواز کو کیا کروں، جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں تم کو اُن سے ملنے پر مجبور کروں، یہ امر واقعہ ہے کہ ظاہری آسائش کبھی قلبی کوفت کا سد باب نہیں کرسکتی، لیکن دنیاوی تفکرات جو انسانی زندگی کے لئے جزو لاینفک بنے ہوئے ہیں ان کا اندفاع ضرور ہوجاتا ہے۔ ابر نیساں کا ہر قطرہ موتی نہیں بنتا۔ سورج کی شعاعیں ہر پتھر کو ہیرا نہیں بناتیں۔ پھر تمھاری شکایت لاحاصل! ابھی چھوڑ دو ان سب تصنعات کو ــــ آؤ، اور فضائے حیات میں

عشق و محبت کے روح پرور نغمے الاپیں ـــــ دنیا کو اپنے نغموں کی شیرینی میں گم کردیں۔ یہاں تک کہ فردوسی نغمے الاپتے الاپتے خود بھی اپنے نغموں کو بھول جائیں ـــــ۔ اس وقت موسم کتنا دلفریب ہے؟ تمھارے بھیجے ہوئے "بیلے کے پھولوں" کا ہار عجب بہار دکھا رہا ہے۔ پھولوں سے محبت کی خوشبو آس پاس کی فضا کو معطر کررہی ہے۔ سارا گھر مہک رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے محبت کی لطیف بو سے مشام جان ـــــ ہوا چل رہی ہے، درخت جھوم رہے ہیں۔ ظالم بوندوں نے اور بھی جذبات میں ایک پرکیف ہیجان پیدا کر دیا ہے ذرہ ذرہ، جوش مستی کا پیمانہ چھلکا رہا ہے ـــــ اے کاش! اس وقت تم میرے پاس ہوتے اور یہ ٹھنڈی اور سہانی رات، یہ پرکیف موسم مجھے تمھاری قربت سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے ـــــ موسم بہار کی آمد آمد ہے ـــــ دل کی پژمردہ کلی ابھی سے کھلنے کے لئے صبح کا انتظار کررہی ہے ـــــ جذبات کی فراوانی معاذاللہ کچھ نہ پوچھو ـــــ نہ جانے کتنی آرزوئیں کتنے ارمان اس خانۂ دل میں پرورش پا رہے ہیں، اللہ راس لائے ـــــ

موسم برشگال کی کیف انگیزیاں مجھ ایسی حساس دل ہستی سے پوچھو، کالی کالی گھٹائیں چھائینگی ـــــ بجلی چمکے گی ـــــ ایسے میں غم کی ماری کوئل کی دردناک آواز میرے دل میں ایک غمناک ہوک پیدا کر دیگی ـــــ تم بے اختیار یاد آجاؤگے! ـــــ پپیہے باغوں میں شور مچائینگے! ـــــ مستی میں ڈوبی ہوئی ہوائیں چلینگی، اور ختم ہوجائینگی، بوندوں کا سیلاب آئیگا اور نکل جائے گا۔ میں فراوانی جذبات سے مغلوب ہوکر تمھاری محبت میں گم ہوجاؤنگی، ـــــ اگلے، پچھلے واقعات یاد آجائینگے ـــــ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلے گا ـــــ جس کا مقابلہ یہ سحاب نہ کرسکے گا! ـــــ تمھاری یاد ہوگی اور میرا سینہ، دنیا کے سارے غم بھول جائینگے ـــــ ایک کیف، ایک بیخودی مجھے اپنی سحر آفرینیوں میں مسحور کرلیگی ـــــ اس وقت تم مجھ سے کتنا دور ہوگے ـــــ یاس و ناامیدی کی گھنگھور گھٹائیں دل افسردہ کے چرخ پر چھا جائیں گی، ـــــ اشک محبت کی بارش ہوگی، برسات کی راتیں ہونگی اور ـــــ غم و اندوہ کے لمحات؟ ـــــ کسی طرف سے ؎

بالم آئے بسو مورے من میں

ساون آیا تم نہ آئے ۔۔۔ تم بن رسیا کچھ نہ بھائے

من میں مورے ہوک اٹھت جب ۔۔۔ کوئل کوکت بن میں

"بالم آئے بسو مورے من میں" کی کیف آفریں صدائیں کانوں پر آئینگی! ـــــ دل تمھارے لئے بیچین ہوجائیگا ـــــ نغمے فضا میں ارتعاش پیدا کرکے موج ہوا میں تحلیل ہوجائینگے ـــــ لیکن میرے سینہ میں وہی ـــــ "تم بن رسیا کچھ نہ بھائے" کی کھٹک بدستور جاری رہیگی، ـــــ کیا تم بھی مجھے اس موسم میں یاد کروگے؟ ـــــ جس کی لطیف ہواؤں میں محبت کی بو، دنیا کو پیغام طرب دیتی ہے۔ اور جس کا پہلا قطرہ جذبات بیخودی میں ہیجان پرور جوش پیدا کردیتا ہے۔ آہ ـــــ اس وقت تمھاری یاد مجھے سرور و انبساط کی دنیا میں گم کردیگی، میں کھو جاؤنگی! ـــــ کیف و بیخودی کے بے پناہ جذبے میں! ـــــ دنیا میں انقلاب آئینگے، اور ختم ہوجائینگے سورج اور چاند بدستور دنیا کو روشنی پہونچاتے رہینگے ـــــ دن ختم ہوکر پھر طلوع ہوگا ـــــ رات اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ بساط دنیا پر قدم رکھیگی ـــــ باغوں میں کلیاں پھولوں کی شکل اختیار کرتی رہینگی ـــــ موسم بہار اسی طرح دلفریب وادیوں میں ـــــ کیف سامانیوں کی تازہ روح پھونکتا رہے گا۔ لیکن ـــــ وہ دن جو ـــــ جوانی کے بہترین دن تھے ـــــ اب پلٹ کر نہ آئینگے!

نظام عالم میں اس طرح تغیر و تبدل ہوتا رہے گا ـــــ پھر کیوں نہ ہم وقت کی قدر کریں۔ جوانی پلٹ کر نہیں آتی۔ پیارے جو کچھ کرنا ہے جلد کرلو، وقت ہوا کے دوش پر بھاگا جارہا ہے، دنیا کی کوئی قوت ـــــ قوت وقت کی پرواز کا مقابلہ نہیں کرسکتی ـــــ آؤ ـــــ آؤ، شباب بھاگا جارہا ہے ـــــ جذبات روٹھے جارہے ہیں ـــــ منائیں! ـــــ منائیں ان زریں ساعتوں کو! ـــــ جو اس وقت میسر ہیں ـــــ پھر کہاں نصیب ہونگی یہ سنہری ساعتیں جوانی کی طرح ـــــ اس وقت ایک حسرت ـــــ ایک "خوشگوار خواب" ان کا نعم البدل ہوگا۔ میرے پیارے! ـــــ آؤ آؤ ـــــ جلد آؤ! میں تمھارے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے بیٹھی ہوں۔

سراپا محبت۔ نرگس

ـــــ (۱۱) ـــــ

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

درد نواز اختر! ـــــ سلام نیاز! صبر شکن تارنے دل میں

غم کی آگ بھڑکا دی، اف، اپنے نازک لبوں کی آہ کی تاثیر نہ پوچھو — میری زندگی کا ہر لمحہ تمھارے اندفاع پریشانی میں سرگرداں ہے۔ پیارے تم ہی بتاؤ کہ جب ناکامیاں دامن نہ چھوڑیں تو کیا کروں؟ — دست کوشش شل ہوئے جاتے ہیں اے کاش، یہ جان حزیں تمھارے کام آسکتی۔! ہائے کیسی قیامت ہے کہ اپنی آنکھوں سے دل کا خون ہوتے دیکھوں اور چپ رہوں، — خاموش رہوں، میرے عزیز محبوب، مجبوری کا پھندا گلا گھونٹے دیتا ہے، خدا شاہد ہے کہ مجھے تم سے زیادہ کچھ عزیز نہیں مگر جان جان قسمت کی جانکاہیاں ماحول کو سخت اندوہگیں اور خطرناک بنا رہی ہیں کوئی اپنا ہمدرد و رفیق نہیں! تہید ستی ایک جہنمی شعلہ ہے! — خدا کے لئے اپنے کو سنبھالو — یہ بے صبری تم جیسے عالی دماغ کے لئے زیبا نہیں — یہ کیا تم بھی عام لوگوں کی طرح غم فراق کی فراوانی سے گھبرا اٹھے۔ بس بس — دیکھو میری — "نگہ انتخاب" کو مجروح نہ کرو ان نگاہوں نے دلیری کی ادائیں بہت دیکھی ہیں، اب ذرا — "شان شجاعت" بھی دکھاؤ — مردانہ وار ضبط کے جوہر دکھاؤ، اپنی مثال قائم کردو — جیو اور مصیبتوں کو ٹھکرا کر جیو، ہمت و استقلال کو رفیق بناؤ تمھاری عزت کی قسم — تمھاری غیرت پسندی اور عزت نفس کا شدید احساس ہے۔ اپنے فرض محبت کو بھی جانتی ہوں لیکن ع

دست شل کو دخل ناممکن خط تقدیر میں

تمھاری ذہنی خلفشاریوں کے خار رگ رگ میں پیوست ہیں خدا کے لئے دامن ہراس نہ چاک کرو — سخت الجھن میں گرفتار ہوں — ساری ساری رات جاگتے گزر جاتی ہے — جی ڈوبا جاتا ہے، اب رخصت کی اجازت دو۔ شدید گرمی ہے۔ حواس ٹھیک نہیں،

بدنصیب و ناکام، نرگس،

(۱۲)

کون سی رات آن ملئے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

میرے آرام جان اختر! — سلامت رہو، انتظار کے شعلے کب تک مجھ ہجراں نصیب کو بھسم کرتے رہینگے! بولو، اب دماغ اب ان گتھیوں کو سلجھانے کے قابل نہیں رہا۔ زندگی کا ہر لمحہ زمانہ کی بندش میں الجھ کر رہ گیا ہے اب زندگی مجھ سے بیزار ہے اور میں زندگی سے! — خوش ہو جاؤ۔ اب دل کی ساری آرزوئیں فنا کا جام پی چکیں۔ حسین تمناؤں نے چادر الم میں منہ چھپا لیا ہے۔ یاس کے خاکستر صحرا میں تنہا بھٹک رہی ہوں، بولو اس وقت بھی تم نہ آؤگے کیا تمھیں میری بیکسی اور کس مپرسی پر بھی تاسف نہیں آتا

پھری ہیں یوں تپلیاں شب غم کہ شام ہی سے سحر ہوئی ہے
مگر نہ آنا تھا تم نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہوئی ہے،

رات دن زندگی کے فلسفہ پر غور کرتی ہوں لیکن مقصد حیات سمجھ میں نہیں آتا۔ محبت کی آخری سرحد پر پہونچ چکی ہوں۔ اب امتیاز من و تو بھی باقی نہیں رہا قطرہ کو اب دریا میں مل جانے دو۔ آنکھیں اشکبار ہیں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ لکھا نہیں جاتا۔ دماغ چکر کھا رہا ہے۔ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی ہے۔ ایک حسرت — ایک تمنا — ایک آرزو ابھی دل میں باقی ہے۔ اگر اسے تم قبولیت کا درجہ دے سکو تو جلد آؤ۔ میری مضطرب روح تمھارے لئے بے چین ہے۔ اگر تم نہ آئے تو میرا خاتمہ ہو جائیگا اور پھر ایک خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نظر نہ آئیگا۔ اس وقت تمھاری زبان پر یہ شعر ہوگا! باقی پھر کبھی! —

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

تمھاری بیمار نرگس

جذباتِ عالیہ

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری

میری مزاج داں نگہِ بے خبر کہاں، احساسِ دردِ عشق کہاں، چارہ گر کہاں

نظارۂ مدّعا ہے یہ قسمت مگر کہاں، دنیائے آرزو میں نمودِ سحر کہاں

تاریک اب تو بزمِ تصوّر بھی ہو گئی، وہ عالمِ خیال کا حسنِ نظر کہاں

شعلہ تھا دل جو بجھ کے ہوا خاکِ رائیگاں، اب اعتبارِ عشق کہاں، وہ اثر کہاں

رہتے صنمکدے میں مگر محوِ ذکرِ حق! اتنے جنابِ شیخ وسیع النظر کہاں

آشفتگیٔ دل کو سمجھتا نشاطِ روح! ناصح رموزِ عشق سے ہے باخبر کہاں

رنگین بیاضِ عشق رہی نا گدازِ دل، اب آنسوؤں میں جوش وہ اے چشمِ تر کہاں

تاریک رات، تاب شکن منزلِ دراز، اس بیکسی میں دیکھئے ہو گی سحر کہاں

اے حسن تو ہی آج اٹھا گوشۂ نقاب، میری نگاہِ شوق میں اب یہ اثر کہاں

زاہد بھی میکدے میں ہے ساغر بدست آج، میکش یہ کہہ رہے ہیں کہ حضرت ادھر کہاں

احساسِ دل کی چوٹ کا اے دل محال ہے، رکھے گا ہاتھ آج مرا چارہ گر کہاں

رجوع باصل!

محترمہ فاطمہ لیاقت، منشی فاضل۔ بلگرام

مندرجہ بالا عنوان سے رسالہ "مہر" طہران میں ادیب فاضل آقائے ذبیح اللہ صفا کا ایک بصیرت افروز پرمغز مقالہ شایع ہوا ہے جس کی دو قسط کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔ فاطمہ لیاقت،

ہر زبان میں جو خارجی الفاظ داخل ہوتے ہیں ان کی خاص تاثیر ہوتی ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے اکثر ہموطن ادبا کی کوشش ہے کہ عربی کے وہ الفاظ جو کہ فارسی میں داخل ہوگئے اور جن کی "صورت" اور "معنی" میں فرق ہوگیا ہے انھیں اسی اصل عربی صورت میں استعمال کریں جو کہ عربی لغت میں موجود ہو۔ لیکن میں ان عربی الفاظ کے فارسی میں استعمال کے متعلق جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ اس کے خلاف ہے۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ ان کے خیال کو غلط ثابت کردوں، اس لئے زبانوں کے تغیر اور لہجوں کے اختلاف (جو کہ کسی زبان کے اجنبی الفاظ میں پیدا ہوجاتے ہیں) پر بحث کیجائیگی۔

الفاظ، علامات وکلمات کی ایجاد کا سبب انسان کی ضرورت ہے دور اولیں میں انسان بجائے اس کے کہ اشاروں، کنایوں سے کام لیتا اس نے چھوٹے چھوٹے الفاظ بنائے جن کے ذریعہ سے وہ اپنا مطلب بآسانی ادا کرسکے اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاسکے۔ اس طرح وہ چھوٹے الفاظ بنتے رہے جن کی ترقی یافتہ شکل یہ "الفاظ بزرگ" ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستہ اول کے افراد کی افزائش کے بعد ان کو دوسرے مسکن کی ضرورت ہوئی ہوگی اور انھوں نے مجبوراً ترک وطن کرکے اپنی موروثی زبان ساتھ لے گئے ہونگے، لیکن "مسکن جدید" میں نئے حالات نئے ماحول، اور چیزوں کے لئے دوسری لغات کی ضرورت کے مطابق علامتیں (الفاظ) اختراع ہوئیں۔ اس طرح اصلی زبان سے اس میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا۔ علاوہ ازیں مرور ایام کے ساتھ ہی "محیط جدید" نے ان کی عادات اطوار پر بھی اثر ڈالا۔ یہانتک کہ روحانی

اور جسمانی فرق نے ان کو اصلی قوم سے متمیز کردیا۔ اس صورت میں زبان اور لہجے میں فرق آگیا۔ جس سے اصلی زبان الگ زبان معلوم ہونے لگی۔ اس طرح جتنے دستے اصل زبان سے علیٰحدہ ہوکر دوسری جگہ بستے گئے مختلف ماحول اور ضروریات نے ان کی زبان، لہجہ، معاشرت وتمدن پر مختلف اثر ڈالا، اس طرح ہر دستے کی زبان اور لہجہ اصل سے جدا ہوکر ایک نئی چیز معلوم ہونے لگا۔ اور ہر قبیلے کی زبان میں ایک دوسرے سے فرق ہوگیا۔ وہ قومیں جن کا زمانہ بہت نزدیک تھا لیکن مجاورت میں زندگی بسر کرتے تھے ان میں بھی یہی اختلاف ہے جیسا کہ ایرانی اور سنسکرت میں، حالانکہ ہندو وایرانی ایک زمانہ میں "رود جیحون" اور کوہ ہندوکش کے دامن میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی لغت ایک تھی۔ مثلاً ماہ وآفتاب کے لئے دونوں ایک ہی لفظ استعمال کرتے۔ جبکہ انھوں نے ہجرت کی ان کا ایک دستہ مغرب کی طرف چلاگیا جس کو بعد میں "ایران" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دوسرا گروہ ہندوستان کی طرف گیا اور ہندو کہلایا۔ اول الذکر نے اپنی لغت میں تبدیلی کرکے "ماہ وشیر" کردیا اور ثانی الذکر نے "ماس وتیرا"۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، یہاں تک کہ اگر زبان "فرس"۔ "ہخامنشی" اور زبان اوستائی (پہلا ایران کا جنوبی لہجہ ہے اور دوسرا مشرقی) اور زبان تبرستانی وگیلانی (کہ حقیقتاً ان کے قدیم و جدید لہجوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں) کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اختلاف کلی پایا جائیگا۔ ماحول کے علاوہ دوسرا سبب "زمانہ کا اختلاف" بھی ہے۔ مرور ایام کے ساتھ۔ دوسرے دستہ کی اطلاعات، ان کے علوم وفنون کی خبر، لغات

اور اصطلاحات قومی کے ساتھ دوسرے تک پہونچتی ہیں، اس طرح سے بھی زبان میں فرق آجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفیتِ نژادی۔ ماحول و مسکن اور زمانہ کی بھی وجہ سے زبان پر اثر پڑتا ہے اور ان کی زبان پہلے سے کسی قدر مختلف اور ارتقائی پہلو اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں زبان ایرانی، (بلکہ عام دنیا) کا تغیر و ارتقا، اس کا ثبوت ہے۔ اگر دو قومیں جن کے خصائص زندگی مختلف ہوں اتفاقاً مل جائیں اور ان کے خصائص و زبان اختیار کرلے لگیں تو جدید لغت پیدا ہوجائیگی۔ جو دونوں کی زبانوں سے الگ ہوگی اب دیکھنا یہ چاہئے کہ آیا اس اختلاف میں لہجہ کا بھی فرق پیدا ہوگا۔؟ اس مقام پر مذکورہ عوامل کی تاثیر دوسرے مقامات کی بہ نسبت شدید و سخت تر ہے اور امور "لازمۂ طبیعت" سے شمار ہوتے ہیں۔ "قانونِ طبیعی" کے مقابلہ میں اس کی مخالفت محال ہے۔ مثلاً ہندی، ہندوستانی زبان میں کرہ قمر کو ماس کے لفظ سے یاد کرتا ہے اور ایرانی اس کے لئے ماہ نہیں بولتا اور اس اصلی لفظ کو مجبوراً استعمال کرتا ہے۔ اس کی زبان پر اتنا گراں اور نامانوس نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہی قوم اجنبی لفظ استعمال کرتی جس سے کان ناآشنا تھے۔ یا اس کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہوتی تو مجبوراً قانونِ طبیعی، اختصاصاتِ نژادی و مکانی کے لحاظ سے اس میں اس قدر تبدیلی پیدا کرنی پڑتی کہ جو اس کی طبیعت کے موافق ہو اور کان اس سے مانوس ہوجائیں۔ پس ہر زبان کے لئے نوامیس مخصوص ہیں کہ اجنبی لغات اس کی اجازت سے داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً عربی میں وزن فعلول نادر و نایاب ہے۔ اس کی کمیابی ثابت کرتی ہے کہ اس کا استعمال اہل عرب کیلئے گراں و ثقیل ہے۔ بنابریں اگر کسی اجنبی زبان مثلاً ایرانی سے کوئی لفظ اخذ کیا جائے جو کہ پہلے سے اس میں موجود اور فعلول کے وزن پر ہو تو اس کی نامانوسی اور گرانِ طبعی کے سبب سے اس میں تغیر پیدا کردینگے۔ مثلاً (سَتور) کو دَستُور (وزیر) زُنبور کو زَنبُور تلفظ کرینگے۔ اسی طرح سے وزن (فعلول) کم مستعمل ہے۔ کوئی لفظ ہو تو اس کا ثقل دور کرکے فعلول کے وزن پر استعمال کریں گے۔ یعنی کُرباس کو کِرباس، سرداب ایران سے، زبانوں میں علاوہ اختلاف اوزان کے اختلاف حروف بھی پایا جاتا ہے، مثلاً عربی میں حروف ژ۔ گ۔ پ۔ کا وجود نہیں۔ اگر کوئی ایسا لفظ اس میں شامل ہو تو اس کو دوسرے حرف سے بدل دینگے ژ، ز سے۔ پ، ب سے ف، گ۔ ک رج سے مثلاً یزدگرد۔ (یزدجُرد)۔ گندشاپور (جندیسابور)

اکثر حرکات کا بھی فرق ہوجاتا ہے۔ ان طریقوں سے اہل عرب بآسانی ان الفاظ کو صرفی و نحوی قواعد کے مطابق لاسکتے اور صیغہ جمع میں بھی استعمال کرسکتے ہیں، اس قسم کے تصرفات تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً فرانسیسی میں کوشش سے بھی کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکتا جو غیر زبان کا شامل ہوگیا ہو اور اس میں کوئی تبدیلی نہ پائی جاتی ہو۔ جیسے لفظ لازورد (معرب لاجورد) جب فرانسیسی میں آیا تو Azure ہوگیا باوجودیکہ اس کا "لا" جزو کلمہ ہے اس کو لام تعریف قرار دے لیا۔

فارسی کے متعلق خیال ہے کہ جو الفاظ زبان خارجی سے اس میں داخل ہوئے ان میں تغیر ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی اور زندہ زبانوں کی طرح اس میں بھی جو الفاظ زبان غیر سے داخل ہوتے ہیں ان میں بےحد تغیرات پیدا ہوجاتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ وہ الفاظ جامہ فارسی سے آراستہ ہوکر اپنی اصلیت اور اجنبیت ہی کھودیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے دعوی کی تائید میں مشتے نمونہ از خروارے مثالیں پیش کرونگا۔

(۱) الفاظ کے لئے اکثر اعراب ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی رعایت نہ کی جائے تو معنی ہی خبط ہوجائیں۔ لیکن ایرانی اس کے عادی نہیں وہ نہایت سادگی سے لغت کا استعمال کرتے ہیں، مثلاً اثیر۔ اسیر۔ اساس وغیرہ کو ایک ہی ترتیب سے کہینگے۔

(۲) عربی کے ان کثیر التعداد الفاظ میں، جو کہ جزو فارسی ہوگئے ہیں۔ اکثر تغیرات ہوتے اور اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اکثر اصلی معنی کے بالکل متضاد استعمال ہوتے ہیں، مثلاً لفظ "فراغت" کہ عربی میں اس کے معنی "جزع و قلق" کے ہیں لیکن فارسی میں "آسودگی" کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن عربی کے "فراغ و فروغ" کا مرادف ہے جیسا کہ نظامی کہتا ہے ؎

بسوئے اوج فراغت چناں کنم پرواز
ازیں حضیض کہ بشکستہ است بال و پرم

قصد، عربی میں ارادے کے معنی میں مستعمل ہے۔ فارسی میں علاوہ اس معنی کے "از پے آزار و باکشتن کسے برخاستن" کے بھی آتا ہے ؎

قصدِ جانست طمع در لبِ جاناں کردن
تو مرا بیں کہ دریں کار بجاں می کوشم
حافظ

زجر، کے معنی عربی میں منع کرنا، زور سے ڈانٹنا یا نکالنا کے ہیں

فارسی میں عذاب دادن، شکنجہ کردن کے ہیں ؎

جان بیگانہ ستاند ملک الموت بزجر
زجر حاجت بنود عاشق جاں افشاں را — سعدی

رعنا، عربی میں خود پسند اور احمق کے لئے ہے لیکن فارسی میں خوبصورت خوش قامت کے واسطے۔

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ مارا — حافظ

عربی کی حالت تراکیب فارسی میں حالت وصفی و اسمی میں مستعمل ہوتی ہے مثلاً "لاابالی" عربی میں "باک ندارم" اور فارسی میں کوئی شخص جو کہ کسی چیز کا پابند نہ ہو۔ ؎

لاابالی چہ کند دفتر دانائی را
طاقت وعظ نباشد سر سودائی را — سعدی

اللہ اکبر (خدا بزرگ ہے) فارسی میں تعجب شدید کے اظہار کے لئے کہا جاتا ہے ؎

کنوں ہر کہ آنجا یکہ دیدہ باشد
بصیرت ہمی گوید اللہ اکبر — فرخی

اقبال، عربی میں "روئے آوردن" کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن فارسی میں اس طرح بہت کم مستعمل ہے، بلکہ بخت کے معنی میں باساتذہ کے کلام میں بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے۔ ؎

بکشاد جہ گاں در اقبال بر جہاں
فرخندہ باد بر ملک شرق جہ گاں

(۳) حرکتوں میں تبدیلی کرنا یا بعض حروف میں زیادتی یا کمی کر دینا اکثر کلمات عربی کے الفاظ کو الٹ دینا۔ اس کی مثال فارسی میں بہت ملتی ہے جیسا کہ قِمار (بکسر اول) سے قُمار (بضم اول) حیوان (بفتح اول و ثانی) سے (بفتح اول و سکون ثانی)۔ اکثر عربی کی حرکت پر اور حرکت بڑھا دیتے ہیں مثلاً لہو و عفو (بسکون ثانی) کو تحریک ثانی بھی دے دیتے ہیں۔

فردوسی نے لفظ "عفو" یوسف زلیخا میں کئی جگہ اسی طرح استعمال کیا ہے

دگر راست گوئید با من سخن — عفو تاں کنم کردہائے کہن
عفو کردنت زاں گناہ عظیم — لجاجت بخواہم ز رب کریم

(۴) ایک خاص تغیر جو ایرانیوں نے عربی لغت میں کیا ہے وہ الف کو ی سے مبدل کرنا، یا ادبا کی اصطلاح میں "امالۂ الف" ہے، اس قاعدے کے تحت میں بہت سے عربی الفاظ میں تغیر ہو گیا۔ مثلاً آمن کو بصورت تغیر "ایمن" بولیں گے۔ ؎

خاں را بخانہ باز فرستاد سرخ روئے
باخلوت و نوازش و با ایمنے بجاں — فرخی

"ولکن" بدل کر "ولیکن" ہوا۔ آخر میں تخفیف ہو کر لیک، ولے سے بدل گیا۔ ؎

جرمے نہ کردہ ام کہ عقوبت کند ولیک
مردم بشرع می نکشد ترک مست ہات — سعدی

وہ الفاظ جن کا الف مقصورہ ی سے بدل جاتا ہے، اساتذہ ہمیشہ اس کا قافیہ ی سے کرتے اور الف ممدودہ سے کرنا عیوب سخن میں سے سمجھتے ہیں۔ انوری کہتا ہے ؎

صبا بہ سبزہ بیاراست دار دینی را
نمونہ گشت زمیں مرغزار عقبی را
خدائے عزوجل گوئی از طبیعی مزاج
باعتدال ہوا دادہ جان معنی را

اسی قاعدہ کے مطابق کتاب، رکاب، سلاح وغیرہ کو بدل کر کتیب، رکیب، سلیح کر دیتے ہیں۔

(۵) عربی میں معمولاً اسمائے ناقص کے "یائے آخر" کو بوجہ اجتماع ساکنین حذف کر دیتے ہیں جیسے داعی، قاضی، معطی وغیرہ کو "داع" "قاض" "معط" پڑھتے ہیں۔ لیکن فارسی میں چونکہ اس قسم کے کلمات کا استعمال گراں سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ اسی طرح بولے جاتے ہیں۔

(۶) اکثر عربی مصادر فارسی میں اسمائے مصادر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اسراف، روئت، "عفو" کو ایک مصدر بڑھا کر بصورت مصدر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً اسراف کردن، "عفو کردن"، "عفو شدن"، روئت کردن، روئت شدن وغیرہ۔

(۷) اسمائے جموع کے آخر کا ہمزہ اور مصادر و صفات کا ہمزہ حذف ہو جاتا ہے مثلاً اتقیاء، کبریاء، البقاء، ضیاء وغیرہ ضیا، اتقیا، البقا، کبریا۔

شکر سپاس نعمت و منت خدائے را
پروردگار خلق و خداوند کبریا — سعدی

(۸) الف مقصورہ یا ہمزہ کو جو کہ "بائے اضافہ" یا کاف تفسیر یا واؤ عطف کے بعد آتا ہو پڑھتے وقت حذف کر دیں گے۔ بآب، بآسمان

بآشکم کو باب، باسمان، دبشکم پڑھیں گے۔ ۵
چو روئے یار من شد دہر گوئی
ہمی چہرہ بشوید بآب کوثر — دقیقی

فاطمہ لیاقت، بگرام

عظمتِ نسوانی!

شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام کی ایک دلکش بنگالی نظم کا ترجمہ

میری نگاہ میں مرد و عورت سب برابر ہیں! —— دنیا کے حشمت و جلال کی تعمیر میں عورت کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا مرد کا! —— سوز و ساز، خلش و تپش، ریاکاری اور آنسو، ان کی تخلیق میں مرد کا اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا عورت کا! دیوی! —— تجھے گناہ کا سبب کون بتائے؟ کہدے! —— گناہ کا تخم بونے والا ابلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا۔ اس جہان میں جتنے درخت ابھرتے ہیں، جتنے پھول کھلتے ہیں —— عورت ہی نے ان میں رنگ و بو۔ شیرینی و لطافت کی روح پھونکی ہے! —— ہمنشین تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے اندر ممتاز آرام کر رہی ہے، باہر شاہجہاں محو خواب ہے!

عورت دل ہے —— مرد جسم، —— اگر مرد سورج کی تپش یا باد سموم کا جھونکا ہے تو عورت —! "چاند کی کرن" اور نسیم صبح گاہی! —— اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جام کوثر، عورت ہی نے شاعری کی بنیاد ڈالی اور مرد کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا —— مرد نے ہل چلایا —— عورت نے پانی سے سینچا —— ان دونوں کے جوگ سے کھیتی لہلہا اٹھی، مرد کی ہر فتح و ظفر عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا۔ لیکن یہ کون بتائیگا کہ کس کے لئے عورتوں نے کس طرح اپنا سہاگ اجاڑا، اور ماں نے دل کے ٹکڑوں کو کیونکر نکال پھینکا —؟ شجاعت کی داستانوں میں کب لکھا ہے کہ کس کس فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے برق دم بنا دیا تھا —— اس لئے —— مرد سن لے کہ عورت کو جتنا کچلے گا اتنا ہی نامرد ہوتا جائے گا۔!

عورت! —— تو نے اپنے نازک ہاتھوں سے دنیا کو آج تک امرت کے پیالے پلائے ہیں۔ لیکن اب انہیں ہاتھوں سے سم قاتل پلائے جا —— پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب مرد کے ساتھ ساتھ عورت کے اعزاز میں بھی زمین سے شادمانی کے نعرے بلند ہونگے!

(ترجمہ) فاطمہ لیاقت (منشی فاضل)

سائیں بابا

اثر خامہ علامہ امجد حیدرآبادی

دنیائے دوروزہ میں امجد! کیا جانے کیا کاہش ہوتی ہے
اک خواہش پوری ہوتے ہی پھر دوسری خواہش ہوتی ہے
ہے موت وحیات کا ہنگامہ، ہر دم میں وجود اور دم میں عدم
دم بھر کیلئے جو ہنستے ہیں وہ دھوپ میں بارش ہوتی ہے
تم جس کو کمال سمجھتے ہو، وہ زوال کا ہے زینہ بابا

پیدائش سے مرنے تک بچوں کی طرح سب روتے ہیں
ہم جیسے جاگنے والوں سے اچھے ہیں جو قبر میں سوتے ہیں
جب ساری زمیں گردش میں ہے پھر ہمکو سکوں کیا خاک ملے
ہم فکر میں خاطر جمعی کی بیکار پریشاں ہوتے ہیں
اب اس کا نکلنا مشکل ہے جو ٹوٹ گیا کانٹا بابا

ہر بند کلی کو کھلنا ہے، ہر سانس کو تن سے نکلنا ہے
ہر شخص کو خاک میں ملنا ہے، ہر جسم کو سڑنا گلنا ہے
جو کرنا ہے وہ بھرنا ہے، جو لینا ہے وہ دینا ہے
ہر نیکی کا بدلہ ملنا ہے، ہر شاخ بدی کو پھلنا ہے
مشہور مثل ہے دنیا میں، "ہر جیسے کو تیسا بابا"

رونے کے سوا یاں کام نہیں، دنیا میں خوشی کا نام نہیں
یاں کوئی مسرت ایسی نہیں ہے، غم جس کا انجام نہیں
ہر پھول کی تہ میں کانٹا ہے، ہر سبزی کے نیچے کالا ہے
سب لوٹتے ہیں انگاروں پہ، یاں چین نہیں آرام نہیں
ہے سارے جہاں کا حال یہی اک تو ہی نہیں تنہا بابا

ہر کھونے کے آخر پانا ہے، ہر پانے کے آخر کھونا ہے
ہر رونے کے پیچھے ہنسنا ہے، ہر ہنسنے کے پیچھے رونا ہے
پتری، بالک، دھن، دولت ہے، عیش وطرب ہے، اور راحت ہے
یہ ہے، وہ ہے، سب کچھ ہے، ہر ہونے کے بعد نہ ہونا ہے
سمجھا دیا جو سمجھانا تھا، اب سائیں یہاں سے چلا بابا!

یہ نظم ہمارے ایک فقیر دوست سائیں بابا کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ — احمد حسین، امجد،

ڈراما!

"زبان تھا نہ سُودتھا"

از جناب پارٹیالوی بی۔ اے (آنرز)

افراد،

نعیم، ——— ایک رئیس زادہ،
عذرا، ——— نعیم کی بیوی،
ضیا، ——— بیرسٹر، عذرا کا کالج کلاس فیلو اور دوست،
جمیلن، ——— خادمہ،
خدابخش، ——— خانساماں،

(بالکونی نما کا کھلا سا برآمدہ جس میں ملحقہ کمرے کے دو دروازے کھلتے ہیں سامنے چھوٹا سا خوبصورت کٹہرہ لگا ہوا ہے۔ غالیچے پر دائیں جانب پیانو اور ذرا ہٹ کر بید کی تین کرسیاں، ایک پر نعیم بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ پاس ہی تپائی پر ایش پلیٹ میں رکھا ہوا سگریٹ دھواں دے رہا ہے۔ دوسری پر عذرا سوزن کاری میں مشغول ہے۔ سامنے چنار کے درخت اور پہاڑ نظر آرہے ہیں۔ آسمان ابرآلود ہے ——— عذرا کی آنکھیں اچانک آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ موسم کی عمدگی سے متاثر ہو کر لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی ہے اور وہ بے اختیار پیانو پر جا بیٹھتی ہے۔ مگر نعیم کو مصروف مطالعہ دیکھ کر پھر اپنی جگہ پر آبیٹھتی ہے اور سوزن کاری میں مشغول ہو جاتی ہے۔ نگاہیں بار بار اوپر اٹھتی ہیں۔ آخر ایک آدھ گھڑی کے بعد کہتی ہے)

عذرا۔ اخبار میں سب ہی کچھ بھول گئے۔ شاعر ہو کر یہ بے توجہی۔ موسم تو دیکھئے۔

نعیم۔ (سر اوپر اٹھاتا ہے) اہاہا! آنے دو گھٹائیں پیاری، گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا (اخبار کو تپائی پر رکھتے ہوئے) اس میں بھی یہی کچھ پڑھ رہا تھا۔ (سگرٹ کو اٹھا کر کش لیتا ہے)۔

عذرا۔ یہی کچھ کیا؟

نعیم۔ یہی کچھ موسم کا ذکر۔ کوئی ڈاکٹر شاہ ہے۔ باٹنی کا پروفیسر، کسی پودے کی تلاش میں گلمرگ گیا تھا۔ اس نے وہاں کے حسین مناظر اور دلکشا موسم کی بہت تعریف کی ہے۔ میں اس کی روئداد سفر دیکھ رہا تھا۔

عذرا۔ وہ بیچارہ مناظر سے وہاں کیا محظوظ ہوا ہوگا۔ کیا اتنا ہو سکتا ہے جتنا ہم اُس روز پکنک پر ———؟

نعیم۔ واقعی، اس روز تو کمال ہو گیا تھا۔ صرف تیری معیت کا اثر تھا عذرا، جو میں نے اس روز اپنی زندگی کو اس قدر مستغرق لطف و لطافت پایا۔ کہ کشمیر کے مرغزاروں میں پہلے کئے ہوئے سب سفر ہیچ ہو گئے تم جیسے خزینۂ یگانہ کے پہلو بہ پہلو شراب عشق سے مدہوش ہو کر ان دلاویز لالہ زاروں میں ان وجد انگیز خوشبوؤں میں سیر کرتے رہنا کیا بھول جانے والا واقعہ ہے؟ تم جیسے لطیف نادرۂ عشق کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر ان بلند قامت چناروں کے نیچے (چناروں کی طرف اشارہ کرتا ہے) اس مملکت حسن میں جہاں اس عطر بیز ہوا، اس نسیم عشق و سودا میں سانس لیکر، اس سوئے ہوئے سبزے پر مصروف گلگشت ہونے کا کوئی نعم البدل ہو سکتا ہے؟

عذرا۔ ہوں، ہوں، (اٹھتی ہے) آپ تو بس یونہی (نعیم کے پیچھے کھڑی ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہاتھ کو چوم لیتا ہے)

نعیم۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں (اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے سینہ

پر رکھ لیتا ہے) میری عذرا! تم نے پچھر کے جو رنگ نہ دیکھے تھے اب دیکھ رہی ہو کہ نہیں ؟

عذرا ۔ (لجاجت سے) دیکھ رہی ہوں، آپ کی بدولت،

نعیم ۔ کیا ؟

عذرا ۔ کیا ؟ قدرت کے جنت نگاہ مناظر میں ایک "سحر" محسوس کر رہی ہوں (سامنے پہاڑوں کی چوٹیوں اور چناروں کو دیکھتی ہے) درختوں کی سرسراہٹ میں جو نہ سنا تھا اب سن رہی ہوں۔ جو خوشبوئیں کبھی نہ سونگھی تھیں اب وہ میرے مشام جان تک پہونچ رہی ہیں۔ آپ کی بدولت، صرف آپ کی،

نعیم ۔ (اپنے سر کو کرسی کی پشت پر ٹیک کر عذرا کے چہرے کو تکتے ہوئے) اس سحر اور خمار کی روح رواں تم ہو، عذرا، تمہیں نے، صرف تمہاری موجودگی نے قدرت کے ان روح پرور نظاروں میں شعریت کا رنگ بھر دیا ہے ورنہ میرے لئے یہ اتنک پھیکے چلے آ رہے تھے۔ (اس کو ہاتھ سے موڑ کر سامنے کی کرسی پر بٹھاتا ہے) ؎

تیری مناسبت سے بہاروں میں رنگ ہے میرے تصورات سے ہے حسن ماہ میں

عذرا ۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اتنا مبالغہ !

نعیم ۔ عذرا، یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ بتاؤ گلمرگ کی خاک آخر کب پامال ہونے کی آرزو مند رہیگی۔ بیچاری تمہارے پاؤں چومنے کو ترس رہی ہے۔

عذرا ۔ اس طرح کیوں کہتے ہیں آپ ! بس یہی تو جی چاہتا ہے کہ مجھ غریب کو بناتے رہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس پروفیسر نے طبیعت اکسائی ہے۔

نعیم ۔ میں نے تو گلمرگ میں ایک سیزن گزارا ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ جانا تو نصیب نہیں ہوا نا ؟

عذرا ۔ میرے ساتھ جانے میں کیا ہے؟

نعیم ۔ تمہارے ساتھ جانے میں ؟ مت پوچھو، پھر کہو گی مبالغہ کرتا ہوں ۔

عذرا ۔ اونہہ، بھول گئی،

نعیم ۔ نہیں اپنے سوال کا جواب لو ۔ (عذرا مسکرا کر اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہے) باغ کی ملکہ معلوم ہے کون ہوتی ہے — ؟ بہار — اس کی عدم موجودگی میں چمنستان کا دربار درہم برہم رہتا ہے مگر جونہی وہ آئی اس کے حضور میں وہ دربار اپنی پوری شان حاصل کر لیتا ہے،

پھول کھلے جاتے ہیں، کلیاں شگفتہ ہو ہو جاتی ہیں، بلبلیں سینہ پھاڑ پھاڑ کر گاتی ہیں۔ میں جب گلمرگ میں رہا ہوں وہاں کے تمام محاسن طبعیہ رائگاں جا رہے تھے۔ ملکہ موجود نہ تھی۔ اب جب تم جاؤ گی عذرا پھول کھل جائینگے۔ میں تمہیں ان ہاتھوں سے گن گن کر بتاؤنگا کہ، یہاں یہ موجود نہ تھا۔ وہاں وہ موجود نہ تھا۔ یہاں گلاب نہ تھا وہاں آبشار نہ تھا، پھر اگر یہ تیری خاطر داری نہیں تو کس کی ہے ۔؟

عذرا ۔ توبہ توبہ، جانے دیجئے، اچھا میں چلونگی، (مسکرا کر) مگر آپ خدا را وہاں مچھلیاں نہ پکڑیں ۔ (دونوں ہنستے ہیں) ۔

نعیم ۔ (مسکراتے ہوئے) اس روز تمہارا کہنا پتھر پر لکیر ہو گیا ۔ ورنہ میں نے اسی ڈوری سے کئی بار شکار کیا ہے ۔

عذرا ۔ میرے کہنے پر کہ کوئی مچھلی نہیں پھنسے گی آپ کو بھی ضد ہو گئی، اور پھر آپ کی ناکامی، توبہ، لطف دیگئی، میں واقعی اس روز بہت ہنسی تھی۔

نعیم ۔ تعجب ہے، تم کھاتے وقت تو میز پر مچھلی کا ایک ٹکڑا نہیں چھوڑتیں پکڑتے وقت روکتی ہو کر ننھی جانیں ہیں ۔ (قہقہہ)

عذرا ۔ ہائے اسی تکرار میں تو میری نئی ساری خراب ہو گئی،

نعیم ۔ پانی اتنا گدلا تو نہ تھا ۔؟ بچاتے بچاتے بھی پاؤں جا پڑا ۔

عذرا ۔ اگر میری ساری پر داغ نہ پڑ جاتے تو پکنک بہت ہی اچھی تھی۔ شاید پٹرول سے مٹ جائیں ۔

نعیم ۔ (بے پروا ہو کر) مٹ جائینگے۔ آتشی ساری اور تمہارا بدن۔ خوب پھبتی تھی اس دن۔ یہ ساری، رنگ تو اچھا ہے مگر وہ چیز دیگر تھی ۔

عذرا ۔ (پلّو کو ہاتھ میں لیکر) کپڑا ذرا گف ہے ۔

نعیم ۔ واقعی پردہ نصف لطف زندگی ضایع کر دیتا ہے ۔ کیوں عذرا، ہم اپنی موجودہ زندگی سے جو حظ اٹھا رہے ہیں وہ پردہ کے حامیوں کو کہاں نصیب ؟ کیا وہ اتنی آزادی سے پکنک پر جا کر اس طرح گلچھرے اڑا سکتے ہیں، شاید اس مسرور زندگی کی ایک جھلک بھی ان تک نہ پہونچ سکے

عذرا ۔ کل آپ پردے کے حامی بنے ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی آپ کی ۔

نعیم ۔ حامی نہ تھا۔ پردہ اٹھنے کے چند نقائص کہہ رہا تھا ۔ بالخصوص جب کوئی غیر شخص بیوی کی طرف گھور کر یا ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو کم از کم میاں تو برداشت نہیں کر سکتا خصوصاً میری خودداری تو اس کی متحمل نہیں ہو سکتی

عذرا - قریباً ہر چیز کے پہلو بہ پہلو چند ایک برائیاں بھی تو ہوتی ہیں جہاں گل ہے، وہاں خار بھی ہے۔

نعیم - ہاں ٹھیک ہے، مگر یہ وہ خار ہے جو مجھے بے طرح لہولہان کئے دیتا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ ہی کی بات ہے، ٹینس پر تم لیڈی کپور سے باتوں میں مشغول تھیں۔ میں کرسی پر لیٹا سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر چودہری نے پارٹنر بنانے کے لئے بیحد اصرار کیا۔ مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے اسے ٹال دیا۔ میں اس وقت تجھے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر دراز ہو کر تجھے دیکھتے رہنا میری پیاری عذرا میرے لئے بہت بڑی دماغی عشرت ہے۔ میری نظر اچانک جو پھری تو ضیا پر پڑی، میں نے وہاں وہ کچھ دیکھا جو میری تفریح کی بربادی اور تخریب عشرت کے لئے بہت کافی تھا۔ وہ تجھے دیکھ رہا تھا۔ کن نظروں سے ـــــ میں نہیں بتا سکتا نہیں بتاؤنگا۔ اس کی آنکھوں میں ذلت، ہوس . میں نہیں ـــــ بتاؤنگا۔ وہ لعین ہے۔ خبیث!

عذرا - ہیں ہیں! کیا ہو گیا؟ ضیا، میں اسے چار پانچ سال سے جانتی ہوں۔ بڑا اچھا ہے۔

نعیم - تم عورتیں سادہ لوح ہو۔ مرد کو نہیں جانتیں۔ وہ کس طرح اچھا ہے بتاؤ؟

عذرا - (گھبرا سی جاتی ہے) میں کالج کے زمانے سے اسے جانتی ہوں۔ ہمارے گروپ کا سیکریٹری تھا۔ میرا اور مس وارث کا ہم جماعت اور بڑا رفیق تھا۔

نعیم - ہوگا، مگر اب یہ "تجدید رفاقت" مجھے نہیں بھاتی۔ انگلستان کا پانی پی کر آدمی میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ مجھے تم نے اس سے متعارف کیوں کرا دیا۔ اب وہ ہر دوسرے تیسرے دن آ دھمکتا ہے۔ اس کی یہ بے تکلفی اچھی نہیں، تم اس سے ملنا کم کر دو پھر دیکھوں کیونکر آتا ہے۔

عذرا - (تمتمائے ہوئے چہرے سے) آپ تو غصے میں آ گئے۔ نہ خطا، نہ قصور، میں ہر حکم ماننے کے لئے تیار ہوں مگر یہ تو کہئے آخر اس میں آپنے کون سی اتنی بڑی برائی دیکھی ہے جو اس طرح پنجہ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، مہذب ہے، انگلستان کا فارغ التحصیل ہے، چونکہ نیا نیا یہاں آیا ہے، اس کی یہاں کسی سے لمبی چوڑی ملاقات ہے نہیں، اس روز سڑک پر اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ ادہر ادہر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے قیام کے متعلق پوچھنے پر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میری شادی ہو گئی ہے تو اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھے مبارکباد دی، اور آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، ایسا ہی ہے نا، جیسے آپ کے کسی رفیق کی شادی ہو جائے تو کیا آپ اس کی بیوی کے دیکھنے کے خواہشمند نہ ہونگے؟ اس بیچارے کا قصور کیا ہے آخر؟ یہی کہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے؟ آپ کی طبیعت میں وہم بہت ہے اگر اس نے دیکھ بھی لیا ہے تو کیا ہے؟

نعیم - کیا ہے؟ میری طبیعت کو مکدر کرنے کے لئے بہت کافی ہے، میں بہت بڑا خود غرض ہوں سنا تم نے! تمھارے چہرے پر میری جمی ہوئی نظر کو اس بات کا احساس ہونا کہ وہاں کسی اور کی بھی گہری نظر بھٹک رہی ہے مجھے زندہ درگور کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کسی کی نگاہ ہوسناک کو کیا مجال کہ تیرے رخسار سے چھو بھی جائے۔ ضیا کو تجھے بار بار دیکھنے کا کیا حق تھا؟ ایک خاتون کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا اور پھر اس کے شوہر کی موجودگی میں، بھری کلب کے اندر یہ کہاں کی تہذیب ہے؟ اس کی آنکھیں مجھے اس وقت سے لیکر اس وقت تک خطرناک معلوم ہو رہی ہیں۔ اس مہلک حادثہ کی بنا پر رقابت و خوف کی آگ کے ناقابل تحمل سوز شعلے مجھے اندر ہی جلا رہے ہیں، تم کہتی ہو کہ اگر اس نے دیکھ لیا ہے تو کیا ہے؟

عذرا - وہ کیا تھیں نظریں! توبہ، جنھوں نے اتنا برانگیختہ کر دیا ہے۔ آپ کا دماغ بہت وہمی واقع ہوا ہے۔ بے بنیاد وہموں اور فکروں کو جگہ دیدینا بھی تو اچھا نہیں ہوا کرتا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی اس وسیع قلبی، وسیع قلبی ہی کہوں نا؟ اور خود غرضی نے اتنی شدید اور مہلک صورت اختیار کر لی ہو کہ ضیا کی معمولی نگاہ کو بھی آپنے کیا کیا سمجھا۔

نعیم - آہ کاش! یہ حقیقت نما وہم! بے بنیاد وہم بھی بن جائے میں نے تو اسی دن سے اس کی حرکات و سکنات کو جانچنا، تولنا شروع کر دیا تھا۔ عذرا، کیا کہوں، ہر چیز وہم سے روشن حقیقت اور شک سے تیقن میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اگر علم النفس کا سالہا سال کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی چشم زدن میں غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ان معرکۃ الآرا کتابوں کا انبار، اگر نفس کے اسرار و رموز پر لکھے ہوئے وہ ڈھیر جو میری نظر سے گزر چکے ہیں، ایک پل میں بے نتیجہ

لاحاصل اور بے معنی ہوکر ہو یا بُرد ہو سکتے ہیں تو میں مان لوں کہ میں نے اس ملعون کی مختصر اور معمولی نگاہ کو اپنی کوتاہی کے سبب اصل سے بہت زیادہ سمجھا ہے۔ مگر عذرا اس نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں اس کی آنکھوں میں اس کا ناپاک دل اچھل رہا تھا اس کی آنکھیں بہت خطرناک ہیں، تمہیں بچنا ہوگا عذرا سنتی ہو۔

عذرا۔ (ذرا تنک کر۔ آنکھیں پرنم ہیں) یا خدا میری جان کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ پیارے نعیم ان ہلکی باتوں کو خدارا ختم کرو۔ آپ کن واہی خیالات میں بھٹک رہے ہیں۔ چھوڑو ان کو۔ یہ ہم کیا اچھی باتیں کر رہے تھے۔

نعیم۔ میں آج تک اس غبار کو روکتا رہا، مگر آج شدت جذبات سے زبان آپ ہی آپ کھل گئی، میں نہیں چاہتا کہ ضیا میرے مکان پر آئے۔ تمہارے دوستانہ مراسم تو کجا۔ میرے لئے تم دونوں کی صاحب سلامت بھی گراں خاطر ہے۔ اس کو تم خود کہہ دو کہ میرے مکان کی دہلیز سے نہ گزرے ورنہ خود میں اس کو وہ ڈانٹ دونگا کہ یاد کریگا۔ اور تم اس سے فوراً اگلے پچھلے تمام تعلقات منقطع کردو۔ بس،

عذرا۔ کیا یہ باتیں میں نعیم سے سن رہی ہوں جو ———!

نعیم۔ ہاں نعیم سے جس کو عذرا کی معشوقیت اور محبت نے تنگدل بنا دیا ہے۔

عذرا۔ کچھ سوچئے بھی تو۔ دو دن کی یگانگت کو قطع کرنا مشکل سا معلوم ہوتا ہے چہ جائیکہ برسوں کے دیرینہ مراسم کو چشم زدن میں منقطع کر دیا جائے۔ کالج کا ہم جماعت، ٹینس کا پارٹنر، پیارا رفیق، اور پھر طرہ یہ کہ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ضیا تو مجھی ہی کو اس معاملے میں قصور وار گردانیگا یا مجھے ناشائستہ، بد اخلاق اور متکبر کیا کیا کچھ نہ کہے گا۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ ضیا جو آج تک میرا احترام کرتا رہا ہے مجھے بالآخر برے الفاظ سے یاد کرے۔ ڈیر نعیم! میں آپ کا ہر جائز حکم ماننے کیلئے تیار ہوں۔ آپ تسلی رکھئے میں وہ طریقہ اختیار کرونگی جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ذرا صبر سے کام لیجئے گا۔ میں آہستہ آہستہ آپ کے حکم کی تعمیل بجا لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرونگی۔ آدمیت کا اور تعلیم یافتہ ہونے کا تو یہی تقاضا ہے کہ میں آج کل پرسوں ہولے ہولے اس سے تعلقات کا دامن سمیٹ جاؤں اس طرح کہ اسے محسوس بھی نہ ہو اور اگر ہو بھی تو وہ اسے محض اپنے وہم ہی پر محمول کرے۔ زندگی میں کون کسی سے کوئی روز روز ملتا ہے۔ میرے اچھے نعیم جی! میرے اخلاق کی ہر کس و ناکس کے سامنے تعریف کرنے والا، میرا پرانا مداح، انجام کار میری طرف سے یوں خواہ مخواہ شاکی ہو جائے۔ کیا فائدہ نعیم میرا بھرم بنا رہنے دو۔ پچھلے دوشنبہ کو وہ مجھ سے مس وارث کی شکایت کر رہا تھا کہ اس نے اس کے انگلستان سے بھیجے ہوئے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ درآنحالیکہ میں قریباً ہر خط کا جواب دینا اخلاقی فرض سمجھتی رہی ہوں۔ میں جانتی تھی وہ حساس اور زود اثر آدمی ہے۔ میرا بھی بھلا خط لکھنے میں آخر کیا گھستا تھا۔ آخر کوئی خوشی خوشی ملے تو اسے دھتکار نہیں دینا چاہئے۔

نعیم تم خط کا جواب دیتی رہی یا نہ دیتی رہی ہو، پچھلی باتوں کو چھوڑو جن اخلاق کا وہ مالک ہے۔ میں جان گیا ہوں، میں پاگل نہیں، نادان نہیں بے سمجھ نہیں۔ تم کو جو کہتا ہوں ماننا پڑیگا۔ معاملے کو طول نہ دو اگر تمہیں میرے دل و دماغ کی پریشانی و ویرانی کا خیال ہے تو یہ معاملہ آج ہی دو ٹوک ایک کر دو۔

عذرا۔ مگر ———!

نعیم۔ میں اگر مگر سننے کے لئے تیار نہیں میں بس رو رعایت لائیں ہی میں اس کا بہت لحاظ کر چکا ہوں، کوئی اور ہوتا تو میں آنکھیں نوچ لیتا خدا کی قسم!

عذرا۔ مگر آپ اتنا تو خیال کریں کہ ———،

نعیم۔ کر چکا، بہت کر چکا ہوں، عذرا میرا سر کھاؤ۔ تمہیں میرا کہنا ماننا ہوگا کیا آج آئیگا وہ؟ ——— بولو، بولتی نہیں؟؟

عذرا۔ (منہ ڈھیلا چھوڑ کر) شاید ———!

نعیم۔ سن لیا جو میں نے کہا؟

عذرا۔ (آنکھیں پونچھتے ہوئے) آج؟؟؟ دو ایک کی مہلت،

نعیم۔ پھر وہی بحث، میں کہتا ہوں آج، ہاں کہو یا نہ۔

عذرا۔ کل سہی!

نعیم۔ پھر میں نپٹ لونگا اس سے آج،

عذرا۔ میرے اچھے، آپ کیوں تیز ہو رہے ہیں؟

نعیم۔ (کرسی سے اٹھ کر ملحقہ کمرے میں داخل ہو جاتا ہے) تیری ضد۔ بہت اچھا،

عذرا ۔ میرے خدا میں کیا کروں ۔ ان کو بے وجہ ضد ہو رہی ہے ۔ ضیا، کو جہاں تک میں جانتی ہوں بہت نیک اور عمدہ آدمی ہے ۔ میں آج تک اس کی عزت کرتی آئی ہوں ۔ ان خوشگوار حالات میں میں کیوں کر اس کو اپنے مکان پر آنے سے یا کلب میں ملنے سے انکار کر دوں ۔ وہ نو وارد ہمارے سوا اس کا یہاں کوئی واقف نہیں ، کبھی کبھی آ جاتا ہے ، ہائے قدرت کی ستم ظریفی ، بہت سا اللہ گزشتہ ایام میں ہماری یگانگت نے وہی طالب علمی کی سی دوستی کی بلندی اختیار کر لی ہے ۔ اگر مجھے بالآخر اسے دھکا دیکر ہی گرانا تھا تو ہم اتنی بلندی پر نہ پہونچ گئے ہوتے ، اسے چوٹ آ جائیگی ، ہائے مجھے برا کہیگا ۔

(نعیم ہاتھ میں کوئی کتاب لئے کمرے سے برآمدے میں آتا ہے ۔ اپنی کرسی گھسیٹ کر عذرا سے کچھ دور پر بیٹھ کر کتاب پڑھنا شروع کرتا ہے ۔ اس کی تھوڑی پشت عذرا کی طرف ہے ۔ عذرا بھی اسے دیکھ کر تپائی پر سے اخبار اٹھا کر پڑھتی ہے ۔ کبھی کبھی نعیم کو کن انکھیوں سے دیکھ لیتی ہے ، مگر ایک آدھ منٹ کے بعد اخبار کے مطالعہ میں منہمک ہو جاتی ہے)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

منظر دوم

(دائیں طرف کوٹھی کا ایک ہشت پہلو کمرہ ، جس میں دو دروازے ہیں ایک بالکل سامنے اور دوسرا دائیں طرف برآمدے میں اس دروازے کے مقابل ، اسی کمرے کی ایک کھڑکی جس کا رخ میدان میں ہے ۔ کچھ فاصلے پر بائیں جانب باورچی خانہ ہے ۔ جس کی چمنی سے دھواں نکل رہا ہے ۔ میدان میں کچھ بجری بچھی ہوئی ہے اور گملوں سے آراستہ ہے ۔ پس منظر پہاڑ کی چوٹیاں نظر آتی ہیں ۔ نعیم ہاتھ میں دو ایک پیکٹ لئے اور ایک نئی چھتری جس پر ابھی کاغذ کا غلاف لپٹا ہوا ہے بائیں جانب سے آتا ہے ۔ ہشت پہلو کمرے میں عذرا پیانو پر گا رہی ہے ۔ ع

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہیں تو ہو

وہ کھڑکی کے قریب آ کر رک جاتا ہے اور گانا سنتا ہے ! ۔

نعیم ۔ (مسکرا کر) کیا سریلی آواز ہے ، شعلہ سا لپک اٹھتا ہے (اندر سے ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز آتی ہے اور پیانو مدھم ہو جاتا ہے) خوب ہی کیا ہنس رہی ہے واہ ۔۔۔! (ایک گملے پہ پاؤں رکھ کر کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر جھانکتا ہے اور گھبرا کر اتر آتا ہے) ضیا ۔۔۔ ضیا ۔۔۔ (پیکٹ ہاتھ سے گر پڑتے ہیں ۔ پیانو رک جاتا ہے ۔ خود ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور چھتری کی نوک ایک گملے پر رکھ کر جھک کر سوچتا ہے) ۔۔۔۔ ضیا سے ہنس رہی ہے ۔۔۔ ضیا ۔ آہ یہی تمام اندیشے مجھے برباد کئے جا رہے تھے ، خوف و اضطراب کی خبیث روحیں جو کئی دن میرے آشیانۂ مسرت پر منڈلایا کرتی تھیں مجھے اب کھا رہی ہیں نگل رہی ہیں ۔ آہ ، میں کیا کروں ۔ ضیا ۔۔۔۔ ضیا کا گلا بازا رمیں دبوچ لیتا ۔ اسے مار ڈالتا ۔ میرے قریب ہی سے تو گزر گیا تھا ۔ میں نے نہ جانا شیطان اسی طرف آ رہا تھا ۔ (بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے ، وہ مقفل ہے ۔ دوسرا کھولتا ہے ، وہ بھی ۔ لات مارتا ہے) عذرا ، عذرا ، دروازہ کھولو ، سنتی نہیں ، عذرا (پہلے دراڑوں میں سے دیکھنے کی پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا ہے پھر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے) میں کواڑ توڑ دونگا ، سنتی ہو ، (برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ہیجانی حالت میں ادھر اُدھر پتھر تلاش کرتا ہے ۔ اتنے میں دیکھتا ہے کہ خادمہ جائے لئے جا رہی ہے اور برآمدے کے قریب پہونچ چکی ہے) جمیلن جمیلن (وہ ایسے چلی جاتی ہے جیسے سنا ہی نہیں ۔ نعیم اس کی طرف بھاگتا ہے اتنے میں وہ اندر داخل ہو جاتی ہے اور دروازہ فوراً کھٹ سے بند ہو جاتا ہے وہ لپکتا ہے اور دروازے کو مقفل پاتا ہے ، لات مارتا ہے) اندر کیا ہو رہا ہے آج ؟ جمیلن ، تو باہر آ لے ، تیری گردن نہ اڑا دوں تو (ایک طرف ہو کر ماتھے پر ہاتھ مار کر آہستہ سے) اے خدا یہ کیا سازش ہے ۔ وہ چلائے پی رہے ہیں کیا ؟ عذرا کے کانوں کو کیا ہو گیا آج ؟ کیا ضیا اسے دروازہ کھولنے نہیں دیتا ۔ (جوش میں آ کر) او ذلیل ، کمینے ضیا ، خبیث ، اگر اپنی خیر چاہتا ہے تو دروازہ کھول دے ۔ کھول دے میں تجھے کہہ رہا ہوں ۔ آخری بار ، (دروازہ کو پھر کھٹکھٹاتا ہے) عذرا ۔۔۔۔! نعیم بول رہا ہے ، سنتی نہیں ، میں پولیس کو بلوا لونگا ۔ ضیا اندر ہے میں جانتا ہوں ، تم کچھ اپنی ، میری عزت کا خیال کرتی ہو تو دروازہ کھول دو ۔ میں تجھے معاف کر دونگا ۔ ہاں دروازہ کھول دو میں وعدہ کرتا ہوں ، اگر میں کواڑ توڑ کر اندر آ گھسا تو پھر تم دونوں کی خیر نہیں سن لو ، یہ میرا آخری فیصلہ ہے ۔ میں نادان نہیں ہوں ، میں معاملے کو اب پہچان گیا ہوں ۔ (دروازے کو پھر کھٹکھٹاتا ہے ۔ مایوس ہو کر پتھر تلاش کرتا ہے اور دھیمی آواز میں کہتا ہے) آہ ، عذرا کو میں آج تک فرشتہ خصلت سمجھتا رہا ۔ میری بھول تھی ، اس کے محبت بھرے الفاظ کو معراج زیست سمجھ رہا

تیری حماقت (سر پر ہاتھ مارتا ہے) آہ، وہ عورت نکلی، صرف عورت، مکار، فریبی، دغا باز، (اس کی نظر گلے پر پڑتی ہے اسے اٹھا لاتا ہے اور دروازے پر دے مارتا ہے گلا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے) بیوی کے ساتھ آج نوکروں نے بھی سازش پر کمر باندھ رکھی ہے۔ جمیلن، تجھے تو آج میں زندہ نہیں چھوڑتا۔ (برآمدہ سے اترتا ہے) او خدا بخش، او خدا بخش! (باورچی خانے کی طرف جاتا ہے۔ اس کا دروازہ بھی بند ہے) آج سب دروازے بند ہو رہے ہیں۔ آہ میر خدا، آج میرے دل کا دروازہ بھی عذرا پر بند ہو جائیگا ـــــ وہ بھی کیا یاد کریگی۔ (دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے) ـــــ او خدا بخش!

خدا بخش ۔ (دروازہ کھولتے ہوئے) جی حضور ـــ آپ ہیں حضور۔

نعیم ۔ او حضور کے بچے، دروازہ کیوں بند ہے؟

خدا بخش ۔ جی، جی، ہوا سرد چل رہی تھی۔

نعیم ۔ جی ہاں، باہر تو تو نیا ہو رہا ہے۔ بکتا کتنا ہے؟ جمیلن کہاں ہے؟

خدا بخش ۔ اندر بیٹھی ہے حضور۔

نعیم ۔ اندر ـــ ؟؟؟

خدا بخش ۔ جی صاحب!

نعیم ۔ کہاں ہے وہ؟ باہر تو بلا اُسے۔

خدا بخش ۔ جمیلن! باہر آؤ، صاحب بلا رہے ہیں۔

(جمیلن آتی ہے، نعیم ہکا بکا رہ جاتا ہے)

نعیم ۔ کہاں تھی اتنی دیر تو؟

جمیلن ۔ یہیں بیٹھی تھی حجور ـــ!

نعیم ۔ یہیں؟ جھوٹ بکتی ہے تو، چائے لیکر تو نہیں گئی؟

جمیلن ۔ کہاں حجور ـــ؟

نعیم ۔ کہاں کی بی۔ اندر کمرے میں بیگم صاحب کے پاس۔

جمیلن ۔ کب؟

نعیم ۔ ابھی پانچ سات منٹ ہوئے۔ بھلا تو جانتی ہے۔ جب میں نے تجھے آوازیں دی تھیں اور تو سنی ان سنی ایک کرکے اندر گھس گئی۔

جمیلن ۔ بھلا میں آپ کی آواز نہ سنوں۔ حجور کبھی ہو سکتا ہے۔

نعیم ۔ (غصہ سے تلملا کر) بہت اچھا یہ بات ہے۔ کیوں او خدا بخش! یہ چائے لیکر نہیں گئی؟

خدا بخش ۔ نہیں غریب نواز!

نعیم ۔ ابے او بڈھے کھوسٹ، تو بھی جھوٹ بکتا ہے۔ یہ ڈاڑھی دیکھ، مجھے جھٹلا رہا ہے نمک حرام، کیا میں اندھا ہوں؟ میں نے خود اسے جاتے دیکھا ہے (جمیلن سے) کیا نادان بنی کھڑی ہے۔ بول سچ ورنہ اڑاتا ہوں (ایک دھپڑ دیتا ہے) بول نہیں تو یہ ایک اور (ایک اور دھپڑ دیتا ہے) تیری کھال ادھیڑ دونگا۔

جمیلن ۔ جی۔ بو۔ لیتی ہوں ـــ (خدا بخش کانپتا ہے)

نعیم ۔ بول پھر ـــ؟

جمیلن ۔ گئی تھی۔

نعیم ۔ دیکھا۔ واپس کہاں سے آئی تھی؟

جمیلن ۔ پچھلی کھڑکی سے۔

نعیم ۔ اب ٹھیک بک رہی ہے۔ تو سیدھی میرے پاس کیوں نہیں آئی؟ تم سب لچر ہو، پاجی کہیں کے، (خدا بخش سے) چائے لیکر جائے اور تجھے علم نہ ہو، خانساماں بنا پھرتا ہے۔ حرامی، جھوٹا، اور تو اور میرے ساتھ جھوٹ؟ بک کتے؟ بک۔ مسکین صورت بنائی ہے بلی کے بچے، بولتا کیوں نہیں؟ دوں تجھے بھی ایک چپیٹ، چائے یہ پگڑی فیتے دار، نواب زادے، بکتا کیوں نہیں، میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا تو نے۔ جانتا نہیں میں کون ہوں؟

خدا بخش ۔ (ہاتھ جوڑتا ہے) حضور بیگم صاحبہ نے ـــ!

نعیم ۔ بیگم صاحبہ نے کیا ـــ؟

خدا بخش ۔ منع کر دیا تھا اور یہ ـــ (صدری میں ہاتھ ڈالتا ہے)

نعیم ۔ رک کیوں گیا۔ کہتا کیوں نہیں۔ یہ کیا؟ کیا ہے جیب میں؟

خدا بخش ۔ (دس روپے کا نوٹ نکالتا ہے) جمیلن کو دیا تھا کہ آدھ آدھ،

نعیم ۔ اوں، بیگم نے دیا تھا جمیلن کو؟ کیوں جمیلن؟

جمیلن ۔ نہیں جی بیگم صاحبہ نے نہیں، بیا صاحب نے۔ میں تو لیتی نہیں تھی۔ انھوں نے جبردستی کہا کہ چائے لے جاؤ، تمھارا اور کھانساماں کا حصہ ہے! چائے کا انعام ہے اور ـــ

نعیم ۔ (غصے سے کانپ رہا ہے، چہرہ سرخ ہو رہا ہے) اور ـــ

جمیلن ۔ (ہاتھ باندھ کر) کہا کہ صاحب لاکھ پوچھیں تم چائے لیکر گئی تھی،

تم اور کھانساماں ایک نہ مانا۔ مجبور ہیں بے قصور ہوں۔ (نعیم کے
پاؤں پر گر پڑتی ہے۔ خدا بخش بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پگڑی نعیم
کے پاؤں پر رکھ دیتا ہے)

نعیم ۔ ہٹ جاؤ پرے او پاجیو! ۔۔۔ ایسا و بڈھے خاندان کے پاتو ذلیل
کتے! بے ایمان، کہاں ہے تیری وفاداری، عذرا اور ضیا کے کہنے
پر؟؟؟ ان کو تو میں وہاں پہونچاؤں گا جہاں سے ان کی خبر بھی
نہ آسکے ۔ آؤ ادھر جلدی ۔۔۔ ۔۔۔ جلدی آؤ ۔

(کمرے کی طرف تیز قدمی سے رجوع کرتا ہے ۔ دروازوں کو دیکھتا ہے وہ ابھی
تک بند ہیں ۔) توڑ دو اس کو (دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے) نہیں نہیں
کھڑکی کو، ٹوٹ جائیگی جلدی ۔۔۔ ۔۔۔ پکڑو، گملا یہ ۔ جلدی کرو ۔ (خدا بخش گملا
اٹھاکر کھڑکی پر مارتا ہے ۔ شیشے ٹوٹتے ہیں ۔) چٹخنی کھول دو ۔ ہاتھ بڑھاکر ۔ اوپر
چڑھو (وہ چٹخنی کھولتا ہے ۔ نعیم نیچے کھڑا ہے ۔ زور سے دھکا دیکر کواڑ
چوپٹ کھول دیتا ہے ۔)

خدا بخش ۔ (کواڑ کھلتے ہی) اندر تو کوئی بھی نہیں ۔

نعیم ۔ (حیرت سے) کوئی بھی نہیں؟؟ (اوپر چڑھ کر کھڑکی سے اندر کودتا
ہے ۔ اندر سے) کیا چھپ گئے کہیں ؟ بھاگ گیا ۔ بزدل، ڈرپوک، یہی
تھی ہمت، کمینے (آواز دیتا ہے) عذرا ۔۔۔ ! (سامنے کا دروازہ کھول
کر گھبرایا ہوا ایک پرزہ کاغذ کا باہر کی کھلی روشنی میں غور سے دیکھتا ہے ۔ ہاتھ
کانپتے ہیں) عذرا کی تحریر!

" میں جارہی ہوں، ضیا کے لئے میرے دل میں بہت احترام
اور عزت ہے ۔ تمہاری فضیحتی نے آج میرا دل کھٹا کردیا ہے
نعیم، میری تلاش مت کرنا ۔۔۔۔ "

(سر پر ہاتھ مارتا ہے) میرے اللہ وہ بھاگ گئی ۔ عذرا کو لے گیا ۔ آہ عذرا
جس کو میں جنت کی حور سمجھے تھا ۔ وہ نار جہنم کا بھڑکتا ہوا شعلہ نکلا ۔ شعلہ جس نے
آشیانہ مسرت کو جلاکر راکھ کر گیا ۔ میں عورت کو فرشتہ سمجھے تھا ۔ آہ عورت
... دغاباز ۔ فریبی ۔ مکار عورت ۔۔۔ میرا دل، میرا دل ۔۔۔ ،
(دل پر ہاتھ رکھتا ہے ۔ غشی کی حالت میں نیچے گرتا ہے ۔ خدا بخش
پکڑ لیتا ہے ۔۔۔)

(پردہ گرتا ہے)

منظر سوم

(وہی منظر اول ۔ بالکونی میں نعیم کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے ۔ عذرا اپنی
کرسی پر موجود نہیں نعیم کی گردن ذرا جھکی ہوئی ہے ۔ عذرا چہرے پر غازہ ملے ۔ بالوں
کو بنائے ۔ نئی کامدار ساری پہنے اس کی شکنوں کو درست کرتی داخل ہوتی ہے اور آپ
ہی آپ کہتی ہے ۔ "اپنی پسندیدہ ساری کو دیکھ کر آپ ہی آپ من جائینگے" اپنی
کرسی پر بیٹھتی ہے اور بیٹھتے وقت ساری کے آنچل سے ایش پلیٹ نیچے گر کر ٹوٹ
جاتی ہے ۔ نعیم گھبرا کر دیوانوں کی طرح سر اٹھاتا ہے) ۔

نعیم ۔ مجھے پکڑنا ۔ میں مر رہا ہوں ۔ (عذرا اٹھ کر جلدی سے بڑھتی ہے نعیم کھڑا
ہو جاتا ہے) اوہ کیا میں بیداری کے عالم میں ہوں میرے خدا ۔ تو عذرا ہے کیا

عذرا ۔ کیا ہو گیا میرے پیارے ۔ (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے) ہوش کرو ۔

نعیم ۔ (پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتا ہے) کیا ضیا آیا تھا یہاں ؟ "

عذرا ۔ نہیں تو ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے میرے پیارے ؟

نعیم ۔ تم گائی نہیں ؟

عذرا ۔ کیا ؟

نعیم ۔ " تم ! تمہیں تو ہو " ۔

عذرا ۔ (گھبرا جاتی ہے) تمہیں کیا ہو گیا ہے پیارے ؟ میں کب گائی ہے ؟

نعیم ۔ (عذرا سے بغلگیر ہوتے ہوئے) میری پیاری عذرا ، ہیبت ناک ، ڈراونا
خواب ، میرا وہم ، میرا دماغ مجھے ڈرا رہا ہے ۔ یہاں ضیا کبھی نہیں آسکتا
بس اُف خواب تھا ۔ کیا خواب ہے میرے خدا ۔

عذرا ۔ (خوفزدہ ہوکر) کیا تھا خواب پیارے نعیم ۔۔۔ ؟

نعیم ۔ مت پوچھو عذرا ۔ میں نہیں بتاؤنگا ۔ وہ خواب ۔ وہ خواب ۔۔۔ اوہ
وہ کون آرہا ہے ۔ (بالکونی میں سے انگلی سے دور اشارہ کرتا ہے) ضیا ہے
کیا ؟ ۔۔۔ وہ ہرگز نہیں آسکتا ۔

عذرا ۔ (گھبراتی ہے) شاید یہی ہو، آجائیگا تو کیا ہو جائیگا میرے اچھے نعیم !

نعیم ۔ آہ میں مر جاؤنگا عذرا پیاری ! " (جمیلن آتی ہے)

عذرا ۔ کچھ کہو تو پیارے !

نعیم ۔ (جمیلن سے) ضیا سے کہدو آئندہ یہاں نہ آیا کرے ۔ بس ،
(جمیلن چلی جاتی ہے ۔ نعیم اور عذرا ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے) ۔۔۔ بابر بٹالوی بی ۔ اے آنرز

کیفیات!

سحبان الہند حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی

اُدھر مہرِ درخشاں پر، اُدھر رنگِ گلستاں پر
جہاں سے ہو نگاہیں پڑ رہی ہیں روئے جاناں پر

نہیں آیا جو دستِ شوق میں دامانِ نازِ ان کا
پڑا وہ ہاتھ وحشت میں مرے چاکِ گریباں پر

کہیں ہیں جیب کے ٹکڑے، کہیں ٹکڑے گریباں کے
جنوں نے پاؤں پھیلائے ہیں اب صحرا کے داماں پر

بہ قدرِ جوشِ حسرت میں قدم لیتا ہوں آنکھوں سے
قفس سے حق پہونچتا ہے مرا فصلِ بہاراں پر

کچھ اس انداز سے دیتے ہیں گل وہ اپنے ہاتھوں سے
میں یہ سمجھا کہ دل لائے ہیں میرا نوکِ پیکاں پر

مرادِ دستِ جنوں وہ رنگ لایا ہے کہ میں سمجھا،
بہار آئی ہے ایسی ٹوٹ کر میرے گریباں پر

بھری محفل ہی محشر کی الٰہی حشر کیا ہوگا
گواہی خود مری ہی وہ بھی ایک اک فردِ عصیاں پر

ہجومِ شوقِ نظارہ نے کیسا پہلو نکالا ہے
بنا تارِ نظر چلمن کا پردہ روئے جاناں پر

مجالِ دید بھی ٹھہرے تو کوئی اور کیوں دیکھے
مری آنکھوں کا پردہ ڈال لو تم روئے تاباں پر

اسے حسنِ طلب کی شوخیاں کہتے ہیں رحمت سے
کہ مجھ کو ناز اس کے سامنے ہے اپنے عصیاں پر

مرے دل کی تسلی چٹکیوں سے ہو نہیں سکتی
یہ جی میں ہے کہ خود زخموں کو رکھ دوں اب نمکداں پر

وہ آئے ہیں مگر اس شکل سے باور نہیں آتا
کبھی ان پر نظر ہے اور کبھی ہے دل کی ارماں پر

جگر کے چند ٹکڑے تھے ہوئے بربادِ رسوائی
رہے کچھ آ کے آنکھوں میں، جمے کچھ آ کے مژگاں پر

بھرا رہتا تھا دل، آنکھوں سے اشکِ غم نکل آئے
گھٹا چھائی تھی میخانے پہ، برسی ہے بیاباں پر

الٰہی داد کیفی کو ملے جوشِ اسیری کی
رہا جب تک یہ سر ٹپکا کیا، دیوارِ زنداں پر

عراقی ستارہ پرست

مصر کے مشہور عربی رسالہ "الہلال" سے خاص عالمگیر کیلئے ترجمہ کیا گیا

از جناب مولوی عبدالوالی صاحب قریشی آروی

قبل ازیں کہ تمدن جدید اطراف عراق پر چھا جائے، عراق سینکڑوں مذاہب اور لاکھوں جذبات کا گہوارہ تھا، لیکن ان مختلف مذاہب اور متفرق جذبات کو تمدن جدید کا تباہ کن سیلاب خس وخاشاک کی طرح بہا لے گیا حتیٰ کہ مجموعی حیثیت سے ان کی تاریخ پر بھی مطلع ہونا دشوار ہو گیا۔

ایک عجیب وغریب فرقہ کے حالات آج میں بیان کرنا چاہتا ہوں جو ہر حیثیت سے دوسرے انسانوں سے مختلف ہے۔ یہ اپنے رسوم، معاشرت اور خیالات وعادات میں دوسرے انسانوں سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اس فرقہ کو صابئہ کہتے ہیں۔ اگر اس فرقہ کی جداگانہ حیثیت کا یہی حال رہا اور اپنے رسم ورواج پر اسی طرح جما رہا تو یقیناً صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیگا۔ عراق ہی آخری ملک ہے جس کی آغوش میں یہ فرقہ پرورش پا رہا ہے اور قدیم مذاہب کی تاریخ کا آخری صفحہ اسی پر ختم ہو گا۔

عام اصول

ابتدائے آفرینش سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ عالم کی عجائبات اور فطرت کی رنگینیاں انسان کو اپنی تعظیم پر اور بڑا سمجھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً طوفان، ہوا جب تیز چلتی ہے انسان فطرت کی اس عظیم الشان قوت کو دیکھ کر متحیر وسرگرداں ہو جاتا ہے اور خوف سے اس کے جسم میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ فطرت کی ان نیرنگیوں کو خاص قوت عطا کی گئی ہے اپنے کو ان کے مقابلہ میں کمزور سمجھتا ہے اور ان کو بڑا اور پاک سمجھے جانے کے لائق خیال کرتا ہے یہیں سے پرستش کے خیال کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی اس حد تک نشوونما ہوتی ہے کہ انسان ہر اس شے کے سامنے سر خم کر دیتا ہے جس سے وہ خائف ہو اور جس کی حقیقت سے جاہل ہو اور جو اس کی نگاہ میں عجیب وغریب معلوم ہو حتیٰ کہ جتنے انسان ہوئے اتنے خیالات پیدا ہو گئے اور یہ خیالات اس حد تک ترقی کر گئے کہ فطرت کی تمام قوتوں کو ایک قوت کے ماننے پر تیار ہو گئے۔ تیز ہوا، روشن آفتاب، بھڑکتی ہوئی آگ معبود سمجھی جاتی تھی، لوگ ان کی پرستش کرتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تمام قوتیں کواکب سیارات کے ماتحت مانی جانے لگیں اور ایک زمانہ کے بعد کواکب سیارات کی قوتوں کا انکار ہونے لگا۔ خدائے واحد کے سوا تمام قوتیں ختم ہو گئیں اب اختلاف محض خدائے واحد کی صفات اس کے شریک وہمسر ہونے اور نہ ہونے کا اختلاف نہ رہا۔

صابئہ کی قسم!

صابئہ کا ذکر قرآن میں بھی ہے لیکن ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے اور ہمارے لئے ان کے عقائد کا بالتفصیل بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کتاب الملل والنحل کے مصنف نے صابئہ کی ایک قسم بیان کی ہے جس کا نام صابئہ حرانیہ رکھا ہے بعضوں نے کہا ہے کہ یہی قدیم صابئہ میں سے ہیں لیکن بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ وہ قدیم صابئہ میں سے ہیں درست نہیں کیونکہ علامہ ابن ندیم نے اپنی فہرست (مطبوعہ یورپ) کے صفحہ ۳۲۰ میں یہ لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کا اس کی اواخر عمر میں بلاد روم سے غزوہ کے ارادے میں دیار مصر پر گزر ہوا

اہل مصر نے خلیفہ مامون کا شاندار استقبال کیا۔ ان میں ایک جماعت حرانیوں کی بھی تھی۔ اس زمانہ میں ان کی ہیئت یہ تھی کہ وہ عبا پہنا کرتے تھے ڈاڑھی بڑھائے رہتے تھے۔ ان کی یہ ہیئت مامون کو پسند نہ آئی اس نے ان سے پوچھا کہ تم مسلم ہو یا یہود و نصاریٰ، انھوں نے جواب یہ دیا کہ ہمیں کسی سے تعلق نہیں۔ مامون نے دوبارہ یہ پوچھا کہ تمھارے پاس کوئی آسمانی کتاب ہے؟ انھوں نے کہا۔ نہیں،

مامون نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ میرے والد بزرگوار کے زمانہ کے سرکش لوگ ہیں قتل کی خواہش ظاہر کی۔ حرانیوں نے یہ کہا کہ ہم جزیہ ادا کرتے ہیں۔ خلیفہ مامون نے کہا تم ملحد ہو جزیہ تو ان کا قبول کیا جاتا ہے جو اسلام کے خلاف ہیں اور اہل کتاب میں سے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ لیکن غزوہ روم سے واپس آنے تک تمھیں مہلت دیتا ہوں۔ علامہ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ حرانی اپنی زندگی سے مایوس ہو کر مشرف باسلام ہونے لگے ڈاڑھیاں کٹوادیں اور نہایت مضطرب و بےچین نظر آنے لگے۔ حرانی سرداروں میں سے ایک کے پاس آئے اور کہا کہ میری نجات کی کوئی راہ بتلایئے اور سردار کے سامنے بہت ساری اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کیں سردار نے کہا کہ خلیفہ جب آئے تو اس سے یہ کہنا کہ میں صابئہ میں سے ہوں، میرا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

صابئہ کا ایک فرقہ اور بھی ہے جو ان دنوں عراق میں آباد ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ وہ قدیم صابئہ میں سے ہے۔ ان کے بارے میں مسیو ہنری پونیون لکھتا ہے کہ یہ مندا یبہ ہے جو اس زمانہ میں صابئہ کے نام سے مشہور ہے اس فرقہ کا بانی وسوسہ کے مرض میں گرفتار تھا۔ وہ ان شہروں سے جو زابین[1] کے درمیان واقع ہیں مقام میشان[2] میں آگیا۔ یہ مسیحی تھا اس کا نام دبدا اور اس کی ماں کا نام ام کسنطا تھا۔ اس کے بعد وہ نہر قاردن[3] کے کنارے پر آباد ہو گیا اور یہیں اس نے اپنے نئے دین کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کا اکثر حصہ مارقونین مانوئین اور کنیتین اور قدیم فرقہ صابئہ سے ماخوذ ہے۔ زمانہ کے ساتھ یہ نیا دین بھی ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ دبدا کے متبعین کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی اور نہر قاردن کے علاوہ عراق کے دوسرے دیہاتوں اور شہروں میں بھی یہ دین پھیل گیا۔

اس زمانہ میں صابئیوں کی تعداد پانچ چھ ہزار کے قریب ہے اور یہ عراق کے ان قصبوں اور دیہاتوں میں آباد ہیں جو کسی بہتے دریا کے کنارے واقع ہیں مثلاً عمارہ۔ قلعہ صالح۔ قرنہ۔ کرمہ۔ عزیزیہ۔ سوق الشیوخ۔ انعار بصرہ اور بعض صابئیوں نے بغداد۔ مصر۔ قاہرہ۔ ایران کو بھی اپنا وطن بنا لیا ہے۔ وہ ان شہروں اور قصبوں کو جو نہر جاری کے کنارے پر آباد ہیں اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ان کی عبادتیں اور ان کے رسم و رواج کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ بہتے پانی میں غسل نہ کریں اور رسوم کو وہاں ادا نہ کریں۔ اب میں ان کے عقاید و رسوم کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو کسی قدر دلچسپ اور عجیب و غریب ہیں۔

صابئہ کے عقاید

صابئہ کا اعتقاد ہے کہ خدا کی اولیں مخلوق روحانی تھی جس کا نام ان کی اصطلاح میں ہیی قدمایا یعنی حی قدیم ہے اللہ نے اس کو پیدا کیا اس کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے عوالم کو اور عوالم کے ساتھ ساتھ غیر متناہی نفوس مقدسہ کو پیدا کیا۔ اس کے بعد دوسری مخلوق پیدا کی جس کا نام ہی تینانی ہے اس کے ساتھ بہت سے دوسرے نفوس پیدا کئے اس کے بعد تیسری مخلوق پیدا کی جس کا نام ہیی تلیثائی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی ان چیزوں کو پیدا کیا جو پہلے دونوں کے ساتھ پیدا کی تھی۔ نفوس دو قسم کے ہوتے ہیں ایک انزی (عوام) دوسرے ملکی (بادشاہ) اس کے بعد سات عوالم پیدا کئے جن کو آمی دھشو خا یعنی عوالم مظلمہ کہتے ہیں، جو آفتاب کی روشنی سے منور ہوتے ہیں ان میں بسنے والے انزی بھی ہیں اور ملکی بھی اور ان ہی سات میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

آسمان و زمین کے متعلق ان کی عجیب و غریب تحقیق یہ ہے کہ وہ مربع یعنی چوکور ہے زمین کے نیچے پانی ہے جس پر زمین پھیلی ہوئی ہے آسمان سات طبق کا مجموعہ ہے آفتاب چوتھے پر ہے اور ماہتاب ساتویں پر۔

آسمان و زمین بلکہ ساری کائنات آگ و ہوا سے مرکب ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا جب زمین کے بنانے سے فارغ ہوا تو اس نے زمین پر عالم انوار جس کا نام آبی دھنورہ ہے اس سے ایک فرشتہ درختوں کے لگانے کے لئے

---

[1] عراق کی مشہور نہر زاب اکبر اور زاب اصغر مراد ہے [2] یہ شہر جنوبی عراق میں واقع ہے [3] یہ نہر جنوبی بصرہ میں ہے (مترجم)

بھیجا۔ اور ایک دروازہ ہوا اور پانی کے لئے کھول دیا اور دوسرا دروازہ روشنی کے لئے۔ اسی سے آفتاب روشنی حاصل کرتا ہے تاکہ دوسرے ستاروں کو بالواسطہ روشنی پہونچائے۔

انسان کی ابتدا کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ اولیں انسان کورہ قدمایا (یعنی آدم علیہ السلام) تھا کہتے ہیں کہ خدا نے اتباجیل (جبریل) کو زمین کی طرف بھیجا کہ آدم کو اس کی شکل پر بنائے۔ اتباجیل نے خدا کی صورت پر کورہ قدمایا کو مٹی سے بنایا اور اس کی بائیں پسلی سے حوا کو پیدا کیا پھر کورہ قدمایا اور حوا کے جسم میں روح قدس کو اتارا اور فرشتوں نے کورہ قدمایا کو ان تمام چیزوں کے نام بتلائے جو زمین پر ہیں۔ اس کے بعد بحکم ربانی تمام فرشتوں نے کورہ قدمایا کو سجدہ کیا مگر ہادبیشہ[1] نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور اس نے خدا سے یہ کہا کہ تونے مجھکو آگ سے پیدا کیا ہے اور کورہ قدمایا کو مٹی سے، میں کیونکر اسے سجدہ کرسکتا ہوں؟ اس نافرمانی کی سزا میں خدا نے ہادبیشہ کو جنت سے نکال دیا۔

[1] شیطان کو کہتے ہیں۔

عالم کی تاریخ کے بارہ میں وہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا ۵۸۷۳۰۹۵ سال سے آباد ہے اور اس دعوی کو ثابت کرنے کے لئے لچر پوچ دلائل اور بے سروپا قصص و حکایات بیان کرتے ہیں جن کو ایک معمولی عقل والا انسان بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ ہوگا۔

خیر و شر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ خیر و شر کتم عدم سے عالم وجود میں انسان کی وجہ سے آتے ہیں اور انسان کے افعال سے ظاہر ہوتے ہیں انسان اپنے خیالات میں بالکل آزاد ہے اسی وجہ سے قیامت کے روز خدا کے روبرو سوال و جواب ہوگا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے خیر و شر کے راستوں کو انسان پر واضح کردیا ہے۔ اسے آزادی ہے جسے چاہے اختیار کرے۔

موت کے بارے میں صابئہ کا اعتقاد یہ ہے کہ موت انتقال روح کا نام ہے۔ فنا روح کا نام نہیں۔ روح جسم سے نکلنے کے بعد فنا نہیں ہوتی بلکہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف چلی جاتی ہے حتی کہ عالم انوار میں پہونچ جاتی ہے اور ان کے خیال میں اس وقت تک طاہر نہیں ہوتی جب تک کہ وہ جسم طاہر سے نہ نکلے۔ اسی وجہ سے عالم نزع میں میت کو غسل دینا اور کفنانا ان کے نزدیک واجب ہے تاکہ روح جسم سے طاہر نکلے۔ جب میت نجس مرجائے

تو اس کا چھونا حرام ہے جو شخص ناگہانی موت کے پنجہ میں گرفتار ہو کر مر گیا وہ کافر مرا۔ میت پر اس کے وارثوں کا نوحہ کرنا درست نہیں اس لئے کہ رونے والے کے آنسو کا ہر قطرہ بحر ناپیدا کنار بن کر روح کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور روح کو آبی دہنورد (عالم انوار) کی طرف جانے سے روک دیتا ہے۔ موت کے بعد میت سے دنیاوی عمل کے بارے میں دو فرشتے سوال کرتے ہیں اگر عمل حسنہ ہوتا ہے تو روح عالم انوار کی طرف بھیج دی جاتی ہے اور اگر عمل سیئہ ہوتا ہے تو روح پر عذاب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ روح پاک ہو جاتی ہے۔

صابیہ کے دینی احکام

صابیہ کی نماز وہ پہلی نماز ہے جس سے انسان آشنا ہوا وہ اس نماز میں قیام و رکوع نہیں کرتے بلکہ زمین پر بلا سجدہ کئے بیٹھتے ہیں۔ دن میں تین مرتبہ ادا کرتے ہیں طلوع شمس کے وقت، غروب شمس کے وقت۔ زوال شمس کے وقت دیر تک ذکر خیر میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کی ابتدا، طہارت، وضو، اذان سے کرتے ہیں۔ طہارت سے مراد غسل جنابت ہے۔ وضو سے مراد چہرہ کا دھونا ہاتھوں کا دھونا۔ شرمگاہ کا دھونا کان اور ناک کا مسح کرنا اور اذان سے مراد آہستہ آہستہ پست مقام پر کھڑے ہو کر ذکر خیر کرنا۔ عراقی صابیہ کے نزدیک روزہ جائز نہیں حالانکہ حرانیوں اور ان صابیوں کے نزدیک جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے روزہ رکھنا مستحب ہے۔ عراقیوں کے نزدیک روزہ رکھنا گویا ان چیزوں کو حرام کرنا ہے جن کو خدا نے حلال کیا ہے۔ باوجود اس عقیدہ کے عراقی ۳۶ دن گوشت نہیں کھاتے ہیں جیسا کہ نصاریٰ کرتے ہیں اور کبھی کبھی پڑوسی مسلمانوں کو دکھلانے کیلئے روزہ بھی رکھ لیتے ہیں۔

صابیہ کے یہاں ایک سے چار تک شادی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ مساوات قائم رہ سکے اور طلاق بھی دی جا سکتی ہے بشرطیکہ زنا کے یا حیض کے بعد غسل نہ کرنا چوری کرنا، نماز نہ پڑھنا ثابت ہو جائے۔ مسلمان قاضی کے دربار میں یا اسلامی حکومت کے محکمہ میں طلاق دی جاتی ہے تاکہ صابیہ کا کاہن مطلقہ عورت کو جب وہ توبہ کر لے اور معافی مانگ لے تو پہلے شوہر کے نکاح میں لا سکے۔

ان کے یہاں نکاح کا طریقہ یہ ہے۔ جب ایک شخص کا نکاح ہوتا ہے تو عورتیں دلھن کے گھر جاتی ہیں جن سے کاہن یہ معلوم کرتا ہے کہ دلھن دوشیزہ ہے۔ اس لئے کہ اس عورت کا نکاح پڑھانا جو دوشیزہ نہ ہو ان کے کاہنوں کو نجس کر دیتا ہے

نکاح کی رسم سردی کا موسم ہو یا گرمی کا بہتے پانی میں ادا ہوتی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ کاہن اپنے دوستوں کے ساتھ دولھن کے مکان پر آتا ہے اور دلھن کو اپنے ساتھ دریا کے کنارے پر لے جاتا ہے اور وہاں اس کو پانی میں غوطہ دیتا ہے اور ایک خاص قسم کی دعا پڑھتا ہے جب دعا پڑھ لیتا ہے تو اس کو پانی سے نکالتا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک مشعل دیتا ہے جس سے لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلھن ہے اور گھر کی طرف لیجاتا ہے گھر پہونچکر ایک خاص قسم کی دعا پڑھتا ہے پھر اس کو ساتھ لیکر دریا کی طرف آتا ہے سابق کی طرح پھر غوطہ دیتا ہے اور دعا پڑھتا ہے اس کے بعد گھر لا کر نو عروسی کے حجرہ میں بھیجدیتا ہے تاکہ وہ شوہر کے انتظار میں نو عروسی کے تخت پر بیٹھے۔ کاہن دولھا کے ساتھ بھی وہی رسم ادا کرتا ہے جو دولھن کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور دولھا کو دلھن کے وکیل کے ساتھ لیکر دلھن کے حجرہ میں آتا ہے اعزہ و اقربا جمع ہوتے ہیں کاہن نکاح کا خطبہ پڑھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد مہمانوں کے سامنے باریک آٹے کی روٹی رکھی جاتی ہے اگر حاضرین اس کو نہ کھائیں تو فقرا کو دے دی جاتی ہے۔ یا پانی میں ڈال دی جاتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہی کاہن جس نے نکاح کی رسم ادا کی تھی اپنا مخصوص لباس زیب تن کر کے آتا ہے اور دلھن کو دولھا کے پاس لے جاتا ہے۔ دلھن کی پشت دولھا کی پشت سے ملا دیتا ہے اس کے بعد دلھن کو حکم دیتا ہے کہ وہ دولھا کے سامنے آکر اس کے سر پر تین دفعہ دائرے بنائے۔ ہر دائرہ کے بعد کاہن ایک ایک خاص قسم کی دعا پڑھتا ہے۔ پھر دو کوزے جو اس رسم کی اختتام کے لئے تیار کئے جاتے ہیں کاہن انھیں توڑ کر اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ دین مہر نکاح کے بعد مقرر ہوتا ہے جس کو عورت ایک مرتبہ میں لے سکتی ہے۔

بڑی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی عورت سے جو چاہے ..... کر لے نہ وہ شور و غل مچائیگی اور نہ اس سے خلاصی کی کوئی تدبیر کریگی اور نہ اُس کا مقابلہ کریگی اگر وہ کچھ کرتی ہے تو بس اتنا کہ زمین یا تخت یا کرسی جو بھی قریب ہے اس پر ہاتھ رکھ کر یہ کہتی ہے "اے خدا تو دیکھ رہا ہے" جس سے اُس کی ناراضگی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن آج تک اس کا راز معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے

صابیہ کے کاہن

صابیہ کو کوئی مجاز حاصل نہیں ہے کہ بغیر دینی سرداروں کے مشورہ کے

وہ کسی کام کو کرے۔ نکاح۔ جنازہ۔ ذبح کرنا۔ نام رکھنا۔ وغیرہ یہ سب امور دینی سرداروں کے ہاتھ انجام پاتی ہیں۔ دینی سردار باعتبار درجہ کے پانچ قسم کے ہوتے ہیں ہر وہ شخص جس میں کہ ایک کی شرائط موجود ہوں وہ شریک ہو سکتا ہے۔ وہ قسم یہ ہیں۔ حلالی ترمیدہ۔ گنزورہ۔ ربش امہ۔ الربانی۔

حلالی ... وہ جس میں حسب ذیل ... موجود ہوں۔ وہ سلیم الجسم پیدائشی کوئی عیب نہ ہو ... شریف ... باپ دادا ان صفات کے ساتھ موصوف ہوں اس کی ماں سے جس وقت کہ اس کے باپ نے شادی کی ہو وہ بیوہ نہ ہو۔ اسی طرح سے سات پشت تک اس کی مائیں ان صفات کے ساتھ موصوف ہوں۔ دینی ابتدائی کتابوں کو آتا پڑھے جس سے وہ اس تعمید کی رسم کو جو اس فرقہ کے لئے مخصوص ہے جان لے اور اس کا کام یہ ہے کہ جانوروں کے ذبح کرنے کی رسم ادا کرے۔

ترمیدہ ..... اس کا کام یہ ہے کہ وہ تعمیہ کا نکاح پڑھائے اور اس کے لئے اجازت نہیں کہ وہ اس سے اعلیٰ درجہ کی طرف جانے کی کوشش کرے اور دوسرے دینی امور کی مشق کرے اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے سپرد وہ کام کئے جائینگے جو ایسا کرنے والے کی سزا ہے۔ حلالی اگر ترمیدہ کے درجہ کو حاصل کرنا چاہئے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف درجہ کے دینی سرداروں کے سامنے ما، جاری میں غسل کرے اور ان کے ساتھ سات دن تک رہے اور سات دن پلک ذرا جھپکنے بھی نہ دے ... تاکہ کہیں شیطان ... حملہ کرے۔

گنزورہ ..... (خازن یا کتاب گنزہ کا مفسر) کام اس کا یہ ہے کہ وہ اس ترمیدہ سے جو درجہ علیا کے حصول کا خواہاں ہو یہ وعدہ کرائے کہ وہ ما، جاری کے قریب کے کنوئیں پر لکڑی کے تخت پر کھڑا ہوگا اور ما، جاری میں دینی سرداروں کے روبرو غسل کریگا۔ اس درجہ کے سردار آج تک کل سات ہوئے ہیں۔

ربش امہ ... (رئیس الامتہ) آج تک اس درجہ کا سردار صابیوں میں کوئی نہیں پایا گیا۔

ربانی ... اول سے آخر تک کوئی اس درجہ کو یحییٰ علیہ السلام کے سوا حاصل نہیں کر سکا۔

کاہنوں کا کھانا

کاہن کیلئے اپنے گھر کے سوا دوسرے کے گھر کا کھانا حرام ہے اس عورت کے ہاتھ کا پکایا ہوا بھی حرام ہے جس نے غسل نہ کیا ہو محض بیوی کے ہاتھ کا کھانا جائز ہے جس پر اس کو اعتماد ہو کہ وہ کھانا پکانے کے اصول سے واقف ہے اور برابر غسل کرتی ہے اگر اس کی بیوی نہ ہو تو اسے خود کھانا پکانا چاہئے۔ کاہنوں کے لئے جو جانور ذبح کیا جاتا ہے اس کے ذبح کا طریقہ عام لوگوں کیلئے جانور ذبح کرنے کے طریقہ سے مختلف ہوتا ہے۔

صابئہ کا غسل

صابئہ کے نزدیک کھانا کھانا حرام ہے جب تک وہ غسل نہ کرلے۔ بچہ جب تک غسل نہ کرایا جائے پاک نہیں ہوگا۔ خدا سے اپنے گناہوں کو بغیر غسل کے کوئی معاف نہیں کرا سکتا غسل کے یہ طریقے ہیں

تعمید الزواج۔ تعمید الجنایہ۔ تعمید الولادۃ۔ تعمید الجماعۃ، ہر ایک کے آداب دوسرے سے جداگانہ ہیں جن کو بخوف طوالت چھوڑتا ہوں۔

صابی کی مقدس کتابیں

صابئہ کی چند کتابیں ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی دینی مشکلات کو دور کرتے ہیں ان کتابوں میں سات کتابیں انکے نزدیک بڑی مستند ہیں۔

کتاب[1] الکنزہ ربہ . . . . . . یہ وہ کتاب ہے جو آدم علیہ السلام پر نازل ہوئی اس میں مخلوقات کی ابتدا اور ان چیزوں کا ذکر ہے جو انسان کے لئے پیدا کی گئی۔

کتاب سدرہ یہی . . . . . ان تعلیمات کا مجموعہ ہے جس کو یحییٰ علیہ السلام لائے تھے۔ اس میں یحییٰ علیہ السلام کی سوانح اور ان کے ارشادات اور تعلیمات مذکور ہیں اور اس میں ستاروں اور سیاروں سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب القلیستا . . . . اس میں محض شادی کے طریقے بتلائے گئے ہیں اور خطبوں کا ذکر ہے۔

کتاب سدرہ دنشماثا . . . . . . اس میں جنازہ وغیرہ کا ذکر ہے اور اس کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ میت کو تلقین اور دفنانے کے طریقے۔ میت پر نوحہ کی حرمت کی وجہ بتائی گئی ہے اور ان تمام چیزوں کا ذکر ہے جو موت سے تعلق رکھتی ہیں،

کتاب الدیوان . . . . . . یہ کافی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ان کے صوفیوں کے قصص اور سیرت وصورت کا ذکر ہے اور اس سے ان کی دینداری کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب اسفر نیواشا . . . . . اس میں برجوں سے بحث کی گئی ہے اور برجوں کی معرفت کے ذریعہ جو بچہ جس برج میں پیدا ہوتا ہے اس برج سے اس کا نام چنتے ہیں اور اس کی سعادت وشقاوت کو معلوم کرتے ہیں۔

کتاب الابنانی . . . . . اس کتاب میں دینی اشعار ہیں اور دینی اذکار جن کو وہ اپنی نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں۔ یہ کتاب قلمی ہے اور بہت زمانہ کی ہے اس وقت اس کا نسخہ کمیاب ہے۔

---

[1] مطبوعہ نسخہ جرمن میں ملتا ہے۔

صابئہ کے تہوار

اب میں کاہنوں کے جشن کو بیان کرکے تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

پہلا[1] تہوار جس کا نام ان کی اصطلاح میں "دھوہ ربہ" ہے ۳۶ گھنٹہ تک منایا جاتا ہے اگست کی نویں تاریخ سے یہ شروع ہوتا ہے۔

دوسرا[2] تہوار جس کا نام ان کی اصطلاح میں "دھوہ یر دنایاشہ" ہے۔ یہ اواخر اگست میں شروع ہوتا ہے اور اوائل ستمبر میں ختم ہوتا ہے۔

تیسرا تہوار جس کا نام ان کی اصطلاح میں "دھوہ شینشہ" ہے تین دن تک منایا جاتا ہے۔ صابئہ کے خیال میں زمین سیال تھی اس کے بعد سخت بنادی گئی۔ یہ تہوار اسی دن کے شکریہ میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کا آغاز ۱۸ مارچ سے ہوتا ہے۔

یہ ہیں مختصر طور پر اس عجیب وغریب فرقہ کے حالات میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے بہت کم اصحاب اس فرقہ سے باخبر ہونگے۔

عبدالوالی۔ آروی

ابر کا ٹکڑا اور ستارہ

جناب سید محمد فاروق صاحب فاروقی - بانسپاری

فلک پر شب کو محو گشت تھا اک ابر کا ٹکڑا
کسی تارے نے اس ہستی کے شیدائی سے یوں پوچھا

زمیں سے جانب گردوں تجھے تقدیر لائی ہے
شعاع مہر نے تجھکو نئی دنیا دکھائی ہے

نہیں بے وجہ بیتابی کی ضو تیرے نگینے میں
کسی انساں کا دل تو نے چھپا رکھا ہے سینے میں

وہ انساں جس کے شیشے میں شراب نکتہ بینی ہے
زمیں پر رہ کے بھی حاصل جسے گردوں نشینی ہے

بیاں کر اس سراپا راز کی محفل کا افسانہ
سنا تا جا ذرا دنیائے آب و گل کا افسانہ

یہاں تو جذب باہم زیست کا راز نہانی ہے
وہاں بھی کیا یہی آئین بزم زندگانی ہے

حیات و موت کا ساغر یہاں تو روز چلتا ہے
جبین مہر سے واں بھی یہی چشمہ ابلتا ہے؟

خموشی جس کو کہتے ہیں یہاں کی زندگانی ہے
وہاں بھی داخل فرض تقا کیا بے زبانی ہے؟

نہ پوچھ اے غنچۂ باغ فلک افسانۂ انساں
بنا ہے ٹوٹ جانے کے لئے پیمانۂ انساں

مٹے ہیں محفل عالم میں ہو کر جلوہ گر لاکھوں
وہاں کی خاک میں خوابیدہ ہیں شمس و قمر لاکھوں

فنا کا ہر طرف بزم جہاں میں بول بالا ہے
مگر انداز واں کے مرنے جینے کا نرالا ہے

حیات نو تجھے حاصل نہیں ہوتی فنا ہو کر
بدل جاتی ہے واں ہر شئے اجل سے آشنا ہو کر

بہار جذب باہم روح ہے تیرے گلستاں کی
بنا ہے اختلاف آرائیوں پر بزم انساں کی

قیام ہستی انجم خموشی زباں تک ہے
وہاں کی زندگی ہنگامۂ شور و فغاں تک ہے

سناؤں کیا تجھے اس خاک کے پتلے کا افسانہ
سراپا ہوش ہو کر ہوش سے رہتا ہے بیگانہ

فریب نفس کھا کر آپ کو گمراہ رکھتا ہے
ستم ہے یہ کہ سینے میں دل آگاہ رکھتا ہے

سمجھتا ہے کہ نار غم میں ڈالا کیوں گیا ہوں میں
فضائے باغ جنت سے نکالا کیوں گیا ہوں میں

مگر یہ آگہی ہے پردۂ غفلت میں پوشیدہ
ہوس نے طبع انساں کو کیا ہے اپنا گرویدہ

اگر اپنی حقیقت سے بشر آگاہ ہو جائے
یہ ظلمت خانۂ ہستی تجلی گاہ ہو جائے

پردیسی پیا!

از جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب سیالکوٹی

"الوداع میری جان!"

"خدا حافظ میری پیاری!"

فلورنس زنگ آلود پھاٹک پر جھکی ہوئی اپنے خاوند کو شہر کی طرف جانے والی سڑک پر تیز رفتاری سے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد موٹر پردہ نظروں سے چھپ گیا مگر فلورنس اسی طرح کھڑی رہی۔ ہوا کے ایک شریر جھونکے نے اس کی بل کھائی ہوئی زلفوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا۔ مگر اس کی بیخودی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

فلورنس زیادہ خوبصورت نہیں تھی۔ بچپن میں اس کا حسن جاذب نظر تھا۔ زمانہ تعلیم میں اس کے ساتھی اس سے محبت کرتے تھے۔ مگر اب اس کی عمر بتیس برس سے زیادہ تھی اور طفلانہ خوبصورتی کے نقوش مدہم ہو کر غایب ہو چکے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک دفتر میں ٹائپسٹ کی اسامی مل گئی، اور وہ اپنی ذمہ داریوں میں اس قدر کھو گئی کہ بیاہ کرنے کی بھی فرصت نہ ملی۔

ان ایام میں وہ ایک بار وہ محبت سے آشنا ضرور ہوئی۔ دفتر میں اس کے قریب ایک کلرک بیٹھا کرتا تھا جس کا نام مارٹن تھا۔ وہ بارہا دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا کرتی تھی مگر مارٹن کا ایک چھوٹا بھائی تھا اور وہ اپنی فالتو آمدنی اس کی تعلیم میں صرف کر رہا تھا۔ اس لئے اس میں فرنگیوں کا مہنگا عشق خریدنے کی ہمت نہ تھی۔

اچانک قسمت نے کروٹ بدلی اور فلورنس کی خوش بختی کا ستارہ افکار کے تاریک بادلوں کو چیرتا ہوا افق امید پر ظاہر ہوا۔ اس کا ایک چچا مر گیا اور اس کے لئے اتنی جائداد چھوڑ گیا کہ وہ فارغ البالی سے زندگی بسر کر سکتی تھی۔ فلورنس مالی مشکلات سے چھٹکارا حاصل کر چکی تھی، اور مارٹن اپنی زندگی اس سے وابستہ کر کے چین و آرام سے زندگی بسر کر سکتا تھا مگر توقع کے خلاف وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ اب فلورنس سرمایہ دار تھی، مغرور تھی اور مارٹن کو دکھانا چاہتی تھی کہ اس کے چاہنے والے سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔

اتفاق نے اسے ہنری کے راستے میں لا کھڑا کیا۔ وہ ایک نگاہ میں اس کا عاشق ہو گیا اور ایک مہینہ کے اندر اندر وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے۔

اس واقعہ نے مارٹن کے دل میں محبت کی چھپی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دی۔ وہ فلورنس کے پاس مجسم سوال بن کر آیا اور محبت کی بھیک مانگی مگر فلورنس نے اس کی چاہت کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

"ہنری بالکل اجنبی ہے تمہیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں"۔

"مجھے معلوم ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں"۔

"تم نے ایک ہفتہ میں یہ رائے کیسے قائم کر لی؟"

"محبت، فلسفہ نہیں ہے کہ اس پر برسوں محنت کی جائے"۔ فلورنس نے ناز سے کہا اور مارٹن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہا ہوں"۔ مارٹن نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا"۔ فلورنس نے جواب دیا۔ "مگر حقیقت یہ ہے کہ میں آج تک محبت سے بالکل نا آشنا تھی"۔

مارٹن ناکام لوٹا مگر اس کے دل میں محبت کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ چکا تھا اور اس کیلئے خیال محبوب سے دامن چھڑانا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ فلورنس اور ہنری نکاح کے مقدس رشتے سے باندھ دیئے گئے تھے۔ مارٹن مغربی عاشق تھا اگر اس کی رگوں میں مشرقی خون ہوتا تو اپنے رقیب کے پیٹ میں آگ بھر دیتا مگر اس کے اردگرد بیسیوں ناکام محبت انسان گھوم رہے تھے اس لئے صبر کر کے بیٹھ رہا۔

شادی کی دوسری رات فلورنس نے خواب دیکھا۔ اس کا شوہر دم توڑ رہا تھا۔ مارٹن اس پر جھکا ہوا تھا اور اسی کے طاقتور ہاتھوں نے ہنری کو آغوش مرگ

میں سلایا تھا۔ فلورنس ماتم کرنے کی بجائے اپنے شوہر کی موت پر تسکر گزار تھی اور مارٹن نے اسے آغوش میں دبا رکھا تھا۔

یہ خواب حد سے زیادہ بھیانک تھا۔ مگر پندرہ دن میں تین بار یہی خواب دکھائی دیا جس سے وہ ایک عجیب الجھن میں گرفتار ہوگئی۔ اس وقت بھی وہ اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنے شوہر سے ذکر نہیں کیا تھا مگر دراصل وہ اسے مارٹن کی زد سے محفوظ رہنے کے لئے ایک غیبی تنبیہ خیال کرتی تھی ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے بیخودی سے چونکا دیا اور وہ دوڑ کر ملاقات کے کمرہ میں گئی۔

"کون صاحب ہیں؟"

"فلورنس، میں ہوں مارٹن؟"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"میں نے ایک ہفتہ کی رخصت لیلی ہے اور یہاں ایک ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو آج رات شرف ملاقات حاصل کر دں!"

"نہیں" فلورنس نے تلخ لہجہ میں کہا "آپ کی تشریف آوری کی ضرورت نہیں"

کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر حسرت و مایوسی کے لہجہ میں مارٹن کی آواز سنائی دی ——"بہتر میں آپ کو تکلیف نہیں دونگا ——"

فلورنس کو ٹیلیفون میں اس کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"آج رات ہمارے یہاں ایک دو مہمان آئے ہوئے ہیں" فلورنس نے متاثر ہوکر کہا "آپ کل رات تشریف لا سکتے ہیں"

"شکریہ" مارٹن نے جواب دیا مگر اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی "بہت ممکن ہے کہ میں کل صبح یہاں سے چلا جاؤں۔ خدا حافظ ——"

فلورنس نے رسیور کو لٹکا دیا اور اطمینان کا سانس لیا۔

"وہ یہاں نہیں آسکتا، وہ یہاں نہیں آسکتا" اس نے کئی بار کہا "میں خوش ہوں کہ وہ مجھ سے ملاقات نہیں کر سکا"

خیالات کی کشمکش سے گھبرا کر وہ ٹہلنے کیلئے باغ میں چلی گئی۔ بہار کا موسم تھا ذرے ذرے پر جوانی کا عالم تھا۔ گلاب کے تختے میں بلبل گا رہی تھی اور اس کے نغمے محبت کے آئینہ دار تھے۔ یہ باغ اور مکان جس کا ذرہ ذرہ جنت نگاہ تھا ہنری نے شادی سے چند روز پہلے اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا تھا۔ فلورنس نے جب اسے دیکھا تو اس کی خوبیوں پر دیوانی سی ہوگئی۔ یہ جگہ بالکل الگ تھلگ اور آبادی سے دو میل کے فاصلہ پر تھی، مگر اس کے کشادہ کمرے۔ خوبصورت عمارت دلکش باغ، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون کا تعلق ان سب چیزوں نے مل ملا کر اسے بہت دلچسپ بنا دیا تھا۔ اس کے مالک کو روپے کی ضرورت تھی اس لئے وہ مکان کو کرایہ پر دینے کے بجائے بیچنے پر آمادہ تھا۔ اگرچہ ہنری بہت امیر تھا مگر نقدی کی صورت میں اس کے پاس صرف ہزار پونڈ تھے اور مکان کا مالک تین ہزار طلب کرتا تھا۔ فلورنس نے اپنا نصف سرمایہ دیکر وہ مکان خرید لیا۔ نوکر چاکر اس ویرانے میں گھبراتے تھے اس لئے فلورنس نے مکان کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کا انتظام خود سنبھال لیا مگر باغیچہ کو درست رکھنے کیلئے ہفتہ میں دو بار گاؤں سے ایک بوڑھا مالی آیا کرتا تھا۔

باغیچہ میں جاتے ہی فلورنس مالی سے دوچار ہوئی جو پھولوں کے ایک تختے کو سیراب کرنے میں مصروف تھا۔ وہ شرائط کے مطابق منگل اور ہفتہ کو آیا کرتا تھا اور اس روز خلاف معمول جمعرات کا دن تھا۔

"جارج، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" فلورنس نے اس کے قریب جا کر کہا۔

بوڑھا جھک کر آداب بجا لایا۔

"ہفتہ کو میرے یہاں ایک تقریب ہے اس لئے میں آج حاضر ہوگیا ہوں، امید ہے کہ آپ اور مسٹر ہنری میری مجبوری کو مد نظر رکھتے ہوئے معاف فرمائینگے۔

"معمولی بات ہے!" فلورنس نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ کل آپ لندن تشریف لیجا رہی ہیں"

"میں تو کہیں نہیں جا رہی!"

"میں نے مسٹر ہنری سے سنا تھا کہ کل صبح آپ دونوں لندن جا رہے ہیں اور عرصہ تک وہیں رہینگے"

"غلط ہے" اس نے مسکرا کر کہا "تم نے غلط سمجھا ہوگا!"

اگرچہ وہ باغبان سے مصروف گفتگو تھی مگر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ہنری نے ایسا کیوں کہا تھا "لندن جا رہے ہیں" درحقیقت وہ لندن سے کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔

"میں شہری زندگی اور خاص طور پر لندن سے نفرت کرتی ہوں" اس نے ہر ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی" جارج نے اعتراف کرتے ہوئے کہا "آپ کے یہاں رہنے سے مجھے خوشی ہے"

"اس مکان کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" فلورنس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ مکان لندن کے ایک رئیس نے بنوایا تھا اور باغیچہ کو درست کرنے کے لئے اس نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ اس نے مکان کی تعمیر پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ تم اس روپے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکو گے مگر اس نے جواب دیا کہ میں اس کے پورے دو ہزار پونڈ وصول کر دونگا۔"

"اس نے تین ہزار وصول کئے ہیں" فلورنس نے مسکرا کر کہا۔

"دو ہزار" جارج نے دہرایا۔ "قیمت میرے سامنے طے ہوئی تھی۔"

"تمھیں اس معاملے میں غلط فہمی ہو رہی تھی۔ یہ مکان تین ہزار پونڈ میں بکا ہے"

جارج جھک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"اس کی قیمت دو ہزار پونڈ طے ہوئی تھی۔" اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔

۲

فلورنس نے اس سے مزید گفتگو بیکار سمجھی اور آگے بڑھ کر پھولوں کا گلدستہ تیار کرنے لگی۔ جب وہ رنگین اور مہکتے ہوئے پھولوں سے دامن بھر کر واپس جا رہی تھی تو اسے ایک پودے کے سبز پتوں میں ایک چھوٹا سا کاغذ دکھائی دیا۔ چونکہ وہ اس کے خاوند کی ڈائری سے پھاڑا گیا تھا اس لئے اس نے جھک کر اس پرچہ کاغذ کو اٹھا لیا۔

ہنری باقاعدہ زندگی بسر کرنے والا انسان تھا اور ہر روز طے شدہ پروگرام کے مطابق کام کرتا تھا۔ اس ورق پر ۱۳ مئی جمعرات کی تاریخ درج تھی اور چونکہ وہ اسی دن سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے فلورنس نے شوق سے اپنے شوہر کا پروگرام پڑھنے کے لئے ورق کھولا مگر وہاں "نو بجے رات" کے سوا کوئی لفظ درج نہ تھا۔ فلورنس اس معمہ کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ وہ بار بار سوچتی تھی کہ نو بجے رات لکھنے سے ہنری کا مطلب کیا تھا مگر غور و فکر سے کسی نتیجہ پر پہونچنا دشوار تھا۔ آخر کار اسے مارٹن کے یہ الفاظ یاد آگئے۔ "یہ آدمی بالکل اجنبی ہے۔ تمھیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔"

انجام کار اس نے خیالات کو دل سے نکال دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور باورچی خانے میں جا کر کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ شام کے قریب ہنری گاؤں سے واپس آیا اور دونوں میاں بیوی نے مل کر کھانا کھایا اور بعد میں وہ ملاقات کے کمرے میں جا بیٹھے۔ ہوا میں گرمی کا اثر غالب تھا کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور خوشبو سے بھری ہوئی ہوا کے جھونکے دل میں خوشی پیدا کر رہے تھے۔

"آج نو بجے رات آپ کا کیا پروگرام ہے۔" فلورنس نے مسکرا کر اپنے خاوند سے پوچھا۔

ہنری کے چہرے پر سیاہی دوڑ گئی اور گھبرا کر بولا۔ "کیا مطلب؟"

فلورنس نے ڈائری کا ورق اس کے سامنے رکھ دیا۔

ہنری نے بمشکل اپنے حواس پر قابو حاصل کیا اور مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "آج رات ایک حسینہ سے ملاقات کا وعدہ ہے اس کے بال بھورے اور آنکھیں نیلی ہیں ہو بہو تمھاری شکل کی ہے۔"

"میں نہیں سمجھی" فلورنس نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں، میں نے یہ الفاظ یادداشت کے طور پر لکھے تھے۔ آج رات میں چند فوٹو دھونا چاہتا ہوں اور اس کام میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"اور نو بجے رات کے سوا اور کوئی وقت موزوں نہیں ہے۔"

ہنری گھبرا گیا۔

"میری پیاری" اس نے صاف لہجے میں کہا۔ "ہر ایک کام کے لئے وقت مقرر ہونا چاہئے اس سے زندگی باقاعدہ بنتی ہے۔"

اس کے بعد ہنری نے آرام کرسی پر لیٹ کر سگار پینا شروع کر دیا اور فلورنس اپنے خیالات میں کھو گئی۔

"میں تمھارے متعلق کچھ نہیں جانتی۔" فلورنس نے جذبات کی کشمکش سے تنگ آ کر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

ہنری چونک اٹھا۔ یہ سوال بالکل نیا اور انوکھا تھا۔

"پیاری! میں نے اپنی زندگی کے تمام اوراق تمھارے سامنے الٹ دیئے ہیں۔ میں لنکا شائر میں پیدا ہوا۔ آسٹریلیا میں شباب کی بہار دیکھی۔ پچھلے دس سال جنوبی افریقہ میں مقیم رہا اور وہیں یہ تمام دولت پیدا کی۔"

"کیا اس سے پہلے آپ کو کسی سے محبت پیدا ہوئی؟"

"ہرگز نہیں، میری پہلی اور آخری محبت تمھیں ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "مگر آج رات تم ایسی دور از کار باتیں کیوں پوچھ رہی ہو!"

فلورنس کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

"آج صبح سے میری طبیعت بیقرار ہے۔"

"کیوں؟" ہنری نے پوچھا۔

"آج ہر ایک چیز مجھے پریشان بنا رہی ہے۔ جارج مجھے ایک عجیب

الجھن میں ڈال گیا ہے۔ اس نے تمھاری زبانی سنا تھا کہ کل صبح ہم دونوں لندن جا رہے ہیں۔

"نامعقول" ہنری نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

فلورنس حیرت سے اپنے خاوند کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اور پیشانی سے بل بوٹی پھڑک رہی تھی۔

"تمھیں کیا ہو گیا؟" فلورنس نے گھبرا کر کہا۔

"وہ بڑا بدمعاش ہے"۔ ہنری نے غصے سے بھڑکتے ہوئے کہا۔

"لیکن اسے یہ خیال کیونکر پیدا ہوا؟"

"میں نے اس سے ہرگز ذکر نہیں کیا۔ ہاں یاد آ گیا۔ ایک روز میں نے اس سے مذاق کیا تھا کہ ہم تمھیں لندن لے جائینگے"۔

وہ گھبراہٹ میں اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر فلورنس نے مکان کی قیمت کا ذکر چھیڑا۔ ہنری کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔ "وہ دو ہزار پونڈ نقد وصول کر چکا ہے اور جب ہم مزید ایک ہزار پونڈ ادا کرینگے تو اس وقت ہمیں مالکانہ حقوق حاصل ہونگے"۔

"ایسا ہی ہو گا" فلورنس نے جواب دیا اور کلاک کو دیکھ کر کہنے لگی "نو بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں چلو نو ڈھو لیں"۔

"دیکھا جائیگا" ہنری نے بے خیالی سے جواب دیا۔

۳

صبح کو جب فلورنس بیدار ہوئی تو غم و افکار کے بادل غائب تھے اور حسب معمول کامیاب زندگی کی مسرتیں اس کے سامنے مسکرا رہی تھیں۔ دن بھر مارٹن نے کوئی پیغام نہ بھیجا اور نہ کوئی خلاف معمول واقعہ پیش آیا۔ مگر شام کے قریب وہ دوبارہ پریشان ہو گئی "یہ آدمی بالکل نیا ہے اور میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی"۔

خیالات دوبارہ اسے پریشانی کی ہولناک تاریکیوں میں گھسیٹ لے گئے اور وہ اپنے دل کو تسلی دینے کی ناکام کوشش میں ادھر ادھر گھومنے لگی "کل رات دو نو بجے کس عورت سے ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ نو ڈھونا محض ایک بہانا تھا؟ ——— وہ جارج پر اتنا ناراض کیوں تھا؟"۔

اگلے روز ہنری کچھ ضروری اشیا خریدنے کے لئے بازار گیا فلورنس

خود جانا چاہتی تھی مگر ہنری نے اسے روک دیا اور منت و سماجت کے باوجود اسے جانے نہ دیا۔ یہ واقعہ فلورنس کے لئے مزید پریشانی کا باعث ہوا۔ وہ اسے بازار جانے سے کیوں روکتا ہے یہ معمہ بھی اس کے فہم سے بالاتر تھا۔

"ممکن ہے کہ وہ اسے مارٹن سے دور رکھنا چاہتا ہو" اس نے اپنے دل کو فریب دینے کی کوشش کی مگر درحقیقت وہ خود اسے باور کرنے کیلئے تیار نہ تھی۔ آخر کار وہ دل بہلانے کے لئے مکان کی صفائی میں مشغول ہو گئی خوابگاہ کو صاف کیا۔ ملاقات کے کمرہ کو جھاڑا اور پھر اپنے خاوند کے خاص کمرے میں پہنچی وہاں جا کر وہ پھر خیالات کی رو میں بہہ گئی اور اس نے ہنری کے کاغذات کو الٹ پلٹ کرنا شروع کیا۔ خطوط اور ضروری تمسک ملاحظہ کئے۔ دراز کھول کر دیکھے۔ جیبوں کی تلاشی لی۔ مگر سنگار میز کے دو دراز اس سے کھل نہ سکے اب وہ سراپا جستجو بن چکی تھی اور معلومات حاصل کرنے کے شوق میں اس کی ہمت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ اس نے چابیوں کا گچھا ڈھونڈ نکالا اور تیسری چابی نے ایک دراز کا تالہ کھول دیا۔ اس کے اندر سے چیک بک اور نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ نکالا۔ اس کے علاوہ خطوط کا ایک بنڈل تھا جو ایک خوبصورت دھاگے سے بندھا تھا۔ اشتیاق سے فلورنس کی روح آنکھوں میں کھینچ آئی۔ اس نے بنڈل کھولا خطوط دیکھے بھالے اور شرما کر اسی دراز میں رکھ دیئے وہ اس کے اپنے خطوط تھے جو اس نے شادی سے قبل ہنری کے نام لکھے تھے۔ دوسرا دراز کسی چابی سے نہ کھل سکا۔ مگر فلورنس شکست کھانے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ نیچے جا کر چابیوں کا ایک گچھا لے آئی اور اس کی مدد سے وہ دراز کھول لیا اور بڑے شوق سے باہر کھینچا اس میں اخبارات کا ایک بنڈل تھا جو قدیم ہونے کی وجہ سے میلے ہوگئے تھے۔ فلورنس نے اطمینان کا سانس لیا اور ان کی اہمیت سمجھنے کیلئے انہیں کھولا وہ سات سال قبل کے امریکن اخبار تھے اور ایک بدمعاش عیار آدمی پیس نامی کے مقدمہ کی روئداد ان میں شایع ہو رہی تھی۔ حکومت کو شبہ تھا کہ پیس متعدد معصوم عورتوں کی جان لے چکا ہے۔ اس کے مکان میں فرش کے نیچے ایک عورت کا ڈھانچہ ملا تھا۔ اس نے کئی شادیاں کیں مگر ہر بار کچھ عرصے کے بعد اس کی بیوی گم ہو جاتی تھی اور کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ پیس نے اضلاع متحدہ کے قابل ترین وکیلوں کی مدد سے اپنے مقدمہ کی پیروی کی اور الزام ثابت نہ ہو سکا مگر بعد میں اسے فریب دہی کے الزام میں آٹھ سال بامشقت قید کی سزا دی گئی۔

فلورنس کو اس کے حالات بخوبی یاد تھے اور اسے یہ بھی معلوم تھا نہ تین سال کے بعد پیس قید خانے سے نکل بھاگا اور اضلاع متحدہ کی پولیس اسے دوبارہ گرفتار نہ کر سکی۔ عورتوں کو بہکانے میں پیس کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا اور اس کے متعلق دیر تک اخباروں میں رائے زنی ہوتی رہی۔ ایک اخبار میں پیس کا فوٹو بھی موجود تھا۔ فلورنس نے بڑے اشتیاق سے اسے روشنی میں لے جا کر دیکھا۔ مگر اس کو دیکھتے ہی خون اس کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔ پیس اس کے خاوند ہنری کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ غالباً اسی لئے اس کے پاس اخبارات محفوظ تھے۔ تصویر کے نیچے اس کے مختصر حالات اور یہ الفاظ درج تھے۔

"ملزم نے اپنی ڈائری میں کئی مقامات پر دن کا پروگرام بتاتے ہوئے وقت کا اندراج کیا ہے مگر اس کے مقابل میں کوئی کام درج نہیں ہے اور سرکاری وکیل کا خیال ہے کہ ان ایام میں بیگناہ بیویوں کو ہلاک کیا گیا۔"

مقدمے کی روئداد میں ایک عورت کی شہادت درج تھی جس نے ملزم کی شناخت میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی بائیں کلائی پر ایک مسہ تھا۔ فلورنس کے ہاتھ سے اخبارات کا بنڈل نیچے گر پڑا اور خوف کی وجہ سے وہ تھرا اٹھی، اس کے خاوند کی بائیں کلائی پر زخم کا ایک چھوٹا سا نشان تھا۔

۴

کمرہ اسے گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور ہونٹ پھڑکنے لگے۔ مکان اس کے روپے سے خریدا گیا ——— وہ روپیہ جس سے اسے مستقل ماہوار آمدنی تھی ——— اُس وقت وہ ہنری کے پنجہ سے نکل بھاگنا چاہتی تھی اور مارٹن کی آغوش کے سوائے اسے کہیں جائے پناہ نظر نہیں آتی تھی پیس نے اسے اپنا شکار بنانے کے لئے تاکا تھا اور ممکن تھا کہ بہت جلد ——— جب اسے جمعرات ۹ بجے رات کے الفاظ یاد آئے تو اس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی جان کس طرح بچی؟ کس چیز نے اس کو بچایا اور عین وقت پر کیوں جھجک گیا؟ اور معاً ان سوالات کا جواب بجلی کی طرح اس کے دماغ کی تاریکیوں میں چمکا ——— جارج ——— اب اسے اپنے خاوند کے بے پناہ غصہ کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ لوگوں کا شبہ دور کرنے کے لئے وہ یہ کہتا رہا کہ ہم دونوں لندن جانے والے ہیں۔ خلاف معمول اس روز جارج باغیچہ میں کام کرنے کے لئے آیا اور مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی ———

اس رات مجھے قتل کرنا خطرناک تھا۔ جارج کا بیان اسے پھانسی کے تختے تک لے جاتا۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے کے بعد ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ ہنری کے واپس لوٹنے سے پہلے وہ اس مکان سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے کاغذات کو دراز میں رکھا اور تالا لگا دیا۔

عین اس وقت باہر سے صدر دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی اور خون اس کی رگوں میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ ایک دو منٹ فلورنس بت بنی کھڑی رہی اور پھر کھڑکی سے باغیچہ کی طرف جھانکا۔

اس کا خاوند مسکراتا اور گنگناتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیلچہ تھا۔ جسے دیکھ کر فلورنس خوف کی وجہ سے لرز اٹھی۔ اس رات اس کے قتل کے لئے تمام سامان مہیا ہو چکا تھا۔

ہنری گنگناتا ہوا مکان کے پشت کی طرف چلا گیا۔ وہ فوراً سیڑھیوں سے اتری اور باہر کی جانب بھاگنے لگی۔ مگر جس وقت وہ پھاٹک کے قریب پہنچی، ہنری اس طرف آگیا۔

"ہیلو!" اس نے کہا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

فلورنس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بھاگنے کا موقع ہاتھ سے جا چکا تھا لیکن اگر اس نے ہنری کو شبہ میں نہ ڈال دیا تو اب بھی ممکن تھا۔

"میں ذرا اس طرف ٹہلنے جا رہی ہوں"۔ اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"بہتر" ہنری نے کہا۔ "میں بھی آپ کے ہمراہ چلتا ہوں"۔

"نہیں نہیں مجھے سر درد ہے۔ اگر اکیلی جاؤنگی"۔

ہنری نے اسے غور سے دیکھا اس کی آنکھوں میں شبہ کی جھلک صاف نمایاں تھی

——"فلورنس تمہیں کیا ہو گیا تم زرد ہو رہی ہو"۔

"کچھ نہیں"۔ اس نے اندوہ کو تبسم کے پردے میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھے سر درد ہے، سیر کرنے سے آرام ہو جائیگا"۔

"میرے ساتھ چلنے سے آپ کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوگی" ہنری نے کہا۔ "میں ضرور آپکے ساتھ جاؤنگا"۔

اب انکار کرنا بے سود تھا۔

فلورنس نے مشکل سے اپنے حواس کو درست کیا۔ مگر بار بار وہ مضطرب ہو کر ادھر ادھر دیکھتی تھی۔ اور بالکل خاموش تھی۔ پھر اگر ہنری نے اس کے

سر پر بادام روغن کی مالش کی اور دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ لذیذ طعام فلورنس کے حلق میں اٹک رہا تھا۔ اس کے دل میں قیامت کا طوفان بپا تھا موت اپنے بھیانک روپ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کسی کونے میں مُنہ لپیٹ کر رونا چاہتی تھی۔ وہ اس تنہا مکان میں اس خونخوار مرد کے ہمراہ تنہا تھی، آبادی سے بہت دور ــــــ یار و احباب اس کے حال سے بے خبر تھے وہ اس قیدی سے مشابہ تھی جسے پھانسی کا حکم مل چکا ہو اور جلاد اس کی کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔ وہ حسرت اور افسوس سے زمین و آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ اونچے نیچے درخت سبز پوش۔ پورے سُرخ سُرخ پھول اس کی نگاہوں کو خوشنما نظارہ دے رہے تھے [illegible] شیشے کے گلے سے ملکر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ دوسرے کمرے میں ٹیلیفون لگا تھا۔ وہ مدد کے لئے پکار سکتی تھی مگر اس جلاد کے روبرو ایسے ممکن نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اسے یہ خیال سوجھا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ مارٹن آج رات مجھ سے ملاقات کرنے آرہا ہے۔ مگر الفاظ اس کے ہونٹوں پر آکر رک گئے۔ یہ خونخوار قاتل فوراً مجھے ہلاک کر دیگا اور ٹیلی فون پر مارٹن کو اطلاع دیدیگا کہ آج رات ہم مصروف ہیں ــــ کاش آج مارٹن میرے پاس ہوتا ــــ

اچانک اسے ایک نیا خیال سوجھا اس نے اپنے حواس پر مکمل قابو پالیا اور اٹھ کر قہوہ تیار کرنے لگی ــــ

"خوب یاد آیا!" ہنری نے کہا۔ "آج رات وہ فوٹو دھونے ہیں۔"

فلورنس سر سے پاؤں تک لرز اٹھی مگر اس نے صاف لہجے میں جواب دیا "آپ اکیلے دھولیں میں بہت تھکی ماندی ہوں۔"

"کام بہت جلد ختم ہو جائیگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو تھکن محسوس نہیں ہوگی۔"

ہنری قہقہے لگا رہا تھا مگر فلورنس کانپ رہی تھی۔ وہ موت و حیات کے درمیانی نقطہ پر کھڑی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں قصاب کو فون کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس وقت؟"

"بلاشبہ اس کی دکان بند ہو چکی ہے مگر وہ گھر میں ہوگا۔ کل اتوار ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ تھوڑے سے پسندے صبح سویرے لے آئے۔"

وہ تیزی سے ٹیلیفون کے کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر لیا۔

"دروازہ کھلا رہنے دو۔" ہنری نے چلا کر کہا۔

"پتنگے اندر آرہے ہیں۔" فلورنس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

اندر جاکر اس نے مارٹن کو بلایا مگر ابھی کوئی بات نہیں کرنے پائی تھی کہ ہنری دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ فلورنس کے دل کی حرکت مدھم پڑگئی۔ اور اس کی امید دھوئیں کی طرح ہوا میں گم ہو کر رہ گئی۔

"ہنری پیارے چلے جاؤ۔" اس نے رک رک کر کہا۔ "میں جب فون کر رہی ہوں تو میرے کمرے میں نہ آیا کرو۔"

جواب میں وہ مسکرا دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا تم واقعی قصاب کو ٹیلی فون کر رہی ہو۔"؟

اس کی تجویزوں کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ امید یاس کے انبوہ میں گم ہو گئی مارٹن ٹیلی فون پر آنے والا تھا۔ کیا وہ چلا کر اسے خطرے سے آگاہ کر دے اس وقت وہ اس چابی کو پکڑے ہوئے تھی جس سے آواز کا تعلق قائم کیا یا توڑا جا سکتا ہے اچانک ایک اچھوتی تجویز اس کے ذہن میں داخل ہوئی۔

"یہ بہت مشکل ہے۔" اس نے سوچا۔ "اور اس مہم کو سر کرنے کے لئے عقل اور ذہن کے تمام خزانوں کی ضرورت ہے تاہم میں کوشش کروں گی۔"

اس وقت دوسری جانب سے مارٹن کی آواز سنائی دی۔

فلورنس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور کہا۔

"مسز ہنری بول رہی ہے (اس نے تعلق توڑ دیا) کل صبح سویرے سات پسندے لے کر (تعلق قائم کر لیا) یہاں تشریف لائیے۔ نہایت ضروری ہے (تعلق توڑ دیا) شکریہ مسٹر تھارن معاف فرمائیے میں آپ کو بے وقت تکلیف دے رہی ہوں مگر یہ پسندے میرے لئے (تعلق قائم کر لیا) زندگی اور موت کا سوال (تعلق توڑ دیا) ہیں بہتر کل صبح (تعلق قائم کر لیا) بہت جلد۔"

اس نے ریسیور علیحدہ رکھ دیا اور مڑ کر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ مجسم اضطراب تھی مگر ہنری بالکل مطمئن تھا۔ "خدا جانے مارٹن نے ان حالات کو سمجھا ہے یا نہیں۔"

وہ اٹھ کر ملاقات کے کمرے میں چلی گئی اور دونوں میاں بیوی آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"اب تمہیں افاقہ معلوم ہوتا ہے۔" ہنری نے کہا۔

"جی ہاں، اب مجھے آرام ہے۔"

فلورنس نے مسکرا کر کلاک کی طرف دیکھا آٹھ بجکر پچیس منٹ تھے ہارٹن یقیناً ۹ بجے سے پہلے یہاں موجود ہوگا۔

"آج قہوہ کچھ بدمزہ تھا" ہنری نے ماتھا سیکڑتے ہوئے کہا۔

"ایک دوکاندار نے نمونہ کے طور پر بھیجا تھا۔ آئندہ ہم اسے استعمال نہیں کرینگے۔"

فلورنس ان دنوں ایک رومال کاڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنا سامان نکالا اور کام میں مصروف ہوگئی۔ ہنری ایک کتاب پڑھ رہا تھا اچانک اس نے کلاک کی طرف دیکھا اور کتاب ایک طرف پھینکدی۔

"ساڑھے آٹھ ہو چکے ہیں چلو اب چل کر فوٹو دھولیں۔"

سوئی فلورنس کے ہاتھ سے گر پڑی۔

"اس وقت نہیں ۔۔۔ مجھے کام ہے۔"

"نہیں میری جان ساڑھے آٹھ ہو چکے ہیں۔ میں نے یہی وقت مقرر کیا تھا"

"ذرا ٹھہرو !"

"تمہیں یاد ہوگا کہ میں ہمیشہ سے وقت کا پابند ہوں اب میں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

فلورنس سر سے پاؤں تک لرز اٹھی۔ ہنری کا ہولناک ارادہ بے نقاب ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں اشتیاق سے چمک رہی تھیں اور وہ بار بار اپنی مٹھیوں کو بند کر کے اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیر رہا تھا۔ اس کی حرکات میں دیوانگی اور اشتیاق کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ ہنری جذبات کے زیر اثر اٹھ کھڑا ہوا اور فلورنس کو کندھوں سے پکڑ کر خوب جھنجھوڑا۔

"چلو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر لیجاؤنگا۔"

فلورنس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑایا اور بھاگ کر کونے میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ گو وہ مجبور اور بے اختیار تھی ہنری دانت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

"فلورنس آؤ، آؤ۔"

"نہیں، نہیں!"

اس کے ہونٹوں سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

"ہنری، ٹھہرو ٹھہرو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں! "مجھے اعتراف کرنا ہے

وہ رک گیا ۔۔۔!

"اعتراف؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں اعتراف گناہ!" فلورنس نے اپنے شوہر کی توجہ کو جذب کرتے ہوئے کہا۔

ہنری کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔

"کوئی پرانا عشق؟"

"نہیں" فلورنس نے کہا۔ "نہیں ایک جرم! ۔۔۔ جس کی میں مرتکب ہوئی تھی۔"

فلورنس نے ہنری کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خود جرائم پیشہ تھا اور اس لفظ سے اسے بہت دلچسپی تھی۔

فلورنس دوبارہ صورت حالات پر قابو پا چکی تھی۔

"بیٹھ جاؤ" ہنری نے کہا۔

فلورنس آہستہ آہستہ اپنی کرسی کی طرف بڑھی اس کا دماغ ایک ایسا افسانہ تیار کرنے میں مصروف تھا جو کم ازکم بیس منٹ تک اس کے خاوند کو متوجہ رکھے۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا" اس نے آہستہ سے کہا کہ "میں پندرہ سال تک ایک دفتر میں ٹائپسٹ رہی مگر یہ حقیقت سے بعید تھا۔ دو بار میں نے ملازمت ترک کی۔ جب میں بائیس برس کی تھی تو ایک دولتمند بوڑھا مجھ پر عاشق ہوگیا اور ہم دونوں میاں بیوی بن گئے۔" وہ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ "میں نے اسے مجبور کیا کہ میرے حق میں زندگی کا بیمہ کرائے۔"

ہنری اس کے قصہ کو غیر معمولی دلچسپی سے سن رہا تھا اس کے ہونٹ لٹکے ہوئے اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"جنگ عظیم کے دنوں میں میں ایک ہسپتال میں کام کرتی رہی تھی۔ وہاں میں نے ہر قسم کے زہروں سے واقفیت حاصل کی۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی۔ ہنری پوری پوری دلچسپی لے رہا تھا۔

ناامیدی کے اندھیرے میں امید کی کرن جھلملا رہی تھی۔

"وہاں ایک زہر تھا ۔۔۔ سفید سفوف ۔۔۔ اس کا ایک ذرہ مرگ ناگہاں کا پیام تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں زہروں سے واقفیت ہوگی؟"

یہ سوال اس نے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔ اگر ہنری زہر کے اقسام سے واقف ہوا تو اسے کہانی وضع کرنے میں محتاط رہنا پڑیگا۔

"میں زہروں سے بالکل ناآشنا ہوں۔"

فلورنس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اس زہر سے فوراً موت واقع ہوجاتی ہے مگر ڈاکٹر یہی سمجھتے ہیں کہ موت دل کی حرکت بند ہوجانے سے واقع ہوتی ہے۔ میں نے اس زہر کی کچھ مقدار چرالی اور اپنے پاس رکھی۔" وہ پھر رک گئی۔

"کہئے کہئے!"

"آج نہیں پھر سہی!"

"نہیں نہیں، میں آج ہی سننا چاہتا ہوں۔"

"ہماری شادی کو ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ میں اپنے بوڑھے شوہر کی خدمت میں کوئی کمی روا نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر ایک سے میری تعریف کرتا تھا اور ہمسایوں میں میری خدمت گزاری اور اطاعت کے چرچے تھے میں ہر روز شام کو اپنے شوہر کیلئے قہوہ تیار کرتی تھی ایک روز میں نے موقع پاکر تھوڑا سا زہر اس کے پیالے میں ڈال دیا۔"

فلورنس خاموش ہوگئی اور بڑی احتیاط سے سوئی میں دھاگہ ڈالا اسے اپنی زندگی میں کبھی ایکٹ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر اس وقت وہ دنیا کی بہترین ایکٹرس کو شرمندہ کر رہی تھی اور ایک خونخوار قاتل کا پارٹ کمال خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی۔

"میں بالکل مطمئن تھی اور اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑی سی بیقراری ظاہر کی اور کہنے لگا کہ میرا دم گھٹتا ہے۔ میں نے کھڑکی کھول دی مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکا اور تھوڑی دیر کے بعد مر گیا۔" فلورنس مسکرا رہی تھی۔ نو بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ مارٹن ابھی آتا ہوگا۔

"بیمہ کا روپیہ کتنا تھا؟" ہنری نے پوچھا۔

"دو ہزار پونڈ! مگر میں نے اسے جلدی برباد کر دیا اور اپنی اسامی پر واپس چلی گئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ وہ مجھے دوشیزہ خیال کرتا تھا اسے مجھ سے محبت ہوگئی اور ہم دونوں ویلز میں جاکر میاں بیوی بن گئے۔ میرا شوہر حسین اور امیر تھا اس نے میرے حق میں زندگی کا بیمہ نہیں کرایا مگر وصیت میرے حق میں مرتب کی۔ میں حسب معمول ہر روز اس کے لئے قہوہ تیار کرتی تھی۔" فلورنس ناز و ادا سے مسکرائی۔ "آپ جانتے ہیں کہ میں قہوہ بہت عمدہ تیار کرتی ہوں۔"

ہنری نے تیز تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اچانک ایک دن میرے خاوند کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ میں

زار زار رو تی اور اپنے سر کے بال نوچتی تھی۔ ڈاکٹر کو مجھ پر شبہ نہیں تھا گر وہ میرے شوہر کی ناگہانی موت پر بہت حیران تھا۔ ہمسایوں نے مجھے تسلی و تشفی دی اور میں اپنے دفتر میں واپس آگئی۔ دوسرے خاوند کی موت پر مجھے چار ہزار پونڈ ملے اور میں نے انہیں بنک میں جمع کروا دیا۔ تب ——"

ہنری بیقرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ سانس رک رک کر آتا تھا ——۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلی سے فلورنس کی طرف اشارہ کیا۔

"قہوہ، او میرے خدا قہوہ!"

فلورنس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی وجہ ہے کہ وہ ذرا اکڑ وا تھا۔ شیطان مجسم تو اپنی عادت سے باز نہیں آئی۔"

وہ اپنی کرسی کے بازو کو زور سے پکڑے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوراً اسے دبوچ لیگا۔

"تم نے مجھے زہر دیدیا ہے۔"

فلورنس اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس الزام کی پرزور تردید کرنا چاہتی تھی گر فوراً اسے ایک نئی بات سوجھی۔ ہنری اسے دبوچ لینے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس نے اپنے حواس جمع کئے اور پوری بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا۔

"ہاں! میں نے تمہیں زہر دیا ہے۔ زہر ابھی سے اپنا اثر دکھا رہا ہے اب تم کرسی سے حرکت نہیں کر سکتے —— حرکت نہیں کر سکتے۔"

وہ اپنی پوری قوت ارادی سے اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک جانب زندہ رہنے کی خوشگوار امید تھی اور دوسری جانب سر موت اپنے سرد پنجوں سے اس کا گلا دبوچ رہی تھی۔ اگر چند منٹ تک وہ اپنی کرسی سے حرکت نہ کر سکے تو کامیابی یقینی ہے۔ ورنہ ——

یہ کیا ہے سڑک پر قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے صدر دروازے کی چولیں چیخ رہی ہیں۔ پگڈنڈی پر چلنے کی آہٹ ہے دروازہ کھولا جا رہا ہے!

"تم حرکت نہیں کر سکتے" اس نے چیخ کر کہا۔

فلورنس اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑ کر مارٹن کے آغوش میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بیقرار ہو کر پوچھا۔

مارٹن کے ہمراہ پولیس کا ایک باوردی سپاہی تھا۔

"اندر جا کر دیکھو!"

مارٹن نے فلورنس کو احتیاط سے کوچ پر لٹا دیا۔ "میری جان" اس نے جھک کر کہا۔ "میں حاضر ہوں۔"

فلورنس نے آنکھیں کھولیں؛ اور کمزور لہجے میں اس کا نام لیا۔

"اندر ایک آدمی کرسی پر لیٹا ہے۔" پولیس مین نے کہا۔ "مگر حس و حرکت سے عاری ہے۔"

"وہ مر چکا ہے۔"

فلورنس کی آنکھیں بند تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیند میں بڑبڑا رہی ہے۔

ممتاز حسین۔ بی۔ اے۔ سیالکوٹ

کیفستان!

جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق ایم۔اے

نہ جانے کیا ہے ساقی دُرپرستوں کے مقدّر میں
چمکتا درد ہے یا آتشیں بادہ ہے ساغر میں

محبت نے فسانہ کرکے چھوڑا رہتی دنیا کو
بھرا کیفِ عدم عالم کے زنگار رنگ منظر میں

یہ لرزش، یہ گدازِ دل، یہ گرمی، یہ گرانباری
ہوا میں ہے، نہ پانی میں۔ نہ آتش میں نہ پتھر میں

نشیمن جل رہے ہیں، ہر چمن شعلہ بداماں ہے
یہ کس نے بجلیاں رکھ دی ہیں ہر برگِ گل تر میں

دلِ گم گشتہ کیا آیا صدائے بازگشت آئی
پکار آئے اسے ہم آج جاکر کوئے دلبر میں

کچھ اس سے رہروانِ عشق کو دلبستگی سی ہے
وہ عزمِ رہنمائی دیکھتے جاتے ہیں رہبر میں

نہ کھولی آنکھ تم نے بادۂ ہستی کے متوالو!
تھی اک جاتی ہوئی دنیا یہاں اک ایک منظر میں

پیامِ ناگہاں ہے موت کا یا دل ہے پہلو میں
میں کس کے ساتھ جاتا ہوں حریمِ نازِ دلبر میں

تجھے دیکھیں مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے
یہی اک رازِ پنہاں تھا طلوعِ صبحِ محشر میں

دلِ غمگیں ذرا آواز دینا عمرِ رفتہ کو
یہ حسرت آج کیسی ہے نگاہِ نازِ دلبر میں

اسیرانِ بلا یہ شامِ ہجراں جھیل ہی لینگے
بہت کچھ ہے ابھی تو تیرہ بختوں کے مقدّر میں

نہ ہو احساس تو ہے ساری دنیا بےحس و مُردہ
گدازِ دل ہو تو دُکھتی رگیں ملتی ہیں پتھر میں

ہمیں ہیں زندہ در گور اور حیاتِ جاودانی بھی
نہ بختِ خضر میں یہ ہے، نہ تقدیرِ سکندر میں

چھڑا اس رنگ سے افسانۂ بیدردیٔ قاتل
شہیدِ ناز آخر سو گئے آغوشِ خنجر میں

صدائے آمد آمد دل سے اٹھی خیر ہو یارب
فنا کے راز پنہاں ہیں خرامِ نازِ دلبر میں

گدازِ انجم میں، اک درماندگی کا کیف عالم میں
فراق ایسی کہاں ہے شامِ غم سب کے مقدّر میں

غزل

(از ماسٹر تبارک علی عبرت صدیقی بریلی)

کوئی کیا سمجھے مرے کیف کی دنیا کیا ہے
محوِ ساقی ہوں مجھے حاجتِ صہبا کیا ہے

حسن کیا چیز ہے اور عشقِ جنوں زا کیا ہے
سوچتا ہوں کہ یہ ہنگامۂ دنیا کیا ہے

اب تو ہر سمت سے آتی ہے انہیں کی آواز
کوئی کیا سمجھے مرے عشق کا نغما کیا ہے

ذرۂ خاک بھی محرومِ تجلی نہ رہا
چشمِ عاشق سے ہو پنہاں یہ تماشا کیا ہے

مجھ کو محسوس ہوا راہِ وفا میں اکثر
جیسے وہ پوچھ رہے ہیں کہ تمنا کیا ہے

یہ بھی حس اب مجھے اے جوشِ تمنا نہ رہی
درد کیا چیز ہے اور سعیٔ مداوا کیا ہے

اس میں آتے ہیں نظر دیر و حرم کے جلوے
دیکھ تو چشمِ طلب نقشِ کفِ پا کیا ہے

غرق ہو کر نظر آیا مجھے ساحل کا نشاں
اب کھلا راز کہ طغیانیٔ دریا کیا ہے

آپ اب یاد دلائیں تو مجھے یاد آئے
مجھ کو معلوم نہیں میری تمنا کیا ہے

کچھ سوا آرزوئے چشمِ تماشا ہو جائے
میں سمجھتا ہوں کہ اس پردہ کا منشا کیا ہے

اے مرے دردِ محبت کے مٹانے والے
یہ بھی معلوم ہے انجامِ مداوا کیا ہے

اس طرف ہے وہ نظر مائلِ پرسشِ عبرت
میں ادھر سوچ رہا ہوں کہ تمنا کیا ہے

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی، ادبی (باتصویر) رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۵ — فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۳۶ء — نمبر ۱۵

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۷ء دسمبر ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں اپنی نمایاں خصوصیات کے ساتھ شایع ہوگا

حافظ محمد عالم صاحب ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پرس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر ماڑا رسدھا لاہور سے شایع کیا۔

ملاحظات

دسمبر ۱۹۳۶ء میں شایع ہونے والے معرکہ آرا خاص نمبر ۱۹۳۷ء سے متعلق چند گذارشات

حسب معمول امسال بھی دسمبر کے پہلے ہفتہ میں عالمگیر کا خاص نمبر ۱۹۳۷ء انشاء اللہ العزیز ان ہنگامہ خیز خوبیوں اور معرکہ آرا خصوصیات کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا، جو عالمگیر اور صرف عالمگیر کے خاص نمبروں کا حصہ ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں خاص نمبر ۳۷ء میں شایع ہونے والے گرانقدر مضامین اور تصاویر کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کر کے عالمگیر کے ناظرین کرام کو یہ یقین دلا دوں کہ فی الواقع آپ کے عالمگیر کا خاص نمبر ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے اپنی نظیر آپ ہوگا۔ لیکن میرے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں تمام مضامین، تمام افسانوں، تمام حصہ نظم، اور تمام تصاویر پر مختصر سے مختصر طور پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔ میں صرف چند مضامین، چند افسانوں، چند نظموں اور چند تصاویر کے متعلق کچھ لکھوں گا۔ لیکن کن مضامین اور کن تصاویر سے محترم ناظرین کرام کو متعارف کراؤں، یہ انتخابی مرحلہ میرے لئے بیحد مشکل ہے۔ عالمگیر کے خاص نمبر کے مضامین اور تصاویر تو بلا مبالغہ شروع سے آخر تک اس قدر دلآویز اور کامیاب ہیں کہ ان میں سے چند ایک کو منتخب کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

بہرحال میں اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

تصاویر خاص نمبر ۳۷ء کی تمام تصاویر کے بلاکس خاص طور پر عالمگیر کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ تمام تصاویر میں سے صرف تین چار پر کچھ لکھ سکونگا اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ۔

نورجہاں اور گلاب کا پھول۔ اتنی بہترین اور ایسی لاجواب تصویر ہے کہ قابل مصور نے اس پر اپنے تمام کمالات فن کو پوری کوشش کے ساتھ صرف کر دیا ہے آپ تصویر ملاحظہ فرما کر یقیناً عش عش کر اٹھینگے۔

عمر خیام کی ایک رباعی۔ عمر خیام کی رباعیات پر پیشتر ازیں بھی تصاویر آپ کے ملاحظہ سے گذری ہونگی لیکن یہ تصویر اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی اور آخری تصویر ہے۔ جس شخص نے بھی اب تک اس تصویر کو دیکھا وہ خراج تحسین و آفرین ادا کرنے پر مجبور ہوا۔

التجائے محبّت۔ کہنے کو تو ایک تصویر ہے لیکن فی الحقیقت آرٹ کا ایک ایسا بے پناہ اور قیامت آفریں نمونہ ہے جس پر خود مصوری کو بھی بجا ناز ہے۔ تصویر دیکھنے اور صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ان تصاویر کے علاوہ اور بھی متعدد بہترین سہ رنگی و یک رنگی تصاویر ہیں جن پر عدم گنجائش کے سبب سے اظہار خیال ناممکن ہے۔ خاص نمبر میں ملاحظہ فرمایئے اور داد دیجئے۔

مضامین بوجوہ خاص نمبر ۳۷ء کے مضامین عالمگیر کے گذشتہ خاص نمبروں کیلئے بھی قابل رشک ہیں چند مضامین پر بالاختصار اظہار خیال کرتا ہوں۔

ابن ماجد۔ ہندوستان کے مشہور مورخ علامہ حکیم سید شمس اللہ قادری کا وہ معرکہ آرا مضمون ہے جو آپنے ازراہ کرم خاص طور پر عالمگیر کیلئے لکھا ہے۔ ابن ماجد کون ہے؟ اس کا مفصل حال تو آپ کو مضمون کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا مختصر طور پر یہ عرض کرتا ہوں کہ ابن ماجد مشہور عرب جہاز راں تھا جس نے ہندوستان کا راستہ معلوم کرنے کیلئے واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی۔ یہ شخص بہت زیادہ قابل اور عظیم المرتبت تھا لیکن اب تک قعر گمنامی میں ہے حالانکہ یورپ والے اس کی قابلیت کے معترف ہیں۔

فاران کی تحقیق۔ علامہ عنایت رسول مرحوم چریا کوٹی کا اتنا بلند پایہ غیر مطبوعہ مقالہ ہے جو عالمگیر کی خوش قسمتی سے اس کے خاص نمبر میں شایع ہو رہا ہے۔ علامہ عنایت رسول مرحوم وہ محترم شخصیت ہیں جن سے سر سید مرحوم

نے عبرانی زبان سیکھی تھی۔

کولمبس ۔ کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے چوہدری محمد طفیل صاحب نیتر بی۔اے نے نہایت کاوش سے اس پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے اس کی تصویر بھی شایع کیجارہی ہے جس کے لئے ولایت تک خط وکتابت کرنا پڑی۔

اردو نثر پر ایک نظر پروفیسر مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔اے کا زبردست تحقیقی مقالہ جو پڑھنے اور صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

شہزادہ مراد بخش ۔حضرت کوثر چاندپوری کا بہترین تاریخی مضمون۔

غالب اور فلسفہ حیات ۔مولانا ماہر القادری کا قابل قدر علمی مضمون ہے جو بہت زیادہ کاوش وکوشش کا نتیجہ ہے۔

ان کے علاوہ اور متعدد بیش قدر مضامین بھی شریک اشاعت ہیں۔

افسانے خاص نمبر سنہ ۳۷ء کے تمام افسانے اتنے دلکش اور دلآویز ہیں کہ اس سال کے کسی خاص نمبر میں آپ کو ایسے دلچسپ افسانے نظر نہ آئینگے چند افسانوں کے عنوانات ملاحظہ فرمایئے۔

زمین کی تحریر، باپ کی قربانی (تاریخی افسانہ) جہازی لیٹیرن، زبیدہ کے ابّا، دعوت زہرہ (تاریخی اور باتصویر) روپ متی اور باز بہادر۔(تاریخی اور باتصویر) موت کی دلھن، دو ملاقاتیں پروفیسر (سائنٹفک افسانہ) عجیب مسافر، وغیرہ وغیرہ،

حصہ نظم ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ عالمگیر کے خاص نمبر سنہ ۱۹۳۷ء کا حصہ نظم اتنا بلند ہے کہ اس کا جواب مشکل ہے۔ اس دعویٰ کا بہترین ثبوت تو خود خاص نمبر ہے لیکن مندرجہ ذیل سطور سے بھی آپ کو ایک حد تک اندازہ ہوسکے گا۔

خاص نمبر میں ملک کے موجودہ تقریباً تمام شعراء مثلاً عالیجناب نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل استاد حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ عالیجناب نواب اختیار جنگ بہادر۔ اعتبار الملک حضرت دل، حضرت جگر مرادآبادی پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔اے۔ کنور لطافت علی خاں طالب باغپتی۔ مولانا فطرت، حضرت نوح ناروی جانشین داغ وغیرہ وغیرہ کے غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ ایسے قابل احترام شعرا، کا غیر مطبوعہ کلام اور غیر مطبوعہ گرامی نامے بھی شریک اشاعت ہیں جو آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً۔

حضرت امیر مینائی، حضرت اکبر الہ آبادی، حضرت جگر برہم گورکھپوری، حضرت ریاض خیرآبادی وغیرہ

یقین ہے کہ مندرجہ بالا سطور سے عالمگیر کے خاص نمبر کی قابل رشک خصوصیات کا ایک حد تک آپ اندازہ کرسکیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاص نمبر ۱۹۳۷ء کو ملاحظہ فرمائے بغیر اُس کی خوبیوں کا کماحقہ اندازہ کرنا ناممکن ہے، یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ ادارہ عالمگیر نہایت نیک نیتی کے ساتھ اپنی ان تمام کوششوں کو بروئے کار لارہا ہے جو اس کے حیطہ امکان میں ہیں۔ ادارہ عالمگیر اپنے فرائض کو پوری تندہی سے انجام دے رہا ہے۔ عالمگیر کے محترم قارئین وناظرین بھی اپنے فرائض کا احساس فرمائیں اور عالمگیر کی توسیع اشاعت کیلئے زیادہ سے زیادہ کوشش فرما کر اپنے عالمگیر کی جائز اعانت کی فرض سے عہدہ برآ ہوں۔

(حافظ) محمد عالم مدیر عالمگیر عفی عنہ

اگر آپ

عالمگیر کا وہ معرکہ آرا، اور مہتم بالشان خاص نمبر جو اگلے مہینہ میں نہایت آب وتاب سے شایع ہوگا **مفت** حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال کیلئے فرمائش خریداری بھیجکر اس تحفہ کو حاصل کیجئے سالانہ خریداری کی صورت میں آپ کو جون سنہ ۳۷ء میں شایع ہونے والا سالانہ نمبر بھی مفت ملیگا۔ سالانہ خریداری میں بہرحال آپ کا فائدہ ہے قیمت ایک سال کیلئے چار روپے چار آنے للعہ علاوہ محصولڈاک

نیازمند:۔ مینجر عالمگیر لاہور

خریداران عالمگیر رسالہ ہذا کی صفحہ ۲ پر اعلان ضروری ضرور ملاحظہ فرمائیں!

منّا اور موتی

ایک واقعہ

از مسٹر حسن عزیز جاوید

۱

کچی سڑک تھی۔ شام کا جھٹپٹا ہو چکا تھا۔ اسی وقت گھیڑی ندی کے پل کو عبور کرتے وقت موٹر کا ٹائر پھٹ گیا۔ میں نے شوفر کو گاؤں میں آدمی لانے کیلئے بھیجا تاکہ موٹر کار دھکیل کر بستی میں پہونچائی جائے۔ ایک گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ جب کہیں بارہ تیرہ آدمی شوفر کے ہمراہ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دیر اس لئے ہوگئی تھی کہ سب کسان اپنی اڑاؤنی۔ غلّے کی ناپ۔ تول اور کھلیان سے لے جا کر گھروں اور کوٹھیوں میں بھرنے میں مصروف تھے موٹر کار کہاں رکھی جائے اور ہم لوگ رات کہاں بسر کریں اس کا فیصلہ شوفر نے اثنائے راہ ہی میں کر لیا تھا۔ گاؤں میں سب سے اہم کاشتکار منا اور موتی تھے انھیں کے ہاں ہم دونوں ناخواندہ مہمان ٹھہرنے والے تھے۔ منا بڑا بھائی تھا، موتی چھوٹا بھائی۔ کسی زمانے میں دونوں بھائی ایک ہی گھر میں رہتے سہتے تھے جو پچیس ایکڑ کی آراضی وراثت میں ملی تھی اسے دونوں بھائی خوشی خوشی جوتتے بوتے تھے۔ جو غلہ اُگتا اس کی دیکھ بھال یکجہتی سے کرتے تھے اور پیداوار ایک ہی کوٹھی میں بھر کر اس میں سے خرچ کرتے تھے لیکن ماں کے مرنے سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ساس ہمیشہ دو اور دو سے زیادہ بہوؤں کے درمیان ثالث بالجبر کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اور جب ساس یا دوسرے لفظوں میں حاکم خانہ اپنے دن پورے کر کے اپنے بیٹوں کو بہوؤں کے رحم پر چھوڑ جاتی ہے تو ایسی کایا پلٹ ہوتی ہے کہ ایک چولھے کے دو لا محالہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت نوح کا طوفان بھی بڑھیا کے تنور ہی سے شروع ہوا تھا بعینہٖ اسی طرح ہندوستانی زندگی کا طوفان "افتراق و انتشار بہوؤں کے چولھوں ہی سے شروع ہوتا ہے۔ منا اور موتی بیچارے بھلا کب مستثنیٰ رہنے والے تھے ساس کو مرے چند ہی روز ہوئے ہونگے کہ دونوں بہوؤں نے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور انجام کار دونوں بھائیوں کے گھروں کے درمیان میں جو صحن تھا اسے ایک پختہ دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کرا کر دم لیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کھیتی بھی منقسم کرا کر لطف اندوز ہوتیں لیکن گاؤں کے چار پنچوں نے جو فیصلہ کر دیا تھا کہ دونوں بھائی ایک ساتھ کھیتی کریں اور جب فصل تیار ہو جائے۔ کٹنی ہو چکے، اڑاؤنی ہو چکے تو چوکیدار کا حق۔ لوہار، بڑھئی، چمار کا حق خدمت اور لگان نکال کر دونوں بھائی آدھا آدھا غلہ بانٹ لیا کریں۔ اس کے سبب ان کی ایک نہ چلی۔ تاہم آئے دن "دمڑی کی دال نیاری ٹال"۔ "ستر بھائی کی کھیتی بُری"۔ "خدا کون دن لائے جب ہل کی پھاریں تک الگ ہو جائیں"۔ ان کے زبان زد نعرے تھے۔ دیورانی کے نزدیک جٹھانی اور جیٹھ اور جیٹھانی کے نزدیک دیورانی اور دیور ایسے تھے کہ اگر صبح صبح ان کا منہ دیکھ لیا جائے تو دن بھر بھونے ہوئے چنے بھی نہ ملیں۔

نفرت اور کدورت نے یہاں تک ترقی کر لی تھی کہ پنگھٹ اور نہانے کے گھاٹ پر اگر ایک دوسرے کا سامنا ہو جاتا تو آپ ہی آپ نمبر۲ کے فٹ بال بلیڈر کی طرح بتدریج منہ اور گال پھول جاتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں زہر کے بجھے ہوئے تیر ایک دوسرے پر برسا دیئے جاتے۔ گاؤں میں اگر کوئی شادی، مونڈن یا اور کوئی تقریب ہوتی یا بھگوان جی کی پوجا، ست نارائن کی کتھا۔ رت جگا۔ دادرے ہوتے تو جہاں ایک بیٹھتی اس جگہ دوسری کا بیٹھنا ایسا تھا گویا ببول کے کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو،

بات بات میں طعن و تشنیع تو معمولی امر واقعہ تھا۔

موٹر کار دھکیل کر بستی میں لے جانے کیلئے جب تیرہ آدمی آئے تو منا اور موتی پیش پیش تھے۔ گھٹنوں سے اونچا جانگھوں تک کا کھدر کا گول پردے والا انگرکھا جس میں سینے کے قریب بند بندھے تھے منا کے زیب جسم تھا۔ دوپلی ٹوپی اوڑھے تھا۔ گھٹنوں تک کی لال کنارہ کی دھوتی باندھے تھا اور لال نری کا جوتہ پہنے تھا۔ جسے بڑے لوگوں سے ملنے کے وقت پہننے کی خاطر سے بحفاظت رکھ چھوڑا تھا۔ موتی کا بھی قریب قریب اسی قسم کا لباس تھا۔ دونوں بھائیوں نے قریب ہوکر زمیں بوس سلام کیا اور دیگر ہمراہیوں کی معیت میں موٹر کار دھکیل کر بیجا کر اپنے کھلیان کے اندر کھڑی کردی۔ فطری سادگی۔ دیہاتی بھولا پن ان کے بشرے سے ہویدا تھا۔ ایک ایک بات کا جواب دیتے وقت "جی سرکار" ضرور کہتے تھے۔

۲

ایک بان کی چارپائی میرے لئے لاکر بچھائی گئی۔ اس پر گودڑوں کا پیال ڈالا گیا۔ اس پر میرا بستر بچھا۔ میں ابھی ہاتھ منہ دھو کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک پیتل کے لوٹے میں چھاچھ اور ایک پتے کے دونے میں گوڑ منا کے یہاں سے اس کا بڑا بیٹا بنسی لایا اور میرے سامنے سلام کرکے ہاتھ میں لئے کھڑا ہوگیا۔ میں نے ہر چند انکار کیا لیکن لڑکا بہت عاجزی کے ساتھ مصر ہوا کہ میں چھاچھ ضرور پی لوں چنانچہ آدھا لوٹا میں نے پی لیا اور باقی شوفر کو دیدیا۔ منا اور موتی چلم پیتے پیتے میرے سامنے ان بے شمار حکام اور صاحبان کا ذکر کرتے رہے جو ان کے یہاں وقتاً فوقتاً ٹھہرتے رہے اور ان کے ساتھ منا اور موتی نے کس طرح کا برتاؤ کیا تھا۔ دوران گفتگو میں انھوں نے اپنی شادی، اپنے بیٹوں بیٹیوں کے حالات، اپنی والدہ کے انتقال کی داستان، اپنی فصلوں کی حالت اور بیلوں کے مرجانے کے کوائف بھی سنائے اور باوجودیکہ عورتوں کے باعث الگ الگ ہوگئے تھے تاہم ان دونوں میں کیسی سچی برادرانہ محبت برقرار ہے اس کا بھی بڑے فخر کے ساتھ اعتراف کیا۔ لیکن ان دونوں کو اپنی بیویوں کی حالت پر افسوس تھا جو انھیں ایک جگہ مل کر نہیں رہنے دینا چاہتی تھیں۔ منا نے بڑے ناز کے ساتھ یہ بات بھی سنائی کہ اس کا موتی اگرچہ چھ بچوں کا باپ ہوچکا ہے اور بازو برابر ہے لیکن اگر وہ اسے دس جوتے بھی مار دے تو موتی اتنا شریف ہے کہ کبھی اُف نہ کریگا۔ اسی طرح موتی نے بھی کہا کہ منا بھیا مجھ سے الگ ہیں مگر اپنی اولاد سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔ اگر میرے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو انھیں درد محسوس ہوتا ہے۔ دیر تک میں ان کی دیہاتی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان سے سوالات کرتا رہا۔ گاؤں کس کا ہے۔ آبادی کتنی ہے؟ کس قوم کے کتنے آدمی رہتے ہیں۔ پولیس والے تو تنگ نہیں کرتے۔ اس کے بعد منا کے گھر سے میرے اور شوفر کے لئے گھی۔ دال، چاول، پاپڑ، اچار پیتل کی تھالیوں میں رکھا ہوا آیا۔ ہم نے کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔ منا اور موتی بھی اپنے اپنے گھر کھانا کھانے چلے گئے۔

۳

رات بہت ہوچکی تھی۔ پھاگن کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ گاؤں میں ایک طرف عورتیں ڈھولک بجاکر ہمنوائی سے اپنے دیہاتی گیت گا رہی تھیں اور میں چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ جب وہ دونوں کھانا کھا کر آئے تو بہت دیر تک بیٹھے چلم پیتے رہے۔ پھر میرے قریب آکر اندازہ لگایا کہ میں سوتا ہوں یا جاگ رہا ہوں۔ میں نے اور آنکھیں بند کرلی تھیں اور خراٹے لینے لگا تھا۔ اس لئے انھیں میری جانب سے اطمینان ہوچکا تھا۔ شوفر بھی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ شاید نئی جگہ ہونے کے سبب اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

منا نے کہا۔ "رے بھائی موتی! آج تو ہی اپنے ہاتھ سے بٹوارہ کر۔"

موتی بیساختہ بولا — "نہیں بھیا مجھ سے ہرگز نہ ہوگا۔ تم بڑے ہو خود ہی میرا حصہ الگ کردو۔"

منا نے ہنس کر کہا۔ "اگر تو آج حصہ کر دیگا تو کیا ہوجائیگا۔"

موتی بولا — "نہیں بھیا۔ تمہارے پہلے میرا ہاتھ لگانا اچھا نہیں۔ میں پاپ کا مستحق ہونا نہیں چاہتا۔ تم باپ کے برابر ہو۔ تم ہی سب کچھ ہو تمھارے پوتر ہاتھوں سے ڈھیریاں لگاؤ۔ ایک ڈھیری میں اٹھالے جاؤں گا ایک تم اٹھا لینا۔"

منا نے ہنس کر کہا۔ "اوہنہ بھائی تو بڑا مورکھ ہے اچھا جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی کرتا ہوں۔"

اڑائے ہوئے غلے کا جو انبار لگا تھا اسے منا نے دو حصوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ دو گھنٹے کے بعد کہیں جاکر دو ڈھیر تیار ہوئے۔ منا نے کہا۔ "اچھا اب لے کون سا ڈھیر لینا ہے۔" مگر موتی نے کہا "نہیں جو

ڈھیر تم دوگے بھتیا وہی میں لوں گا۔"

منانے پھر تبسم کا اظہار کیا اور ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کرکے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ ڈھیر لے جاؤ۔"

موتی نے اپنی ٹوکری میں گیہوں بھرا اور سر پر رکھ کر گھر لے گیا جب منانے دیکھا کہ موتی دور نکل گیا ہے تو جلدی سے پندرہ بیس ٹوکری گیہوں اپنے انبار میں سے نکال کر اس کے ڈھیر میں ڈال دیا۔ پھر منانے اپنی ٹوکری بھری اور موتی کے آنے کے بعد اپنے گھر پہونچانے چلا گیا۔ اس کے دور نکل جانے کے بعد موتی نے جلدی سے اپنے ڈھیر میں سے بارہ ٹوکری گیہوں نکال کر منا کے ڈھیر میں ڈالدیئے اور اپنی ٹوکری بھر کر گھر لے جانے کیلئے بھائی کی آمد کا انتظار کرنے لگا جب منا واپس آگیا تو موتی اپنی ٹوکری لیکر گھر چلا گیا۔ پھر منانے دس بارہ ٹوکری گیہوں اپنے ڈھیر کے نکال کر موتی کے ڈھیر میں ملادیئے اور جب موتی آگیا تو وہ اپنا غلہ ٹوکری میں لیکر رکھنے کیلئے چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد موتی نے بھی اپنے بڑے بھائی کے ڈھیر میں اپنے ڈھیر میں کا کچھ غلہ شامل کردیا۔ دو گھنٹہ تک یہی تماشہ دیکھتے رہنے کے بعد مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا جبکہ موتی منا کے ڈھیر میں غلہ ملا رہا تھا۔

میں نے کہا ـــــ "اس طرح تو تم دونوں بھائی رات بھر بھی اپنا غلہ اٹھا کر نہ لیجا سکوگے۔"

اتنا سنتے ہی موتی چونک اٹھا اور میرے پاس آکر دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا ـــــ "سرکار ہم سمجھے آپ سوگئے ہیں۔ آپ نے تو دیکھ لیا۔"

میں نے پوچھا ـــــ "تم آخر ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

موتی نے کہا ـــــ "حضور وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ ان کے یہاں آنے جانے والے، مہمان، سپاہی اور چپراسی سب ٹھہرتے ہیں۔ اس لئے خرچ زیادہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مبادا سال بھر کے اندر ہی ان کا غلہ ختم نہ ہوجائے اور ان کو خرچ کی مصیبت ہو۔ اس لئے اپنے حصہ میں سے اسی جگہ ان کے حصہ میں ملا دیتا ہوں کہ خرچ پورا ہوجائے اور عورتوں کو بھی خبر نہ ہونے پائے۔ لیکن میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ ان سے نہ کہنا۔"

میں نے ہنسکر کہا ـــــ "لیکن مرد خدا وہ بھی تو اپنے ڈھیر میں سے اسی طرح تمھارے ڈھیر میں ملاتا جاتا ہے۔"

موتی نے بڑے تعجب کے ساتھ کہا ـــــ "اچھا ـــــ!" پھر خاموش ہوگیا جیسے وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ہو۔

میں پھر سونے کا حیلہ کرکے لیٹ گیا اتنے میں منا آگیا۔ موتی نے خاموشی سے اپنی ٹوکری اٹھالی اور گھر کی سمت روانہ ہوگیا۔

جب منا بھی چند ٹوکری غلہ اپنے ڈھیر میں سے نکال کر موتی کے ڈھیر میں ڈال چکا تو میں نے کہا۔

"تم لوگ یہ کیا تماشہ کر رہے ہو؟ اس طرح تو تمام رات بیت جائیگی مگر غلہ نہ اٹھ سکیگا۔"

موتی کی طرح وہ بھی چونک اٹھا۔ پاس آگیا۔ کہنے لگا ـــــ "ارے سرکار جاگتے ہیں!"

میں نے کہا "ہاں نیند نہیں آرہی۔ آخر تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

منانے کہا ـــــ "جی کچھ نہیں، وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کے یہاں کھانے والے بہت ہیں۔ میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو اس کا غلہ سال کے اندر ہی ختم ہوجائے اس لئے بڑے بھائی کی حیثیت سے اس کی بغیر اطلاع اپنے حصہ میں سے کچھ غلہ اس کے حصہ میں ڈال دیا ہے کیونکہ اگر اسے معلوم کرکے دیا جائے تو وہ ہرگز نہ لیگا۔ لیکن سرکار میں ہاتھ جوڑتا ہوں اس سے تذکرہ نہ کرنا اسی جگہ غلہ زیادہ دے دینا اس لئے مناسب تھا کہ عورتوں کو خبر نہ ہونے پائے ورنہ مفت میں جھگڑا برپا ہوجاتا۔"

میں نے ہنسکر کہا ـــــ "مگر بھائی تم صرف اس کے ڈھیر میں ملاتے جاتے تو اچھا تھا۔ جتنا تم ملاتے ہو اتنا ہی وہ دوبارہ تمھارے ڈھیر میں ڈالدیتا ہے۔"

منانے کہا ـــــ "ہیں!"

میں نے کہا ـــــ "بالکل واقعہ ہے۔ موتی کا بھی یہی کہنا ہے کہ بڑے بھیا کو تکلیف نہ ہو۔ ان کا خرچ زیادہ ہے ـــــ اس لئے میں ایسا کر رہا ہوں۔"

منا پر استعجاب طاری ہوگیا وہ سر کو ہاتھ لگا کر بیٹھ گیا اور گویا ہوا ـــــ "موتی میرا سچ مچ کا بھائی ہے۔" اور پھر آہ سرد بھرنے لگا۔

دوسرے دن ٹائر درست کرکے ہم لوگ گیدڑی سے روانہ ہوگئے۔

سالہا سال بیت چکے۔ مگر پھر اس طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا تاہم یہ واقعہ نہیں بھولتا۔ ہمیشہ منا اور موتی کی برادرانہ الفت کی تصویر آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔

جہاں کہیں بھائیوں کی نفسانیت اور نفیض کا تماشا نظر آتا ہے۔ منا اور موتی کی یاد آجاتی ہے۔

حسن عزیز جاوید

غزل

مصورِ قلم جناب ماسٹر باسط صاحب بسوانی

اُن کو بھی افسردہ گُل کا آسیبِ دھوکا ہو گیا
ایک داغِ عشق سے کیا دل کا نقشا ہو گیا

دل کے آتے ہی سرِ بازار رُسوا ہو گیا
میری اُلفت کا جو ہونا تھا نتیجہ ہو گیا

کہدیا ہاں کہدیا میری نگاہِ شوق نے
ہو گیا رازِ محبّت اُن پہ افشا ہو گیا

نقدِ دل کی کیا حقیقت۔ نقدِ دل کیا چیز ہے
جان دینا بھی محبّت میں گوارہ ہو گیا

اہلِ محفل سے چھپایا لاکھ ہم نے رازِ دل
خود نگاہیں کہہ اٹھیں اُلفت کا سودا ہو گیا

عشق نے اس کو سکھائے نازو اندازو غرور
خود بخود کب حُسن خود بیں و خود آرا ہو گیا

عکس پر اس کی نظر ہے آئینہ ہے سامنے
خود تماشہ دیکھنے والا تماشا ہو گیا

آرہا تھا دل میں کچھ کچھ توبہ کرنے کا خیال
شکر ہے اتنے میں بابِ میکدہ وا ہو گیا

اشکِ خونیں دیکھ کر وہ پوچھتے ہیں ناز سے
کس لئے روتے ہو کیا خونِ تمنا ہو گیا؟

دل کی دنیا ہی بدل دی اس نگاہِ ناز نے
دل کہے جانے کے قابل، دل ہمارا ہو گیا

ابتدائے عشق میری بن گئی معراجِ عشق
راہِ اُلفت میں قدم رکھتے ہی رُسوا ہو گیا

خود ہی وہ اٹھلا کے چلنا، خود ہی سب سے پوچھنا
کیوں قیامت آگئی۔ کیوں حشر برپا ہو گیا

آپ سے یہ پوچھنا تھا۔ آپ نے کیا کر دیا ؟
آپ مجھ سے پوچھتے ہیں آپ کو کیا ہو گیا

اہلِ باطن نے نظر کی جلوہ گاہِ قلب پر
اہلِ ظاہر کے لئے قبلہ ہی کعبہ ہو گیا

اُف ری دنیائے محبت اُف رے تیرے انقلاب
قیس لیلیٰ بن گیا۔ یوسف زلیخا ہو گیا

دل کے آنے سے ہمیں کچھ اور تو آیا نہیں
جان دینے کا مگر کچھ کچھ سلیقہ ہو گیا

خط میں جو تیرے لکھا ہے پیش آتا ہے وہی
یہ بھی کیا کمبخت قسمت کا نوشتہ ہو گیا

دل بھی ہے قربان باسط جان بھی میری نثار
کوئی میرا ہو نہ ہو، میں تو کسی کا ہو گیا

خود بخود ہنستا ہوں باسط خود بخود روتا ہوں میں
خود ہی پہروں سوچتا ہوں مجھکو یہ کیا ہو گیا

تاریخ یونان کا ایک دلچسپ ورق

محترمہ فاطمہ لیاقت صاحبہ منشی فاضل، بلگرام!

تین سو سال قبل مسیح دولت یونان دنیا کی سب سے بڑی قوت تھی اور وہ دور ایسا زریں دور تھا کہ اس کو اہل یورپ یونان کا "قابل فخر زمانہ" کہتے ہیں، اس کی تہذیب و معاشرت، علوم و فنون تمام دنیا پر فوقیت رکھتے تھے، ایک طرف فن کی ترقیوں کا یہ حال تھا تو دوسری طرف شجاعت و بہادری اور حب الوطنی کی یہ کیفیت تھی کہ ۴۸۰ ق.م میں جب داریوش شاہ ایران کے جانشین زرکسیز (خسرو) نے یونان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کیں اور ایک لشکر عظیم لیکر جس کی تعداد بارہ لاکھ اسی ہزار بتائی جاتی ہے آبنائے درہ دانیال کو عبور کر کے شہر "موپلی" کے مشہور درے تک پہونچ گیا اس وقت یونان کی تمام "اتحادی فوج" وہاں پہونچ چکی تھی اور صرف "لیونی ڈس شاہ اسپارٹا" بقول مورخین پانچ ہزار دو سو سوار کے ساتھ اس کی یورش کو روکنے درہ شہر موپلی پر موجود تھا چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر ایسی سرفروشانہ جنگ کی کہ ایرانیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اگرچہ لیونی ڈس مع جملہ سپاہ کے مرا لیکن، اس کی قربانی بیکار نہ گئی بلکہ اس نے سارے یونان میں حب الوطنی، غیرت، آزادی اور جاں بازی کی روح پھونک دی اور وہاں کا بچہ بچہ دشمنوں سے جنگ کرنے پر تیار ہو گیا۔ بقول ایک مورخ کے، "اسی جدوجہد میں اس نے یورپ کی روح کو ایشیا، کا غلام ہونے سے بچا لیا۔ گویا آئینی آزادی کے اس تخم کو فنا نہ ہونے دیا جس کا ایرانی استبداد کے ہاتھوں فنا ہو جانا یقینی نظر آتا تھا۔۔۔۔"

ہر کمالے را زوال کے مصداق اب اسی یونان کی حالت ابتر ہے عام طوائف الملوکی اور خلفشار اس کا خاتمہ کر رہی ہے۔ وہ تیسرے درجہ کی قوت سے بھی کم خیال کیا جاتا ہے، یوں تو اس وقت بھی سارا یونان ایک حکومت کے زیر نگین نہ تھا بلکہ ہر بڑے صوبہ کا ایک ایک الگ حکمران تھا اور ان میں ہمیشہ خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی لیکن دو تین خاص حکومتیں اسپارٹا۔ ایتھنز، مقدونیہ سب میں طاقتور اور ذی مرتبت سمجھی جاتی تھیں۔

یہ خانہ جنگی اس وقت تک قائم رہی جب تک سکندر کی سی پرعظمت اور بہادر ہستی نے اس کو مٹا کر ایک سلک میں منسلک نہ کر دیا سکندر کا باپ فیلقوس شاہ مقدونیہ بیحد شجاع تھا لیکن وہ شجاعت سے زیادہ فریب و مکاری سے کام لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کا بین ثبوت شہر الائٹہ کی تسخیر ہے۔ اس کا دست ہوس کبھی ریاست فوکس کی طرف بڑھتا تھا کبھی "اٹیکا" کی طرف، جب اس کی دست درازیاں اور ہوس رانیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو تمام صوبوں نے باہم اتحاد و مصالحت سے اس ظالم کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنے کی خاطر ایک صلحنامہ مرتب کیا اور ڈموس تھینز مشہور مصلح یونان کی جادو بیانی سے کافی فوج جمع ہو گئی یہ اتحادی فوج بیوشیہ سے نکل کر فیلقوس سے نبرد آزما ہوئی۔ ذلت تو کوئی قسمت میں لکھی تھی اس لئے سب کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور فتح نے فیلقوس کا اقتدار اور بڑھا دیا۔ تھیبز اور تھینز کی شکست نے تمام یونان کے حوصلے پست کر دیئے۔ ایتھنز نے ڈر کر فیلقوس سے جو صلح کی اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ "آئندہ وہ فیلقوس کو تمام یونان کا سردار تسلیم کرینگے اور خود کوئی سیاسی اتحاد قائم نہ کرینگے۔" اس عام غلامانہ حالت میں اگر کسی ریاست نے سر تسلیم خم نہ کیا تو وہ اسپارٹا تھی۔

تقریباً سارے یونان کی تسخیر کے بعد اس کو ایران پر لشکر کشی کی حسرت ہی تھی کہ ۳۳۶ ق.م میں ایک مقدونوی امیر کے ہاتھ سے مارا گیا

تخت نشینی کے وقت وہ صرف مقدونیہ جیسے معمولی علاقہ کا حکمراں تھا لیکن اس کی کشور ستانی نے بحیرۂ مارمورا سے لیکر جنوبی یونان تک زیر نگین کر لیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد سکندر زینت آرائے اورنگ شاہی ہوا جس کو تاریخ نے "سکندر اعظم" کا خطاب دیا ہے اور جس کے جنگی حوصلے، شجاعت و دلیری کا افسانہ صفحۂ تاریخ پر سنہرے حروف میں مرتسم ہے اس کی شہرت و عظمت بلا وجہ نہیں، تخت نشینی کے وقت ۳۳۶ ق۔م میں اس کی عمر بیس سال اور فتح ایران کے موقع پر چھبیس سال کی تھی۔ ۳۰ سال کی عمر میں، مصر و شام، ایشیائے کوچک، سندھ، باختر اور بہت سے مقامات اس کے زیر حکومت آچکے تھے۔

فیلقوس کے مرنے کے بعد وارث تخت کی کمسنی کے خیال نے تمام مقبوضہ حکومتوں کو بغاوت آزادی کے خواب دکھلانے شروع کر دیئے لیکن نوجوان اور عقلمند حکمران نے جس کے آگے فتح دست بستہ تھی ان سب کے خوابہائے شیریں شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیئے، اور جتنی تدبیریں مخالفین نے سوچی تھیں الٹی ہو گئیں۔

اس نے سب سے پہلے عہد نامہ کی "انجمن ڈیلفی" سے تجدید کرائی جس کی رو سے وہ بھی فیلقوس کی طرح "محافظ دین اور سپہ سالار یونان" تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر کورنتھ میں میٹنگ کی جس میں تمام یونان کے نمائندے شریک ہوئے انھوں نے بھی اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اس کو حکمران یونان تسلیم کر کے ایران پر لشکر کشی کی اجازت دیدی اس طرح شورش سے قبل ہی سارا یونان سکندر کے زیر حکومت تھا۔ اب اس نے تسخیر ایشیاء کا ارادہ کیا۔ لیکن ابھی تیاری نہ کر سکا تھا کہ تھریس تھینز کی بغاوت کی خبر کانوں میں پہونچی۔ بعجلت ادھر سے روانہ ہو کر ایک خونریز جنگ کے بعد سارا جنوبی کنارہ اور تھینز باغیوں سے صاف کر دیا۔

۳۳۴ ق۔م میں جب سکندر نے آبنائے درہ دانیال کو عبور کر کے اپنے مرحوم باپ کی خواہش کے مطابق ایران پر حملہ کیا اس وقت دارائے ثالث حکمران تھا۔ اس کو تاریخ اچھے اوصاف اور الفاظ سے یاد نہیں کرتی۔ اس کی پہلی جنگ ایرانی گورنر نے "گرانی کس" (بنیا چائی) ندی کے کنارے ہوئی فتح نے اس کی ہمت بلند اور ایرانیوں کی ہمت پست کر دی دوسری جنگ ایک سال بعد ایسوس میں ہوئی جہاں خود دارا اپنی فوج کے ساتھ تھا۔ سکندر نے حملہ کیا ؎

دو دست آوریدہ بکوشش پزں — بہر دست شمشیر الماس گوں
دو دستی چناں می گذارید تیغ — کز و خصم را جاں نیامد دریغ
چو بر فرق پیل آمدت خنجرش — فرو ریختے زیر پائش سرش

جنگ زور و شور سے ہو رہی تھی۔ میدان کارزار جانبین کی کوششوں سے کشمکش گاہ بنا ہوا تھا۔ جس کا نقشہ نظامی گنجوی نے "سکندر نامہ" میں یوں کھینچا ہے ؎

دو لشکر چو مور و ملخ تاختند — نبرد جہاں در جہاں ساختند
سپہ از دو سو صف بیاراستند — ہزبراں بہ نخچیر برخاستند
بہ شمشیر پولاد و تیر خدنگ — گذرگاہ بر مور کردند تنگ
ز سم ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
جگر تاب شد نعرہ ہائے بلند — گلوگیر شد حلقہ ہائے کمند
ز تاب نفس در ہوا بستہ تیغ — جہاں سوخت از آتش برق تیغ

ابھی کسی کی قسمت کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ بزدل دارا فرار ہو گیا جس سے عام لشکر میں انتشار پھیل گیا۔ بے سر کی فوج جو اب تک بہادری سے قدم جمائے لڑ رہی تھی اب کس طرح ٹھہر سکتی تھی، اس نے بھی اپنے بادشاہ کی تقلید کی ایک جنگ میں سکندر کو دارا کے حرم اور کثیر مال غنیمت ملا۔ اب اس نے شام اور کنعان کی طرف عنان توجہ پھیری، یہ صوبے کچھ زیادہ استقلال نہ دکھلا سکے لیکن شہر صور (ٹائر) نے سکندر کے دانت کھٹے کر دیئے۔ طویل حملے کے بعد جبکہ سکندر عاجز آ گیا تھا اس نے مجبوراً ہتھیار ڈالے۔ اسی طرح شہر گاز نے بھی بیحد دلیری اور جانبازی سے مقابلہ کیا۔ اس کی فتح کے بعد اب ظفر یاب بادشاہ کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے مصر پر حملہ کیا۔ مصر نے جو کہ ایرانیوں کے زیر حکومت رہ کر مذہبی تشدد سے گھبرا گیا تھا زیادہ مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ یہاں اس نے اسکندریہ کی بنیاد ڈالی جو آج تک اس کی عظیم الشان فتوحات کی شہادت دے رہا ہے۔ اب اس نے پھر ایران کا رخ کیا۔ دارا نے مغربی علاقہ اور اپنی بیٹی اس کی زوجیت میں دیکر صلح کرنی چاہی لیکن سکندر کی اس شرط نے کہ "شاہ ایران اس کے دربار میں حاضر ہو" صلح نہ ہونے دی۔

جنگ کے امن سوز شعلے پھر بھڑک اٹھے۔ ۳۳۱ ق۔م میں

اربیلا (موجودہ موصل) کے نزدیک دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جہاں دارا نے پھر فرار ہو کر عزت ایران پر بزدلی کا دھبہ لگایا۔ سکندر نے بڑھ کر پایہ تخت سوس پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد سارا ایران اس کے پائے ظفر پر سجدہ ریز ہوگیا۔ اب اس کو سنو سال قبل کی ایتھنز کی بربادی یاد آئی اور اس نے اصطخر کو جلا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیا۔

اربیلا سے بھاگ کر دارا ہمدان پہونچا۔ سکندر نے اسے یہاں بھی چین نہ لینے دیا اور گرفتار کرنا چاہا۔ دارا نے صلح کی خواہش کی لیکن اس کے امرا نے اس کو ذلت سمجھ کر مجبور اور بے بس جبکہ ایران کو اپنی زیر نگرانی کر لیا وہ ہرکانیہ کے مقام پر پہونچے تھے کہ سکندر سے مقابلہ ہو گیا۔ ... فرار ہوتے وقت دارا کو بھی اپنے ہمراہ لے جانا چاہا لیکن دارا نے تن بہ تقدیر ہو کر انکار کیا۔ ناچار بادشاہ کو اب موت کے سوا کون پوچھنے والا تھا، زمانہ کی انقلاب پسندی کے ساتھ سب کی نظریں پھر چکی تھیں۔ نظامی کے قول کے مطابق خصوصاً اس کے دو نمک حرام مقرب اس کے قتل پر آمادہ ہوئے

بدارا دو سرہنگ بودند خاص | باخلاص نزدیک و دور از خلاص
زبیداد دارا بجان آمدہ | دل آزردگی درمیان آمدہ
چو زینگونہ بازاری آراستند | بخون از سکندر اماں خواستند
کہ مایم خاصان دارا و بس | بدارا ز ما خاص تر نیست کس
بخواہیم فردا بروتاختند | زبیداد او ملک پرداختند
چو فردا علم برکشد در مصاف | خورد ضربت تیغ پہلو شگاف
ولیکن بشر طیکہ بیدست رنج | بما برکشادہ کنی قفل گنج
زما ہر یکے را توانگر کنی۔! | بزرکار ما ہر دو چوں زر کنی!
سکندر بر آں خواستہ عہد بست | بہ پیماں دراں خواستہ داد دست

یہ دونوں کور نمک دارا کو مکر و فریب سے دھوکہ دیکر میدان میں لائے

بدیں عشوہ دادند شہ را شکیب | یکے بردلیری یکے بر فریب

اور اس کو قتل کر دیا۔

دو سرہنگ غدار چوں پیل مست | بران پیلتن برکشادند دست
درافتاد دارا بداں زخم تیز | زگیتی در آمد یکے رستخیز
درخت کیانی در آمد بخاک | بغلطید در خوں تن زخمناک

بعض مورخین اور نظامی کی رائے ہے کہ سکندر دارا کو قتل کر دینا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ جب دارا کی لاش کے قریب آیا تو گھوڑے سے اتر پڑا اور دارا کا سر اپنے زانو پر رکھ کر خاک و خون صاف کیا اور نہایت افسوس سے کہنے لگا۔

نخواہم کہ بر خاک بودے سرت | نہ آلودہ خوں شود پیکرت

دارا نے سکندر کو محرم پا کر چند وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ بھی کہ

ہماں روشنک را کہ دخت منست | بداں نازکی دست پخت منست
بہ نزد انئ خود ... بلند | کہ فرخ بود گوہر ارجمند
دل ... از ... | کہ با روشنی بہ بود آفتاب

اور حسرت و یاس راہی ملک جاوداں ہوا۔

بہ بازوئے بہمن بہ اسود مار | ز روئیں وژ افتاد اسفندیار
بہار فریدوں و گلزار جم | بہ باد خزاں گشتہ تاراج غم
نسب نامہ دولت کیقباد | ورق بر ورق ہر سوئے بردہ باد
تن مرزباں دیدہ در خاک و خوں | کلاہ کیانی شدہ سرنگوں

ایران کی فتح کے بعد اس نے سیستان، کابل فتح کرکے سکندریہ ایریوں (موجودہ ہرات) کی بنیاد ڈالی سمرقند لیکر ہندوستان پر حملہ آور ہوا کئی لڑائیوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جب راجہ پورس کو شکست دیکر آگے بڑھنا چاہا تو اس کی ماندہ و خستہ فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اب مجبوراً ہندوستان میں ... روشنک سے شادی کی اور خوب جشن ... بابل آکر عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت" کا مصداق ہو کر اس عظیم الشان سپہ سالار کو دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔

سکندر خیالات اور کیریکٹر کے لحاظ سے بھی ایک قابل تعریف شخصیت کا مالک تھا۔ شاگرد ارسطو ہونے کے سبب سے اس میں دانائی۔ عدل، مساوات ہمدردی استقلال جیسی صفات موجود تھیں لیکن بعض مورخین کی رائے کے مطابق فتح ایران کے بعد اس کی یہ صفات اگر ختم نہیں تو کم ضرور ہو گئی تھیں اس میں بہیمیت و خود پرستی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو انتہا سے بڑھی ہوئی دولت و ثروت کا لازمی نتیجہ ہے۔

طوفانِ نوح

ناخدائے سخن، تاج الشعراء، فصیح العصر حضرت نوح ناروی

اب وہ سرمستیٔ بہار نہیں
نشہ کیسا مجھے خمار نہیں

اہل محفل کو دیکھتے رہیے
کون ہے کون بیقرار نہیں

دوستی اُن کی، دشمنی اُن کی
مجھ کو دونوں کا اعتبار نہیں

کیا مرے دل سے برق کو نسبت
ہے مگر اتنی بیقرار نہیں

بڑھتی جاتی ہے اُن کی زلفِ دراز
اس طوالت کا اختصار نہیں

شوخیوں نے بنا دیا بجلی
اب انھیں اک جگہ قرار نہیں

زندگی پر زمانہ مرتا ہے
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

جا رہے ہیں شباب کے ایام
میرے کہنے میں یہ بہار نہیں

آپ کہہ لیں ذلیل و خوار مجھے
عشق لیکن ذلیل و خوار نہیں

جھلملاتے ہوئے چراغ ہیں سب
بزم ہستی کا اعتبار نہیں

بعد مرنے کے دل ٹھہر ہی گیا
زلزلے میں مرا مزار نہیں

مجھ کو دیتے ہیں اس لئے وہ شراب
جانتے ہیں یہ بادہ خوار نہیں

کیا خبر سانس کب اُکھڑ جائے
اس ہوا پر کچھ اختیار نہیں

لوگ کہتے ہیں ناخدائے سخن،
نوح دنیا میں بے وقار نہیں

بیگناہ مجرم!

جناب وسیم صاحب انصاری، ردولوی!

(۱)

"معلوم ہوتا ہے کہ ولی محمد صاحب اب تک حاضر نہیں ہوئے" میں نے اخبار "ٹائمز" کے "ذاتیات" کا کالم پڑھتے ہوئے کہا۔

"کون ولی محمد؟" جاسوس خاں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کل میں نے آپ کو ایک اشتہار سنایا نہیں تھا جس میں ولی محمد اور اس کے صندوق کا ذکر تھا۔ یہ اشتہار مسلسل شائع ہو رہا ہے کہ ولی محمد کو اپنا صندوق ایک ہفتہ میں مال گودام سے نکلوا لینا چاہیئے ورنہ وہ نیلام کر دیا جائیگا۔ اشتہار کیلیے ایک دھمکی ہے۔"

میں جاسوس کے ہمراہ چائے نوشی میں مصروف تھا کہ ایک سفید پوش شخص کمرہ میں داخل ہوا۔

"جناب میں انتہائی ادب سے معافی چاہتا ہوں کہ میں بغیر اطلاع کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ پریشانیوں نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے۔ خدا کے لئے آپ میرے معاملات میں دلچسپی لیجئے اور ایک بیگناہ کی جان بچایئے"

میں نے جاسوس کی طرف دیکھا۔ اور جاسوس نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ قریب ہی تھا کہ میں اسے دیوانہ سمجھتے ہوئے نکلوا دوں کہ جاسوس نے اس سے مزید حالات بیان کرنے کی فرمائش کی۔

نووارد، میرا بھائی ولی محمد انتہائی تعجب انگیز مصائب میں مبتلا ہے۔ فی الحال وہ پولیس کی حراست میں ہے اور قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ہے!"

جاسوس، آپ تمام واقعات بلاکم وکاست بیان کیجیے۔

نووارد، میں تمام واقعات بلاکم وکاست بیان کرونگا۔ مشکل یہ ہے کہ ان کی ابتدا کہاں سے کی جائے۔ ان میں کچھ تجارتی معاملات ہیں اور کچھ خانگی، میں تجارتی معاملات سے ابتدا کرتا ہوں —— ولی محمد جواہرات کی ایک بڑی دکان کا سفری ایجنٹ ہے۔ سفر کی حالت میں وہ بہت کم سامان اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ بڑے دوکانداروں کو یہ سامان بطور نمونہ دکھایا جاتا تھا اور چھوٹے سوداگروں کے ہاتھ اسے فروخت بھی کر دیا جاتا تھا۔ ہفتہ کے ختم ہوتے ہوتے وہ مکان واپس آجایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ جانے لگا تو اس نے تمام سامان ایک بڑے صندوق میں رکھا اور تجوری کو خالی کر دیا خدا جانے اس مرتبہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بہرحال صندوق لیکر وہ چلا گیا، مال گودام میں اسے رکھ دیا اور تفریح کیلئے روانہ ہو گیا۔ وہ ایک غیر آباد سڑک پر چل رہا تھا کہ اسے ایک بٹوہ ملا۔ اس پر کسی کا نام نہیں تحریر تھا۔ ولی محمد نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس کو تھانہ پر جمع کر دیا جائیگا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے کرایہ کی گاڑی روکی اور اس میں بیٹھ گیا چند قدم چلنے کے بعد ایک عورت نے گاڑی کو رکوایا اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ جب گاڑی والے نے کرایہ کا مطالبہ کیا تو عورت نے اپنے جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کے بعد ولی محمد سے بٹوہ کی واپسی کی طالب ہوئی۔ اس نے بٹوہ سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس مکارہ نے اب شور وغل مچایا کہ اس نے میری گرہ کاٹی ہے۔ گاڑی والے نے آگے چل کر دونوں کو سڑک پر کھڑے ہوئے پولیس مین کے سپرد کر دیا۔ تھانہ پر داروغہ نے عورت سے چند سوالات کئے۔ میرے بھائی کے غم وغصہ کی انتہا نہ تھی جب اسے معلوم ہوا کہ عورت اسی بٹوہ کا ذکر کر رہی ہے جسے اس نے سڑک سے اٹھایا تھا۔ اور جو اب تک اس کی جیب میں تھا۔ ولی محمد نے واقعہ بیان کیا لیکن یہ کہنا فضول ہے کہ وہ باور نہ کیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ گلو خلاصی مشکل ہے اس نے اپنا نام بھی غلط بتا دیا۔

کرسمس کی تعطیلات کے بعد مقدمہ پیش ہوا، مدعیہ حاضر عدالت نہیں
ہوئی اس وجہ سے ولی محمدؐ رہا کردیا گیا۔ رہا ہوتے ہی وہ اسٹیشن کی جانب
روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے اخبار "ٹائمز" خریدا اور ذاتیات کے کالم میں
اس کی نگاہیں خود اسی کے نام پر ——— "

"ایک صندوق کے متعلق" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! ——— کیا آپ کی نگاہوں سے وہ مضمون گذرا ہے؟ اس
صندوق میں جواہرات تھے اور اسی لئے وہ پریشان تھا۔ وہ جب اسٹیشن
پہنچا تو اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا"

(۲)

"اچھا! اب اس کی خانگی زندگی کے حالات سنئے" نووارد نے کہا
"میں افسوس کے ساتھ عرض کرونگا کہ ولی محمد ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کر
رہا تھا جس سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ اس
سے عقد کرلیگا لیکن ساتھ رہنے کے بعد اسے نہایت تلخ تجربات ہوئے۔ وہ
اس کی صورت کا غلام تھا لیکن سیرت کا دشمن۔ وہ بدمزاج تھی اور شراب پی کر
تو وہ اہل محلہ کیلئے مستقل عذاب ہوجاتی تھی۔ تھیٹر کی ایک کمپنی سے اس کا معاہدہ
بھی تھا۔ اس کا میل جول بھی مشکوک لوگوں سے تھا۔ حامد سے بھی اُس کے
تعلقات تھے۔ ولی محمد نے اس سے مل کر شرفا کی صحبت کو قریب قریب خیرباد
ہی کہدیا تھا۔ آخر کار ایک دن اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ میرے
بھائی نے ایک شریف عورت سے عقد کی سلسلہ جنبانی کی جس کو اس نے اس
شرط پر منظور کیا کہ وہ محتاط زندگی بسر کرے اور کچھ رقم پس انداز کرے
اس کے بعد ولی محمد نے اس عورت کو جس کا نام جمیلہ تھا، گھر سے نکال دیا۔
لیکن اس نے ایک قیامت برپا کردی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ مکان کا ایک حصہ
اسے رہائش کے لئے دیدیا جائے۔

مکان کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اس کی کنجی جمیلہ بائی نے اپنے
پاس رکھی۔ وہ وقتاً فوقتاً اب بھی مکان میں آتی رہی ———

بہتر ہوگا کہ اب آپ اپنی توجہ اسٹیشن دہلی کی جانب مبذول فرمائیے۔ ولی محمد
کے مال گودام سے جانے کے ایک ہفتہ بعد لوگوں نے شکایت کی کہ مال گودام
میں بدبو ہے۔ اسٹیشن ماسٹر اور محافظ مال گودام نے صفائی کرائی۔ ولی محمد
کے بکس کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ میعاد سے زیادہ رہ چکا ہے۔ اسے ہٹانے پر
معلوم ہوا کہ بدبو اسی صندوق سے آرہی تھی۔ پولیس طلب کی گئی۔ اشتہار
دیا گیا اور صندوق کھولا گیا۔ اس میں سے ایک عورت کا بایاں ہاتھ اور کچھ
خون آلود کپڑے برآمد ہوئے۔ مزید تفتیش سے پولیس نے یہ نتیجہ نکالا کہ دلی
ایک دن مچھلیوں کے شکار کے لئے گیا تھا۔ تالاب میں جال ڈالا گیا اس میں
ایک داہنا ہاتھ جو بظاہر دستیاب شدہ ہاتھ کا جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ برآمد ہوا
ایک پیر بھی دستیاب ہوا جس کے متعدد ٹکڑے کردیئے گئے تھے۔ صندوق
سے جو ہاتھ برآمد ہوا تھا اس کی شناخت بھی آسان تھی اس پر لفظ
"ج - ب" کھدے ہوئے تھے۔ اور یہ حروف جمیلہ بائی کے ہاتھ پر کھدے
ہوئے دیکھے جاچکے تھے۔ لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جمیلہ بائی آخری بار
میرے بھائی کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھی گئی ہے۔ اس اطلاع
پر پولیس مکان میں داخل ہوئی اور تلاشی لی ———"

"کیا تمھیں علم ہے کہ ان کو کوئی چیز مکان سے بھی دستیاب ہوئی؟"
جاسوس نے سوال کیا۔

"نہیں جناب مجھے اس کا علم اب تک نہیں ہوسکا" نووارد نے
جواب دیا۔

"تمھارے بھائی نے تمھیں بتایا کہ ہاتھ اس کے صندوق میں کیسے نکلا؟"

"جناب! اس کا خیال ہے کہ مال گودام میں اس کے جواہرات غائب
کئے گئے اور وہ ہاتھ صندوق میں رکھ دیا گیا۔ مال گودام میں ہر شخص اپنا سامان
جمع کرنے کیلئے جاسکتا ہے۔"

"کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو مقتول سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو"
جاسوس نے پوچھا۔

"جی نہیں! کوئی خاص آدمی میری نگاہ میں نہیں ہے۔ جمیلہ بائی
سے اہل محلہ متنفر ضرور تھے اور میرا بھائی اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا"

"ابھی تم نے حامد کا نام لیا تھا۔ ان میں تو کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا؟"

"وہ دونوں انتہائی خلوص سے ملتے تھے اگر لڑائی ہوئی ہوتی تو
حامد اس سے علحدہ ہوسکتا تھا۔ قتل کا ارتکاب کیوں کرتا؟"

"حامد کے متعلق تم اور کچھ جانتے ہو؟"

"وہ ایک لڑھکتا ہوا پتھر تھا۔ کبھی ایک مقام پر نہیں رہا۔ آج یہاں
کل وہاں، ہر طرح کی ملازمتیں اس نے کی ہیں یہاں تک کہ اس نے مردہ گھر کو

کو عجائب خانوں میں فروخت کیا ہے، لیکن جناب قتل کرنے میں اس کی کیا
غایت پوشیدہ ہو سکتی ہے۔؟"

"یہی تو ایک سوال ہے تمھارے بھائی کے یہاں "منشا" اور "غایت"
دونوں چیزیں ملتی ہیں ـــ اچھا ولی محمد نے کبھی جمیلہ بائی کو قتل کی دھمکی تو نہیں
دی؟" جاسوس نے پوچھا۔

"افسوس ایسا بھی ہوا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

"اچھا اب میں اس معاملہ پر غور کروں گا یہ کہنا بیکار ہی ہے کہ حالات
حوصلہ افزا نہیں ہیں"۔ جاسوس نے کہا۔

"درست ہے! لیکن ہم کو خداوند کریم پر بھروسہ رکھنا چاہئیے! جناب
وہ بالکل بے گناہ ہے! اسے بچا لیجئے!" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پتہ میز پر
رکھدیا اور رنج و افسوس کے ساتھ رخصت ہوا۔

(۳)

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنی تحقیقات دہلی اسٹیشن سے شروع کیجئے گا"
میں نے کہا۔

"ہاں! ہم کو عجلت کرنی چاہئیے۔ پولیس سے اجازت حاصل کرلی؟"
جاسوس نے دریافت کیا۔

"ہاں اجازت حاصل کرلی ہے، لیکن امین صاحب آپ سے قبل
تفتیش کے لئے روانہ ہو چکے ہیں"۔ میں نے کہا۔

جاسوس نے اپنا سفری بیگ جسے وہ کسی حالت میں بھی علیحدہ نہیں
کرتا تھا اٹھایا اور اسٹیشن کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستہ میں میرے مخاطب
کرنے پر بھی اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اسٹیشن پر امین صاحب نہایت
سرگرمی سے تفتیش فرما رہے تھے۔ ہمارے جاسوس کو دیکھتے ہی بولے،

"آئیے آئیے! خالد صاحب! مگر دیکھئے آپ ملزم کی اعانت نہ کیجئے
گا۔ ورنہ اس معاملہ میں آپ کی شہرت پر بہت ہی خراب اثر پڑیگا۔ میں نے
اس کمرہ کا بھی معاینہ کرلیا ہے۔ وہاں ایک ہوٹل میں کچھ گولیاں فراہم ہوئی ہیں
کمرہ میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ہم لوگ قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں
لاش کے کچھ ٹکڑے بھی ملے۔ میں نے ماہرین کے پاس انھیں بھیجا۔ رپورٹ
سے معلوم ہوا کہ وہ ایک عورت کی لاش کے ٹکڑے ہیں، اس کی عمر کا اندازہ
۳۵ سال کیا جاتا ہے اور تقریباً یہی جمیلہ بائی کا سن تھا۔ گولیوں کے زہر
کا اثر بھی لاش سے ظاہر ہو رہا تھا۔ دیکھئے یہ گولیاں ہیں"۔

خالد کا یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ معاملہ کی تفتیش کرتے ہیں تو اس بات
کا خیال نہیں کرتے کہ ان سے کیا کہا گیا ہے اس وقت بھی وہ اسی صورت
سے تحقیقات میں مصروف تھے جیسے کہ ان کو لاش کے متعلق کوئی علم ہی
نہیں تھا۔ انھوں نے لاش کا معاینہ کیا۔ ہر ٹکڑے کی پیمائش کی۔ اس کے
بعد مُردہ انگلیوں کے نشانات اتارے۔ وہ کھدے ہوئے حروف پر خاص
توجہ دے رہے تھے بار بار خوردبین لگا کر انھیں دیکھتے تھے۔

خالد کو اس طرح مصروف دیکھ کر امین صاحب نے کہا۔ "معلوم
ہوتا ہے خالد صاحب کو خوردبین استعمال کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے میرا
خیال ہے کہ اگر تاج محل ہوٹل میں آگ لگے تو یہ اس کا معاینہ بھی خوردبین
ہی سے کرینگے۔ دیکھئے نا! جو حروف بیس فٹ کے فاصلے سے پڑھے جا
سکتے ہیں ان کو بھی وہ خوردبین سے دیکھ رہے ہیں"۔ خالد اب تک اسی
طرح مصروف رہے اس کے بعد انھوں نے اپنی توجہ صندوق پر مبذول
کی جس پر "و۔م" لکھا ہوا تھا۔ اس کی بھی پیمائش کی گئی۔

"اب آپ لوگ چل سکتے ہیں!" خالد نے کہا۔

"ولی محمد نے بیان غلط دیا ہے! کوئی دوسرا یہ کام نہیں کرسکتا تھا
کہ لاش لے جائے صندوق خالی کرے۔ پھر دوسرے صندوق سے لاش نکالے
اور اس صندوق میں رکھے۔ صندوق میں نہایت عمدہ قفل لگا ہوا تھا جو توڑا
بھی نہیں گیا۔ میری موجودگی میں میرے حکم سے وہ قفل توڑا گیا ہے۔ اس کے
علاوہ مال گودام میں ہر وقت آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہاں
کسی کی ہمت نہیں ہوسکتی۔ لیجئے سامنے سے محافظ مال گودام بھی آرہے ہیں"
امین نے خالد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خالد ـــ کیوں محافظ صاحب ولی محمد کی روانگی کے بعد کن
لوگوں نے مال جمع کیا۔؟"

محافظ، بہتر ہوگا کہ آپ رجسٹر دیکھ لیں"۔

خالد نے رجسٹر سے چند نام اپنی نوٹ بک میں نقل کئے اور امین
صاحب سرکاری سراغرساں اور محافظ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تماشہ کے اصل
ہیرو ولی محمد سے ملنے کے لئے جیل کی جانب قدم اٹھائے۔

(۴)

"دیکھو ولی محمد! تم جس قدر واقعات بیان کروگے اسی قدر آسانیاں اپنی راہ میں پیدا کروگے؟" خالد نے کہا۔

"سرکار! میں کیا عرض کروں، میں بالکل بے قصور ہوں، جمیلہ کے خون سے میرا دامن ویسا ہی پاک ہے، جیسا آپ کا ——"

"میں واقعات پوچھتا ہوں واقعات! کیا اپنی بیقصوری کا راگ الاپنے سے مجرم بیقصور سمجھا جاتا ہے، ہمت کرو، شاید کوئی ایسی بات جسے تم اہم نہ سمجھتے ہو میرے نزدیک اہم ہو۔ وقت ضایع کرنے سے کیا حاصل؟"

"جمیلہ بائی کا قد پانچ فٹ ۷ انچ تھا۔ اس کے بال سنہرے تھے میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی دشمن نہ تھا۔ وہ اپنی جماعت میں ہر دلعزیز تھی۔"

"تمہارے کمرہ سے امین صاحب سرکاری سراغرساں نے کچھ گولیاں برآمد کی ہیں!"

ایک بار میں علیل ہوا تھا۔ ڈاکٹر جمشید کے مشورہ سے انھیں میں لایا تھا۔ لیکن ان کو میں نے مطلقاً استعمال نہیں کیا۔ وہ شیشی سربمہر رکھی ہے۔"

میری حیرت کی انتہا نہ تھی جب خالد نے رخصت ہوتے وقت ولی محمد کو اطمینان دلایا کہ "تم کو رنجیدہ اور مغموم ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرا خیال ہے کہ تم بری ہو جاؤ گے۔"

(۵)

میں نے امین صاحب کو اس وقت چار بجے مدعو کیا ہے اور اب اُن کی تشریف آوری کا منتظر ہوں۔ خدا خدا کرکے وہ وقت آگیا کہ میں ولی محمد کو بری کرا سکوں۔"

امین صاحب کمرہ میں داخل ہوئے اور معمولی صاحب سلامت کے بعد فرمایا۔ "خالد صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ولی محمد کا دامن جمیلہ بائی کے خون سے پاک؟ میں نے اپنی تحقیقات کے نتائج مرتب کرلئے ہیں۔ ہمارے پاس جمیلہ کی لاش ہے۔ ولی محمد اور جمیلہ کے تعلقات ناخوشگوار ہیں —— ولی محمد کے صندوق سے لاش برآمد ہوئی ہے، دوسرا حصہ مکان سے برآمد ہوا ہے —— ولی محمد نے اکثر مقتولہ کو دھمکایا ہے —— زہریلی گولیاں پائی گئی ہیں —— ولی محمد صندوق جمع کرنے کے بعد عرصہ تک لاپتہ رہا ہے کیا اب بھی کسی بات کی کمی ہے؟ کیا اب بھی ولی محمد قاتل نہیں ہے؟" "غلط، سراسر غلط"

سراغرساں کی باتوں کو سن کر خالد مسکرایا!

"آپ نے غلط آدمی، غلط صندوق اور حد یہ ہے کہ غلط لاش دستیاب کی ہے۔"

امین پر معلوم ہوتا تھا کہ بجلی نے اپنا اثر کر دیا ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ میری بھی یہی کیفیت تھی۔

"خالد صاحب! لاش پر نام کے ابتدائی حروف بھی تو گُدے ہوئے ہیں" امین نے کہا۔

"جمیلہ بائی طویل القامت تھی اس کی لمبائی پانچ فٹ پانچ انچ تھی اور یہ عورت پانچ فٹ تین انچ سے تجاوز نہیں کرتی۔ جمیلہ کے بائیں ہاتھ پر گودنے کے نشانات تھے، اس عورت کے نہیں تھے۔"

"نہیں تھے؟ کیوں؟ میں نے اور آپ نے ان نشانوں کو لاش پر نہیں دیکھا؟" امین نے سوال کیا۔

"میں لاش کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، بلکہ عورت کا، جن نشانات کو ہم نے دیکھا ہے وہ مرنے کے بعد بنائے گئے ہیں اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ زندگی میں یہ نشانات نہیں تھے"، خالد نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو اس کا یقین کامل ہے؟" امین نے دریافت کیا۔

"ہاں! اگر خوردبین سے آپ دیکھیں تو آپ میرے ہم خیال ہونگے زندہ جسم میں سوئی کے نشانات بھر جاتے ہیں اور مُردہ جسم میں کھلے رہتے ہیں اور خوردبین سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مردہ جسم کو مجرم نے خوب غسل دیا اور اس کی سطح کو کسی نرم چیز سے دبایا تاہم سوراخ نمایاں ہیں۔ ان میں روشنائی بھی موجود ہے" خالد نے جواب دیا۔

"اچھا، اب صندوق کا معاملہ لیجیئے، آپ کو اس کا علم کیونکر ہوا کہ وہ دوسرا صندوق ہے!" امین نے کہا۔

"یہ بھی بالکل صاف ہے۔ ولی محمد کا صندوق "احسان اینڈ سنز" کے کارخانے کا بنا ہوا ہے۔ گذشتہ اپریل کی ۹ تاریخ کو اس نے خرید کر اپنے نام کے ابتدائی حروف لکھائے تھے۔ قفل "پرتاب اینڈ برادرز" کے کارخانہ کے ہیں۔ قفل اعلیٰ پیمانہ کے ہیں، اس لئے ان پر رجسٹری شدہ نمبر ہیں۔ اس قفل پر وہ نمبر بھی نہیں ہیں۔ پرتاب کے یہاں جانے سے معلوم ہوا کہ یہ تالے تیرہ جولائی کو فروخت ہوئے۔ اب آپ سمجھے؟" خالد نے جواب دیا۔

"اچھا یہ فرمائیے کہ یہ صندوق کس کا ہے؟" امین نے استفسار کیا۔

"اہلیہ پریم کا!"

"یہ کون ہے؟"

"جو پہلے جمیلہ بائی کے نام سے مشہور تھی۔"

"مرحومہ! لیکن وہ اپنا ہاتھ کیسے چھوڑ جاتی، لاش کے ٹکڑے کس کے ہیں؟"

"ٹھہریئے! آپ کو گرہ کٹنے کا علم ہے۔ ولی محمد پر یہ الزام عاید تھا یہ ایک سازش تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ولی محمد اتنے دنوں کیلئے اس مقدمہ میں الجھا رہے تاکہ ان کو اس کا موقع مل جائے کہ صندوق بدلے جا سکیں اور لاش کے ٹکڑے مکان پر اور دریا میں رکھے جا سکیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے والے ایک سے زیادہ ہیں۔ جمیلہ بائی تک ان کا پہونچنا نہایت ضروری تھا تاکہ وہ پوری نقل اتار سکیں، مردہ جسم پر حروف کندہ کرنے کے وہ ماہر ہونگے۔ ولی محمد کے یہاں ان کی آمد رفت ہوگی، ان کے قبضہ میں ایک عورت کی لاش بھی تھی ـــــ" خالد نے کہا۔

"لیکن ایسی عورت اور کون ہو سکتی ہے؟" امین نے پوچھا۔

خود جمیلہ بائی! اور حامد جس سے اس کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے حامد اس سے قبل ایسی تجارت کر چکا ہے۔"

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔"

"اور سنئے حامد صاحب کی اہلیہ بھی مفقود ہیں۔

۲۹ رجولائی کو ولی محمد اسٹیشن آیا، گرہ کٹ کی حیثیت سے گرفتار کیا گیا اس کے بعد اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ انھیں تاریخوں میں اہلیہ حامد لاپتہ ہوئی۔ اس کے بعد اہلیہ پریم دہلی اسٹیشن کے مال گدام میں ایک صندوق جمع کرتی ہے جو یقیناً انہیں تاریخوں کے اندر خریدا گیا ہے اس صندوق سے عورت کا ہاتھ دستیاب ہوتا ہے اس کے بعد لاش کے ٹکڑے ولی محمد کے یہاں برآمد کئے جاتے ہیں۔ ولی محمد "مصلحۃً" رہا کرایا جاتا ہے، مدعیہ حاضر عدالت نہیں کی جاتی۔ ولی محمد قاتل کی حیثیت سے گرفتار کیا جاتا ہے ولی محمد اگر قاتل ہوتا تو اس نے لاش کا کوئی حصہ اپنے صندوق میں بند ہی کیوں کیا ہوتا اور پھر اسے مال گدام میں چھوڑ ہی کیوں گیا ہوتا؟"

"آپ نے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں، میں غلط راستے پر تھا اچھا اب ہم کو حامد کی جستجو کرنی چاہیئے۔" امین نے کہا۔

"آپ اس کو مکان پر نہیں پائینگے۔ وہ دیہات میں ہے۔ انے بنک کا حساب بھی منتقل کرا لیا ہے۔"

"تو ہمیں دیہات کا سفر اختیار کرنا چاہیئے!"

۶ ـــ چار مہینہ بعد میں نے خالد صاحب کو انکی کوششوں پر مبارکباد پیش کی کہ اہلیہ حامد کے قاتل اپنی کیفر دار کو پہونچے حامد کو سزائے موت ملی اور جمیلہ بائی کو ۷ سال قید با مشقت کی سزا!"

سحرِ حلال

پروفیسر فراق ایم۔ اے، گورکھپوری

ہوش و حواس میں شبِ غم کب حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

دورِ فلک یہاں نہیں، دورِ حیات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

کچھ بے ثبات ہی ہے نہ کچھ با ثبات ہے
اب عشق ماورائے حیات و ممات ہے

جینا جو آگیا تو اجل بھی حیات ہے
اور یوں تو عمرِ خضر بھی کیا، بے ثبات ہے

کیوں انتہائے ہوش کو کہتے ہیں بیخودی
خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے

ہستی کو جس نے زلزلہ ساماں بنا دیا
وہ دل قرار پائے مقدر کی بات ہے

یہ موشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر
کس کو دماغِ کاوشِ ذات و صفات ہے

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل تیری تو کیا کائنات ہے

گردوں! شرارِ برقِ دلِ بیقرار دیکھ
جن سے یہ تیری تاروں بھری رات رات ہے

ٹوٹے فریبِ بیخودی و ہوشِ عشق میں
بیگانۂ قیودِ حیات اب حیات ہے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا،
یہ فرقِ مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

گم ہو کے ہر جگہ ہیں زخود رفتگانِ عشق
ان کی بھی اہلِ کشف و کرامات ذات ہے

یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب
تم دل دکھاؤ وقتِ مصیبت تو بات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں فرقت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیات فراقؔ ایک رات ہے

گلباز

شاہی زمانہ کے شاہی چور کی حیرت انگیز داستان

جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

میر غلام عباس لکھنؤ کے قدیم باشندے اور ایک شریف سب کے بیٹے تھے۔ صورت شکل اچھی گورے چٹے۔ میانہ قد۔ کم رو۔ نحیف الجثہ۔ تعلیم یافتہ وضعدار۔ دوست نواز۔ علم مجلس سے واقف۔ باتیں ایسی لچھے دار کہ پہروں سنا کیجئے۔ معمول تھا کہ سہ پہر کو چوک کی ہوا کھانے ضرور نکلتے تھے۔ جالی کا کرتہ اور شربتی کی اچکن، کندھے پر چکن کا رومال، ہاتھ فیروزے کی انگوٹھی۔ دوپلی چکن کی ٹوپی گھڑی میں سونے کی زنجیر۔ دیکھنے میں شریف و رئیس معلوم ہوتے تھے مگر اس شکل وصورت کے ساتھ خدا نے ایک عیب بھی دیا تھا یعنی چور اول نمبر کے تھے۔

حضرت خاقان زماں محمد امجد علی شاہ کا زمانہ ہے۔ امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ خلعت اور ہاتھی پالکی سے سرفراز ہو کر مسند وزارت پر جلوہ گر ہیں۔ مرزا علی رضا بیگ کوتوال شہر رومی دروازے پر کوتوالی کر رہے ہیں۔ میر غلام عباس کی سفاکیوں کا شہر میں شہرہ ہے مہاجن اپنی دولت کی حفاظت میں کوشش بلیغ کر رہے ہیں۔ لیکن میر صاحب کی کارروائیوں کا سکہ ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ لوگ ان کی خدمت میں دریغ نہیں کرتے جس رئیس سے جتنی رقم طلب کی جاتی ہے گھر بیٹھے چلی آتی ہے اسی چوری کے مال سے میر صاحب خمس و زکوٰۃ بھی نکالتے ہیں۔ غریب غربا کے ساتھ سلوک ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی جگہ دھر لئے گئے اور بعد تحقیق جرم ثابت ہوا عدالت سے ایک سال کی سزا ہوئی مہینہ بھر تک دوران مقدمہ میں بند حوالات میں رہے گھر سے کھانا جاتا تھا۔ جس دن سے سزا کا حکم سنایا گیا سیخچے والے اصطبل میں قید ہوئے۔ تو بھی گھر سے کھانا، افیون، تمباکو، روزانہ پہنچتا تھا کیونکہ شاہی جیلخانے میں بھی قیدیوں کو کوئی تکلیف گھر آنے کے سوا نہ تھی یعنی غذا تو اچھی نہ ملتی تھی باقی سب طرح کا آرام تھا کوئی مشقت نہیں لی جاتی تھی۔ دوست احباب دیکھ سکتے تھے، عزیز و اقارب مل سکتے تھے، اگر تکلیف تھی تو یہ تھی کہ قیدی گھر نہیں آسکتا تھا۔ بعینہ یہی حالت تھی جیسے آج کل انگریزی جیل خانوں میں انگریز قیدی مگر اس پر بھی میر صاحب کو زندگی حرام تھی، یار باش اور زندہ دل آدمی ان کے لئے تو اتنی قید بھی دوزخ سے کم نہ تھی ــــ!

محرم سے دو ماہ قبل بادشاہ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ فدوی گردش فلک سے چوری کے الزام میں ناحق گرفتار ہو کر مبتلائے مصیبت ہے شیعہ مذہب ہے اور محرم کا زمانہ قریب ہے اور میں ماتم دار حسینؑ ہوں۔ ہر سال تعزیہ رکھتا ہوں۔ اگر اس زمانہ میں بھی زندان مصیبت سے رہا نہ ہوا تو قیامت میں دربار حسینؑ میں فریاد کرونگا۔ واسطہ خون حسینؑ کا مجھے تعزیہ داری کی اجازت دی جائے۔ بعد ایام عزا حاضر ہو کر سزا کی مدت پوری کرونگا۔ یہ عرضی منصف الدولہ سید باقر صاحب قبلہ مجتہد مہتمم عدالت فوجداری کے حضور میں پیش ہوئی اور حکم ہوا کہ ملزم بری کیا جائے۔ میر غلام عباس رہا ہو کر خوشی خوشی گھر پر آئے۔ بٹیر بازی ہونے لگی۔ یاروں میں افیون چلنے لگی محرم میں ماتمدار حسینؑ بنے۔ سیاہ کپڑے پہنے گلے میں ناڑا ڈالا۔ خوب خوب مجلسیں کیں۔ ہر جگہ شریک بزم عزا ہوئے اور بعد اربعین منصف الدولہ بہادر کے اجلاس پر حاضر ہو گئے کہ بقیہ سزا بھگت آؤں۔ عدالت نے از راہ ترحم سزا معاف کر دی اور ہدایت کی کہ تم شریف آدمی ہو ایسی حرکت آئندہ سرزد نہ ہو۔

ایک دن ڈپٹی نواب معین الدولہ نے میر صاحب کو ایک گوہر نایاب دکھایا جس کی چمک سے میر صاحب کی آنکھوں میں خیرگی آگئی اور ارشاد کیا کہ میرے پاس اس کی ایک ہی فرد ہے۔ یا تو کہیں سے مجھے ایسا موتی بہم پہنچا دو یا اسے تم چرا لیجاؤ۔ میں نے تم کو بحل کیا۔ میر صاحب نے کئی روز کا وقفہ دیکر رات کو پشت دولتسرا سے کمند ڈالی۔ کوٹھی میں داخل ہوئے دیکھا نواب صحن خانہ میں مسہری پر آرام کر رہے ہیں۔ آپ نے آہستہ آہستہ پنکھا جھلا، نواب صاحب نے کروٹ بدلی۔ کنجی کا گچھا ازار بند میں بندھا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو معلوم ہوا ازار بند میں ایک دوسری گرہ بھی دی ہوئی ہے۔ اسے بھی کھولا تو وہی موتی نکلا۔ میر صاحب نے کنجی کا گچھا تو باندھ دیا اور موتی لیکر چلتے ہوئے۔ دوسرے دن نواب کی ملاقات کو آئے تو وہی موتی پیش کیا اور کہا غلام نے آپ کی فرمائش پوری کر دی۔ نواب نے دیکھا تو حقیقت میں موتی ویسا ہی تھا۔ بہت پسند کیا اور کہا بھئی اس کی قیمت کیا لوگے؟ میر صاحب نے کہا پہلے آپ اپنا موتی محل سے لائیں اور دونوں کو ملا کر دیکھیں۔ نواب نے خیال کیا کہ موتی تو میرے پاس ہے مگر ان کے سامنے ازار بند سے نکالنا رکیک بات ہے۔ اس لئے محل میں گئے اور وہاں دیکھا تو ازار بند خالی ہے۔ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے اور کہنے لگے ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

پھر میر صاحب سے کہا۔ میں تو مانوں گا، کوئی ہمزاد تمہارے قبضہ میں ہے ورنہ میرے موتی کا غایب ہونا خلاف قیاس امر ہے۔ میر صاحب نے اول سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ سن کر بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے تو یہ موتی آپ کی محنت کا صلہ ہے آپ ہی اسے قبول کریں یا مجھ سے اس کی قیمت لے لیں میر صاحب نے کہا۔ میں نے آج تک کسی دوست کے مال پر نظر نہیں ڈالی میرے محلے کے لوگ گھر کا دروازہ بند کر کے نہیں سوتے اور ان کا ایک تنکا بھی نہیں جاتا۔ مجھ پر تو آپ کا مال حرام ہے۔

میر صاحب حیدری طوائف کے عاشقوں میں سے تھے صورت، شکل تو کچھ اچھی نہ تھی۔ سانولا رنگ چیچک کے داغ اس کثرت سے گہرے گہرے تھے کہ الاماں! مگر گلا نور کا پایا تھا۔ امیر مرزا ایک بانکے تھے، وہ بھی اسی پر مرتے تھے مگر میر صاحب کی آشنائی سابق سے تھی اور حیدری میر صاحب سے محبت کرتی تھی۔ اس کا وسیع امامباڑہ انھیں کی دولت سے تعمیر ہوا۔ ایک دن حیدری نے فرمائش کی کہ میر صاحب تمہاری بدولت بہت چین کیا دولت و ثروت جو کچھ میرے پاس ہے سب تمہاری دی ہوئی ہے مگر میں نے آج کرم بخش طوائف کے ہاتھ میں ہیرے کے جڑاؤ کڑے شیر دہاں دیکھے تو دل لوٹ ہو گیا۔ جہاں سے بنے مجھے بھی ویسے ہی کڑے بنوا دو۔ میر صاحب نے کہا مجھے وہ کڑے دکھا دو۔ اس نے کرم بخش سے منگوا دیئے آپ نے غور سے دیکھا اور کہا بس یہی دیکھنا تھا مجھے معلوم ہو گیا جس سنار نے اسے بنایا ہے۔ ممکن ہوا تو اس سے بہتر تم کو بنوا دونگا۔ اپنے شاگردوں سے بھی کہدیا کہ اس طرح کے کڑے کی جوڑی کہیں دیکھنا تو ہمیں اطلاع دینا۔

خبر ملی کہ آتوجی قادر بخش کی ماں کے پاس ایک جوڑی کڑے کی نہایت نفیس قدسیہ محل کی دی ہوئی موجود ہے اور وہ آج کل ٹپنہ سے لکھنؤ میں آئی ہوئی ہیں اور گولہ گنج کے قریب کسی کوٹھی میں رہتی ہیں۔ اس خبر کے سنتے ہی میر صاحب کو فکر پیدا ہوئی۔ کوٹھی کو دیکھنے گئے۔ موقع دیکھا ملازموں سے ملاقات کی۔ پہرہ داروں کے نام پوچھے۔ آرام خاص کا وقت دریافت کیا۔ مکان کا نقشہ دیکھا پوچھتے پوچھتے یہ پتہ بھی مل گیا کہ آتوجی کے پاس جواہرات و زیورات کی قسم سے نواب قدسیہ محل کا دیا ہوا تھوڑا بہت جو صرف سے باقی رہ گیا ہے وہ سب لوہے کی الماری میں مقفل ہے اور الماری کے پاس آتوجی کی مسہری لگی ہوئی ہے اور وہاں دن رات کھونٹا سی بیٹھی رہتی ہیں صرف دو تین مرتبہ چوکی پر تو جاتی ہیں نماز کے لئے مسہری کے پاس چوکا لگا ہوا ہے اس پر سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے اور جانماز رکھی ہے آس پاس پیش خدمتیں مامائیں اپنے اپنے دالانوں میں رہتی ہیں قریب ہی باورچی خانہ ہے آدھی رات تک تو کھانے سے فراغت ہوتی ہے۔

میر صاحب جب سب پوچھ چکے تو ایک دن اندھیری رات میں مکان کی چھت پر باہر سے چڑھے اور زینہ سے آہستہ آہستہ اتر رہے تھے کہ آتوجی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ یہ سمجھ گئے کہ میرے پاؤں کی چاپ سے کچھ شک گذرا۔ چپکے کھڑے ہو کر جھانک کر دیکھا تو آتوجی بیٹھی ہوئی ہیں اس وقت گھڑی دیکھی تو دو بجے تھے اب میر صاحب اس خیال میں ہیں کہ آنکھ لگے تو زینے سے اتر کر مکان میں جاؤں مگر وہ خدا کی بندی اسی طرح بیٹھی رہی ابھی بہت اندھیرا تھا کہ ماما سے لالٹین جلوا کر چوکی پر گئیں۔ اتنی فرصت میں میر صاحب مکان میں جاتے ہی کمرے میں گئے اور مسہری کے پاس سے الماری

کے قریب پہونچے تو دیکھا ماما مع لالٹین واپس آرہی ہے اور آتو جی اب فریضہ صبح کے انتظام میں ہیں یہ تو جھٹ الماری کے نیچے لیٹ رہے اور بیچارے بھوکے پیاسے دن بھر لیٹے رہے سانس تک نہ لی۔ رات کو آتو جی چوکی پر گئیں اور لوگ کھانا پکانے میں مصروف تھے کہ انھوں نے آہستہ سے زت ماری تو الماری کا قفل کھٹ سے نیچے گر پڑا۔ آپ نے جواہرات کا صندوقچہ اپنے پاس رکھ لیا اور تین بجے رات کو جب چوکیدار بھی خواب ناز میں تھے زینے سے کوٹھے پر اور کوٹھے سے گلی میں جا کر بی حیدری کے امام باڑے میں پہونچے اور کہا ان چیزوں کو ذرا حفاظت سے رکھنا۔ صبح کو شہر میں ایک عام شہرت تھی کہ بی آتو جی کے گھر میں جھاڑو پھر گئی ایک تنکا تک نہ بچا۔ عدالت میں عرضی دی گئی۔ کوتوال کو تحقیقات کا حکم ملا لیکن کچھ سراغ نہ لگا۔

کئی مہینے کے بعد عیش باغ میں ساون کے میلے ہو رہے تھے اور ساون کے آخری جمعے میں بڑی دھوم دھام تھی تمام شہر کی رنڈیاں خیمے ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔ بی حیدری بھی ایک خیمہ میں فروکش ہیں جو نہایت نفیس قالینوں سے آراستہ ہے۔ کرسیاں مونڈھے قرینے سے لگے ہیں خدمتگار نئی وردیاں زیب جسم کئے کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ہیرے کے کڑوں کی شیر دہاں جوڑی ایسی زینت دے رہی ہے کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں۔ شدہ شدہ کسی مخبر نے یہ خبر مرزا رضا علی بیگ کوتوال کو پہونچائی وہ بحیلہ ان کے خیمے میں آئے کڑوں کو غور سے دیر تک دیکھتے رہے۔ اتنے میں میر صاحب بھی آگئے۔ کوتوال نے پہلے تو حیدر جان سے کہا۔ ماشاء اللہ آج تو آپ کا زیور سب رنڈیوں سے سبقت لے گیا سبحان اللہ مگر یہ کڑے کی جوڑی تو سارے لکھنؤ میں فرد ہے ذرا تکلیف نہ ہو تو اتار کر مجھے دکھا دیجئے اس نے ایک کڑا اتار دیا۔ کہنے لگے دوسرے ہاتھ کے بھی اتار دیجئے تو دونوں کو ملا کر دیکھوں۔ پھر کہنے لگے یہ کب آپنے بنوائے۔ اس نے کہا صاحب ہم کو بنوانے کی کیا ضرورت ہے اللہ رکھے میر صاحب کو جن کے دم سے ہم نے بہت کچھ چین کیا۔ یہ بھی انھیں کا عطیہ ہے۔ میر صاحب دل میں کہنے لگے ہے ہے، کیسی بیوقوف عورت ہے اول تو کوتوال کے آتے ہی اسے کڑے چھپا دینا تھے اور نہ چھپائے تھے تو میرا نام لینا کیا ضرور تھا۔ یہ کلمہ سن کر کوتوال صاحب میر صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔ کیوں جناب میر صاحب قبلہ آپ نے اس زیور کو کہاں سے بنوایا۔ میر صاحب نے حواس بجا کر کے جواب دیا۔ جناب ہم کو زیور بنوانے کی کیا حاجت ہے۔ لکھنؤ آباد رہے ہمارے دم کے واسطے کیا کمی ہے اچھے سے اچھا کھاتے ہیں۔ اچھے سے اچھا پہنتے ہیں۔ مزے کرتے ہیں۔ کوتوال صاحب نے کہا اچھا اس کا مزہ آپ کو اب چکھایا جائیگا۔ میر صاحب نے کہا بہتر۔ کوتوال کے ساتھ جو پولیس باہر کھڑی تھی اسے حکم دیا کہ میر صاحب کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈالدو۔ ہتھکڑی کا نام سن کر میر صاحب کے تیور بدلے ہوئے جب پولیس والے ہتھکڑیاں پہنا چکے تو میر صاحب نے کوتوال سے کہا کہ رضا علی کیا تم اپنے دل میں سمجھتے ہو کہ میں ایک شریف سید کو بے عزتی سے گرفتار کرکے لے جاسکتا ہوں یہ کہہ کر دونوں ہاتھوں کو ایسا جھٹکا دیا کہ ہاتھ ہتھکڑیوں سے باہر نکل آئے اور پیچھے ہٹ کر کہا اچھا، تم اتنے جوان ہو اور سب کی کمر میں تلوار ہے اگر مجھ کو گھیر کر پکڑ لو تو خط غلامی لکھے دیتا ہوں مرزا رضا علی تو جانتے تھے کہ میر صاحب کے مقابلے کا آج کوئی جوان شاطر نہیں ہے اس لئے خوشامد کرنے لگے۔ میر صاحب غلطی سے آپ کی خدمت میں گستاخی ہوئی۔ معاف کیجئے گا یہ پولیس دیہات کی ہے آپکے حفظ مراتب کا اسے کیا خیال ہوتا آپ میرے دوست ہیں۔ میں سرکاری حکم سے مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ورنہ ایسا خیال بھی نہ ہوتا۔ اگر آپ کو ہماری بدنامی منظور ہے تو بسم اللہ آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اور اگر کچھ پاس ملاقات ہے تو عدالت تک تشریف لے چلئے ہم پیش کرکے اپنے عہدے سے بری الذمہ ہو جائینگے، اس وقت آپ کو اختیار ہے۔

میر صاحب نے کہا اچھا چلئے۔ ہم کو آپ کی آبرو کا پاس اپنی جان سے زیادہ ہے۔ میر غلام عباس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور بعد ثبوت جرم کچہری سے گل لگانے کا حکم نافذ ہوا۔ مرزا رضا علی بیگ نے حکم پاتے ہی اس کی تعمیل کو لازمی سمجھا۔ کیونکہ وہ بھی میر صاحب سے جلے ہوئے تھے اور عہد شاہی میں اس قسم کی سزا بہت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ جب تک میر صاحب کی سفارش کو اکابرین شہر آئیں آئیں مرزا رضا علی بیگ کوتوال نے دو لوہے کے گول چھلے جن کا دور پیسے کے برابر تھا آگ میں لال کرا کے میر صاحب کی دونوں کنپٹیوں پر لگا دیئے۔ اس دن سے میر غلام عباس گلباز کے نام سے مشہور ہو گئے۔

کچھ زمانے بعد غدر ہو گیا لوگ چار مہینے تک خانہ بدوش رہے بہت سے بے قصور آدمی بھوٹیوں کے ہاتھ سے مارے گئے بہت سے شرفا

کے گھر لٹے۔ تمام دولتمند، ذی عزت دانہ دانہ کو محتاج ہوگئے۔ باغیوں کے شبہ میں بہت سے ناکردہ گناہ تہ تیغ ہوئے۔ بعد تسلط ہزاروں نوجوان بڈھے باپ کے سامنے عیش باغ کی بارہ دری میں سولی پر لٹکائے گئے۔ گورنمنٹ نے قبضہ کرکے تمام شہر میں کچہریاں قائم کیں جیلخانے بنوائے اور ان کو خطرناک سزائیں ملنے لگیں۔ رام بانس کوٹتے کوٹتے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے چکی پیستے پیستے دم ناک میں آگیا۔ سخت محنت لی جانے لگی۔ بید پڑنے لگے یہ سب حال میر صاحب نے سنا تو چوری سے توبہ کرلی اور نیا قانون ایجاد کیا بعض رؤسا نے ہنسی سے کہا کہ حضرت آپنے اپنا پیشہ اب کیوں چھوڑ دیا کہنے لگے بھائی وہ زمانہ اور تھا۔ ہم قوم بادشاہ تھا۔ ہم قوم حاکم تھے۔ یہ انگریز سات سمندر سے آئے ہیں ان کو ہمارا کیا درد ہوگا، ان کی بلا سے مردہ دوزخ میں جائے یا جنت میں انھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ یہ تو دشمن کی طرح سزا دیتے ہیں۔ ہمارے جینے مرنے کا انھیں افسوس نہیں ان کے وقت میں ہاتھ پاؤں بچاکر کام کرنا چاہیئے!

چوروں کے مختلف اقسام ہیں۔ ٹھگ، یہ لوگ ایک قوم ہیں دیہات میں رہتے ہیں مسافروں کو دھوکہ دیکر جنگل کی طرف لیجاتے ہیں اور ان کو زہر کھلاکر یا پھانسی دیکر مار ڈالتے ہیں۔ چور یہ لوگ مختلف اقوام کے ہیں رات کو نقب لگا کر یا کمند پھینک کر چوری کرتے ہیں کسی کی جان نہیں لیتے ڈاکو یہ ایک جماعت ہے جو دن دہاڑے گھر میں گھس کر مالک مکان کو ہلاک کرتے ہیں۔ اور اس کا اسباب لوٹ لے جاتے ہیں۔ لٹیرے۔ یہ بھی دن کو آنکھوں کے سامنے سے چیز لیکر بھاگتے ہیں۔ گرہ کٹ یہ راہگیروں کی گرہ کاٹ لیتے ہیں۔ اچکے یہ ہاتھ سے چیز چھین کرلے بھاگتے ہیں۔ غرضیکہ چوری کی سزا تو اتنی سخت ہے کہ میں اس کی برداشت نہیں کرسکتا میں نے توبہ کرلی ہے لیکن قانون کی روسے میں نے ایسے ضابطے مقرر کئے ہیں جو اس الزام میں نہیں آسکتے۔

شاہی کے بعد میر غلام عباس نے رسی بٹوں کے محلہ میں قیام کیا، وہاں تمام محلہ چوری سے محفوظ رہنے لگا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی وہی کچھ خدمت کرتے تھے۔ گنگا نامی ایک شاگرد تھا اس نے آپ کو ایک نفیس ڈول دیا پوچھا بھائی یہ تم کہاں سے لائے ہو اس نے کہا استاد یار سے دس بارہ جو بڑھے اور چھکڑے گیہوں کے جا رہے تھے ان کے بیچ میں ایک چھکڑے کے پیچھے ڈول رسی لٹکی ہوئی تھی ہم کو آپ کی فرمائش کا خیال آگیا۔ دو آدمی ہمارے ساتھ اور بھی تھے انھوں نے دھوتی ندی میں چھانٹی اور گیلی گیلی لیکر سڑک پر آگئے۔ ہم نے کہا اس دھوتی کو کھول کر سکھانے کے بہانے سے اس چھکڑے کے پیچھے لگادو۔ جب انھوں نے آڑ کرلی تو ہم نے ڈول رسی اتار کر کچھ اناج بھر لیا یہ وہی ڈول ہے۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ایک مہاجن سود بہت کھاتا ہے اور بڑا مالدار ہے۔ میر صاحب نے ایک صندوقچہ زیور جواہرات کا اپنے پاس سے نکالا اور اسی وضع وقطع کا ایک صندوقچہ بنوالیا۔ اس پر زربفت کا غلاف چڑھایا اور پانچ چھ آدمیوں کو وردیاں نئی پہنائیں اور ایک پینس مع پردے کے منگوائی۔ نو بجے رات کو کہار بلواکر اس پینس میں دونوں صندوقچے رکھ دیئے اور پینس کے ساتھ چند سپاہی کر دیئے اور ایک آدمی کو داروغہ صاحب بناکر ہمراہ کیا۔ داروغہ صاحب بہت شان وشوکت سے مہاجن کے مکان پر آئے اور بیان کیا کھنڈت پور کی رانی صاحبہ تشریف لائی ہیں جوڈیشلی میں مقدمہ ریاست کی کل ایک پیشی ہے یہ ٹھاکر بلبھدر سنگھ کی بیوہ ہیں کچھ روپیہ سردست عملے والوں کو دینے کی ضرورت ہے اور نہ دیا جائے تو مقدمہ خراب ہوا جاتا ہے۔ یہاں اس قدر روپیہ نہیں ہے علاقہ ضلع سیتاپور میں ہے سردست پانچہزار روپیہ چاہیئے اگر تم نے رانی صاحبہ کا نام سنا ہو یا انھیں جانتے ہو تو اس وقت روپیہ دیدو جو سود لگاؤگے ادا کیا جائیگا۔ اور پرسوں تمھارا سب روپیہ گاؤں سے منگوا دیا جائے گا اس میں بھی عذر ہو تو رانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میرے پاس جو زیور چالیس ہزار کی مالیت کا ہے اسے اپنے پاس رکھ لو۔ مہاجن نے کہا بھلا اس وقت روپیہ کی تدبیر کہاں ہوسکتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ زیور کا رکھنا جانچنا بھی تو مشکل ہے سویرے معاملہ طے ہوسکتا ہے۔

داروغہ صاحب نے کہا۔ بات یہ ہے کہ اتنی جلدی اور ایسی سخت ضرورت نہ ہوتی تو ہم بغیر سودی سو جگہ سے چالیس پچاس ہزار تمھاری دعا سے مانگ لاسکتے تھے۔ نواب شیش محل سے بھی لین دین ہے مگر رشوت کا معاملہ جوڈیشل کمشنر کا عملہ۔ فریق ثانی کی کوشش پر تو اسی وقت پانی پھر سکتا ہے جب ہم رات ہی کو مٹھی گرم کردیں ورنہ دوسرا فریق کامیاب ہوجائیگا کیونکہ رشوت تو قرض نہیں ہوسکتی دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا مال تو جائیں

ہزار کا ہے زیور میں کہاں تک دغا اور کھوٹ ہوگی۔ تم پرکھ لو اندازہ کر لو تمہاری طبیعت جنچے تو روپیہ دو ورنہ کسی دوسری جگہ سے کوشش کی جائے کیونکہ ہمیں تو صرف ایک ہی مہینہ کا سود دینا ہوگا اور روپیہ اسی میعاد کے اندر ادا کر دینا ہے لالہ پہلے تم زیور تو دیکھ لو۔

داروغہ نے بنیں کے پاس جاکر کہا حضور ذرا صندوقچہ دید یجئے اور صندوقچہ لیکر لالہ کے پاس رکھ دیا اس نے دیکھا زربفت کے غلاف میں چاندی کا صندوقچہ ہے۔ زیور کو اچھی طرح جانچا۔ سونے کی چیزوں کو کسوٹی پر رگڑا جب اپنا اطمینان کر لیا تو کہا اچھا اس وقت چار ہزار کا بندوبست ہو سکتا ہے اور دو روپیہ سینکڑہ سود لیا جائیگا۔ داروغہ نے کہا سود تو بہت کہتے ہو لیکن ہمیں ضرورت ہے اس کی کوئی بات چیت نہیں ضرورت کے وقت ایسا ہوتا ہے مگر روپیہ تم کو پورا پانچہزار دینا ہوگا۔

زیور دیکھ کر مہاجن کے منہ میں پانی بھر آیا کسی طرح پچاس ہزار روپیہ سے کم کا مال نہیں ہے رہ گیا تو کچھ دے جائیگا۔ اسی وقت مال کی ایک فہرست بنائی وزن لکھا گیا۔ نوعیت لکھی گئی۔ اور ہر چیز میں ایک چٹھی لگا کر مہاجن نے سب کے سامنے صندوقچہ بند کیا قفل لگا کر کنجی داروغہ صاحب کو دیدی، داروغہ نے کہا ذرا سا گوندہ دو تو رانی صاحبہ اپنے نام کی مُہر قفل پر چسپاں کر دیں تاکہ شک باقی نہ رہے۔ مہاجن نے اس کو پسند کیا صندوقچہ بنیں میں گیا، اور بہت جلدی قفل پر مُہری کاغذ چپکا ہوا واپس آیا۔ پانچہزار کے کھدرے نوٹ مہاجن نے دیدیئے۔ یہ لوگ روپیہ لیکر چمپت ہو گئے مہینہ بھر تک تو مہاجن نے صبر کیا۔ لوگوں سے دریافت کیا کھنڈت پود کا پتہ نہ لگا۔ اور معلوم ہوا کہ کسی بیوہ رانی کا مقدمہ بھی نہیں ہے اس وقت اسے بہت افسوس ہوا لیکن دل مضبوط تھا آخر صندوقچہ جی کڑا کر کے کھولا اس میں اینٹیں بھری ہوئی تھیں بے چارہ باوجودیکہ کثیر دولت رکھتا تھا مگر اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکا۔

میر غلام عباس نے شارع عام پر ایک کمرہ بنوا لیا اور اس میں دو چار بٹیر باز دو چار افیونی بیٹھے ہوئے ہیں حقہ چل رہا ہے گپے چل رہے ہیں گویا تمام محلہ انھیں کی اردلی میں رہتا ہے دس گاڑیاں گیہوں کی جا رہی ہیں دو شریف آدمیوں نے انھیں آواز دی اور کہا اگر تم بیچنا چاہتے ہو تو یہیں سودا میر صاحب کے ہاتھ کر لو۔ گاڑیوں میں ایک مکھیا ہوتا ہے اس نے کہا اچھا۔ گیہوں کا نرخ طے ہوا اور مال تلنے لگا۔ محلے کے لوگ دو دو چار چار روپیہ کا اناج خرید رہے ہیں اور جو کوئی دس روپے کا لیتا ہے پانچ روپیہ میر صاحب کو دے جاتا ہے اور کہہ جاتا ہے کہ باقی پھر دیدیا جائیگا وہ سب روپیہ اپنے پاس جمع کرتے جاتے ہیں چار روپیہ کا اناج اپنے گھر میں بھجوا دیتے ہیں جو سپاہی پہرے پر ہوتا ہے اسے بھی دو روپے کا اناج مل جاتا ہے اس صورت سے سب اناج بک جاتا ہے اور جو کچھ روپیہ جمع ہوتا ہے میر صاحب اس میں سے دس روپیہ نکال کر باقی روپیہ مکھیا کے ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ کہتا ہے باقی روپیہ تو دیجئے کہتے ہیں کہ باقی روپیہ بھی دو مہینہ کے بعد آ کر لے جانا کیا ہم مکرتے ہیں اپنا حساب کر لو ہم سے لکھوا لو۔ وہ لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ محلے والے تو سب ان کے شریک ہوتے ہی ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب انھیں کی طرف سے بولنے لگتے ہیں آخر کاغذ لکھوا کر چلا جاتا ہے۔ دو مہینے کے بعد پھر آتا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں بھئی روپیہ کا ابھی تک بندوبست نہیں ہوا ذرا صبر کرو آج کل میں روپیہ آنے والا ہے آخر وہ مجبور ہو کر دیوانی میں نالش کرتا ہے ان کی تحریر پیش کرتا ہے۔ میر غلام عباس فوراً اقرار کر لیتے ہیں کہ بیشک اس کا روپیہ واجب الادا ہے۔ اور یہ تحریر بھی میرے ہاتھ کی ہے اور اس کا تمام حساب صحیح ہے۔ سرکار اسے ڈگری دیدیتی ہے اجرائے ڈگری کراتا ہے تو مکان میں ٹوٹی چارپائی بھی نہیں ملتی ہے۔ مجبور ہو کر ان کی ذات پر قرقی لاتا ہے اور میر صاحب گرفتار ہو جاتے ہیں، اس صورت میں نالش کرنے والے کو سات روپیہ ماہوار قیدی کی خوراک کے دینا پڑتے ہیں اور میر صاحب بیٹھے بیٹھے آرام سے کھاتے تھے اور جس مہینہ میں خوراک کا روپیہ جمع نہ ہوا یہ چھوٹ کر گھر چلے آئے پھر وہی مشاغل شاہی۔ بڑے بڑے کھاتے کھلے ہوئے ہیں لوگ حساب جانچ رہے ہیں۔ حقہ بھرا ہوا ہے یار لوگ چین اڑا رہے ہیں کوئی شامت کا مارا دیہاتی مل گیا۔ لوگ گھیر گھار کر اسے لائے خود بھی مال کھایا۔ محلہ والوں کو بھی کھلایا اور قرضہ کا سرخط لکھدیا۔ ماہوار ادا کرنے کی رقم طے ہو گئی۔ اب مال دھنی سر پیٹا کرے روپیہ کہاں جو ملے۔ شہر والے تو سب جانتے ہیں بہت کم پھنستے تھے۔ دیہات والے غریب ہمیشہ شکار رہا کرتے تھے۔ آخر کو ان ذات شریف سے منصف صاحب بھی واقف ہو گئے تھے جب کسی کی عرضی ان کی ماتحت گزری اور مدعی مدعا علیہ دونوں پیش ہوئے

منصف صاحب نے صورت دیکھتے ہی مدعی سے کہدیا تم بھی کہاں پھنسے یہ پرانا ڈاکو میر غلام عباس ہے تم نے اس کا نام سنا ہوگا۔ اس کے پاس کیا ہے جو تم لیلوگے سینکڑوں قرقیاں کی جاچکی ہیں ایک پیسہ بھی نہیں وصول ہوا وہ بیچارہ نام سنتے ہی مقدمہ سے دست بردار ہو جاتا تھا۔

ایک دن قضا کا مارا ایک چڑیمار آیا۔ میر صاحب کو اس پیشہ کے نام سے نفرت تھی۔ آپ نے ایک ایک پیسہ چڑیاں خریدیں اور سب محلہ والوں پر سے صدقے کرکے چھڑوا دیں۔ جب کھٹلی خالی ہوگئی تو آپ نے دو آنے پیسے چڑیمار کو دیئے اس نے کہا خداوند یہ کیا دیتے ہیں ایکرہ پیسہ چھ آنہ کا مال چھوڑا ہے۔ کہنے لگے نہیں یہ دام نہیں دیئے تم کو آج کھانے کو یہ دو آنے دیدیئے ہیں۔ کل آکر حساب کرلینا۔ وہ چلا گیا دوسرے دن سویرے تقاضے کو آیا تو کسی محلے والے نے کہدیا ابے کس سے مانگتا ہے جانتا نہیں یہ میر غلام عباس گلباز ہیں کیا آج بھی کچھ شامتوں نے گھیرا ہے وہ نام سنتے ہی رفو چکر ہوگیا لاکھ لوگ پکارتے رہے ایک جواب نہ دیا۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ اس راستے سے مال والوں نے راستہ چلنا موقوف کردیا۔ اور گاؤں گاؤں میں مشہور ہوگیا کہ شہر میں ایک گلباز ہے جو لوگوں کو لوٹ لیتا ہے۔

جب یہ بازار بھی ٹھنڈا پڑ گیا تو میر صاحب کی طباعی نے ایک اور جدت کی، خوش پوشاک تو ہمیشہ سے تھے اور صورت و شکل سے شریف معلوم ہونے تھے کلن خاں حکاک سے جو شیشے کو الماس بنا دیتے تھے کچھ نگینے خرید کئے اور سونے کی انگوٹھیوں پر انھیں جڑوا کر آپ خود رئیس بن کر دو چار خدمتگار ساتھ لیکر کلکتے بمبئی میں جاکر مہاجنوں کے ہاتھ فروخت کرکے لکھنؤ چلے آئے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ پولیس کو اکثر ان کی ذات پر شبہہ ہوا کہ چوری ضرور کرتے ہیں ورنہ ایسا شاہانہ خرچ کہاں سے چلتا ہے مگر کوئی موقع انھیں گرفتار کرنے کا نہیں ملا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے کسی شاگرد نے لمبی چوری کی تھی اور اس نے حسن عقیدت سے اس میں سے کچھ اسباب استاد کی نذر کیا پولیس کو اس امر کی خبر مل گئی۔ وہ تو ان کی دشمن تھی فوراً کوتوال صاحب دوڑ لیکر آپہونچے اس زمانہ میں میر صاحب محلہ اصطبل میں محمد علی خاں بٹی دار کے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے جیسے ہی آپ کو معلوم ہوا کنوئیں میں اتر کر اسباب کسی گوشے میں رکھ آئے اور آپ مکان کی چھت سے لیٹے پڑے رہے۔ پولیس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں ان کے اسباب میں کوئی چیز مال مسروقہ میں سے نہ تھی۔ پولیس ناکام واپس گئی۔

قانونی ترمیم کو آپ نے میر صاحب کی سن لیا اب عقلی ترمیم سنئے۔ ایک میم صاحب خوش پوشاک حسین اور ان کے صاحب بہادر امین آباد کی سڑک پر جا رہے ہیں۔ کوئی حاکم معلوم ہوتے ہیں۔ میم صاحب سونے کی بیش قیمت گھڑی لگائے ہیں۔ ایک دس برس کا لڑکا روتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے میم صاحب مارے ڈالتا ہے۔ ایک آدمی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ لڑکا میم صاحب کے قدموں پر گرتا ہے۔ مجھے بچایئے میم صاحب اسے اٹھاتی ہیں، وہ میم صاحب سے لپٹ کر کہتا ہے مجھے بچایئے۔ مارنے والا تو انگریز کی شکل دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور لڑکا میم صاحب کی گھڑی نکال کر چلتا ہوتا ہے۔ میم صاحب کو خبر تک نہیں ہوتی۔

دوسری ترمیم نخاس میں ایک مسلمان غریب آدمی لوہے کا پنجڑا طوطے کے واسطے چکاتا ہے اور بہت سمجھ بوجھ کر کے چھ آنے کا پنجڑا مول لیتا ہے۔ کمر سے ہمیانی کھول کر اس میں سے ایک روپیہ نکال کر دوکاندار کو دیتا ہے پیسے واپس لیکر چوک کی طرف رخ کرتا ہے کہ ضرورت کی چیزیں اور مول لے ہمیانی کھولتے وقت گنگلے بھانپ لیا۔ سوسوا سو روپیہ اس کے پاس ہے جس گلی میں یہ مسلمان ضعیف آدمی مڑتا ہے اسی گلی سے ایک ہندو مہری بھی اس کے آگے آگے جاتی ہے اور اس سے غفلت میں ایک خوبصورت بٹوا گر پڑتا ہے۔ مسلمان بڈھے کے پاس ہی سے ایک دوسرا آدمی نکل کر اس بٹوے کو اٹھا لیتا ہے اور مسلمان سے ہاتھ جوڑ کر اشارے سے اپنے ساتھ ایک دوسری گلی میں لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائی تم نے تو دیکھا ہی ہے کہ اس مہری کا یہ بٹوا گرا ہے اور ہم نے اٹھا لیا ہے اور یہ خیال کیا کہ مل بانٹ کے کھائینگے تو ہضم ہو جائیگا دیکھو تو اس میں کیا ہے؟ کھول کر دیکھا تو ایک سونے کے کڑے کی جوڑی اور ایک پھیلوں کی ہے آدمی نے کہا بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ اسے بازار میں چل کر آنکوائیں جتنے کو بکے آدھے دام ہم لے لیں اور آدھے دام تم لے لو۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں وہی عورت دوہائی دینے لگی۔ ہے ہے میں لٹ گئی، میرا بٹوا یہاں گر گیا۔ جس کسی نے پایا ہو مجھ سے دس پانچ روپیہ لے لے، میرا تین سو کا مال تھا۔ یہ لوگ اس کے غل مچانے

کے خوف سے ایک دوسری گلی میں چھپ کر بیٹھ رہے ہے۔ اب یہاں بڈھے کو لالچ نے گھیرا۔ کہنے لگا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔ جو قیمت آپکو ہم دیدیں یا تم دے دو اور لے لو اس نے کہا اچھا ڈیڑھ سو کا مال رکھئے پچھتر روپیہ ہم سے لے لیجئے۔ کہنے لگے واہ تین سو کا مال اور پچھتر روپیہ، تم ہم سے سَو روپیہ لیلو آخر ردو کد کے بعد اس نے روپیہ لے لیا اور چلدیا۔ چلتے چلتے بڑے میاں کو شک گذرا کہ ایسا نہ ہو مال کم ہو ذرا انکوا لینا چاہئے۔ مہاجن کو دکھایا اس نے کہا پیتل پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہے یہ تو کوئی چیز نہیں کلیجہ پکڑ کے رہ گئے پولیس میں رپورٹ لکھوائی دن بھر پریشان رہے کچھ حاصل نہ ہوا، یہ بھی میر صاحب کی ایجاد تھی آپ نے اس کا نام ٹپکار رکھا تھا۔

تیسری ترمیم یہ تھی کہ تین آدمی ہیں ایک آدمی گنجفہ کے تین پتے لئے ہے اور اسے ہاتھ سے الٹے رکھتا ہے اور کہتا ہے بتاؤ کون سا پتہ ہے اور جو کچھ لگانا ہو لگاؤ۔ ایک آدمی ایک روپیہ لگاتا ہے کہ یہ بادشاہ ہے۔ وہ جیت جاتا ہے۔ اسی راستے سے دوسرا آدمی جا رہا ہے اور ایک راہگیر سے کہتا ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ وہ ایک روپیہ لگاتا ہے اور ہار جاتا ہے پھر دوسرا اور تیسرا روپیہ لگاتا ہے جیت جاتا ہے۔ راہگیر کو بھی شوق ہوتا ہے ایک روپیہ لگاتا ہے جیت جاتا ہے پھر دو چار روپیہ ہار کر چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد یہ لوگ بھی وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اس کے موجد بھی میر غلام عباس ہیں۔ مزا یہ ہے کہ خود کبھی ایسے کھیل کے مرتکب نہیں ہوئے مگر مکر فریب و دغا میں ان کی ایسی عقل کسی کو نہ تھی۔ آپ جو کام کرتے تھے فوجداری کے قانون سے بچکر، اس عقلمندی کے سبب سے زندگی بھر راحت سے بسر ہوئی۔ مزاج میں فیاضی اور رحمدلی بہت تھی، ایک صاحب کہتے ہیں یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک دن میر صاحب گھر سے نکلے تو ایک آدمی پنچھی لئے جا رہا تھا۔ آپ نے اسے پکڑ لیا۔ ابے کیلئے جاتا ہے؟ وہ اچکا تھا اس نے کہا استاد گرم گرم گلگلے ہیں اور کچھ ان کی نذر کئے میر صاحب نے سب دوست احباب کو بانٹ دیئے۔ وہ گلگلے ہم نے بھی کھائے تھے۔

یہ تو خاص بات ہے جس محلے میں میر صاحب رہتے وہاں کبھی چوری نہیں ہوئی۔ آپ کی تعریف یہ ہے کہ جس قفل پر لات مارتے تھے وہ ٹوٹ جاتا تھا۔ لنگور کی طرح چو منزلے مکان پر چڑھ جاتے تھے پکی دیوار پر اس طرح پاؤں رکھتے تھے جیسے کوئی کمر بچے پر۔ چھپکلی کی طرح دیواروں میں چمٹ جاتے تھے انگریزی زمانے میں کبھی نہ وہ گرفتار ہوئے نہ قید ہوئے مگر بدنام بہت تھے غدر کے سینتیس برس بعد تک تو وہ زندہ تھے اس کے بعد مر گئے اور سنا جاتا ہے کہ تالکٹورے کی کربلا میں دفن ہوئے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

غزل

مرے درد کی ہائے! لذت بڑھا دی
یہ کس نے مری زندگی کو دعا دی؟

میں اب حسرتوں کا جہاں چاہتا ہوں
دعاؤں کی دنیا پہ بجلی گرا دی

دعاؤں کی لذت بڑھا دینے والے
یہ کس نے مجھے بندگی پھر سکھا دی

مرے عزم ہستی کو برباد کر کے،
مری خاکساری کی عظمت بڑھا دی

مرے مولا! ہستی سے کیا کر رہے ہو
بنا کر مٹا دی، مٹا کر بنا دی

سفینے کو موجوں میں کیوں لے گیا تھا
کسی نے مجھے اس طرف سے صدا دی

حزیں جس میں حسن ازل موجزن تھا
بڑے کام کی چیز تھی جو لٹا دی

نتیجہ فکر
آمین حزیں
بہاولپور،

جذباتِ عالیہ

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری

یاد ہے اے ہم نشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے
دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے

تا قیامت بھول سکتی ہی نہیں وہ سرگذشت
اپنے ہاتھوں خاک میں دل کا ملانا یاد ہے

جس جگہ آنکھیں لڑی تھیں وہ ہے منظر سامنے
جس جگہ ہوش اڑ گئے تھے وہ ٹھکانا یاد ہے

جس جگہ دل ہو گیا تھا زخمیِ تیرِ نظر
وہ جگہ وہ وقت وہ صدمے اُٹھانا یاد ہے

وہ مری بیتابیاں وہ جوشِ چشمِ اشکبار
وہ کسی گل پیرہن کا مسکرانا یاد ہے

اُف وہ چشمِ فتنہ ساز اُف وہ نگاہِ سحر کار
اُف دلِ عاشق پہ وہ بجلی گرانا یاد ہے

اک بتِ نا آشنا کافر ادا کے عشق میں
یاد ہے رہ رہ کے وہ آنسو بہانا یاد ہے

وہ نگہبانوں کے پہرے پر بھی با عجز و نیاز
حالِ دل پردے ہی پردے میں سنانا یاد ہے

وہ تلطف اور وہ اُس کا تلون ہائے ہائے
وہ نگاہیں ملتے ہی آنکھیں چرانا یاد ہے

اُس کو میرا یہ پیام اے کاش پہونچاتا کوئی،
جس کو سب وعدے تو بھولے بھول جانا یاد ہے

اے جفا جو اے ستمگر لطف فرما ہو کبھی
یہ بھی کوئی بات ہے بس دل دکھانا یاد ہے

داستانِ دل نہ بھولی ہے نہ بھولیگی ضمیر
ابتدائے عشق کا اب تک زمانہ یاد ہے!

کنول

جناب سید شبیر حسن صاحب فیض حیدرآبادی

پو پھٹ رہی تھی، پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر سے سورج کی کرنیں، جھانک رہی تھیں سڑک پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔

ٹکر جی کے گھر کے تمام لوگ جاگ اٹھے تھے لیکن کنول اپنے بستر پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ سورج کی تیز کرنیں آرامگاہ کی کھڑکی میں سے داخل ہو کر بستر پر پڑ رہی تھیں۔ وہ زیادہ رات گئے سوئی تھی اور اب چیخ وپکار سے بیدار ہوگئی تھی۔ کرنیں الگ ستا رہی تھیں۔ وہ جھنجھلائی، غصے سے کھڑکی بند کی اور دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر اب نیند کہاں!

"رانی جی آپ کو یاد کر رہی ہیں"۔ بوڑھی آیا نے چوکھٹ پر سے آواز دی۔

"چلی جاؤ! مجھے سونے دو" اس نے چڑ کر کہا۔ وہ بیچین تھی اس کی خمار آلود آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔

آخر کار وہ اٹھ بیٹھی۔ بیٹھے بیٹھے کچھ سوچتی رہی۔ پھر قد آدم آئینے کے پاس آکر بال سلجھانے لگی۔ بار بار اپنے کنول جیسے چہرہ، خوبصورت گداز جسم کو دیکھتی رہی۔ ساری کا پلو ڈھلک گیا تھا اسے درست کیا۔ انگڑائیاں لیں، خود اپنے انداز اور بانکپن کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر گھڑی کی طرف نظر دوڑائی —— آٹھ بجے تھے۔ "آج ضرور اس کا خط آئے گا" اس نے دل میں کہا۔ کنول ایک ہفتے سے اپنے منگیتر شرما کے خط کا انتظار کر رہی تھی اس نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ ہفتہ میں دو تین بار ضرور چٹھی روانہ کروں گا۔ وہ آج ہی کے روز کلکتہ گیا تھا۔ کسی اندرونی جذبے کے تحت اس نے اپنے سیب جیسے گال کو چھوا، شرما کا الوداعی بوسہ، وہ شرما گئی۔

ایک سال قبل! ہاں! اسے وہ دن یاد آیا جب وہ شرما کے ساتھ موٹر میں بیٹھی کلکتہ کی سیر کر رہی تھی اور شام کو لالہ پارک میں اس نے گرمجوشی سے چمٹا لیا تھا اس نے کہا تھا —— "کنول کیا تم مجھے قبول کرو گی؟"

ورمیں نے نیچی نظریں کئے شرما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سینما، گھوڑ دوڑ، لکچر، وائٹ سٹی تھیٹر، کیفے، کیا دلچسپ دن تھے اور اب وہ بہت دور اس سے جدا ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کا پیام محبت کنول کے کانوں میں گونجنے لگا جلتی ہوئی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی۔

وہ انھیں خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کی بلی کمرے میں آکر اس کے پیروں پر لوٹنے لگی وہ چونک پڑی۔ اس نے اسے اٹھا لیا سینے سے چمٹایا —— "میاؤں! میاؤں!!"

"پیاری بلی! مجھے بھوک لگی ہے" اس نے میز پر سے دودھ کا پیالہ اٹھا کر اسے دیا۔ وہ دودھ پینے لگی۔ کنول نے محبت سے تھپکا۔ "غر"، کسی کی آہٹ سنائی دی! دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا، شرما بھی اسی طرح دبے پاؤں چپکے سے آکر اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور وہ، اگر سوئی ہوتی تو چٹکی لیکر پلنگ کے پیچھے گھس جاتا! چوکھٹ پر بوڑھی کیسر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا شرما کا خط سمجھ کر اس طرف دوڑی۔ قالین میں پیر الجھا، سنبھلی، جلدی سے لفافہ چاک کیا، مگر وہ تو شاما کا تھا —— گرم گرم آنسو نکل پڑے۔

طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ شاید اس نے خط لکھا ہو اور ملازم نے ڈاک میں نہ ڈالا ہو۔ شاید کالج کی مصروفیات سے فرصت نہ ہوئی ہو۔ شاید وہ بیمار ہو، اس قدر کہ لکھنے کی طاقت نہ ہو۔ پھر اس نے تار کیوں نہیں دیا۔ یا پھر دوستوں میں رنگ رلیاں منا رہا ہو، کالج کی دو ست لڑکیوں کا اس نے بارہا ذکر کیا تھا۔ "کنول مجھے تم سے محبت ہے" "کنول کیا تم مجھے قبول کرو گی؟" اسے یاد آ رہا تھا۔ کنول کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔ بلی اس کے پیروں پر لوٹنے لگی "میاؤں!" چڑ کر اس نے ٹھوکر مار دی۔

"اسکول کی موٹر آگئی۔" آیا نے کہا۔

"میں نہیں جاؤنگی! جی ٹھیک نہیں ہے!"

پھر وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ تکئے کے نیچے سے شرما کے خطوط نکال کر ایک ایک کرکے پڑھنے لگی۔ عطر محبت میں بسے ہوئے نامے، پیارے پیارے خطوط۔ ایک کو بیساختہ اس نے چوم لیا۔ "کتنا پریمی ہے۔ وہ مجھے ہرگز نہیں بھلا سکتا۔"

"میاؤں! میاؤں!" اس نے کھڑکی کھولدی، اور ان پہاڑیوں کو حسرت سے دیکھنے لگی جن پر اکثر دونوں چڑھا کرتے تھے۔

"آپ کے نام تار آیا ہے رانی جی!" آیا ایک لفافہ لیکر آئی۔

اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے لفافہ چاک کیا۔ دل دھڑکنے لگا "شب کی گاڑی سے آرہا ہوں، شرما۔" وہ خوشی کے مارے اچھلنے لگی، آیا کا کندھا پکڑ کر ہلایا ــــ "سنا تم نے، شرما رات آرہے ہیں!" جلدی سے میز کا خانہ کھولا اور اٹھنی نکال کر اسے دی۔ "جاؤ تار والے کو دے آؤ۔" پھر وہ ماں کے پاس گئی۔

"ماتاجی! شرما آرہے ہیں، ــــ شب کو۔"

"کیا خط آیا ہے؟ ــــ"

"نہیں ماتاجی تار ــــ!"

وہ دوڑی ہوئی باورچی خانے گئی، باورچی کو تاکید کرنے لگی۔ "آج رات کا کھانا اعلیٰ درجہ کا پکاؤ، شرما آرہے ہیں!"

پھر وہ اپنے کمرہ میں آئی اور آیا کو بلا کر کہا۔ "دیکھو شوفر سے کہو ٹھیک ۷ بجے کار تیار رہے، یہ لو پٹرول کے دام۔" اس نے دو روپے تھیلی میں سے نکال کر دیئے۔ "دل کہہ رہا تھا کہ آج ضرور خط آئیگا! لو وہ خود ہی آرہے ہیں۔" وہ ہارمونیم پر گانے لگی۔

شام کو چار بجے وہ لباس کے کمرے میں گئی۔ بکس کھول کر ساریاں اور بلوز الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی پہنے۔؟ چند منٹ بعد وہ ایک نفیس ساری زیب تن کئے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی کبھی بال سنوارتی کبھی پلو درست کرتی۔ اس کے پیچھے آیا کھڑی مسکرا رہی تھی وہ صوفے پر بیٹھ گئی، وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ۵ بجے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے گھڑی کی سوئی سات پر رکھدی۔ یکایک الارم بجنے لگا۔ وہ اچھل پڑی، دور کسی انجن نے سیٹی دی لیکن ابھی تو ۵ ہی بجے ہیں۔ وقت گذاری کے لئے اس نے تازہ اخبار اٹھا لیا۔ اشتہارات، جلی سرخیاں، فوٹو سینما کے پروگرام متحرک تصاویر کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے۔ اس نے اخبار پھینک دیا۔

اس نے باورچی خانے میں جاکر پھر تاکید کی۔ تھوڑا سا میٹھا چکھا۔ "آہا کیا مزے کا ہے۔ وہ کھاکر بہت خوش ہونگے۔" موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس نے ایک بار اور خود کو آئینہ میں دیکھا۔ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کیا جلد جلد کافی پی اور جاکر موٹر میں بیٹھ گئی۔

"پہلے رانی باغ چلو۔"

سلیم سٹریٹ، رانی گنج، جان کلب، آخر رانی باغ آگیا۔ تھوڑی دیر سہیلیوں کے ساتھ دل بہلاتی رہی۔ گھڑی میں وقت دیکھا، ۶ بجے تھے۔

"اب میں جاتی ہوں۔" کنول نے سہیلیوں سے کہا۔

"کیوں، کدھر کا ارادہ ہے؟" ایک سہیلی نے کہا۔ "آج تو تم بڑے ٹھاٹ سے نکلی ہو، کوئی بات ضرور ہے۔"

"کہیں نہیں، اسٹیشن تک ایک عزیز کو لینے جارہی ہوں۔"

"سمجھی" اوما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "وہی نہ جن کا نام شرما ہے۔"

"ہم تمہیں نہیں جانے دینگے، کیا وہ ہم سے بڑھ کر ہے۔"

"چلو، اس کی موٹر میں دریا کی سیر کریں۔"

"بہت ٹھیک، بہت ٹھیک" سب نے ایک زبان ہوکر کہا اور سب کی سب کنول کو گھسیٹ کر موٹر میں بیٹھ گئیں۔ کنول کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اوما نے شرارت سے گال نوچ لیا۔ "اچھا تو میری جان، منگیتر کی آمد کی خوشی میں ہم سب کو آئس کریم کھلا تب ہم تجھے جلد چھوڑ دینگے۔"

"منظور" کنول کا چہرہ کھل گیا اور موٹر ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔

کنول نے بمشکل پیچھا چھڑایا اور جب موٹر گھنٹہ گھر ہوکر چلی تو اس وقت پونے سات تھے۔ وہ خود موٹر چلا رہی تھی۔ چوراہے کے جوان نے تیز رفتاری کی علت میں موٹر روک دی، بورڈ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"۱۵ میل فی گھنٹہ۔"

"لیکن مجھے جلد اسٹیشن پہنچنا ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"خیر آہستہ لے چلئیے۔"

موٹر اسٹیشن کے احاطے میں رک گئی۔ ابھی گاڑی آنے میں ۱۰ منٹ باقی تھے۔ "آج تو پون گھنٹہ لیٹ ہے۔" کسی مسافر نے قریب سے کہا۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے ٹکٹ بابو کے پاس جاکر دریافت کیا تو صحیح نکلا وہ تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔

دو نوجوان سوٹ پہنے سگریٹ پیتے اس کے قریب سے گذرے دونوں نے مسکراتے ہوئے دیکھا چند قدم آگے بڑھ کر پلٹے اور اسی بنچ پر ایک طرف بیٹھ گئے۔ کنول سمٹ کر کونے میں کھسک گئی اور اپنی نوٹ بک دیکھنے لگی۔

"کہیں اس نے جھوٹ موٹ تو نہیں لکھ بھیجا؟" ایک نے کہا۔

"مجھے تو امید نہیں کہ آج آئے۔ بھلا وہ کیسے آسکتا ہے امتحان سر پر کھڑا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"وہ تو ایسا مذاق کیا ہی کرتا ہے!" کنول کے کان کھڑے ہوگئے۔

"نہیں منوہر وہ ضرور آئیگا۔ تار میں صاف لکھا ہے کہ ہم سٹیشن پر موجود رہیں۔"

"اگر آجائے تو سیدھے رائل چلیں گے۔ ماتا ہری چل رہا ہے۔"

"مگر یار جب تک شارتی نہ ہو بے لطفی رہیگی۔"

"کیا کرما بھی آج ہی پٹنے سے آرہے ہیں؟" کنول نے دریافت کیا۔

"جی ہاں!" منوہر بولا: "کیا آپ انھیں جانتی ہیں؟"

"کیوں نہیں، آخر وہ عزیز ہی ٹھہرے۔ شرما بھی تو کلکتہ سے آرہے ہیں۔"

"اخوہ، آپ کنول ہیں، انھیں کو لینے آئی ہیں نہ؟"

"ہاں!"

"عجب اتفاق ہے۔"

گاڑی کی آمد کی گھنٹی اور تیز روشنی دیکھ کر کنول اٹھ کر پلیٹ فارم کے اس حصے میں کھڑی ہوگئی جہاں سیکنڈ کلاس کا ڈبہ رکتا ہے۔ ٹرین رکتے ہی کنول ڈبے میں گھُسی لیکن وہ اس میں نہیں تھا۔ ایک ایک کرکے تمام ڈبے دیکھ ڈالے مگر شرما غایب، پریشانی میں وہ زنانے ڈبے میں گھس گئی، اور پچھلے پیر لوٹ آئی۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چل پڑی۔ وہ آخری ڈبے کے نظروں سے اوجھل ہونے تک حسرت سے ٹرین کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

موٹر شاہراہ پر آہستہ آہستہ گذر رہی تھی۔ سڑک کی روشنی وقفے وقفے سے کنول کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کی آنسو بھری آنکھیں چمک جاتی تھیں۔

موٹر ایک چھوٹے سے راستے پر مڑی۔ عین موڑ پر دوسری سمت سے ایک تیز رفتار موٹر یکایک آکر رک گئی۔ قریب تھا کہ بری طرح ٹکرا جاتی مگر شوفر نے ایک دم برک دبا دیا۔ ایک شخص تیزی سے اتر کر آیا اور شوفر کو ڈانٹنے لگا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر کنول آواز پہچان گئی۔

"شرما" اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

"تم ہو کنول!" وہ خوشی کے مارے موٹر سے اتر پڑی۔

"تم کہاں تھے؟ میں ابھی اسٹیشن سے آرہی ہوں۔"

"میں بھی تو وہیں سے چلا آرہا ہوں۔"

"تم تو کہیں دکھائی نہیں پڑے ڈبہ ڈبہ چھان مارا۔"

"تمہیں ستانے کیلئے چال چلی۔"

"دونوں موٹر میں بیٹھ گئے۔"

خالف

[illegible]

جذباتِ فضا!

جناب فضا جالندھری

ہر آہِ سرد شرحِ رازِ جاں معلوم ہوتی ہے
محبت داستاں در داستاں معلوم ہوتی ہے

خلش اب تک جو پنہاں تھی عیاں معلوم ہوتی ہے
نگاہِ یاس دل کی ترجماں معلوم ہوتی ہے

یہ در پردہ شریکِ آسماں معلوم ہوتی ہے
نگاہِ شوخ ادا کیوں بدگماں معلوم ہوتی ہے

نہ دل معلوم ہوتا ہے نہ جاں معلوم ہوتی ہے
محبت میری رگ رگ میں نہاں معلوم ہوتی ہے

تجلّی حیرت افزائے جہاں معلوم ہوتی ہے
عیاں ہونے پہ بھی سب کو نہاں معلوم ہوتی ہے

تمھاری ان حسیں نظروں میں لاکھوں طور پنہاں ہیں
ہر اک گردش میں برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے

دلِ درد آشنا یہ جوش یہ آشفتگی کب تک
مجھے ہر سانس اک موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

مری نظریں تجلّی آشنا۔ دل کیف ساماں ہے
چمن کی پتّی پتّی گلستاں معلوم ہوتی ہے

محبت بعدِ ضبطِ غم نہیں اب کاہشِ خاطر
محبت اب نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

شرارِ حسن شاید تم نے ان میں بھر دیا ہوگا،
کہ ہر پتھر کی مورت جانستاں معلوم ہوتی ہے

ملا ہے رنگ و بو بلبل کو فردوسِ نظر ہو کر
رگِ گل اس کو شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

زبانِ بے نگہ میری، نگاہِ بے زباں میری
محبت کی مکمل داستاں معلوم ہوتی ہے

دلِ پرشوق اس عالم کو معراجِ طلب کہیے
جہاں ہر ایک کوشش رائگاں معلوم ہوتی ہے

ادائے التفاتِ حسن عالم سوز کیا کہیے
مری رگ رگ میں اک برقِ طپاں معلوم ہوتی ہے

مکمل ہو گیا شاید مرا شوقِ گرفتاری!
ہر اک تیلی قفس کی آشیاں معلوم ہوتی ہے

نیازِ عشق نے اب دل کو اس عالم میں پہونچایا
جہاں اپنی جبیں خود آستاں معلوم ہوتی ہے

کسی نے مسکرا کر دل میں برپا کر دیا محشر،
کہ اب تو زندگی اک داستاں معلوم ہوتی ہے

کیا ہے شوقِ بیحد نے یہاں تک مجھ کو وارفتہ
کہ اب منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

گماں ہوتا ہے اُن کا اے فضا اب ہر تجلّی پر
نظر اپنی خدا جانے کہاں معلوم ہوتی ہے

رامپور میں دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا اجتماع

جناب میرزا محمد بشیر صاحب ایم۔ اے

تاریخ رامپور پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ اس کے تاجدار شروع سے صاحب علم و علم دوست رہے ہیں۔ نواب علی محمد خاں کے بیٹے نواب محمد عبداللہ خاں ذی علم بھی تھے اور سخن گو بھی مگر فارسی میں کہتے تھے۔ تخلص[1] کہیں عاصی کہیں آزاد، کہیں مبتلا نظر آتا ہے۔ تاجداران رامپور میں پہلا فرمانروا جس نے اردو میں شعر کہا نواب احمد علی خاں المتخلص بہ رند[2] تھے ان کے چند شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

ساقی و مطرب و شراب ہے آج
خانۂ توبہ بس خراب ہے آج

حشر کو جب حساب مانگیں گے   الاماں شیخ و شاب مانگیں گے
اپنے ساقئ لاابالی سے،   رنداں بھی شراب مانگیں گے

رامپور میں باہر کے شعرا کی آمد نواب یوسف علی خاں کے عہد سے قبل ہی شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ شیخ قیام الدین قائم دہلی کی تباہی کے بعد نواب محمد یار خاں والئ ٹانڈہ کے یہاں رہے۔ لیکن بقول مصنف گل رعنا[3] جبکہ "ان کا بھی کام بگڑا رام پور چلے گئے اور احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کردی، کچھ دنوں اس پر قناعت کی۔" اس بیان کی تائید مقدمہ "مخزن نکات"[4] مصنفہ قائم سے بھی ہوتی ہے۔

نواب یوسف علیخاں ناظم اور نواب کلب علی خاں نواب کی سخن شناسی اور قدردانی کی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کا ایک جمگھٹا رامپور میں نظر آنے لگا۔ دونوں رئیس خود شاعر تھے اور اصحاب علم و فضل کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مرزا غالب نواب یوسف علی خاں ناظم کے متعلق فرماتے ہیں

"بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے نواب صاحب دوستانہ اور شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھکو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے"[5]

نواب کلب علیخاں[6] کے متعلق امیر لکھتے ہیں۔

"میرے ساتھ خاص جو ان کا برتاؤ تھا وہ سوائے میرے اور ان کے کسی کو نہ معلوم تھا۔ دو سو سولہ ماہوار تو تنخواہ وہ مجھ کو دیا کرتے ہیں اور ہر سال ختم سال پر چار پانچ ہزار روپیہ دیدیتے تھے اور اس طرح دیتے تھے کہ وہ جانتے تھے اور میں اور خدا بس اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔"

غالب[7] لکھتے ہیں۔ "نواب صاحب (کلب علیخاں) از روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیہ رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی۔"

—— ادب اردو کی تاریخ شاہد ہے کہ جب دہلی و لکھنؤ پر تباہیوں کی گھٹائیں چھائیں اور غدر ۵۷ء نے اس بہارستان کو تاراج کیا تو سوائے رامپور کے کہیں اور ٹھکانا نہ رہ گیا۔ اگر جغرافیہ کے اعتبار سے رام پور کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان واقع ہے چنانچہ شعرا و اصحاب علم و فضل دلی اور لکھنؤ سے جوق جوق اس طرف آنے لگے یہاں تک کہ

"غدر کے بعد دلی اور لکھنؤ میں جو جس فن کا کامل تھا اس کو رامپور کے سوا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔"[8]

۱۔ انتخاب یادگار صفحہ ۲۱   ۲۔ انتخاب یادگار صفحہ ۶۷
۳۔ گل رعنا صفحہ ۱۸۳   ۴۔ صفحہ ۳   ۵۔ اردوئے معلیٰ

۶۔ مکاتیب امیر مینائی صفحہ ۳۳۵   ۷۔ اردوئے معلیٰ   ۸۔ گل رعنا صفحہ ۴۰

مصنف تاریخ ادب اردو لکھتے ہیں۔ "رام پور وحیدر آباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنھوں نے ان خستہ اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی"۔[1] یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ رامپور میں دلی اور لکھنؤ کے شعرا کا اجتماع قبل از غدر شروع ہو گیا تھا۔ نواب ناظم کے عہد میں غدر ۵۷ء کے پیشتر ہی مومن خاں مومن رام پور میں آچکے تھے مومن کا شعر ہے ؎

دلی سے رام پور میں لایا جنون عشق

ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

اور نواب ناظم ان کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔ "پہلے[2] مومن خاں دہلوی سے مشورہ تھا پھر مرزا نوشہ غالب سے تلمذ ہوا۔ اس کے بعد منشی مظفر علیخاں اسیر لکھنوی کو کلام دکھلایا۔ سب سے اخیر جناب امیر صاحب مینائی سے شعر و سخن میں مشورہ رہتا تھا۔"

مرزا غالب مرحوم ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "[3] نواب یوسف علیخان بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔" اس کے بعد در رامپور جانے کا حال تحریر کیا ہے۔ یہ سب غدر سے پہلے ہوا۔ اسیر بھی غدر سے پہلے آچکے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورا اجتماع دونوں اسکولوں کا غدر کے بعد ہوتا ہے۔ داغ۔ امیر۔ جلال غدر کے بعد رام پور پہنچتے ہیں اور اس ادبی اجتماع کا شباب کلب علی خاں کے عہد میں ہوا۔

نواب کے عہد میں شعرا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور پھر شعراء ہی پر موقوف نہیں ہر ایک فن کے کامل وہاں پائے جاتے تھے۔ ریاست رامپور کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ اتنے باکمالوں کے علاوہ اتنے شعراء کا بار کیونکر اٹھایا جاتا تھا۔ بات یہ ہے کہ نواب کلب علی خاں نے برائے نام کچھ نہ کچھ خدمت ہر شاعر کے ذمہ لگا دی تھی اور اس کام کے اعتبار سے ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ مگر خود اپنے پاس سے وہ انعام و اکرام بھی دیا کرتے تھے اور یہی سبب تھا کہ نواب ناظم کے بعد شعرائے دہلی و لکھنؤ کا مجمع وہاں بڑھتا گیا۔

رام پور کی سرکار سے دہلی و لکھنؤ کے جن شعرا کا دامن وابستہ ہوا ان میں سے خاص خاص یہ ہیں غالب، مومن، داغ، تسلیم، رحیم الدین حیا، حسین علیخاں شاداں، اسیر، امیر، جلال، بحر، خواجہ اسد علی خاں قلق، ان دونوں کے یکجا ہو جانے سے رامپور میں خصوصاً شمالی ہند میں عموماً ادب و شاعری کا ذوق وسیع ہو گیا۔ امیر مینائی نے رامپور میں ایک تذکرہ "انتخاب یادگار" لکھا ہے۔ وہ دیباچہ میں فرماتے ہیں "[4] ایک تذکرہ شعرائے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس خاص دار الریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی کیفیات سخن گوئی کی حقیقت نقش صفحہ روزگار ہو...... مجموع شعرا، اس تذکرہ میں چار سو دس ہیں"۔ ان چار سو دس میں عربی فارسی بھاشا اور اردو کے شعرا بھی شامل ہیں۔

ایک اہم نتیجہ جو ان دو اسکولوں کے اجتماع سے نکلا وہ یہ تھا کہ۔ "[5] نواب صاحب موصوف (نواب یوسف علیخاں ناظم) نے شعراء دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا۔ یعنی دونوں طرز ول کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علیخاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔"

اس بیان کی وضاحت کیلئے ان دو طرزوں کی چند مابہ الامتیاز خصوصیات کا ذکر ناگزیر ہے مثلاً اہل دہلی جذبات کو الفاظ پر فوقیت دیتے ہیں۔ جذبات کی ترجمانی سیدھے سادے الفاظ میں کرتے ہیں۔ فلسفہ تصوف کی دھن میں وہ روح کو دیکھتے ہیں۔ جسم کی پروا نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے اہل لکھنؤ کے یہاں زبان کو جذبات پر فوقیت ہے۔ خیالات آتے ہیں مگر الفاظ کا شوخ جامہ پہنکر۔ تخیل کی جولانیاں، تشبیہ و استعارہ کی پیچ پیچ راہوں سے گذرتی۔ عربی الفاظ کی کثرت۔ صنائع و بدائع کی گلکاریاں محاورات کا صحیح استعمال و فن عروض کی سخت پابندیاں ان کے کلام کی خصوصیات ہیں،

جب یہ دونوں اسکول ایک سرکار کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے، تو ایک طرف صفائی زبان کے معاملہ میں لکھنؤ کے شعراء سے دلی کے شعراء متاثر ہوئے اور دوسری طرف جذبات نگاری میں اہل لکھنؤ نے دلی کا اثر قبول کیا چنانچہ نواب یوسف علی خاں ناظم کو لیجئے جو مومن، غالب اور اسیر کے شاگرد تھے ان کا کلام دونوں طرزوں کے اتحاد کی ایک بین مثال ہے۔ اسیر کی محاورہ بندی اور رعایت لفظی کا لطف اٹھانا ہو تو ناظم کے یہ شعر پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

آبرو کیا پیرہن جب کہ گریباں رہ گیا | بارے آنسو تھم گئے پیر کہ داماں رہ گیا

۱؎ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۰۸ ۲؎ اخبار الصنادید جلد دوم صفحہ ۱۲۵ ۳؎ اردوئے معلی صفحہ ۲۳۴

۴؎ انتخاب یادگار صفحہ ۷ ۵- تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۱۲

سنبل کے پیچ سن کے وہ کھاتا تھا پیچ و تاب
لالے کا داغ دیکھ کے دل داغدار تھا

غالب و مومن کا طرز ملاحظہ ہو ؎

وہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

ہوتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے
گویا یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا

نواب کلب علیخاں نواب کا کلام امیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے مگر پھر بھی داغ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شعر

بچا ہوا تھا جو کچھ تیری چال سے فتنہ
بدل کے رنگ وہی گردش زمانہ ہوا

ادا سے ناز سے غمزے سے سحر کرنے سے
وہ دل کو لیتے ہیں ملجائے جس بہانے سے

سارے دنیا کے مزے کھوتا ہے جانا دل کا
سچ تو یہ ہے کہ برا ہوتا ہے آنا دل کا

دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کے دواوین بھی رامپور سے بکثرت شایع ہوئے دواوین میں امیر کا دیوان "صنمخانۂ عشق"۔ "گوہر انتخاب" وغیرہ داغ کا "گلزار داغ"۔ "آفتاب داغ" اور ایک مثنوی "فریاد داغ"۔ تسلیم کا تیسرا دیوان "نظم دل افروز"۔ "دفتر خیال" رامپور ہی سے شایع ہوئے۔ اسیر جلال۔ منیر اور شعراء کا کلام بھی یہاں سے شایع ہوا۔ "امیر و جلال کی شاعری کا بہترین زمانہ وہ تھا جو رامپور میں گذرا۔ داغ کی شاعری کا آغاز لال قلعے سے ہوا جو اردوئے معلیٰ کا گہوارہ تھا اور اس کے شباب کا زمانہ نواب کلب علیخاں مرحوم جیسے قدرداں کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا۔"[1]

نظم کے قدم بقدم نثر کو بھی ترقی ہوئی، امیر، جلال اور اسیر نے نثر میں رسالے اور کتابیں لکھیں۔ چنانچہ امیر کی تصانیف میں "خیابان آفرینش" "انتخاب یادگار"۔ وغیرہ، اسیر کی "زر کامل عیار" اور جلال کی "سرمایہ زبان اردو" "مفید الشعرا" "قواعد المنتخب" مفید کتابیں ہیں۔ سب سے بڑی خدمت جو اس سلسلہ میں ہوئی وہ "امیر اللغات" ہے۔ امیر مغفور کے ذہن میں اس لغت کا خیال ایک عرصہ سے تھا لیکن "جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت نہ ملی۔ دل میں تھی لیکن کچھ نہیں ہو سکا ذہن بندھی رہی۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدرداں سرالفرڈ لائیل صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی نواب خلد آشیان نے مجھے حکم دیا یہاں تو تمنا بھی تھی۔ فوراً الف کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا"[2]

رامپور ایک ادبی مرکز کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے بہت مشابہت رکھتا ہے جہاں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کے زیر سرپرستی نثر نگار جمع ہوئے انھوں نے مسجع و مقفیٰ عبارت ترک کر کے نثر عاری اختیار کی جو ملک میں مقبول ہوئی۔ رامپور میں لکھنؤ اور دہلی کے باکمال شعراء کا جمع ہونا نوابان ذی شان کے ادبی ذوق و علم کی سرپرستی کا نتیجہ تھا۔ یہاں نثر نے سلاست و صفائی پائی۔ تصنع اور بناوٹ کا سکہ اٹھ گیا۔ جب نواب کلب علیخاں کی شمع حیات گل ہوئی تو اس بزم کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ نواب حامد علیخاں المتخلص بہ رشک کے عہد میں شعر و شاعری کا چرچا کچھ نہ کچھ رہا۔ کتب خانہ جس کو نواب فیض اللہ خاں نے قائم کیا تھا نواب ناظم اور نواب کلب علیخاں کے ہاتھوں اس نے بہت کچھ ترقی کی اور نواب[3] حامد علیخاں رشک کے زمانہ میں کتابوں کی تعداد اکیس ہزار پانچسو ترانوے تھی۔ جن میں آٹھ ہزار چار سو ستر قلمی ہیں۔ ان میں اردو کی بہت سی غیر مطبوعہ کتابیں بھی شامل ہیں مثلاً تسلیم کا "سفرنامہ نواب رامپور" جس میں پچیس ہزار شعر سے کم نہ ہونگے رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی موجود ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ نواب کلب علیخاں کی موت رامپور کے اس تعلق کو جو دہلی اور لکھنؤ سے قائم ہوا تھا منقطع کر گئی۔ امیر مرحوم لکھتے ہیں[5] "ایشیائی باغ جو انھوں نے (نواب کلب علیخاں) نے دنیا بھر سے گل بوٹے چن کر لگایا تھا خزاں کے ہاتھوں اجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس باغ کا ایک کھلایا ہوا شجر ہوں جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اب جب اصل شجر میں نقصان ہے تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم" امیر کا یہ شعر رامپور کی ادبی سرگرمیوں کے اختتام اور دہلی و لکھنؤ کے تعلقات کے خاتمہ کی تاریخ ہے ؎

امیر اب ہم کہاں اور اب کہاں داغ
یہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

۱۔ گل رعنا صفحہ ۴۱۹ ۲۔ دیباچہ امیر اللغات حصہ اول ۳۔ اخبار الصنادید ۴۔ گل رعنا صفحہ ۴۴۴ ۵۔ مکاتیب امیر مینائی صفحہ ۳۳۵

غزل

علامہ خیال مراد آبادی

مجھکو بے ہوش جو کہتا ہے اُسے ہوش نہیں
شعلہ آشامِ ازل ہوں کوئی مدہوش نہیں

ختم ہو جائیگی اک روز جفا کوشیِ حُسن
عِشق کو اپنی حقیقت کا ابھی ہوش نہیں

ضبط و اخفائے محبّت تو ہے خامی کی دلیل
عِشق ہر رنگ فغاں کوش ہے خاموش نہیں

وہ تھا آغازِ محبّت یہ ہے انجامِ جنوں
عِشق بیہوش تھا جب، حسن کو اب ہوش نہیں

یہ مِرے شوقِ فراواں کی ستم ہیں مجھ پر
ورنہ وہ حسنِ حقیقت میں ستم کوش نہیں

جس کے اک قطرہ سے ہو جاتا ہی عالم مدہوش
جام میں اب وہ مِرے بادۂ سرجوش نہیں

نارسائی نگہِ شوق کی ہے ورنہ خیالؔ
جلوۂ حُسنِ حقیقت کبھی روپوش نہیں!

"چار خط"

چار خط!

جناب طفیل احمد خاں صاحب سلطان پوری

گوپال بھائی!

اگر محبت کی جذباتی دنیا" سے الگ 'یونانیوں کا کیوپڈ' واقعی کوئی ہستی ہے تو وہ یقیناً "تم" ہو۔ میں نہیں کہتا تھا کہ تم اپنے ساتھ میرا سکون بھی لئے جا رہے ہو؟ اپنا دھڑکتا ہوا احساس دل، میرے برنٹ کی قاش جیسے دل سے بدل کر لے گئے، بلکہ چرا لے گئے۔ آج تمھیں کالج چھوڑے ہوئے دس دن گذر گئے مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی گئے ہو۔ یقین کرو، آدھا لطف تو تم اپنا زاد راہ بنا کر لے گئے اور آدھا ——— نہیں کہونگا۔ تم ہنسوگے! اسی وجہ سے تو کہہ رہا ہوں کہ تم نے مجھ سے دلوں کا تبادلہ کیا ہے، ورنہ جانتے ہی ہو کہ میں نے آج تک کسی حسین مسکراہٹ کا جواب سوائے قہقہہ کے اور کسی چیز سے نہیں دیا۔ تم سے کم کسی نے میرا مطالعہ کیا ہوگا، مگر یہ تو بتاؤ کبھی تم نے مجھے "فطرت" و "رومان" سے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرتے ہوئے بھی سنا ہے؟

تمھیں اس دھندلی شام کا واقعہ تو ضرور یاد ہوگا جب تم اور یوسف ندی کے کنارے "کیوپڈ و سائیکی" کا افسانہ محبت پڑھ رہے تھے اور اتنے محو تھے کہ میں آیا اور تمھیں خبر تک نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ میں نے پیچھے سے تمھاری آنکھیں بند کر دیں اور تم چونک پڑے جیسے کسی نے خواب سے جگا دیا ہو۔

جب یوسف "حسین سائیکی" کے اس فقرہ پر پہونچا ———

"وہ سکوت، وہ فکر، میں ہی تو ہوں، جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا دیتی ہوں" تو میں نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور تم جھنجھلا اٹھے۔

ایک دفعہ جب تم کالج کی لائبریری میں کتابوں کا انتخاب کر رہے تھے میں نے تم سے "روسو" کی "تاریخ زندگی" لینے پر اصرار کیا تھا، مگر تم نے انکار کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم نے کہا تھا: "اس میں سوائے لغو کارناموں اور انسانی خونریزی کی داستانوں کے اور کیا ہوگا"۔

آخر تمھاری نظر انتخاب "بائرن کے خطوط محبت" پر پڑی اور تم نے اسے بڑے شوق سے لے لیا۔ بتاؤ! کیا ایسے آدمی سے توقع کر سکتے ہو کہ وہ یک بیک کسی پرکیف سانحہ میں اپنی روح کھو بیٹھے گا۔؟

چونکو نہیں! غور سے سنے جاؤ، یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ "جو جس ماحول میں پلتا ہے وہی اس کا ملک الموت ثابت ہوتا ہے"۔

"والٹیر" انقلاب فرانس کا مشہور ہیرو، مذہبیت کا دشمن، مذہب ہی کی گود میں پلا تھا۔

ہاں، تو اب میں وہ "مہیش" نہیں ہوں جسے تم "متحرک بت" کہا کرتے تھے۔ تم میں اور مجھ میں اب صرف اتنا ہی فرق ہے کہ تمھارے دل میں فطرت کے ہر حسن کا عشق سما سکتا ہے لیکن میرا دل صرف ایک "آسمانی تتلی" کیلئے اپنی تمام وسعتیں وقف کر چکا ہے۔

میں اسے آسمانی تتلی ہی کہتا ہوں۔

اس خط کے جواب میں جانتا ہوں کہ تم ناصح مشفق بن کر میری مذمت کروگے مگر بوڑھے بچے! مجھے اب اس کی کیا پروا ہے۔

تمھارا مہیش

۲

پیارے گوپال!

مجھے تعجب اور سخت تعجب ہے کہ تم میری فطرت کے اس مہتم بالشان

انقلاب کو ایک معمولی سا واقعہ تصور کرتے ہو۔

تمہارا خط، کاغذ کا ایک "غیر شاعرانہ ٹکڑا" جس میں ایک لٹے ہوئے انسان کو اور لوٹنے کی کوشش کی گئی تھی ملا! ——— اگر میں تمہاری جگہ ہوتا اور تم میری جگہ تو میں تمہیں خودکشی کر لینے کا ضرور مشورہ دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ تم بھی بدل گئے۔

خیال تھا کہ اب ہم دونوں کا فطری اختلاف جاتا رہا۔ مگر دیکھتا ہوں کہ باوجود انقلاب کے ہم دونوں مختلف ہی رہے خدا کے لئے مذاق نہ کرو! گو تم بہت کچھ جانتے ہو لیکن تمہیں کیا معلوم کہ "کملا" میرے لئے کیا ہے؟

یہ کملا ——— کون سی نئی بلا ہے؟ ——— یہ کوئی نئی بلا نہیں ہے میاں مٹھو! ——— میں نے صرف دل بہلانے کے لئے اس کا نام "آسمانی تتلی" کا ——— "کملا" نام رکھ لیا ہے جو میری زندگی کا "سرمایہ نشاط" ہے۔

میں اس سے محبت کرتا ہوں اور بے انتہا محبت! میں اسے نہیں جانتا، مگر وہ میرے نزدیک ہے بالکل نزدیک، یہاں تک کہ اس کے تصور سے قلب میں ہر گھڑی ایک دھڑکن سی محسوس کرتا ہوں۔ جو کبھی کبھی درد کی صورت میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔

وہ میرے دل کی ایک تمنا ہے اور میری تمنائیں زیادہ تر میرے دل ہی میں رہتی ہیں۔ وہ میرے دل سے کیونکر دور ہو سکتی ہے جبکہ میری زندگی کے پر سکون اور وجدانی جذبے اسی کی آرزو سے برقرار ہیں۔

پیارے گوپال! معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب دنیا مجھے چین سے بیٹھنے دینا نہیں چاہتی۔ یہ وقت گو میرے لئے ناکامیوں اور محرومیوں کا ہے لیکن اتنا تو ہے کہ "پر کیف" ہے۔ مگر زمانہ یہ چاہتا ہے کہ یہ "کیف" بھی چھن جائے اور میرے حصہ میں صرف ناکامیاں ہی ناکامیاں رہ جائیں۔

کل شام کو کلب سے واپس آیا تو سب سے پہلے نوکر نے والد صاحب کا خط دیا۔ تم خود پڑھو اور بتاؤ کہ میں کیا کروں۔

"فیروزپور"

عزیز مہیش! ایشور تمہیں خوش رکھے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤں۔ تمہاری عمر اٹھارہ سال سے تجاوز کر چکی ہے پڑھنا ہے تو عمر بھر پڑھتے رہنا۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک اہم فرض ہے۔ تمہاری شادی یہاں سے کچھ دور ایک بڑے زمیندار کی لڑکی سے طے ہو گئی ہے۔ لڑکی تعلیم یافتہ ہے اور تمہارے حسب خیال۔ اسی ماہ کی بیس کو شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے آج سے کل بیس روز اور رہ گئے ہیں اس لئے تم اب حیلہ حوالہ نہ کرو اور آج ہی گھر کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ امید ہے کہ اپنے بوڑھے باپ کی اس آخری تمنا کو پامال نہ کرو گے۔ تمہارا بہی خواہ ......

جلتے ہوئے یہ خط پڑھ کر کتنا رویا ہوں اُف ——— کیا قیامت ہے؟ میرا دل کسی اور کو چاہتا ہے اور گھر والے زبردستی مجھے ایک نامعلوم وجود کو پیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ میں نے اس خط کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا ہے کیا جواب دوں؟؟

تمہارا مہیش،

۳

اچھے گوپال!

تمہارا خط موت کا پیام بن کر پہنچا۔ میں نے تم سے مشورہ طلب کیا تھا مگر تم تجربے بتانے لگے، ظالم کہیں کے، اپنے کو تجربہ کار اور مجھے ناتجربہ کار سمجھ کر یہ رائے دے بیٹھے کہ میں آگ سے کھیلنا شروع کر دوں۔

مجھے تمہاری زبان سے ایسی باتیں سن کر سخت حیرت ہوئی۔ خدا کیلئے مطالعہ چھوڑ دو۔ کتابوں نے تمہاری فطرت کو مسخ کر رکھ دیا ہے۔ محبت کو تجربہ کاری سے کیا نسبت؟ وہ محبت ہی نہیں جو لہروں کی طرح پرجوش نہ ہو جنہیں اس کی پروا نہیں کہ ان کی ٹھوکریں ساحل پر کیا آفت ڈھا رہی ہیں وہ محبت محبت نہیں جس کا نتیجہ چاند سے چمکتی ہوئی کائنات کی طرح خاموش اور پر سکون ہو، محبت بجائے خود ایک کامیاب تجربہ ہے اس میں کسی مزید تجربے کی ضرورت نہیں، لیکن تمہارا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ گھر گیا اور آج واپس آیا۔ صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں، بھاگ آیا۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری یہ حرکت سماج کی نظروں میں حد درجہ ذلیل اور قابل نفرین سمجھی جائیگی لیکن مجھے اب اس کی کیا پروا ہے "سماج کے بگلا بھگت" میرے متعلق کیا کیا خیال آرائیاں کرتے ہونگے۔ اس کا اندازہ تم مجھ سے بہتر کر سکتے ہو، اس لئے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔ میں بالکل مجبور تھا۔ شادی نہ کرنے کی صورت میں جائداد سے محروم ہو جانے کا

اندیشہ تھا، مگر کرہی کیا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ سوسائٹی کے سامنے عارضی
طور پر سرِ تسلیم خم کردوں۔ اگر سماج نے مجھے اپنے جذبات مجروح کرنے پر زور
دیا تو میں نے بھی اطاعت کے پردے میں انتقام کی صورت نکالی۔
سماج بظاہر مجھے شکست دینے میں کامیاب ہوگئی۔ مگر میرے جذبات
پر قابو نہ پاسکی۔ میری زندگی صرف کملا کے لئے وقف ہوچکی ہے اس پر کسی
اور کا کیا حق ہے خواہ وہ برٹش پارلیمینٹ کی ممبر ہو یا جرمنی کی وزیر تعلیمات
مجھے یہ لالچ دیا گیا کہ وہ دولتمند ہے اور تعلیم یافتہ، اور حسین بھی ہے
ذرا غور تو کرو، یہ باتیں کتنی مضحکہ خیز ہیں۔ کیسے جاہل لوگ ہیں "کیا کیوپڈ"
کا تیر صرف دولتمندوں اور تعلیم یافتوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔
میں نے اس کو دیکھا بھی نہیں کہ وہ ہے کیسی؟ اور دیکھنے کی ضرورت
ہی کیا تھی؟ تم نے لکھا تھا کہ میں ایسا کروں گا تو ایک دوشیزہ پر ظلم ہوگا۔ میں
تم سے پوچھتا ہوں، یہ ظلم ہے کس کا؟ میرا یا سماج کا! اس بیکس دوشیزہ کی
زندگی کس نے تلخ کی، میں نے یا سماج نے؟
میں نے تو ہمیشہ مخالفت کی مگر سنتا کون تھا مجھے کملا سے محبت ہے
اور وہ میری مجازی "شریک حیات" ہے۔ اس لئے کہ ہم دونوں سماج کے ٹھکرائے
ہیں۔ میں نے آج اُس کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں اس فریب کا راز افشا
کر دیا ہے جو اسے سماج کی طرف سے دیا گیا ہے۔ میں نے صاف صاف اس کا
اظہار کر دیا ہے کہ میرے دل پر کسی دوسرے کی حکومت ہے۔ آخر میں یہ بھی لکھ
دیا ہے کہ وہ اس کا انتقام سماج سے لے لے۔ میں نے اسے کامیابی کی بھی امید
دلائی ہے وہ یقیناً میرے حکم کی تعمیل کرے گی۔ میں نے اسے بتا دیا ہے اور اس راز
سے آگاہ کر دیا ہے کہ عورت کا انتقام بہت زیادہ ہولناک ہوتا ہے اور خصوصاً
اس وقت جب وہ اپنے آنسوؤں کی آخری حد تک پہونچ جاتی ہے اور
اس وقت وہ ایسی شیرنی کی طرح ہو جاتی ہے جس کا بچہ اس کے سامنے
مردہ پڑا ہو اور قاتل بھی اس کے سامنے ہو۔
میں جانتا ہوں اور عورت کی کمزور فطرت سے اچھی طرح واقف
ہوں۔ وہ میرا خط پڑھ کر بہت روئیگی۔ یہاں تک کہ اسکی ہچکیاں بندھ جائنگی
اور عجب نہیں کہ کسی ہچکی کے ساتھ اس کی روح بھی دھوکے میں باہر نکل آئے۔
تم میرا یہ خط پڑھ کر ہنس دوگے اور کہوگے پاگل ہوگیا ہے۔ ہاں تمہارا
خیال صحیح ہوگا۔ میں بالکل پاگل ہوگیا ہوں۔ لیکن پاگل کس نے بنایا ہے
صرف تم نے اور تمہاری سماج نے!
ناکام محبت تمہارا مہیش،

—— ۴ ——

پیارے گوپال!
آج کملا کو مرے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہوگیا، آہ، میری آسمانی تتلی
جس کے ہاتھوں میں نے اپنی قسمت بیچ دی تھی، ہاں ہاں، وہی گلاب کی
نوخیز کلی جو ہمیشہ میرے مشام تخیل کو معطر رکھتی تھی، وہی سرخ رنگ کی
حسین دوشیزہ جس کو میں نے ندی کی لہروں سے چھینا تھا۔ آہ چلی گئی،۔۔
اپنی اصلی دنیا میں ——،
اب مجھے اس دنیا سے کیا دلچسپی ہے، اُف، کتنا ہوشربا سانحہ
ہوا ہے۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے اس سے محبت بھی کی اور نفرت
بھی۔ میں نے اسے چاہا بھی اور دھتکارا بھی۔ اور آہ، وہ میری روح کی مالک
ہونے کے باوجود میرے لئے اجنبی بنی رہی۔
اُف! محبت کا کتنا تلخ حزین ڈرامہ ہے، اور میں کس طرح کامران
محبت بن کے ناکام محبت رہا ہوں، بالکل اس طرح جیسے کالی کالی گھٹائیں
آئیں، بجلیاں چمکیں اور بارش نہ ہو۔
آہ! اس کی حسرتناک موت! وہ ایک غنچہ ناشگفتہ تھی جس سے میں نے
محبت کی اور پھر توڑ کر آگ میں جھونک دیا۔ تمہارا خیال صحیح ہے گوپال میں
پاگل ہوں اور بالکل دیوانہ،
آج آٹھ روز ہوئے مکان سے تار آیا۔ لکھا تھا جلد آؤ، تمہاری
بیوی گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہے۔ میں گھر پہونچا تو تمام لوگ پریشان تھے
اور اندر سے باہر تک ایک مسلسل آمد و رفت جاری تھی۔ اس وقت اس
کی حالت بہت زیادہ نازک ہوگئی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہونچا تو وہ
بستر پر خاموش پڑی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر چادر ڈال دی گئی تھی۔
میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا —— بٹھا دیا گیا۔ اور چہرے سے
چادر ہٹا دی گئی —— میں حیرت میں پڑ گیا، وہ کملا تھی، وہی آسمانی تتلی
—— میری زندگی کا سہارا، لیکن آہ! اس کا سرخ چہرہ زرد ہوچکا تھا
اور اس میں اب ایک مسلے ہوئے پھول سے زیادہ دلکشی نہ تھی۔
میں نے بیتابانہ اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں

کھُل گئیں اور وہ مجھے ایک دم توڑتی ہوئی ہرنی کی طرح حیرت سے دیکھنے لگی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور لبوں پر تبسم کی لہریں دوڑنے لگیں اس نے اپنی نازک اور گوری گوری بانہیں میری گردن میں ڈالدیں مگر آہ! یہ سین بہت جلد ختم ہوگیا —— وہ میری آغوش میں سرد ہوگئی اور ہمیشہ کیلئے خاموش

دنیا سچ کہتی ہے، میں گنہگار ہوں۔ بہت بڑا گنہگار، اور مجھے کملا کی روح کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

میں آج پھر ندی کے کنارے جاؤنگا۔ جہاں پہلی بار اس سے ملا تھا اور ممکن نہیں کہ واپس آسکوں اس لئے پیارے گوپال اپنے برباد محبت نہیش کو بھول نہ جانا، اور جب کبھی محبت کے دو کھلاڑیوں کو دیکھنا تو مجھ پر حسرت کے دو آنسو ضرور بہالینا۔

برباد محبت، کملا کا گنہگار

نہیش

شام!

مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی ایم۔ اے۔ گولڈ میڈلسٹ

بادہ بنا ہے خونِ دل آنکھوں کے جام کیلئے
سوزِ الم جو شمع ہے، ہجر کی شام کیلئے

دن جو کٹا دکھائی دی، اپنے وطن کی سرزمیں
صبحِ الم ہوئی نثار، عیش کی شام کیلئے

آئے سمجھ میں کیا تمھیں تیرگیِ شبِ فراق
تم کو چراغِ رُخ ملا، زلف کی شام کیلئے

آیا شباب جوش پر، دل میں امنگیں کیوں نہوں
کتنے چراغ جل گئے، عیش کی شام کیلئے

وعدے کے وقت کی ہنسی کس لئے ہو نہ دلفریب
پھُول ہیں کتنے خوشنما، وصل کی شام کیلئے

سُرخیِ چشم ہے رسا، سوزِ غمِ فراق سے
پھُولی ہوئی ہے یا شفق، ہجر کی شام کیلئے

نغمۂ مایوس

ڈھلے ہوئے آسمان پر جب ابر کے چھوٹے چھوٹے زنگار رنگ کے ٹکڑے افق کی گود میں کھیلتے ہیں۔ ہوا کے سحر طراز جھونکے انھیں مختلف شکلوں میں تبدیل کرتے ہیں اور جب ان فانی بادلوں کا سنہرا اور بھورا رنگ طلسم نگاہ بن کر فطرت کی ہمہ رنگیوں کو بے نقاب کرتا ہے تو ——

اس وقت میں تمھارے جام محبت کے نشے سی سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

—— مگر افسوس تم نہیں آتے ——

دریا کی بیتاب لہریں جب کسی کی یاد میں مضطرب ہو کر ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، ریگستان کے ذرے جب کسی کے خیال میں بگولوں کی شکل میں فلک سے سرگوشیاں کرتے ہوئے اٹھتے ہیں اور جب نظر فریب آبشار پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے پگھلی ہوئی چاندی کی طرح نشیب میں گرتے ہیں تو ——

اس وقت میں تمھارے جام محبت کے نشے سی سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

—— مگر افسوس تم نہیں آتے ——

جب غروب ہونے والا آفتاب کسی کے حسن بے بنیاد کی طرح ڈھلتا نظر آتا ہے اور اس کی ضوفشاں کرنیں سطح سمندر پر پڑ کر منعکس ہونے لگتی ہیں اور جب شفق کی سرخی تمام کوہ و دشت کو لالہ زار بنائے ہوئے ہوتی ہے تو ——

اس وقت میں تمھارے جام محبت کے نشے سی سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

—— مگر افسوس تم نہیں آتے ——

جب سمندر کی زریں لہروں کا اوج مرکز نگاہ بن جاتا ہے اور رنگ شفق کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگتا ہے، جب چرخ نیلوفری اور سمندر کی بسیط سطح میں تاریکی کی وجہ سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور ظلمت نور کے لئے مضطرب نظر آتی ہے تو ——

اس وقت میں تمھارے جام محبت کے نشے سی سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

—— مگر افسوس تم نہیں آتے ——

جب لیلائے شب کی زلف مسلسل منتشر ہو کر تمام کائنات پر چھا جاتی ہے جب نیلگوں آسمان کے ضوفشاں اختر جگمگ جگمگ کر کے بزم ہستی کو روشن کرتے ہیں اور دنیا نیند کی گرم آغوش میں بے خبر ہو جاتی ہے تو ——

اس وقت میں تمھارے جام محبت کے نشے سی سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں

مگر افسوس تم نہیں آتے

جب ماہتاب عالم تاب اپنی پیہم ضیا باریوں سے محفل شب کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے اور اسکی زریں شعاعیں زخم دل پر نشتر کا کام کرتی ہیں اور پہلو میں ایک ٹیس اٹھتی ہے تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

فضائے کائنات جب عالم سکوت میں ملبوس ہوتی ہے اور فلک اخضری پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوتی ہیں جب مہ نو ابر کے پردوں میں سے ڈرتا ڈرتا شعاعوں کی چلمنیں ہٹاتا ہوا جلوہ افگن ہوتا ہے اور اپنے حسن کی جھلک دکھا کر ہر ایک کو حیران کر دیتا ہے تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

رات خاموش رات میں جب بزم فلک آراستہ ہوتی ہے اور شاہدان فطرت رشتہ محبت میں منسلک ہو کر اپنی کشش محبت کا تماشا دکھاتے ہیں جب نور افشاں تاروں کا نظارہ آنکھوں کو خیرہ کئے ہوتا ہے اور سبک پیہم بوسوں سے پتیوں میں ارتعاش انگیز کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

جب صبائے آہستہ خرام کیف آور اور عطر آگیں خوشبوؤں سے مشام جان کو معطر کئے ہوتی ہے اور طائران سحری اپنے اپنے کاشانوں میں بیٹھے راز و نیاز کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو دار لپٹ چشمۂ محبت میں مد و جزر کا سماں پیدا کر دیتی ہے تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

جب اختر ضو فشاں آسمان کی منور قندیلیں تمام رات خاموش کائنات پر مسلسل ضیا پاشی کرتے کرتے تھک جاتی ہیں اور ان کی خمار آلود آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں اور جب نسیم صبح زائی اپنی نزہت بخش تازگی سے مردہ دلوں میں حیات تازہ بخشتی ہے تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

جب شفق پھپھی دلہن کو لال جوڑا پہنا چکی ہوتی ہے اور جب عنادل اپنی سوختہ جگری کے جگر پاش افسانے سنا سنا کر دردناک اور دل سوز لہجہ میں فریاد کناں ہوتی ہے تو میرا ننھا اور کمزور دل اس کی جگر پاش صداؤں سے پاش پاش ہو جاتا ہے تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

ملکہ سحر جب نور کی رتھ میں سوار ہو کر اپنی لازوال دولت بانٹتی ہوئی نکلتی ہے اور مشرق میں نور کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوتے ہیں اور جب بادصبا سے صبح کی آمد کا سندیسہ سن کر درخت فرط مسرت سے جھومنے لگتے ہیں تو
اس وقت میں تمہارے جام محبت کے نشے سے سرشار ہو کر تم کو یاد کرتی ہوں
مگر افسوس تم نہیں آتے

(طبعزاد)

علی احمد، فرزند نواب فصاحت جنگ بہادر

ایثار

جنابہ محترمہ صادقہ بیگم صاحبہ

ڈاکٹر نے ریاض کو کامل دلچسپی اور انہماک سے دیکھا، اس کو اطمینان دلایا اور تیمارداروں کو ضروری تدابیر بتا کر واپس چلا گیا مگر اس کی نظریں اس کے تاثرات قلبی کی غماری کر رہی تھیں کہ وہ مریض کے متعلق مایوس ہو چکا ہے۔ چند سکنڈ کا وقفہ گذرا تھا کہ ریاض نے ہچکیاں لیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ یوں تو وابستگان دامن میں سے سبھی کو جو قلق ہوا وہ ہوا مگر ناصر جس کو اگرچہ بھتیجا تھا لیکن لڑکے سے زیادہ پیارا اور جس کی آئندہ کامیابی کا مدار ریاض کی زندگی پر تھا بیحد متاثر تھا۔ ریاض کی آرزو تھی کہ وہ ناصر کو ایک وکیل کی حیثیت سے دیکھے اور اپنی اکلوتی لڑکی صفیہ کو رشتہ ازدواج کے ذریعہ اس سے منسلک کر دے لیکن آہ، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ریاض کی وفات نے ان زریں توقعات کو بھی پامال کر دیا۔ ناصر کے والدین جب وہ صرف ۷ سال کا تھا طاعون کی نذر ہو چکے تھے مگر اس کو آج تک، ریاض کی شفقتوں کی وجہ سے اس کا احساس نہیں ہوا تھا البتہ آج اس کو معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یتیم ہو گیا ہے۔

ریاض بریلی کے ایک شریف خاندان کا فرد تھا۔ سو روپیہ جو اس کو بطور پنشن ملتے تھے اس کی مالی ضروریات کے کفیل تھے مگر اس کی اچانک موت کیا ہوئی گویا گھر سے برکت بھی اٹھ گئی۔ ناصر کی بھی تمنا تھی کم از کم گریجویٹ ہو جائے مگر اب اس کے ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ اس سانحے سے اس کی شگفتگی مزاج اور جادو بیانی جو احباب کی گرویدگی کا سبب تھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کو اپنا مستقبل تاریک معلوم ہوتا تھا اور اس پر تنہائی مستزاد البتہ صفیہ اس کی مونس تنہائی ہونے کا فخر حاصل کر رہی تھی وہ بریلی کے زنانہ اسکول کی طالبہ تھی اور ذہین ہونے کے ساتھ دولت حسن سے بھی بہرہ یاب تھی، جیسے جیسے وقت گذرتا گیا ناصر کی گرویدگی بڑھتی گئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی تمناؤں کا مرکز صرف صفیہ ہے۔ اس کی ایک جھلک ناصر کو تھوڑی دیر کیلئے تمام کلفتوں سے آزاد کر دیتی تھی۔ مگر سادہ دل صفیہ کو اس والہانہ شیفتگی کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ ایک الھڑ لڑکی تھی جس نے عمر کی صرف چودہ بہاریں دیکھی تھیں۔ صفیہ کی والدہ زاہدہ کا اب واحد مشغلہ عبادت تھا۔ وہ مالک حقیقی سے اپنے محبوب شوہر کی روح کو سکون کے لئے دعا مانگا کرتی تھیں اور ان کو دنیا اور دنیا والوں سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔

ریاض کی موت کو بھی ایک سال گذر گیا۔ ناصر کی بیکاری اس کے لئے انتہائی صبر آزما تھی مگر وہ مجبور تھا۔ بیحد تلاش کے باوجود اس کو کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوا اسی قسم کے خیالات میں محو تھا کہ یکایک اس کے دوست راشد نے آ کر اس تسلسل کو توڑ دیا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد راشد نے موضوع گفتگو بدلا۔

"تمہاری افسردگی حد سے زیادہ ہو گئی اور اسکی وجہ تمہاری بیکاری ہے۔"

"تشخیص تو معقول ہے۔" ناصر نے کسیقدر ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا اچھا ہو اگر کوئی نسخہ بھی تجویز کر دو۔"

"نسخہ یہی ہے کہ تم اپنی تعلیم جاری کر دو۔"

"عزیز دوست، تم کو میری دشواریوں کا شاید علم نہیں ہے۔" ناصر نے اپنے چہرہ کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھکو علم ہے۔ مگر میں تمہاری ہر طرح کی اعانت کیلئے تیار ہوں۔"

"شکریہ، مجھکو ایسی ہی توقع ہے۔ میں اس کا قطعی جواب کل دیسکونگا۔"

کچھ عرصہ بیٹھنے کے بعد راشد رخصت ہو کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ناصر کو رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ وہ صفیہ کو کیونکر جدا کر سکے گا۔ اس کو اسکول تک پہونچانے کون جایا کریگا۔ اس کی دلجوئی کی کس کو پروا ہوگی؛ کیا وہ خود اس کی اجازت دیدیگی کہ میں اس کو چھوڑ کر علی گڈھ

چلا جاؤں! شاید ایسا نہ ہو، آہ! میں اس کے عارضی فراق کو بھی برداشت کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتا۔ انھیں خیالات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ رونے لگا۔ مستقبل کے متعلق تصورات، ادھر صفیہ کی محبت، ناصر کچھ نہ طے کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ وہ رات بھر ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ صبح کو بھی وہی سوال اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

ناصر کو پژمردہ اور نڈھال دیکھ کر زاہدہ نے اس کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور اس سے کبیدگی خاطر کا سبب پوچھا۔ ناصر نے اول اول تو کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا مگر چچی کا اصرار اس کے انکار پر غالب آیا۔ اور اس نے راشد کی گذشتہ روز کی گفتگو کا تذکرہ کر دیا۔

"بیٹا! اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کو تو تمھارا ابھی جی چاہا کرتا ہے۔ یہی تو تمھارے چچا کی بھی خواہش تھی۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آ رہا ہے تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا کون سی عقلمندی ہے پھر یہ کہ علی گڈھ کچھ دور نہیں ہے۔"

مجھکو اپنے سے زیادہ آپ لوگوں کی تنہائی کا خیال ہے۔" ناصر نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے، لیکن میرے خیال میں تم اس بات کو ترجیح دو۔" زاہدہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

اب ناصر نے زیادہ کچھ کہنا لاحاصل سمجھا اور بلاشبہ ایک حقیقی بہی خواہ سے اس طرح کی رائے کے علاوہ اور کسی مشورہ کی امید غلطی ہے۔ صفیہ خود دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے بھی تمام گفتگو کو سنا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی عزیز ترین چیز اس سے چھینی جا رہی ہے۔ اس پر ناصر کی جدائی غیر ارادی طور پر شاق گذر رہی تھی وہ خود یہ نہ سمجھ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ اس نے بڑی جرأت سے کام لیکر کہا۔ "بھائی صاحب! کیا آپ نے مجھ کو تنہا چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا ہے؟"

ناصر اس کے اس سوال پر تڑپ گیا مگر خاموشی ہی کو بہترین جواب سمجھا۔

شام کو راشد پھر اس سے ملنے آیا۔ بڑی ردوکد کے بعد ناصر کو بادل ناخواستہ اپنی رضامندی کا اظہار کرنا پڑا۔ راشد نے اس کو یقین دلایا کہ وہ صفیہ کا بھی ہر طرح خیال رکھیگا۔ اور اس کی آزردگی گوارا نہ کریگا۔

جون کا مہینہ ختم ہونے کو آیا۔ ناصر کا اضطراب اور بڑھ گیا وہ رات کے وقت صحن میں تنہا بیٹھا ہوا نہ معلوم کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ کبھی اس کو خیالات راشد سے بدگمان کرتے اور وہ سوچنے لگتا تھا کہ مجھ کو فریب دیا جا رہا ہے مگر پھر وہ یہ بھی خیال کرنے لگتا تھا کہ آخر اس کے پاس اس بدگمانی کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ کبھی اس کو صفیہ کی تنہائی اذیت دہ معلوم ہوتی اور وہ سوچنے لگتا کہ ہر چہ بادا باد میں اس کو نہ چھوڑوں گا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نامعلوم قوت اس کو اس سے جدا کر رہی ہے۔ وہ انھیں خیالات کی رو میں بہہ رہا تھا کہ اس کے کان میں صفیہ کی مترنم آواز آئی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو صفیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"آپ کو کل علی گڈھ جانا ہے، جا کر سو رہیے!"

ناصر نے صفیہ کی طرف حسرتناک نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "میں اپنی کور بختی کا ماتم کر رہا ہوں، سکون ہی اگر قسمت میں ہوتا تو اس طرح تنہا اس آزمائش گاہ میں نہ چھوڑ دیا جاتا۔"

"ناصر بھائی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمت اور استقلال سے کام لیجیئے، خدا ہماری مدد کریگا۔"

ناصر نے کسی قدر سکوت کے بعد کہا۔ "صفیہ! میرا دل خود بخود بیٹھا جا رہا ہے۔ تم سے جدا ہونا بیحد تکلیف دہ ہے۔ اچھا یہ تو کہو، کیا تم مجھ کو اپنے نازک دل کے کسی گوشے میں جگہ دوگی؟"

یہ کہتے کہتے ناصر نے صفیہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ صفیہ کے بدن میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ وہ سیماب وار تڑپ گئی۔ مگر فطری حجاب نے اس سے جرأت کلام چھین لی۔ آج اس کو جذبۂ الفت کا تجربہ ہوا۔ ناصر نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ تم مجھ کو آئندہ بھائی صاحب وغیرہ ناموں سے مخاطب کرنے کے بجائے میرے نام سے مخاطب کیا کرو۔ یہی میری آرزو ہے۔" صفیہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی نظروں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو زبان نہ کہہ سکتی تھی۔

بالکل اچانک چچی کی آمد کی وجہ سے یہ صحبت ختم ہو گئی۔ ناصر نے صفیہ کو غور سے دیکھا اور ایک آہ زیر لبی کے ساتھ جا کر لیٹ رہا۔

ناصر علی گڈھ جا چکا ہے۔ راشد نے ہر طرح صفیہ کی دلچسپی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ ہر طرح اس کو خوش رکھنے کا ساعی رہتا تھا۔ اول اول تو صفیہ کو حجاب رہا اور وہ بے تکلف نہ ہو سکی مگر رفتہ رفتہ اس کی جھجک دور ہو گئی اور گفتگو میں "آپ" کی جگہ "تم" نے لیلی۔ چونکہ زاہدہ بھی اپنی لڑکی کو ہمیشہ خوش دیکھنے کی آرزومند رہتی تھی اور اس کے پاس کوئی وجہ راشد سے بدظن ہونے کی بھی نہ تھی اس لئے وہ اس اختلاط میں مانع نہ ہوئی۔ سادہ دل صفیہ راشد کی دعوت محبت کو جس کی پیام رسانی کا ذریعہ اس کی آنکھیں تھیں نہ سمجھ سکتی تھی۔ راشد بھی انیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کی تعلیم صرف انٹرنس تک تھی مگر ایک متمول باپ کا بیٹا تھا۔ جائداد اور زمینداری سے اس کو کافی آمدنی تھی۔ اس کے والد کو باغات لگوانے میں بہت دلچسپی تھی چنانچہ اس کے مکان سے متصل بھی ایک خوشنما باغ تھا۔

صفیہ جب کبھی راشد کے یہاں آتی تو اس کی ہر چیز کو بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی اور دل ہی دل میں اس کے ذوق کی داد دیا کرتی تھی۔ گاہ گاہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش یہ چیزیں میری ملکیت ہوتیں صفیہ کو رفتہ رفتہ موسیقی سے بھی دلچسپی ہو گئی اور اب راشد کو زیادہ موقع مل گیا کہ وہ اپنا درد دل گا کر بھی اس کو سنا سکتا تھا۔ وہ موسیقی کے مسحور کن اثر سے بیگانہ نہ تھا۔ اگرچہ صفیہ نہیں چاہتی تھی کہ راشد اس کے تخیلات پر چھا جائے مگر وہ مجبور تھی۔ راشد کے تحائف جو بیش قیمت ہونے کے علاوہ اس کے اعلیٰ ذوق کے شاہد ہوتے تھے صفیہ کو بے اختیار اس کی تعریف پر مجبور کرتے تھے۔ راشد کو ناصر کی عسرت کی بنا پر اپنی کامیابی صاف نظر آ رہی تھی۔ اب صفیہ کا الھڑپن متانت سے بدلنے لگا وہ بھی نشیب و فراز سمجھنے کے قابل ہو گئی۔ وہ اب سوچنے لگی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ناصر بھائی اس کو راشد سے منسلک کر دینگے۔

ایک روز صفیہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی ناصر کا خط پڑھ رہی تھی کہ اتفاق سے راشد بھی آ گیا۔ اس کے استفسار پر صفیہ نے خط اس کو دیکر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ناصر بھائی دسمبر کی تعطیلات میں آ رہے ہیں!"

راشد کا چہرہ یکایک متغیر ہو گیا مگر اس نے اس قلبی انتشار کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کو تو بڑی مسرت ہو گی کیونکہ آپ کے منگیتر تشریف لا رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی صفیہ کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہو گئی۔ "ہاں مجھ کو خوشی ضرور ہے جیساکہ ایک بہن کو خوش ہونا چاہیئے۔ رہا شادی کا معاملہ اس میں میں خود کو آزاد سمجھتی ہوں، اس کے متعلق جو کچھ آپ نے سمجھا ہے وہ آپکا حسن ظن ہے میں تو جناب کی سمجھ کی زیادہ داد نہیں دیسکتی۔"

راشد، صفیہ کے اس جواب سے کچھ شرمندہ ہوا اور اس نے کہا "لیجئے آپ تو ہنسی کی بات میں ناراض ہو گئیں، اچھا معاف کردو۔" چلتے وقت راشد نے صفیہ سے فراموش نہ کرنے کی التجا کی مگر صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

(۲)

ٹرین آئی اور رک گئی، مسافروں کی سراسیمگی، قلیوں کی چیخ پکار سے تھوڑی دیر کے لئے جو ہنگامہ اسٹیشن پر برپا ہو جاتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہماری نظریں ایک عرصہ دراز کے بعد آج پھر ناصر کو بریلی کے اسٹیشن پر دیکھ رہی ہیں۔ وہ نہایت تیزی سے اسٹیشن سے باہر نکل جانے کیلئے لمبے قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ تانگوں کے قریب پہونچا کہ یکہ بانوں اور تانگہ والوں کے بے پناہ اور مسلسل سوالات کا نشانہ بن گیا۔ آخر ایک تانگہ میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ تمام راستہ اس نے نہایت بیتابی کے ساتھ کاٹا۔ وہ متوقع تھا کہ صفیہ دروازے پر اس کی منتظر ملیگی۔ مگر گھر پہونچکر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ راشد کے ساتھ تفریح کیلئے جاچکی ہے تو اس کی دل شکستگی کا عجیب عالم تھا چند منٹ کے بعد صفیہ اور راشد بھی آگئے۔ دونوں نے نہایت گرمجوشی سے ناصر کو خوش آمدید کہا اور رسمی مزاج پرسی کے بعد بیٹھ گئے۔ صفیہ نے کہا۔ "آپ کی آج کی آمد بالکل اچانک ہوئی۔" ناصر نے اس پر لطف صحبت کو شکوے شکایت کی تلخیوں سے بدمزہ کرنا نہ چاہا بلکہ صرف "بجا فرماتی ہیں" کہہ کر موضوع کلام کو بدل دیا۔ راشد کچھ دیر باتیں کرکے چلا گیا۔ کھانے سے فرصت پاکر ناصر نے صفیہ کو ایک نفیس ساری اور ایک خوشنما گھڑی پیش کی جس کو اس نے اظہار ممنونیت کے بعد لے لیا۔

ایام تعطیلات گوناگوں مشاغل میں ختم ہو گئے۔ ناصر کو صفیہ کے متعلق کافی تجربات حاصل ہوئے اس نے بارہا چاہا کہ صفیہ کے متعلق سخت تنقید کرے مگر اس کی علو ہمتی نے اس کی اجازت نہ دی کہ وہ صفیہ کے دل کو الفاظ کے نشتروں سے چھیڑے

آخر ایک دن وہ مردانہ عزم کے ساتھ علیگڑھ روانہ ہو گیا روانگی کے وقت وہ دونوں سے نہایت اخلاق کے ساتھ ملا اور نامہ و پیام کے وعدے اور عنایتوں کے شکریئے کی فرسودہ رسم کو بھی ادا کیا۔ علیگڈھ پہونچکر وہ اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کر رہا تھا اب وہ رومانیت کو ایک مہلک مرض سمجھنے لگا تھا اس کا دماغ اخلاقیات کے دقیق مسائل کو سلجھانے کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا نے اپنے زعم باطل کی وجہ سے ظاہری نمائش کو حقیقت سمجھ لیا ہے اس نے خوب سمجھ لیا تھا کہ اب دولت ہی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔

موسم سرما اپنے شباب پر تھا۔ زاہدہ امکانی احتیاط کے باوجود نمونیہ کا شکار ہو گئی۔ حملہ شدید ہوا اس پر تقاضائے سن، دیکھتے ہی دیکھتے حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر بھی آیا۔

مگر فطرت مسکرا رہی تھی۔ ناصر کو بھی تار سے اطلاع دیدی گئی۔ زاہدہ خود مایوس ہو چکی تھی اس پر خیالات کا ہجوم، اس کے منہ سے بیساختہ چیخ نکل گئی۔ راشد نے اطمینان دلایا۔ صفیہ نے یہ کیفیت دیکھی تو ماں سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی۔ "پیاری امی مجھے تنہا نہ چھوڑیئے۔ آہ، آپ بھی مجھ سے خفا ہو گئیں" زاہدہ نے آنکھیں کھولیں اور بہت ہی نحیف آواز میں کہا۔ "بیٹا راشد سب سے پہلے میں تمہارے احسانات کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ خدا تم کو بامراد کرے۔ میری پیاری بیٹی صفیہ رنجیدہ نہ ہو مشیت ربانی میں کسی کو دخل نہیں۔ دیکھو اپنے ناصر بھائی کا خیال کرنا افسوس میں اس کو نہ دیکھ سکی۔ اچھا خدا تمھارا محا . . . ف . . . ظ ہے" کہتے کہتے اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں اور وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ صفیہ دیوانوں کی طرح ہر ایک کا منہ تک رہی تھی مگر وفور غم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے کہ ناصر بھی آپہونچ گیا۔ صفیہ نے ناصر کو دیکھا تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ناصر نے صبر کی تلقین کی مگر مرحومہ کے قدموں پر گر کر خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ واقعات پلٹنے ہوتے گئے۔ ناصر نے صفیہ کو برجیس کے جو اس کی رشتہ کی بہن تھی حوالے کیا اور ہر طرح صابر و شاکر رہنے کی نصیحت کی اور تعلیم جاری رکھنے پر زور دیا۔ اس کے بعد وہ پھر علیگڈہ چلا گیا۔

رفتہ رفتہ پھر وہی راشد تھا اور وہی صفیہ۔ محبت کی پینگیں بڑھ رہی تھیں۔ صفیہ کو محسوس ہونے لگا کہ اس کو راشد سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے اس کو اکثر اپنے اس فعل پر شرم بھی آتی تھی مگر مجبور تھی اس کو اپنی کمزوری کا امتحان اس وقت ہوا جبکہ اتفاق سے دو تین روز تک نہ وہ خود راشد سے مل سکی اور نہ راشد ہی آسکا۔ اس کے لئے راشد کی جدائی کا ہر لمحہ مضطرب کن تھا۔ وہ ایک پوشیدہ قوت کے ماتحت اس کی طرف کھینچی جاتی تھی وہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی واقعات پر نظر ثانی کر رہی تھی اور اس درجہ کھوئی ہوئی تھی کہ اس کو راشد کی آمد کا علم تک نہ ہوا۔ راشد نے اس سے پہلے کبھی صفیہ کو اس طرح سکون سے بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ آج اس کو صفیہ ایک مرمریں مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے رخسار کی تابش سے چاند کسب نور کر رہا تھا۔ یکایک اس نے دیکھا کہ صفیہ رو رہی ہے۔ اب راشد کے لئے ضبط کرنا محال تھا اور اس نے صفیہ کو گدگدا دیا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ اچھل پڑی مگر راشد کو کھڑا ہوا دیکھ کر محجوب ہو گئی۔

"خدا کے لئے اب رونا بند کرو"۔ راشد نے کہا۔

"کیا میں رو رہی ہوں، آپ بھی بڑے پرلطف آدمی ہیں"۔

"معاف کیجئے گا، آپ صرف رونے کی مشق کر رہی تھیں"۔

"اچھا خیر جانے دیجئے ان باتوں کو۔ یہ تو کہئے آج آپکو فرصت ملگئی"

"مجھے اگر فرصت نہ تھی تو آپ کو تو تھی"۔ راشد نے کسی قدر شوخی سے کہا۔

"مجھ کو بھی چند وجوہ نے معذور رکھا"۔

"آہ، صفیہ۔ تم کو میری محبت کا کوئی احساس نہیں۔ میں نے کتنی راتیں تمھاری یاد میں تڑپ کر گذاری ہیں تم کو اس کا کوئی علم نہیں"۔

"تنہا آپ ہی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے بلکہ . . . . . ." اتنا کہہ کر صفیہ خاموش ہو گئی۔

رفتہ رفتہ چار سال گذر گئے اور وہ دن آگیا کہ ناصر بی۔ اے، کی ڈگری لیکر گھر واپس آیا۔ مگر افسوس آج کوئی نہ تھا جو اس کی محنت کی داد دیتا تھوڑی سی سعی کے بعد اسے وہیں ایک ملازمت ساٹھ روپیہ ماہانہ کی مل گئی، جب سے ناصر آیا تھا اس نے صفیہ اور راشد کو کچھ متوحش سا دیکھا تھا۔ وہ نہایت سکون کے ساتھ واقعات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی نظریں اکثر صفیہ سے پریم کی بھیک مانگتی تھیں مگر اس کی یہ التجا بارگاہ حسن میں قابل قبول نہ تھی اس کی ناامیدی حد سے بڑھ چکی تھی۔

صفیہ کی آزردگی کو برجیس نے بھی تاڑ لیا اور ایک روز بہت بضد ہو کر معاملات پوچھے صفیہ نے پہلے تو اس کو ٹالنا چاہا مگر آخر مجبوراً اس کو اپنا راز کہدینا پڑا ناصر نے بھی وہ سب کچھ سن لیا۔ اب ناصر کیلئے کوئی وجہ راشد اور صفیہ کی شادی کیلئے مانع نہ تھی۔ دوسرے دن صبح ہی ناصر راشد کے مکان پر گیا۔ راشد اس کے اس طرح اچانک آجانے سے گھبرا سا گیا اور اس نے پوچھا کہئے خیریت تو ہے؟ جس کا جواب ناصر نے اثبات میں دیا۔ راشد کے سوال پر کہ اس قدر صبح صبح تکلیف کرنے کی کیا وجہ ہے ناصر نے کہنا شروع کیا۔ "راشد تمہارے احسانات مجھ پر اس قدر زیادہ ہیں کہ میں ان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ تم نے میری اب تک اعانت کی۔ آج میں آخری اعانت کیلئے تمھارے پاس آیا ہو

اور امید ہے تم اس کو رد نہ کرو گے۔ وہ اعانت یہ ہے کہ تم صفیہ کو اپنا بنا لو۔ اس کے لئے میں تمہارے بزرگوں سے بھی طے کر لوں گا۔" راشد حیرت سے ناصر کو دیکھ رہا تھا اور بالکل ساکت بیٹھا ہوا تھا۔

۱۱ اپریل کو ناصر نے صفیہ کو نہایت خوشی کے ساتھ راشد کے حوالے کر دیا اب ناصر کو اپنی زندگی وبال معلوم ہو رہی تھی۔ قریب مغرب ناصر راشد کے مکان پر پہنچا اور صفیہ کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ راشد بھی وہیں آگیا۔ اس نے راشد کا قرض جو اس پر تھا ادا کر دیا اس کے بعد ناصر نے کہا "میں خیال کر رہا ہوں کہ میری زندگی کا افسانہ بہترین طریق پر انجام پا رہا ہے کیونکہ میں نے تم دونوں کے احسانات کا حتی الوسع معاوضہ کر دیا ہے۔"

اس کے بعد وہ وہاں سے چل دیا۔ صفیہ نے ہر چند اس سے ٹھہرنے کیلئے کہا مگر وہ اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔

اس کے بعد کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ ناصر کہاں ہے؟

صادقہ بیگم،

لمعات

از نیّر امرتسری، بی۔ اے۔ بی۔ لِٹ

مجھکو آرام ہے بیگانۂ ارماں ہوکر — خوف لٹنے کا نہیں بے سروساماں ہوکر

ہم کو برباد کیا اوروں کی غمخواری نے — رازِ دل کھول دیا چشم نے گریاں ہوکر

حوصلہ رکھتے اگر ظلم پہ باندھی تھی کمر — آپ قاتل ہوئے مشہور پشیماں ہوکر

اللہ اللہ بُتِ کافر ترا احسانِ جمال — کیا پری زادے بنے بیٹھے ہو انساں ہوکر

میں نے پایا ہے تصوّر ترا کھو کر آنکھیں — گھر یہ آباد ہوا عشق میں ویراں ہوکر

انتہا یہ ہے محبّت میں مری وحشت کی — محمل آتا ہے نظر غولِ بیاباں ہوکر

اشک تھامے تھے کہ رہجائے کسی کا پردہ — کیا خبر تھی کہ اُٹھینگے یہی طوفاں ہوکر

کرکے اظہار ہوئے اُن کی نگاہوں میں ذلیل — دب گئے اور محبّت میں نمایاں ہوکر

اپنا انجام بھی معلوم ہے تم کو نیّرؔ!
سجدہ کرتے ہو بتوں کو جو مسلماں ہوکر

ہندوستان کا بے نظیر گویا

جناب قاضی محمد رمضان صاحب تبسّم گجراتی

تان سین جو ہندوستان کی دنیائے موسیقی میں عدیم النظیر شہرت کا مالک تھا سنہ ۱۵۳۱ء میں گوالیار میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مکرند پانڈے گوڑ برہمن خاندان سے تھا جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا ان دنوں گوالیار ہندوستان بھر میں موسیقی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ جہاں راجہ مان سنگھ نے موسیقی کا ایک بہت مشہور سکول قائم کر رکھا تھا۔

ایام طفلی میں تان سین اپنی عجیب و غریب قوت حافظہ اور نقّالی کا اکثر مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ وہ بمشکل آٹھ سال کا ہوگا کہ اس کے والد نے اسے شہر سے باہر اپنے آموں کے جھنڈ کی رکھوالی پر بٹھادیا۔ یہ آموں کا جھنڈ چاروں طرف سے گھنے جنگلوں میں گھرا ہوا تھا جن میں شیر اور دوسرے درندے بکثرت پائے جاتے تھے۔ رات کی تنہائی میں تان سین اکثر شیروں کی چنگھاڑیں سُنا کرتا تھا اور بے خوف ہوکر جواب میں شیروں سے زیادہ بلند آواز میں چنگھاڑتا۔ اس کی آواز سُن کر دیہات والے متعجب ہوتے اور جنگلی جانوروں کو بھی یہ آواز آموں کے جھنڈ سے دور رکھتی۔

اتفاق سے ایک دن سیلانی سادھوؤں کا ایک گروہ آموں کے جھنڈ کے پاس سے گذر رہا تھا۔ تان سین کی شیرانہ گرج سن کر تمام سادھوؤں پر خوف طاری ہوگیا۔ ایک سادھو جو دوسروں سے زیادہ دانشمند تھا جرأت کرکے آموں کے جھنڈ میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک دبلا پتلا لڑکا درختوں میں چھپا بیٹھا ہے جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ کون چنگھاڑ رہا تھا تو اس نے جواب میں اقرار کیا کہ یہ آواز کسی حیوانی شیر کی نہ تھی بلکہ ایک انسانی شیر کی تھی۔

یہ سادھو ہندوستان کا نامور گویا ہری داس تھا جس نے تان سین کی امکانی قوتوں کا فوراً اندازہ کرلیا۔ وہ تان سین کے والد کے پاس گیا اور اس سے اجازت لیکر اسے اپنے ہمراہ متھرا لے گیا اور اس ہونہار لڑکے کو موسیقی ایسے عظیم الشان آرٹ کی پیچیدگیوں سے واقفیت بہم پہنچائی۔

تان سین کا قدرتی رجحان اس طرف تھا۔ تھوڑے عرصے میں اس نے راگ پر قدرت حاصل کرلی اور علم موسیقی میں ماہر ہوگیا۔ چند سال کے بعد جب وہ وطن گیا تو اس کی شہرت اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ راجہ شمشیر سنگھ والی اجین نے اس کو درباری گویا کی اسامی پر نوکر رکھ لیا۔

تان سین کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی اور بہت سے بادشاہ اس کا شہرہ سن کر اس کوشش میں مصروف ہوگئے کہ کسی طرح، تان سین ان کے دربار کی زینت بن جائے۔ جب شہنشاہ اکبر اعظم نے تان سین کی موسیقی کا شہرہ سُنا تو اس نے راجہ کو لکھا کہ اسے شاہی دربار میں بھیجدیا جائے۔ پہلے تو وہ لیت و لعل کرتا رہا لیکن آخر کار شاہی دھمکیوں کے بعد اس نے تان سین کو دہلی بھیجدیا۔

کئی سال تک وہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں رہا اور مخصوص درباریوں میں اس کا شمار تھا۔ وہ خاص طور پر "شام کلیان" اور "کانڑی" راگوں کا شوقین تھا اور شہنشاہ بھی انھیں راگوں کی فرمائش تان سین سے کیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ اکبر نے تان سین سے پوچھا کہ ساری دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی علم موسیقی کا ماہر ہے؟ تان سین نے کہا اس وقت سوامی ہری داس فن موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ شہنشاہ نے سوامی کو اپنے دربار میں بلوانے کی خواہش کا اظہار کیا تو تان سین نے کہا کہ اس نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اور وہ شاہی احکام کی تعمیل سے بھی انکار کردیگا۔ اس خبر نے شہنشاہ کی خواہش کیلئے تازیانہ کا کام کیا اور تان سین کے استاد کو دیکھنے کیلئے وہ خود اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا۔ تان سین نے کہا کہ اگر سوامی کو اس بات کا علم ہوگیا کہ آپ شہنشاہ اعظم اکبر ہیں تو وہ

آپ کے سامنے گانے پر کبھی آمادہ ہوگا۔ بادشاہ نے نوکر کا بھیس بدلا۔ رات انھوں نے متھرا کی ایک سرائے میں بسر کی اور صبح سوامی کو دیکھنے کیلئے دریائے جمنا کے کنارے روانہ ہوگئے۔ سوامی صبح کی پاٹھ پوجا میں مشغول تھا اپنے چیلے کو دیکھ کر متعجب ہوا۔ جب ساتھی کے متعلق پوچھا تو تان سین نے کہا کہ وہ اس کی سارنگی اٹھانے والا نوکر ہے جب تان سین نے استاد سے کچھ گانے کی خواہش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اسکی طبیعت ابھی اس طرف مائل نہیں ہے۔

تان سین نے ایک نہایت دانشمندانہ چال چلی۔ وہ خود گانے لگا اور جان بوجھ کر چند ایک غلطیاں کیں جس پر سوامی خاموش نہ رہ سکا پہلے تو اس پر ناراض ہوا اور تنبیہہ کی۔ پھر خود صحیح راگ گایا۔ شہنشاہ سوامی کا گانا سن کر بہت خوش ہوا۔

جب گانے کے بعد تان سین نے شہنشاہ معظم کی اصلیت پر سوامی کو مطلع کیا تو وہ بڑی خاطر مدارات سے پیش آیا اکبر نے سوامی کو دربار میں لانے کی بہت کوشش کی ترغیب و تحریص سے کام لیا جاگیر کا وعدہ کیا مگر سوامی نے جانے پر رضامندی ظاہر کی اس کے بعد جب اکبر کو سوامی کے سُریلے اور شیریں راگ سننے کی خواہش ہوتی تو وہ بنفس نفیس اس کے پاس چلا جاتا۔

تان سین اس وقت تک فقید المثال موسیقی دان تسلیم کیا گیا ہے اور ہندوستانی موسیقی میں اسکی ایجادات استاد کا درجہ رکھتی ہیں اس کے متعلق ابو الفضل لکھتا ہے کہ گذشتہ ہزار سال میں اس کے پایہ کا گویا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ تان سین گوالیار میں دفن ہوا اسکی قبر پر ہر سال ایک عظیم الشان میلہ ہوتا ہے جس میں ہندوستان کے ہر گوشے سے بکثرت گویئے شامل ہوتے ہیں اسکی قبر پر ایک نیم کا درخت ہے جس کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے پتے کھانے سے خوش الحانی حاصل ہوتی ہے (ترجمہ از انگریزی)

مردِ کامل!

ایک مصری افسانہ جو خاص عالمگیر کیلئے عربی سے ترجمہ کیا گیا،

جناب مولوی عبدالحلیم صاحب ناظم دربھنگوی۔ مولوی فاضل

"کیا آپ ارواح اور انسانی سایوں کے مستقل وجود کو مانتے ہیں!"
عباس بک نے آتے ہی اپنے قدیمی دوست مصطفٰے پاشا سے کہا۔ وہ اپنے دوست کی ملاقات کو اس کے وسیع محل میں جو عباسیہ میں واقع تھا ہر روز صبح کو گیا کرتا تھا۔ آج آتے ہی اس نے ایسا سوال کیا کہ اس عجیب و غریب سوال نے مصطفٰے کو حیرت زدہ کر دیا انھوں نے کہا۔ "عباس صاحب آپ نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا؟"

عباس۔ میں نے آپ سے اس لئے پوچھا ہے کہ آج جبکہ میں آپ کے یہاں آرہا تھا ایک شخص کی صورت مجھے نظر پڑی جس کو میں خوب پہچانتا ہوں اور آپ مجھ سے بھی زیادہ اسے پہچانتے ہیں۔ وہ شخص وہی ہے جس کو مرے ہوئے کامل ایک سال گذر گیا ہے۔ لیکن آج اسے میں نے اپنی آنکھوں سے زندہ دیکھا ہے۔ میں اپنی موٹر میں بیٹھا ہوا عماد روڈ سے آرہا تھا۔ اس چوک پر جہاں یہ سڑک "فواد روڈ" سے ملتی ہے پولیس نے میری موٹر کو ذرا سا ٹھہرا لیا۔ تاکہ دوسری سڑک کی سواریاں گذر جائیں۔ گذرنے والی موٹروں میں ایک لمبی سی سبز موٹر بھی تھی۔ جس کو ایک جدید انگریزی کمپنی نے اپنی دوسری موٹروں کے ساتھ کرایہ پر جاری کیا ہے۔ یہ بڑی موٹر بالکل میرے سامنے سے گذری۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک ایسے شخص کو بیٹھے دیکھا جسے ہم لوگ ایک سال سے مردہ سمجھے ہوئے تھے لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ موٹر چلا رہا تھا۔ میں نے باوجود اس کے زرد رنگ کے گندے لباس کے جس کو "ڈرائیور" پہنا کرتے ہیں اس کی صورت اچھی طرح دیکھکر پہچان لی۔ قریب تھا کہ میں چیخ پڑتا اور اس سے اپنا تعلق بیان کرتا۔ لیکن وہ بڑی موٹر بہت سے لوگوں سے بھری ہوئی بڑی تیزی سے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے پیارے دوست! کیا آپ جانتے ہیں کہ کون شخص موٹر چلا رہا تھا؟

مصطفٰے۔ نہیں، بتلایئے وہ کون تھا؟

عباس۔ وہ آپ کا بیٹا منیب تھا۔

جونہی مصطفٰے نے اپنے دوست سے یہ جواب سنا اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور خوف و تحیر کی علامات چھا گئیں پھر وہ کانپتے ہوئے بولا "میرا بیٹا ....م ..میرا ...... میرا بیٹا، منیب؟"

عباس بک اس کے قریب آگیا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر سر ہلاتے ہوئے اور ٹھہر ٹھہر کر جواب دینا شروع کیا۔ "ہاں! مصطفٰے پاشا یہ آپ ہی کا بیٹا منیب مصطفٰے تھا۔ وہی جس کے متعلق تمام لوگوں کو گمان تھا کہ وہ سوڈان میں مر گیا۔ اور صرف اسی وجہ سے کہ ہم سے اس کے حالات واخبار کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ہاں ہاں وہی بیٹا جس کی معمولی تلاش کے بعد آپ نے ہمیں خبر دی کہ وہ مر گیا اور اس کی موت کی خبر اچھی طرح تحقیق کر لی گئی ہے۔ مجھ سے آپنے یہ بھی کہا تھا کہ اب تم جہاں چاہو اپنی لڑکی قاسمہ کی شادی کر لو کیونکہ منیب جس سے وہ منسوب تھی اس جہان سے چل بسا۔

مصطفٰے۔ لیکن آپنے یہ کس طرح تحقیق کر لیا کہ وہ منیب ہی تھا؟

عباس۔ ہاں میں نے اچھی طرح تحقیق کر لی ہے۔ سنتے رہئے۔ میں انگریزی کمپنی کی لاری دیکھ کر اسی وقت کمپنی میں گیا اور پوچھا کہ کیا اس کمپنی میں کوئی شخص منیب مصطفٰے نامی بھی کام کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے رجسٹر دیکھ کر مجھے بتایا کہ اس نام کا ایک نوجوان ڈرائیوری کی جگہ پر ابھی نیا مقرر کیا گیا ہے جس کی تنخواہ ۱۵ گنی ماہوار ہے انھوں نے مجھ کو اس کا موجودہ پتہ بھی دیدیا ہے۔" مصطفٰے نے اپنا سر اٹھایا اس پر رنج و غضب کے آثار بھی نمایاں تھے اس نے غصہ سے پوچھا۔

مصطفےٰ - پتہ حاصل کرنے کی کوشش آپنے کیوں کی؟

عباس - تاکہ اس کا پتہ آپ کو دیدوں۔

مصطفےٰ - میں پتہ لے کر کیا کروں گا؟

عباس - آپ اسے دیکھنے کیلئے جائینگے .... اپنے بیٹے کو...

مصطفےٰ - وہ میرا لڑکا نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ گذشتہ سال مر گیا تو میں نے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسکی رسوائیوں اور شرمناک افعال سے مجھے نجات دیکر آرام پہونچایا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ دوسری مرتبہ زندہ ہو کر پھر میری زندگی تلخ کر دے۔ چھوڑیئے آپ نے جو کچھ دیکھا ہے جانے دیجئے!

عباس - اس نے کون سا ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے آپ اس قدر عتاب کر رہے ہیں؟ اور شفقت پدرانہ سے اپنے سینہ کو خالی کئے ہوئے ہیں۔

مصطفےٰ - اس نے جو کچھ کیا ہے سب آپ کو معلوم ہے، آپ جانتے ہیں میں نے اس کو پالا اس پر پورا خرچ کیا۔ وہ تعلیم سے حد درجہ نفرت کرتا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے گھر میں اس کے لئے مدرس کا انتظام کیا لیکن اس پر بھی وہ فلاح کو نہ پہونچا اور امتحان میں کہیں چھپ جاتا اور شریک نہ ہوتا۔ آخر کار مجھ پر اس کی نفرت کا راز ظاہر ہو گیا۔ یعنی وہ اپنے اسباق سے غافل ہو کر مختلف برائیوں اور متعدد لہو ولعب میں پھنس گیا تھا۔ اس کا سونا اور جاگنا نہایت گندے عادتوں اور ذلیل حرکتوں میں گذرتا تھا۔ شراب کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ہر وقت نشے میں چور رہتا جب میں اسکی تعلیم سے نا امید ہو گیا تو اسے مدرسے سے نکال کر غزبہ بھیجدیا تاکہ فن زراعت سیکھ کر میرا قائم مقام بنے کیونکہ میری عمر بہت گذر چکی ہے لیکن وہ وہاں بھی ان معزز و محترم لوگوں سے نہ ڈرا جنہیں میں نے اس پر نگراں مقرر کیا تھا۔ بٹائی پر کھیتی کرنے والوں سے جتنا مال اس کے ہاتھ میں پہونچتا سب اپنی عیاشیوں اور مسرتوں پر اڑانے لگتا۔ وہ قاہرہ کی نہایت پست طبقہ کی عورتوں سے دوستی لگا کر انہیں غزبہ میں اپنے گھر کے اندر بلاتا تھا کیا یہ ساری باتیں ہمارے لئے باعث ننگ و عار اور ہماری عزت پر بدنما داغ نہ تھیں بآخر کار اس کی شرارتیں یہاں تک بڑھیں کہ وہ حادثہ ہوا جس نے مجھے ذلیل کر دیا۔

عباس - گولی چلنے کا واقعہ؟

مصطفےٰ ہاں کیا آپ اس حادثہ کو معمولی سمجھتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے اس کوشش میں اپنی آبرو تک گنوا دی کہ اس نافرمان لڑکے کو رہا کراؤں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس نے غزبہ کو موٹر کے ذریعہ ٹھیک ۲ بجے صبح چھوڑا۔ وہ نشے میں تھا اس لئے قاہرہ دو بجے کے بعد پہونچا۔ راستہ بھر ٹھہرتا ہوا اور شراب پیتا ہوا آیا تھا جیسا کہ ان شیشوں سے پتہ چلتا تھا جو موٹر میں پائے گئے پھر وہ اسی مستی کی حالت میں اپنی ناپاک عادت کی طرف راغب ہوا لیکن جب اپنی مطلوبہ کو دوسرے لوگوں کے ساتھ پایا تو اس پر ریوالور سے فیر کر دیا۔ گولی لڑکی کے شانے پر لگی۔ آگے کیا ہوا؟ ان تمام تفصیلات کا آپ کو علم ہے اف میری کتنی بدنامی ہوئی۔ اپنی پیہم کوششوں کی وجہ سے اس کو قید سے بچانے کے بعد جو اس کو لازمی تھی میں نے اس سے عہد لیا کہ اب وہ شراب نہ پئے گا چنانچہ اس پر اس نے نہایت سخت سخت قسمیں کھائیں تب میں نے اس کو اپنے یہاں آنے دیا۔ اف میں کانپ اٹھتا ہوں جب اس رات کو یاد کرتا ہوں۔

عباس بک نے اس فتنے کو سمجھ لیا جو اس کے دوست کے سینے میں اس وقت اٹھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے دوست کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا: "ہاں مجھے وہ رات خوب یاد ہے۔ میں اپنی بیٹی زینب کی منسوبہ قاسمہ کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کو دیکھا کہ وہ بالکل بدمست مکان کے اندر داخل ہو رہا ہے اور اس کے منہ سے شراب کی بدبو نکل کر پھیل رہی ہے میں نے وہ جواب بھی سنا جو وہ آپ کو بے شرمی سے دے رہا تھا: کیا تو میرا مالک ہے؟ میں اپنی طبیعت سے جہاں چاہتا ہوں جاتا ہوں اور جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ تجھے مجھ سے کیا سروکار ہے۔" لیکن آپنے بھی وہی کیا جو اس کے لئے کافی تھا۔ آپنے فراموش نہ کیا ہوگا آپ نے اسے نکال دیا اور کہا کہ خبردار جو آج کے بعد میرے گھر میں قدم رکھا اور مجھے اپنی صورت دکھائی اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپ کو راضی کرے مگر آپ نے اسے بالکل چھوڑ دیا اور ایکدم الگ رہے اس کے بعد وہ سوڈان چلا گیا تاکہ وہاں کچھ کام کر کے زندگی بسر کرے۔

مصطفےٰ - کیا آپ یہ چاہتے تھے کہ میں اس کے ماسوا کچھ اور کرتا۔

عباس - ہرگز نہیں، اس وقت میں کچھ نہیں چاہتا تھا مگر اب اسکی حالت بدل گئی ہے

مصطفےٰ - اس سے آپ کا مقصد؟

عباس - میرا مقصد یہ ہے کہ آپ ضرور اپنے لڑکے کے پاس جائیں اور اس کو دیکھیں۔ مصطفےٰ پاشا نے قطع کلام کر کے کہا: "میرے دوست آپ کیوں اپنے تئیں خواہ مخواہ مشکل میں پھنسا رہے ہیں میں ہمیشہ یہی یقین رکھونگا کہ میرا بیٹا مر گیا۔ اب دنیا میں میرا کوئی بیٹا نہیں ہے"

عباس ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے آج اسے دیکھا ہے اور وہ موجود ہے مرا نہیں ہے آپ اس کو جانتے ہیں اور شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں ہے مگر آپ اپنی سختی قلب کے سبب اس کی موت کی خبر پھیلانے پر آمادہ ہیں۔

مصطفےٰ ۔ عباس سختی کی کوئی بات نہیں غیر ممکن ہے کہ میرا دل دوسری مرتبہ اس نافرمان لڑکے کے لئے صاف ہو جس نے میری زندگی کو تلخ کر دیا۔

عباس ۔ آپکا موجودہ عزم ممکن ہے کہ اسکی گذشتہ حالت پر چسپاں ہو لیکن اب مینب کی حالت بالکل بدل گئی ہے اب وہ دوسرا شخص ہو گیا ہے وہ صحیح معنوں میں مرد ہو گیا ہے وہ اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے اور اپنا پسینہ بہا کر روزی حاصل کرتا ہے کون تصور کر سکتا تھا کہ ایک صاحب عزت و مرتبہ و مالدار کا بیٹا مینب کسی دن اس طرح پریشان ہوگا کہ روزی کیلئے قاہرہ کی سڑکوں پر موٹر ڈرائیوری کرے گا۔ یہی اس کے انقلاب کی زبردست دلیل ہے کیا ایسا نہیں ہے؟

مصطفےٰ پاشا نے اپنی پیشانی پر تیوری چڑہائی ۔ اور غم و فکر میں سر ہلا کر کہا: "کیا اس کی حالت بدل گئی ہے، یہ کون جانتا ہے۔"

عباس ۔ اگر آپکو شک ہے تو خود اسکی تحقیق کر لیں بغیر تحقیق کے آپ کو شک نہیں کرنا چاہئے ۔ لیجئے یہ اس کا پتہ ہے، جسے میں نے کمپنی سے حاصل کیا ہے

مصطفےٰ نے کاغذ لے لیا اور اس میں پڑہا: "مینب محلہ اربعین عطفۃ الخیالہ ۔ بولاق روڈ۔" مصطفےٰ کے چہرہ پر حالت تاثر ظاہر ہوئی اس نے کہا "ایں مینب وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔" عباس نے دیکھا کہ اس کے دوست پر محبت کا جذبہ غالب ہو رہا ہے تو اس نے کہا: "محترم دوست! میں آپ ہی کی طرح ایک باپ ہوں ۔ اس قدر سنگدلی سے قہر کا جذبہ پیدا کر لینا عبث ہے آپ نے فوج میں تیس سال زندگی بسر کی ہے یہاں تک کہ یہ اعلیٰ منصب حاصل کیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ اس حد تک سختی و درشتی سے کام لیں اس وقت آپ کو لازم ہے کہ اپنے لڑکے کو دیکھنے کے لئے جائیں ۔ خبر نہیں وہ کس بیکسی و بے بسی کی حالت میں ہوگا۔" اس وقت مصطفےٰ کی آنکھیں ہلکے آنسوؤں سے تر ہو کر چمک اٹھیں اس نے چاہا کہ یہ کمزوری ظاہر نہ ہونے پائے ۔ وہ اس کاغذ کو جس پر پتہ لکھا ہوا تھا اپنی انگلیوں سے ملنے لگا ۔ پھر بستر کی طرف متوجہ ہو کر اور اپنی پشت اپنے دوست کی طرف کرتے ہوئے بولا: "میرا بیٹا! کون ... مینب؟ نہیں نہیں۔"

عباس نے اٹھتے ہوئے جواب دیا: "اے پاشا آپ کا بیٹا ہاں آپ کا بیٹا مینب، اگر وہ اس قابل نہیں کہ اسے دیکھا جائے تو قاسمہ ہی کے سبب سے اسے دیکھئے جس کو آپ اپنی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں اس کیلئے اس کا پانا مناسب ہے جس کا وہ ہمیشہ تذکرہ کرتی ہے ۔ اور آج تک اسکے لئے اسکے دل میں خلوص ہے"

دوسرے دن شام کو مصطفےٰ پاشا بولاق روڈ پر لوگوں سے اربعین محلہ کا پتہ پوچھ رہا تھا اس نے محلہ اربعین کو ان پرانے اور تنگ محلوں میں سے پایا جن کی طرف مصلحت تعلیم کے بعد کبھی اس کا گذر نہ ہوا تھا اس میں ٹوٹے بڑے پتھروں کے چبوترے بنے ہوئے اور کئی کئی منزلوں کے مکانات تھے ان کے دروازوں کے سامنے عورتیں بیٹھی ہوئی باتوں میں مصروف تھیں اور مرغیوں اور بطخوں کی حرکات دیکھ رہی تھیں ۔ اس محلہ کی گلی میں پاشا چند قدم آگے بڑہا تھا کہ "عطفۃ خیالہ" مل گیا مصطفےٰ کو سخت حیرت ہوئی جب اس نے عطفہ کو ایک دو منزلہ مکان کا نام پایا اس نے ایک موٹی سی عورت سے جو دروازے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی مینب مصطفےٰ کے متعلق پوچھا ۔ عورت نے کہا کہ میں اس مکان کی مالکہ ہوں مینب نے دوسری منزل کرایہ پر لے رکھی ہے ۔ پاشا دوسری منزل پر چڑہا اور دروازہ کھٹکھٹایا ۔ ایک پچیس سالہ جوان لڑکی نے دروازہ کھولا جو گندمی رنگ کی تھی اور اچھے لباس میں ملبوس تھی ۔ مصطفےٰ نے اس سے پوچھا کہ کیا "مینب کا یہی گھر ہے؟" وہ مصطفےٰ کا منہ غور سے دیکھکر مسکراتی ہوئی بولی "ہاں اے محترم چچا" عورت کے اس خطاب پر مصطفےٰ حیران ہوا لیکن اس کی حیرانی زیادہ دیر تک نہ رہی کیونکہ لڑکی اسے ملاقات کے کمرے میں لیکر آئی اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی: "میں نے آپ کو پہچان لیا ہے آپ مینب کے والد بزرگوار ہیں آپ کی صورت بعینہ مینب کی صورت ہے میں اسکی بیوی ہوں۔"

جونہی اس نے یہ کہا مصطفےٰ پر گویا بجلی سی گر گئی ۔ وہ کمرہ میں جلد جلد نظر دوڑانے لگا اور پھر کرخت آواز سے کہا: "مینب کی بیوی؟"

لڑکی ۔ ہاں مینب کی بیوی مجھے اس سے شادی کئے ہوئے تین ماہ گذر گئے ہیں اس نے اپنی زندگی کے تمام حالات سے خبر دیدی ہے اپنی نادانی اور آپکی شرافت کی بھی غرض مجھے تمام باتوں سے خبر دے چکا ہے۔" پاشا ایک خشک ہنسی ہنستے ہوئے بولا: "شاید تمھیں شادی سے قبل بھی اس نے ان باتوں کی خبر دی ہوگی ورنہ تم اسکو شوہر بنانے میں غور و فکر نہ کرتیں غالباً تم نے ہمارے ساتھ رشتہ جوڑنے میں کچھ ہمارے مال و شرف میں کامیاب ہونے کا گمان کیا ہوگا تو تم" قبل اس کے کہ مصطفےٰ اپنی بات پوری کرے عورت کا چہرہ تمتما گیا اس نے قطع کلام کر کے ایسے لہجہ میں رک رک کر کہنا شروع کیا جو شرم و حجاب سے پُر تھا: "ہرگز نہیں اے میرے آقا! جس دن میں نے اسے شوہر بنانے پر غور کیا تھا اس کے متعلق ذرا بھی خیال نہ تھا

میرا تصور بھی اس طرف گیا تھا میں اس وقت ایک گرلس سکول میں معلم تھی اور اپنی قلیل تنخواہ میں جو مجھے ملتی تھی نہایت اچھی طرح بکفایت زندگی بسر کر رہی تھی منیب ایک دن آیا اور اس نے ایک بالاخانہ کرایہ پر لیا جس کو آپنے داخل ہوتے وقت اس گھر کے بائیں جانب دیکھا ہوگا میں نے اس کے پھٹے ہوئے گرد آلود لباس اور غمناک صورت سے پتہ چلایا کہ وہ مجبوری و تنگی کی حالت میں ہے اور یقیناً اس کی موجودہ زندگی میں کوئی خاص راز پنہاں ہے بس اسی وقت سے اپنے دل میں اس کیلئے کچھ نرمی اور مہربانی کا جذبہ محسوس کیا میں اس کو دیکھتی کہ رات کے آخری حصے میں شراب سے بدمست اپنے کمرہ میں آتا تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا تب گھر کی مالکہ اس کے لئے دروازہ کھولتی مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیکار ہے اسے کوئی کام ہی نہیں ملتا۔ میں نے غور کیا کہ کاش وہ کسی نیک بیوی سے موافقت کرتا جو اس کی مدد کرتی اور اس کو ان تمام بُری عادتوں سے رہائی دلاتی۔ میری فکر کی منشا صرف اسی قدر تھی۔

مصطفےٰ پاشا اس کے قریب آگیا اور اس کی طرف دیر تک دیکھتا رہا پھر اپنے پہلے لہجہ میں کہنے لگا: "لیکن جب تم نے اس کا خاندان اور میرا نام سُن لیا تو پھر تم اس سے شادی کرنے پر کس طرح تیار ہوئیں؟"

لڑکی نے جواب دیا "میں نے اس سے صرف اس لئے شادی کی کہ اس کو بد عادتوں سے بچالوں نہ اس لئے کہ شرافت کو کھوٹا کروں۔" کچھ دیر ٹھہر کر پھر کہنے لگی۔ ایک رات وہ خلاف عادت سویرے مکان پر آگیا اس نے ابھی بالاخانہ کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ اس لئے مکان کی مالکہ نے اس سے نہایت خشک اور ذلیل مطالبہ کیا اور بری بری گالیاں بھی دیں۔ وہ تمام باتوں کو سنتا ہوا بالاخانہ میں داخل ہوگیا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ میں اس وقت اپنے گھر کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سنا، ہاں میں نے سنا کہ وہ نہایت رقت اور تاثر سے رو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا وہ میرے قریب ہی سے گذرا۔ اس کے چہرے سے کسی خطرناک ارادہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، اس کا پیچھا کرنے کیلئے میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہو رہی تھی میں نے اسے دیکھا کہ وہ دریائے نیل کی طرف جا رہا ہے آپ جانتے ہیں کہ دریائے نیل یہاں سے بالکل قریب ہی ہے۔ بولاق کے پل کے پاس منیب ٹھہر گیا اور پانی پر نظر کرنے لگا۔ وہ ایک غمگین قاتل کی طرح رات کی تاریکیوں میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں اس کے پاس آئی اور سلام کرنے کے بعد مختلف قسم کے سوالات کئے بالآخر اس نے مجھ سے اقرار کیا کہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا اور میرے پانی میں کود پڑنے کا وقت بالکل قریب تھا میں اسکو سمجھا بجھا کر تسلی دیتے ہوئے گھر لائی اور مالکہ مکان کا جو کچھ اس کے ذمہ بقایا تھا ادا کر دیا۔ یہی وہ رات تھی جس میں ہم دونوں نے شادی کیلئے گفتگو کی، اس رات نہ آپکی ثروت میں طاقت ہوئی اور نہ آپکی دولت میں نہ آپکے مرتبہ میں کہ اسکی زندگی موت سے بچا لیتی۔ صرف میں نے اسے بچایا ہاں تنہا میں نے بچایا۔ لڑکی بولتی رہی اس کا سینہ دھڑک رہا تھا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھی۔

مصطفےٰ اس کی تقریر سے بہت متاثر ہوا اور نہایت اشتیاق سے اس کے اور قریب ہو کر بولا: "لیکن میری بیٹی تم بغیر شادی کے بھی جو کچھ اس کے ساتھ کرنا چاہتیں کر سکتی تھیں جبکہ تم اس کے خاندان کو جان چکی تھیں جس کی طرف وہ اپنی نسبت کرتا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا "میرے آقا میں آپ سے عرض کرتی ہوں منیب نے جس وقت شادی کا مطالبہ کیا اور عاجزی و الحاح سے کہا کہ میں اسے اپنا شوہر بنالوں تو اس نے صاف طور پر آپ کے متعلق یہ بھی کہا کہ میرا تعلق والدین سے منقطع ہے میں انکی طرف ہرگز ہرگز نہیں لوٹونگا۔ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا ثروت سے بہتر سمجھتا ہوں جس کو میں ان کی جانب سے پاؤنگا۔"

مصطفےٰ نے لڑکی کا رخ اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا "کیا تم نے اسکی تصدیق کرلی؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ منیب جیسا نوجوان اس تنگ محتاج زندگی کو بہتر اور افضل جانتا ہوگا وہ بھی ایک حقیر اور گندے مکان میں جو بہترین آبادی سے دور ہے پھر ایسی لڑکی کے ساتھ جو اگرچہ پاک نفس اور شریف ہے مگر وہ عورت غیر ممکن ہے ایسے مقام میں رہے جو منیب کے خاندان کی عورت کے شایان ہے کیا منیب نے تم سے اپنے بچپن کی منسوبہ قاسمہ کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے، اے میری بیٹی میں تم سے کہتا ہوں کہ قاسمہ کے باپ عباس بک کی موٹر اس اربعین محلہ سے گذر بھی نہیں سکتی، جہاں یہ تاریک عطفہ واقع ہے۔"

لڑکی نے ان فخریہ کلمات کو سُنا اور اپنا سر جھکاتے ہوئے نہایت گہری فکر میں ایک آہ کی اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "محترم آقا! آپ کو حق ہے جو کچھ فرمائیں لیکن میں صحیح عرض کرتی ہوں کہ یہ زندگی جو اس وقت منیب گذار رہا ہے اس کی گذشتہ حالت کا اندازہ کرتے ہوئے درحقیقت جنت ہے۔ آپ نے اسے دور کردیا اس کیلئے اپنا دروازہ بند کر دیا اپنی نرمی اور شفقت اس پر حرام کردی شراب نوشی کی عادت نے اسے یہاں تک پہونچا دیا کہ وہ کبھی ہوش میں نہیں رہتا تھا اور جب سوڈان سے واپس آیا تو کسی کام کی تلاش میں سرگرداں پھرتا رہا

کوئی کام نہ ملا اس پر کام کا راستہ تنگ ہو گیا یا تنگ کنا امید ہو کر موت کو ترجیح دی لیکن مجھ محتاج اور کمزور لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کوشش کی یہاں تک کہ اسے اس جدید کمپنی میں کام کی جگہ مل گئی اب وہ ایک ٹھنڈا آدمی ہے اس کو کسی چیز کا غم نہیں وہ مزدوری کرتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے اب وہ ایسا ہو گیا ہے کہ شراب کو چکھتا بھی نہیں اس نے اقتصاد۔ کفایت شعاری اور میانہ روی کی قیمت پہچان لی ہے اسے سوائے کام اور اس گھر کے کسی چیز سے واسطہ نہیں آپ وہ ایک مرد ہے۔ صحیح معنوں میں مرد کامل!

مصطفےٰ ۔ بہت خوب، میں تہ دل سے مشکور ہوں لیکن اس بارے میں تم کیا کہتی ہو کہ میرا ارادہ اب اسے گھر لے جانے کا ہے۔

لڑکی ۔ میرے آقا آپ جو چاہیں کریں میرا کیا حق ہے۔

مصطفےٰ ۔ اوہ میری بیٹی مجھے امید ہے کہ تم اسے زیادہ حرج نہ سمجھو گی کہ میرے لڑکے منیب کا تعلق تم سے اب نہیں ختم ہو جائیگا اور اسکی زندگی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ گذریگی جو ہر طرح اس کے لائق ہے اور اس کے خاندان سے ہے لیکن تمہارے متعلق میں اس بات کے لئے تیار ہوں کہ تم نے جو کچھ منیب کی ذات پر صرف کیا ہے اس کا معاوضہ دیدوں!

لڑکی ۔ نہیں! اے آقا نہیں! میں اس بدلہ کی کبھی خواہاں نہیں۔ میں جس طرح پہلے تھی اسی طرح زندگی بسر کر سکتی ہوں مجھے کسی شخص سے کسی چیز کی ضرورت نہیں

مصطفےٰ ۔ لیکن جب تم حقیقت میں اس سے محبت رکھتی ہو تو تم پر لازم ہے کہ اسکی سعادت کی راہ میں دیوار بن کر نہ کھڑی ہو مجھے منیب کا اس حالت میں رہنا کسی طرح منظور نہیں اور شاید تم بھی میری اس بات کی تائید ہو گی کہ اس کیلئے گھر لوٹ جانا اور میری ثروت سے فائدہ اٹھانا ہی بہتر ہے تاکہ وہ اس محنت شاقہ سے نجات پائے جو قطعاً اس کے لائق نہیں ہے۔

لڑکی نے کمرہ میں ادہر ادہر نظر دوڑائی۔ ایسی تاریکی پھیل رہی تھی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اختیار میں نہ رہ سکی اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور رونے لگی۔ پاشا اس کے رونے سے بیحد متاثر ہوا اور ضبط کرتے ہوئے اس کے اور قریب آگیا لیکن لڑکی نے اسے بولنے کی مہلت نہ دی وہ خود یہ کہتی ہوئی اس سے دور ہٹتی جا رہی تھی: "محترم آقا! آپ جو چاہیں کریں جب منیب کی یہی مرضی ہوگی کہ اس کی

سعادت میرے چھوٹنے اور آپکے یہاں لوٹنے میں ہے تو مجھے منظور ہے آپ اس سے اس کا تذکرہ کریں۔" وہ مصطفٰے کو وہیں چھوڑ کر کمرہ سے نکل گئی۔

مصطفٰے پاشا اس تنگ بالاخانہ میں تنہا رہ گیا۔ تاریکی کمرہ میں پھیلتی جارہی تھی۔ کمرے کی تمام چیزیں مُردہ جسم کی طرح خوفناک معلوم ہو رہی تھیں پاشا اپنے لڑکے مینب اور اسکی نوجوان معلمہ بیوی کے متعلق فکر کرنے لگا کہ پہلے اس لڑکی نے اپنی ذات کو بلند کیا اور میرے لڑکے مینب کو رتبے پر پہونچایا اور اس کو موت کے مُنہ سے بچایا۔ اسی خاموشی میں چند منٹ گذرے ہونگے کہ پھر دروازہ کھلا اور اسی تاریکی میں ایک شخص اندر داخل ہوا جو دیا سلائی سے اجالا کر رہا تھا مصطفٰے نہایت تیزی سے چیخا "مینب"! مینب گذشتہ تمام باتوں کو بھول گیا اور اپنے باپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان بے اختیار ہو کر دوڑ پڑا۔ باپ اور بیٹا دونوں لپٹ گئے دونوں پر تاثر کا دورہ تھا۔ دونوں گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ دونوں نے اپنے گذشتہ اور موجودہ حالات کا ذکر کیا۔ اسی درمیان میں پاشا نے بیٹے سے اس عورت کے متعلق پوچھا جو اس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کر رہی تھی مینب نے جواب دیا، کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟

مصطفٰے ۔ ہاں، اس نے بات بھی کی ہے۔

مینب ۔ وہ میری بیوی آپ کی بہو ہے۔

مصطفٰے ۔ وہ تمہاری بیوی کس طرح بن سکتی ہے؟

مینب ۔ وہ بیوی سے بڑھ کر ہے۔

مصطفٰے ۔ میں اسے تمہاری بیوی گذشتہ حالت میں سمجھ سکتا ہوں جب تم غریبوں سے مہربانی اور نرمی کے محتاج تھے جب تم خاندان کی محبت اور الفت کو تلاش کر رہے تھے مگر اسے نہ پاتے تھے۔ لیکن اے مینب اب تم ایک بڑے گھر میں لوٹ جاؤ گے .... ہاں میرے گھر میں عنقریب لوٹ جاؤ گے۔

مینب ۔ آپ جو چاہیں کریں لیکن اس کے بغیر میں کسی چیز سے خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مجھے موت سے نجات نہ دلاتی اگر وہ میری قیادت اور میری ہدایت نہ کرتی تو آپ بھی مجھے بلانا منظور نہ فرماتے۔ مجھے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیتے۔ آپ نے مجھے اس لئے بھگا دیا اور دور کر دیا تھا کہ میں شرابخوار کمینہ۔ بداخلاق۔ سست۔ گندہ اور بیکار تھا۔ میں یہاں تک ذلیل ہوچکا تھا کہ مجھے اس عورت نے پہچانا ...."

مصطفٰے ۔ کیا تم اس چیز کو بھول گئے کہ وہ تمہارے طبقہ سے نیچے طبقہ کی ہے۔

مینب ۔ لیکن اس نے مجھے اس وقت پہچانا جبکہ میں ذلیل ہو رہا تھا اور اس سے بھی پست تھا ہاں اس وقت جبکہ میرے طبقہ اور میرے خاندان نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔

مصطفٰے ۔ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم اپنے کو بھول گئے۔ تم یہ فراموش کر گئے کہ تمہاری بچپن سے ایک منسوبہ بھی جواب تک تمہاری منتظر ہے اور تمہاری خطا معاف کر چکی ہے۔ کیا تم اپنے چچا عباس بک کی لڑکی قاسمہ کو بھول گئے؟

اب مینب سر جھکا کر سوچنے لگا اس وقت ایک کثیف بدلی جو چاند کی روشنی پر چھائی ہوئی تھی ہٹ گئی اس کی روشنی بالاخانہ میں پھیل گئی مینب کا زرد کپڑا ظاہر ہو گیا جسے وہ موٹر چلانے کے وقت پہن لیا کرتا تھا اور اب بھی اسے پہنے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے باپ سے تھرتھراتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ہاں! میں تمام چیزوں کو بھول گیا"

بوڑھے نے ضبط کرتے ہوئے اپنے سر کو ہلایا۔ اس کی سانس نہایت زور سے چل رہی تھی۔ اس نے طنزاً کہا۔

"ایں کیا تم یہ بھی بھول گئے کہ وہاں بہت سی دولت ہے جو صرف تمہیں کو مل سکتی ہے لیکن اب وہ میرے چچا کی اولاد کو ملیگی جنھیں میں بُرا جانتا ہوں اور زندگی بھر ان سے نفرت کرتا رہا ہوں، تم نہ جاؤ تمہاری مرضی ..... یہیں اس تنگ اور گندی گلی میں رہو ...... ہاں اس قبر میں رہو جس میں کیڑے کوڑوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہو ...... جس طرح چاہو ..... میں جا رہا ہوں ..."

یہ کہہ کر پاشا نے چلے جانے کا قصد کیا اور سیڑھیوں کی طرف چند قدم چلا۔ مینب بالکل ساکت اور صامت اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکایک مصطفٰے پاشا پیچھے کی طرف مڑا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو روتا دیکھ کر انتہائی تاثر سے جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا بالآخر اپنے بیٹے کے پاس لوٹا اور اپنے ہاتھوں کو اس کے کندھے پر رکھ کر نہایت نرم آواز میں تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "سنو مینب! اب تک میں اپنے ضمیر کے خلاف کر رہا تھا

اور اس پر صبر کرتے ہوئے تم سے تقاضا کرتا تھا کہ تم اپنی بیوی سے خیانت کرو اور اس سے الگ ہو جاؤ حالانکہ اس نے سوائے بھلائی کے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ پیارے بیٹے! میں ناقدرشناس نہیں ہوں تم پر لازم ہے کہ اس کے خوبصورتی اور [illegible] قوت کا اعتراف کرو۔ اگر تم میری موافقت کرتے اور اسے چھوڑ دیتے تو میں تمہیں دل سے برا جانتا...... بلاشبہ اس وقت تم کامل مرد ہو۔

پھر باپ بیٹے نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مینب اپنی بیوی کے ساتھ باپ کے بڑے گھر واقع مہاسیہ میں لوٹ چلے وہاں اسکو نکالنے کا پہلے سبب تھا کہ وہ شریر، عیاش اور آوارہ لڑکا تھا۔ لیکن اپنی بیوی کے سبب اب وہ کامل مرد ہو گیا تھا۔ ہاں! صحیح معنوں میں مرد جیسا ہونا چاہئے اور اب بجا طور پر باپ کے یہاں رہنے کا مستحق تھا۔

(ترجمہ از عربی)

غزل

تمام تر مری ہستی پہ چھا گئے ہو تم، — نظر میں، روح میں، دل میں سما گئے ہو تم

بہارِ حسن کی دنیا دکھا گئے ہو تم، — فضائے عشق کو رنگیں بنا گئے ہو تم

کچھ اس نگاہ سے دیکھا کہ اب نہیں یہ خبر — بنا گئے ہو کہ مجھ کو مٹا گئے ہو تم

جہانِ عشق کے دلچسپ ہیں یہ نظارے — رلا رلا کے کسی کو ہنسا گئے ہو تم

ہمیشہ اس کے مقدر میں ہوگی ناکامی — وہ کیا بنے گا کہ جس کو مٹا گئے ہو تم

دکھا کے جلوۂ رنگیں اٹھا کے رخ سے نقاب — مجھے حجاب سراپا بنا گئے ہو تم

وہی پھر ایک تبسم حجاب کے پردے میں
کہ جس سے سحر کو اپنا بنا گئے ہو تم

سحر الہ آبادی